
فنون

رجسٹرڈ نمبر ایل: ۷۵۷۹
ٹیلیفون: ۶۹۵۸۰

فنون

خاص سہ ماہی شمارہ

۸

ادارہ

احمد ندیم قاسمی حبیب اشعر دہلوی

تزئین
موجد

جلد: ۵ مئی، جون ۱۹۶۷ء شمارہ: ۲۰۱

مقام اشاعت: ۴۷ - انارکلی - لاہور (مغربی پاکستان)

مندرجات



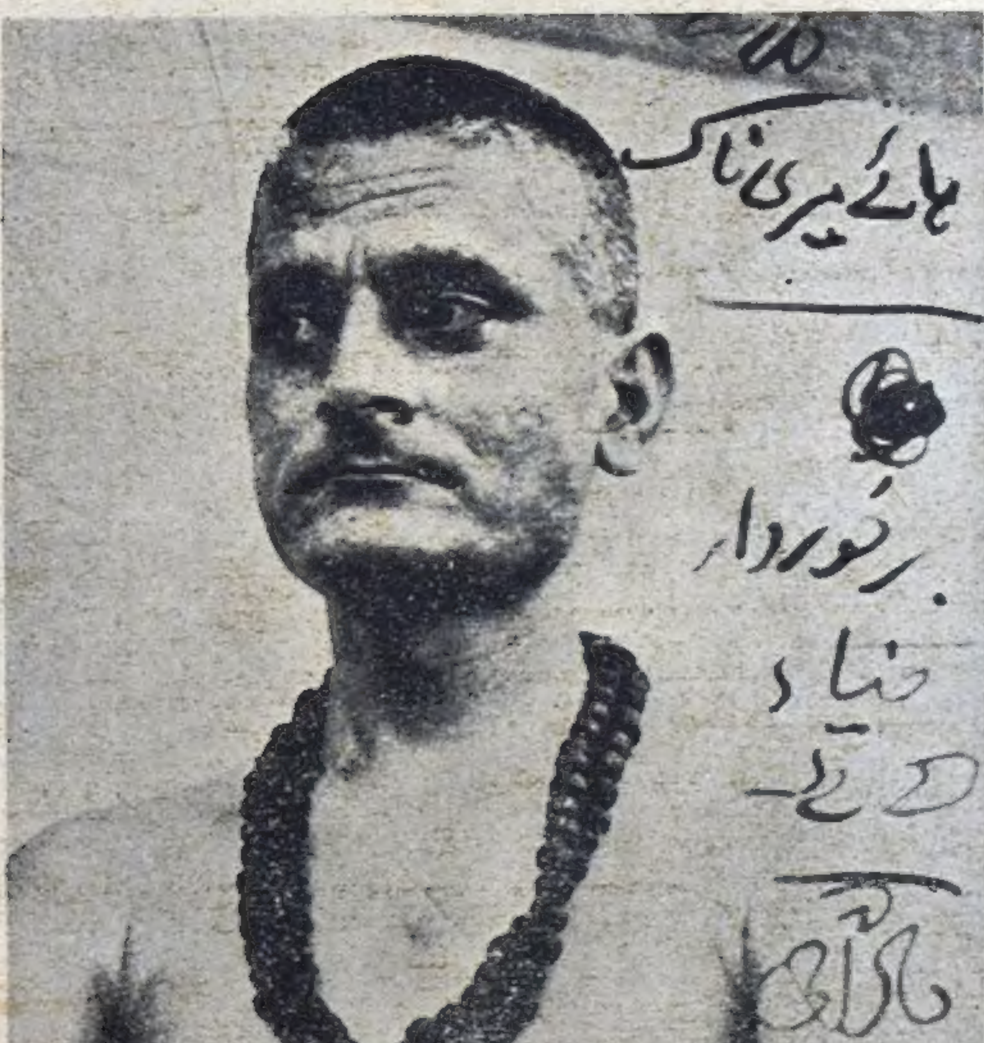


عطیہ بیگم فیضی



سعادت حسن منٹو

عمل : موجد



میرا جی

بشکریہ ضیا جالندھری

ندیم

حرفِ اوّل

فنون کے سہ ماہی نمبر دوں کی بروقت اشاعت کے موسم راہِ کو اب کے اخباری کاغذ (نیوز پرنٹ) کی نایابی اور اس کے بعد گرانی نے شکست دی۔ ابتک کاغذ کی قیمتیں معمول پر نہیں آئیں۔ فنون اور دوسرے معیاری ادبی رسائل کے لئے یہ قیمتیں ناقابلِ برداشت ہیں تو سالوں ہی رسالے کی اشاعت میں تاخیر بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ ان میں سے ایک کو برداشت کرنا ضروری تھا، سو "فنون" کی سہ ماہی اشاعت بخدمت پیش ندامت ہے۔

کاغذ کی مشکل ہم قارئین اور معاونین سے اس تاخیر کے معذرت خواہ ہیں اور ملکی مصنوعات کو اہلِ ملک تک پہنچانے کے ذمہ دار حضرات سے شاکی ہیں کہ بڑے بڑے اشاعتی ادارے تو شاید کاغذ کی نایابی اور گرانی کو اتنی شدت سے محسوس نہ کرتے ہوں مگر یہ صورتِ حال ادبی رسائل کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ بازار میں قیمتیں من مانا عروج حاصل کرتی رہتی ہیں اور کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اس کا تدارک کرے، اور حالات کو سدھارے یا پھر ایک دفاعی بیان ہی جاری کر دیا جائے کہ ملکی ضروریات سے کہیں زیادہ کاغذ تیار کرنے والے کارخانے کو کاغذ مہیا کرنے کے سلسلے میں یکایک کیا رکاوٹیں پیش آگئی ہیں۔ پاکستان میں "انجمنِ ادبی رسائل" کے نام کا ایک ادارہ بھی ہوتا تھا۔ "فنون" کو اس ادارے کی رکنیت کی عزت حاصل نہیں ہے مگر ملتِ مذکورہ انجمن سے یہ پوچھنے کا حق تو شاید حاصل ہے کہ کاغذ کے اس شدید بحران کے دنوں میں اس انجمن نے اپنے وجود کا کیا ثبوت مہیا کیا ہے اور کیا اس کی سرگرمیاں صرف انتخابات اور عہدوں کی تقسیم تک محدود ہیں۔ کم سے کم لاہور سے شائع ہونے والے بیشتر ادبی و علمی رسائل کو کاغذ کی اس نایابی اور گرانی نے بے طرح پریشان کر رکھا ہے اور انجمنیں ایسے ہی حالات کے مقابلے کے لئے قائم کی جاتی ہیں۔

اس مشکل کا حل یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ "فنون" کو کاغذ حاصل کرنے یا مقررہ قیمتوں پر حاصل کرنے میں دشواری پیش آئی ہو۔ قریب قریب ہر اشاعت پر ہمیں ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس مشکل کا کوئی سبب سوائے اس کے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کھلنا نیوز انڈسٹری نے مغربی پاکستان میں اپنا کوئی ذخیرہ قائم کرنے کی ضرورت ... تک محسوس نہیں کی اور ساحل کراچی پر جہازوں کے لنگر انداز ہونے میں ذرا سی تاخیر مغربی پاکستان کے تمام شہروں میں کاغذ کے بازاروں میں تہلکہ مچا دیتی ہے۔ متعلقہ حکام سے استدعا ہے کہ وہ اس صورتِ حال کے حتمی سدباب کی کوئی سبیل سوچیں اور ادبی رسالوں کو باقاعدگی سے جاری رہنے کا موقع بخشیں۔

بیگم عطیہ فیضی گزشتہ دنوں ہماری تہذیب و ثقافت کی ایک مجسم تصویر کو جس کا نام بیگم عطیہ فیضی تھا، موت نے ہم سے چھین لیا۔ بیگم عطیہ فیضی کے انتقال کے بعد ہی اہلِ ملک پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کی شخصیت کتنی ہمہ جہت اور ہمہ رنگ تھی۔ پنجابی کے معروف شاعر اور اردو کے مشہور صحافی "منو بھائی" نے بیگم عطیہ فیضی کے انتقال پر اخبارِ جہاں میں جو یادگار مرثیۂ منثور لکھا تھا وہ اخبار مذکور کے شکریے کے ساتھ "فنون" میں شامل کیا جا رہا ہے کہ ہماری صحافت میں اس سے زیادہ موثر ماتم شاید ہی کسی تہذیبی شخصیت کا ہوا ہو۔

شاہد احمد دہلوی پرچہ پریس میں بھیجا جا چکا تھا جب اردو زبان و ادب کی ایک ہمہ اثر شخصیت شاہد احمد دہلوی کے انتقال کی خبر ملی۔ ہم شاہد احمد مرحوم کے متعلقین کے ساتھ اس غم میں برابر کے شریک ہیں کہ یہ غم پاکستان کی پوری تہذیبی زندگی کا غم ہے۔

شاہد لطیف اردو کے ایک ذہین افسانہ نگار اور فلمی ہدایت کار شاہد لطیف بھی گزشتہ دنوں بمبئی میں انتقال کر گئے۔ ہمیں اس حادثے پر مرحوم کی بیگم عصمت چغتائی صاحبہ سے دلی ہمدردی ہے۔ آئندہ شمارے کا ایک حصہ بچھڑنے والے ان دونوں دوستوں کے لئے وقف کیا جائیگا۔

مختار صدیقی

کوئی ایسی طرزِ طواف ـــــ

پہلا تابلو

عرفات

دن کی یہ خیرہ کن سی دھوپ
اُجالوں کی جنوں خیز چمک ــــ یہ
رات کی چیرتی ٹھنڈک کی نموُ دشمنی
صحرا سازی
آبِ کم یاب سے اس دیس کی محرومی
ہر اک رُت کی خزاں پر وازی!
خار و خس مُردہ، یہ بے برگ و نوا ٹیلے فسردہ
بہ زمیں افتادہ!
خاک بھی زرد و زبوں حال، تو ہر سنگ بھی بد رنگ یہاں
ریت تک جھلسی ہوئی بھوری، کہیں حدِ نظر تک
کوئی بستی نہ نشانِ جادہ!
پست کہساروں کے یہ سلسلے
میداں میں
ڈھلانوں پہ
نشیبوں میں یکی کنکریں
ویرانی و نکبت کا یہ بے آب خرابہ
نہ کہستاں ہے نہ صحرا زادہ!!

ریگ و صرصر کا یہی دشتِ بلا ہے
جسے ٹھہرایا گیا مخزنِ خیر!
قافلے آتے ہیں — رُکتے ہیں یہاں
تازگیٔ جاں کے لیے!
حلِ مشکل میں کسی حیلۂ آساں کے لیے!
اور پر و بالِ ارماں کے لیے!!

(۲)

وقوفِ عرفات

تو بتو ریت کے بے پایاں سمندر پہ اُبھرتے ہیں حباب!
اور — ہر رنگ
ہر اک نسل
ہر اک عمر کا یہ جمِ غفیر —
اپنے ہی خیموں کی صورت — یہ کفن پوش ہجوم!
اپنے ہی ڈیروں، قناتوں کی طنابیں — یہ لوگ
اپنی عمروں کے ہر اک درد کی
بوسیدہ کتابیں — یہ لوگ!
اپنی ہر ایک دُعا، اور مناجاتِ مجسّم
نہ یہ گویا نہ یہ خاموش ہجوم!
اپنے ہی سجدوں کی بے تاب — جبینیں — یہ لوگ!
اپنی دُنیاؤں کے خود آسماں
خود عجزِ تمنّا کی زمینیں — یہ لوگ
ہر طرف پھیلا — رُکا
بڑھ نہ سکا
ٹھوکریں کھاتا رہا
خود ہی — نہ یہ بے ہوش نہ باہوش ہجوم!

نہ یہ بے حس نہ یہ پُرجوش ہجوم!
یہ نہ بھوکا نہ شکم سیر
نہ پیاسا، نہ بلانوش ہجوم!
یہ قناتوں کی طنابیں!
یہ ہر اک درد کی بوسیدہ کتابیں — یہ لوگ
یہ مناجات کے سجدوں کی جبینیں — یہ لوگ
عاجزی اور ندامت کی زمینیں — یہ لوگ

(۳)

دن کی صرصر زدہ اور خشمگیں گھڑیاں
نہ گزرتی نہ ٹھہرتی گھڑیاں!
کائنات اور وجود اور زماں سے
نہ الگ اور نہ مربوط
نہ زندہ ہی، نہ مرتی گھڑیاں!
خیموں اور لوگوں کی
یہ اوّلیں اور آخریں گھڑیاں
نہ بگڑتی، نہ سنورتی گھڑیاں!
سہ پہر تک رہیں آباد —
یہ صرصر میں نہ دبتی، نہ اُبھرتی گھڑیاں!
سہ پہر تک رہیں آباد —
مگر اُن کی تپش اور تمازت میں نہ کچھ آیا زوال!
ہر گھڑی ایک عجب صبر
عجب چین
عجب منت و زاری سے رہی
کیسی بحال، اور نہال، اور چونچال!

(۴)

اس قیامت پہ مگر طرفہ سکوں ہے طاری
دیسے، ہر سمت فضاؤں میں تھی فریاد و فغاں و زاری!
کردہ ناکردہ گناہوں پہ وہ گریے بھی
کراہوں کی بھی پردہ داری
دل کے ارمانوں کی آوازیں گلوگیر
تمناؤں کے لہجے بھاری!
نسلوں اور عمروں کے، زخموں کے لیے
راحتِ مرہم کی طلب
اور ندامت کی جگرافگاری
اپنے فردا میں نئی زیست سے جینے کی
نئی موت سے مرنے کی نئی تیاری

دُوسرا ٹابلو

مزدلفہ کی رات

موتیوں اور ہیروں سے بھی پیاری اُجلی چاندنی!!
جھلملاتی ریت کی پہنائیاں، خنکی سے چُور!
سامنے لٹ چھٹکائیں، ان میں قند کے موتی پروتی چاندنی!
کوہ و صحرا کے پرانے زنگ دھوتی ان میں رنگ، اپنا سموتی چاندنی!
اس تھکے انبوہ کی رُوحوں پہ، برقِ طور ہوتی چاندنی!!
زمزم جھونکے کس قدر آسودہ — کتنے ناصبور!
نسلوں اور عمروں کی راتوں میں کہیں آتی ہے
ایسی شام
یہ زاتوں کی رات!

پہلے ایسا دن بھی گزرے
یہ دنوں کا دن۔ ازل آثار دن!

پھر کہیں آئے گی
ایسی روح میں بستی ابد انجام
یہ راتوں کی رات!

دل میں اس کا حُسن، اس کا نور بھر لو —— (دیکھو اب رونا نہیں)
اب گئے دن
اور نئے دن رات بھی، شاداب کر لو —— (یہ بچپن کھونا نہیں)
اس سکوں اس چمن کی رعنائیوں میں
خوب جی بھر کر سنور لو —— (اس جگہ کچھ جاگنا سونا نہیں)
اور رتی کی کنکریں چُننے کو
گرد و پیش کی بھی کچھ خبر لو —— (یہ خزانہ ہیں مگر ہیرے نہیں سونا نہیں)

لاکھوں ہاتھوں ناخنوں میں
شعلہ افشاں اک تڑپ!
کنکریں چُننی ہیں ——
کھود دو اور کھود دو!
رات کو چاہے سحر کرنا پڑے
ریت کی ہر تہہ کو چاہے سنگِ سر کرنا پڑے!!
کنکریں چُن کر —— انھیں دھونا بھی ہے
گننا بھی ہے
کنکریں پوری بھی کرنی ہیں!
یہ صحرا ہو تہہ و بالا
یہاں پاتال کو چاہے خبر کرنا پڑے!!

پچھلی شب آئی
نوکیلے، تیز تاروں کے دمکتے قافلے!

روح میں رچنے لگا ہے کوئی انجانا گداز
چھُپ کے ہلکوروں سے اب کچھ راز کی باتیں کرو!
کیسے پربستہ ہو
—— کچھ تو حسرتِ پرواز کی باتیں کرو!!

باتیں ——

اے کہ میرے دل میں تیری پاک تنویریں بھی ہیں
میں نے ہر بُت جو بنایا اس کی تصویریں بھی ہیں
میری کایا کے کھنڈر پہ ثبت ہے تیری بقا
روح کی ویرانیوں میں تیری تعمیریں بھی ہیں

تیری راہ کا یہی ناز ہے، جو ملا سو آبلہ پا ملا
تجھے پا کے بھی یہی کر سکا، کہ وہ اپنے آپ سے جا ملا

مری زندگی کے تمام مرحلے آج میری نظر میں ہیں
مرے کیف و کم کے معاملے اسی شب کی راہ گزر میں ہیں

اسی ریت کا، اسی رات کا کوئی ذرّہ کوئی گھڑی ملے
تو یہ کائنات ہو نعرہ زن کہ تجلیاں مرے بر میں ہیں

کبھی رنج کوئی کٹا بھی ہے، کبھی دردِ دل سے مٹا بھی ہے
اے خدائے چارہ گری بتا کہ تو درد بھی ہے دوا بھی ہے

غمِ جاں تو میری سزا سہی، غمِ عشق دل کی خطا بھی ہے
ترا کھینچنا، ہم سے روا بھی ہے کہ تو حُسن بھی ہے خدا بھی ہے

رمیِ جمار

اور اب دن کا ہر اک لمحہ
ہجوم اور شیاطیں پہ برستے کنکر

کیسے فرسودہ و سنگیں ہیں یہ شیطان
عجب ساکت و بے بس بھی نظر آتے ہیں
اُن گھڑ بھی ہیں ـــ
پھر بھی مری صدیوں میں بسے ہیں! ـــ توبہ!
مرے ادراک کی توبہ
مرے اندیشۂ چالاک کی توبہ
مری دانش مری حکمت کی الٰہی توبہ!!

تیسرا تابلو

طوافِ حرم

ماندہ مخلوق کا دم آ گیا آنکھوں میں
تھک جائیں دعاؤں میں ہوئی ہیں لرزاں!
ب ترا گھر ـــ ترا کعبہ تیری مخلوق پہ ہے سایہ کناں!

یہ سیہ ریشمی ملبوس میں لپٹا ہوا
یہ سارے جہانوں میں اکیلا گھرا!
سادگی اور حشم کا یہ انوکھا نقشا!
کبریائی کی جلالت کا
خدائی کی کرامت کا
ہر اک قدرت و شفقت کا ازل سے قبلہ!
اس کے سائے میں کوئی مشرق و مغرب نہیں
ہر سمت و جہت ہی ہے یہی اور اُسی کا جلوہ!
پھیرے پھرتی ہوئی
احرام میں جکڑی ہوئی
دیوانگی ـــ پل پل اُٹھی

آپا دھاپی کے ہر اک پاٹ میں
پستی ہوئی فرزانگی —— پل پل اڑی
نفسا نفسی کی قیامت میں دہلتی ہوئی شرمندگی —— پل پل اُڑی
حلقۂ ریشم میں اک سنگ کو اب چومتی
پھیروں کے نئے پھیر نئے گھیر میں
چکراتی ہوئی ۔ بندگی پل پل اڑی!
لغزشوں اور خطاؤں پہ دعا ساز —— یہ تُو
اپنے گناہوں کا در باز —— یہ میں!
اپنی ندامت کا کھلا راز —— یہ وہ!!
اور —— دیوارِ حرم سے یہ لپٹتے ہوئے
روتے ہوئے
یہ —— تو بھی یہیں
میں بھی یہیں
وہ بھی یہیں!!

مقامِ ابراہیم

سجدہ گہ فرشِ حرم بھی ہے
ترا اور مرا جسم بھی ہے
پاؤں بھی، احرام بھی ہیں
سجدۂ شکر ادا کرکے یہاں لطف و عنایات کو ارزاں کرلیں
جسموں اور روحوں کو اس چشمۂ رحمت سے گلستاں کرلیں
جلوے اتنے ہیں کہ اب حیرتِ جلوہ نہ رہی
سجدے اتنے ہیں کہ اب طاقتِ سجدہ نہ رہی

سعیِ صفا و مروہ

ایک ماں تھی جو انہی ٹیلوں میں دوڑی تھی
کہ مل جائے ذرا سا پانی

اب یہاں صدیوں سے ہر دوڑتا انبوہ تو زمزم سے ہے سیراب
پہ تمنا نہیں آنکھوں سے اُمڈتا پانی !
آفرینش کی گواہی ہے یہ اب !
اور جنم دان کی یہ شرط ہے اب !
جو بھی زمانے ہوں وہ دنیاؤں کی حد تک دوڑیں !
صدیاں یاں مائیں بنیں اور ابد تک دوڑیں !

چوتھا تابلو

احن شوقاً الیٰ دیارِ ....

اور اب آنکھوں میں بسنے لگیں،
اِک راہ بتاتی راہیں
حیرتوں کو ترے جلووں سے ملاتی
تو کبھی کچھ نہ دکھاتی راہیں
میری رگ رگ میں دھڑکتی ہوئی
تقدیر کی شاہراہ بناتی راہیں
یہ وہ راہیں ہیں جہاں پاؤں نہیں
پائے مژہ سے چلنا سفرِ شوق کے آداب میں ہے
یہ وہ راہیں ہیں جہاں اندھی تمازت کا وبال
بادِ پائی کے لیے حیلۂ نایاب میں ہے
یہ وہ راہیں ہیں جہاں گر کے نہ اُٹھنا ہی رہا عینِ حیات
یہ وہ راہیں ہیں، کہ ہر خم میں کہانی ہے
تو ہر ذرّے میں بات
یہ وہ راہیں ہیں جو منزل نہیں
منزل سے مگر کم بھی نہیں
یہ وہ راہیں ہیں کہ جو تا بہ حرم جاتی ہیں

اور ان میں دم رم بھی نہیں
یہ وہ راہیں ہیں جو کعبے سے پلٹ آتی ہیں
یثرب کو نکل جاتی ہیں
اور ان میں کوئی پیچ، کوئی خم بھی نہیں
اور ان راہوں میں ہیں — گنبدِ خضرا کے الوہی انوار
رُوح کھنچ آتی ہے آنکھوں میں، کٹتا ہے سینہ
اشک بے ساختہ بہ نکلے ہیں — یہ قلبِ تپاں
یوں دھڑک اُٹھا ہے — پھر جیسے نہ دھڑکے گا کبھی

جسمِ اطہر کی یہ آرام گہِ عرش نشاں
سجدہ گہِ جنت نشاں
گنبدِ سبز کا یہ دائرۂ یمن و سعادت
یہ سپہرِ رحمت!
یہ زمیں، نورِ نبوت کی امیں
خلوتِ حضرت — یہ زمیں
یہی مقصودِ جہاں ہے
یہی اعلیٰ
یہی اولیٰ
یہی اکبر
تو یہی ایمنِ رحمت — یہ زمین!!

احمد فراز

کشن بی بی

توجب
بمبریٹ کے قاتل پہاڑوں کی صلیبوں سے اُتر آئے
تو یہ جانا
کہ ہم دشتِ عدم کو پار کر آئے
ہر اک کے پاؤں چھلنی، جسم شل
اعضا تھکن سے چُور
لیکن سب
ہراسِ مرگ سے بے جان — بے حس تھے
سبھی یوں زرد رُو جیسے
ابھی تک آسمانوں کے سفر سے لوٹ کر
روحیں نہیں آئیں
چلو ہم سب کے سب زندہ ہیں
جیسے بھی ہیں، یکجا ہیں
ضیا، باسط، سعید اور میں

ہمارا میزباں کب سے، نہ جانے
گھر کے دروازے کھلے چھوڑے
سبک شہتیر کے پُل پر ہمارا منتظر تھا
اس کو یہ معلوم تھا

---

۱ کافرستان کی خوبصورت وادی

ہم اجنبی مہماں
سیاحت کے لیے کن مشکلوں سے
ہفت خواں طے کر کے
اس وادی میں آئیں گے

چناروں کے بلند اشجار
انگوروں کی بیلیں
چار سُو سبزہ
ہوائیں بید مشک و عود و مُر کی خوشبوؤں سے چُور بوجھل
طائرانِ خوشنما و خوش نوا ــــ بے کل
سبک رفتار چشموں کی تہوں میں
پتھروں کا نیلم و یاقوت سا جھل مل
ادھر کچھ دور بزغالوں کے گلّے
نوجواں چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت
برف سے شفّاف و دل آرا
فضا حیرت فزا ــــ سحر آفریں دنیا
"مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را"

ہمارا میزباں مفلس تھا
لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر ہم
خس بدنداں تھے
کشادہ طشت میں بزغالہ بریاں
بطک میں آبِ تاک
اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
الاؤ کی دہکتی آگ کتنی گرم

کتنی خوب صورت تھی

مگر ہم منتظر اس پل کے تھے
جب کافرستاں کی جواں پریاں
زمینِ خلد کی حوریں
دف و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
اپنے محبوبوں کی فرقت کے
نشیلے گیت گائیں گی

الف لیلا کے شہزادوں کی صورت
ہم میں ہر اک
اس طلسماتی فضا کے سحر میں گم تھا

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
سیہ ملبوس میں لپٹے ہوئے
مرمر کے بُت
مہتاب سے پیکر
سبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
کماں کی شکل میں جُنباں
کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں
وحشت سے پاکوباں
دف و تامر و مردنگ کے آہنگ میں
آہستہ آہستہ
کھنکتے قہقہے، عجوب آوازیں بھی
شامل ہو گئیں آخر

کہ جیسے ان گنت سازوں میں
چاندنی سی چھنک اٹھیں
سبھی غارت گرِ تمکین و ہوش و دشمنِ ایماں
ہر اک فتنہ گرِ دوراں
مگر وہ سر گروہِ نازنیناں
غیرتِ ناہید
جانِ حلقۂ خوباں
کشنِ بی بی
قد و قامت ۔ قیامت
جنبشیں ۔ جادو
بدن ۔ طوفاں

ضیا کردار میں گوتم
مجسم صدق و ایثار و وفا
درد آشنا و نفس کش ہمدم
لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا
مگر سب ساتھیوں سے کم

بتانِ آذری رقصاں
مگر با سعد جو اک فنکار
لیکن شکوہ سنج زندگی ہر دم
قلم اس کا دُر افشاں و گہر تحریر
لیکن خود تہی داماں
شکستہ دل
خود اپنے فن سے، اپنے آپ سے نالاں

یہاں دنیا کے غم بھولا ہوا
بسمل
ہر اک پیکر پہ سو سو جان سے قرباں

سعید اک کم نظر، جذبات کا پُتلا
ہندسی
اور فقط جسموں کا سوداگر
جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا
کئی تحفے
ملمع کی ہوئی انگوٹھیاں
جھوٹے نگوں کے ہار
دل آویز آویزے
کسی ماہر شکاری کی طرح
اپنی کمند و دام و تارزآں
ہر اک پر سحر طاری تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

ضیا حیرت میں گم
باسط زخود رفتہ
سعید افسوں زدہ
مَیں بُت!

کشن بی بی کے لب
کلیوں کی صورت نیم وا
اور ہم فقط
آواز کی خوشبو سے پاگل

لذتِ معنی سے نامحرم
"زبانِ یار کیلاشی و ما از حرف بیگانہ"

(ہمارے میزباں نے ترجمانی کی)
کشن بی بی یہ کہتی ہے ——

"—مرے محبوب، تُو اک دستۂ گُل ہے
کہ جو راتوں کو میری چھاتیوں کے درمیاں
خوشبو لُٹاتا ہے
مری ہمجولیو!
بستی کے سارے نوجوانوں میں
مرا محبوب پیارا
جس طرح بن کے درختوں میں ہو نخلِ سیب استادہ
مرا محبوب
جیسے جھاڑیوں کے درمیاں کوئی گلِ سوسن
مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا
اس نے مجھ سے خوب باتیں کیں
وہ کہتا تھا کہ اے میری پری
اے نازنیں
اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل
برسات کا موسم چلا
بادل برس کر کھل چکے
انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اُٹھی
اے کوہساروں کی کبوتر
تو نہ جانے

کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے
آ مرے ہمراہ چل پیاری —"

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
فضا پر سحر طاری تھا
ہر اک کی آنکھ میں تِل کی طرح
وہ کافرستاں کی قلوپطرا
مگر ہم میں کوئی سیزر نہ انطونی

ضیا گوتم سہی
لیکن کُشن بی بی
وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے

نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی
لیکن سحر دم
جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی
کُشن بی بی
سیہ ملبوس میں پیشی
جبیں پر کوڑیوں کا تاج
گالوں پر گُھتی زلفیں
کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے
رخصت ہوئی ہم سے
بصد اندازِ استغنا و دارائی
تو ہم سارے تماشائی سُنتے پتھر
اور پتھر تھے تماشائی

ظہور نظر

دل اور میں

ذہن میرا مجھ سے کہتا ہے کہ تو
ہے خود اپنے دل کے صحرا کا سراب
کون تیرے پاس آئے، کس لیے آئے
کہ خواب —،
جاگتی آنکھوں سے کرتے ہیں گریز
منتظر لمحوں پہ بنتے ہیں عذاب
اتنا کیا کم ہے کہ دشتِ دل کی تپتی دھوپ میں
تو جب اپنی تشنگی کو خود دکھاتا ہے سراب
چھوڑ کر جاتے نہیں تجھ کو، تری
روح کے بے چین و بے منزل سحاب

اور میں —،
بے رحم بوڑھے وقت کی زنجیر میں جکڑا ہوا
چیخ اٹھتا ہوں کہ ایسا ہے تو پھر
تشنہ لب، ترسیدہ، نم دیدہ تمنائیں، کہ جو
میرے دل سے میری جانب ہیں رواں اک عمر سے
ختم سبرِ دشت کرتی کیوں نہیں ! ؟
کیوں نہیں تھکتی ہیں، مرتی کیوں نہیں ! ؟

ادا جعفری

میلادِ بہار

رازداں بہاروں کے
تم کہ طفلِ ناداں ہو
جانے کس گلستاں سے
میرے پاس آ پہنچے
کتنے شوق سے میں نے
اپنے گھر کے آنگن کی
تم کو آبرو بخشی

سال بیت جائیں گے
جب بہار آئے گی
ریشمیں شگوفوں کے
زمزمے بکھیرو گے
اپنے آپ میں کھو کر
نکہتوں کے شہ پارے
لوحِ جاں پہ لکھو گے
سوچ ہر جوانی کی
ناز سب حسینوں کے
ایک جیسے ہوتے ہیں
(اپنے عکس کے آگے
سارے رنگ پھیکے ہیں)

جب بہار آئے گی
جانے میں کہاں ہوں گی
پیچ و خم سے بنتی ہے
منزلوں کی پگڈنڈی
تم تو بھول جاؤ گے
لمس میرے ہاتھوں کا
خواب میری آنکھوں کے

میں تمھیں نہ بھولوں گی
میں کہ فطرتاً ماں ہوں

ادا جعفری

آپ بیتی

میں بھی تھکن سے چُور ہوں، تم بھی نڈھال ہو
گھائل مری نگاہ ہے، تم پائمال ہو
چھالے تپک رہے ہیں، ذرا دھیان تو بٹے
کچھ داستانِ دل ہی کہو، راستہ کٹے
کیا کیا فریب کھائے ہیں پندارِ ہوش کے
دھوکے دیئے ہیں آپ دلِ نامراد کو
کانٹوں کو تم نے تارِ گریباں سمجھ لیا
پھولوں کو میں نے حاصلِ درماندگی کہا
تم اکتسابِ درد کی لذّت میں کھو گئے
میں انبساطِ برگِ گلِ تر کی ہو گئی
اپنے دُکھوں کا چارہ نہ گُل تھے نہ خار تھے
اوروں سے اپنے گھر کا پتہ پُوچھتے پھرے
گھبرا کے آرزوؤں کی شمعیں بجھائی ہیں
کیا قہر ہے کہ خود سے بھی آنکھیں چرائی ہیں
صحرائے درد راہ میں ہے، مضمحل ہیں ہم
رہبر کسے بنائیے، گُم کردہ دل ہیں ہم

مصطفیٰ زیدی

سایہ

تمام شہر پہ آسیب سا مسلّط ہے
دھواں دھواں ہیں دریچے ہوا نہیں آتی
ہر ایک سمت سے چیخیں سنائی دیتی ہیں
صدا ملائے ہم نفس و آشنا نہیں آتی

گھنے درخت، در و بام، نغمہ و فانوس
تمام سحر و طلسمات و سایہ و کابوس
ہر ایک راہ پہ آوازِ پائے نامعلوم
ہر ایک موڑ پہ ارواحِ زشت و بد کا جلوس

سفید چاند کی اُجلی قبائے سیمیں پر
سیاہ دستہ و کفن کا گماں گزرتا ہے
فضا کے تخت پہ چمگادڑوں کے حلقے میں
کوئی خلا کی گھنی رات سے اُترتا ہے

تمام شہر پہ آسیب سا مسلّط ہے
کوئی چراغ جلاؤ، کوئی حدیث پڑھو
کوئی چراغ برنگِ عذارِ لالہ رخاں
کوئی حدیث بعنوانِ صدقۂ دل و جاں
کوئی کرن پئے تزئینِ غرفہ و محراب
کوئی نوا پئے درماندگان و سوختہ جاں

سنا ہے عالمِ روحانیاں کے خانہ بدوش
سحر کی روشنیوں سے گریز کرتے ہیں
سحر نہیں ہے تو مشعل کا آسرا لاؤ
کہیں سے دل کی شگفتی ہوئی دعا لاؤ
دلوں کے غسلِ طہارت کے واسطے جا کر
کہیں سے خونِ شہیدانِ نینوا لاؤ

ہر اک قبا پہ کثافت کے داغ گہرے ہیں
لہو کی بوند سے یہ پیرہن دھلیں تو دھلیں
ہوا چلے تو چلے، بادباں کھلیں تو کھلیں

منیر نیازی

حرفِ سادہ و رنگیں

اک کلی گلاب کی
کوچۂ چمن میں ہے
یاد ایک خواب کی
شام کے گگن میں ہے
اسم سبز باب کا
پُرفریب بن میں ہے
نقش اک شباب کا
سایۂ کہن میں ہے
اک پکارتی صدا
ہجر کے گگن میں ہے
دور دور تک ہوا
کوہ اور دمن میں ہے

احمد ظفر

رشتے

اداسی مرے سر میں پتھر ہے
آنکھوں میں مٹی
دلِ غمزدہ میں الاؤ
کہ جس سے مرے سر میں وحشت جنم لے رہی ہے
ستارے مری چشمِ تر میں اُبھرنے لگے ہیں
الاؤ دہکتے ہوئے سُرخ پھولوں میں تبدیل ہونے لگا ہے

اداسی مری آرزوؤں کی قاتل
کبھی سبزہ و گل کی مانند بکھری ہوئی ہے
کبھی تیرے چہرے کی چاندنی سی نکھری ہوئی ہے
کبھی زرد پتوں کی مانند ہیں میری آنکھیں
کبھی ہونٹ تیرے
اداسی ازل سے ہے اک مرحلہ جن پر

ازل سے ابد تک ستاتی رہی ہے اداسی
دیئے سے جلاتی بجھاتی رہی ہے اداسی
اداسی کبھی ابر پاروں سے گرتی ہوئی سرد جھالر
کبھی دھند ہے آنسوؤں کی

اداسی مرا آئینہ ہے
کہ جس میں ترے حسن کے نقش بکھرے ہوئے ہیں
ترا حسن جس نے اداسی کی مشعل کو روشن کیا ہے
وہ مشعل تری رہنما بن گئی ہے
خموشی بھی جیسے صدا بن گئی ہے
کہ جس کے سہارے ازل سے ابد تک چلا جا رہا ہوں
اداسی مری زندگی بھی، مری موت بھی ہے

احمد ظفر

خزاں

سینہ جویا ہے کسی پھول کا، آنکھیں ویراں
دعوتِ رنگ ملے کس سے کہاں سے؟ کیسے؟
سوچتے سوچتے دن رات گذر جاتے ہیں
کتنے تارے مری پلکوں پہ جلاتے ہیں چراغ
کتنے خنجر مرے سینے میں اُتر جاتے ہیں

پھر وہی سعیٔ مسلسل ہے، وہی جورِ قدیم
وقت زنجیر بھی، تقصیر بھی، تقدیر بھی ہے
ہاتھ ٹوٹے ہوئے، پھوٹی ہوئی آنکھیں جیسے
آئینہ جیسے شکستہ ہو، شکستہ ہے دماغ
بھیک مانگوں سرِ بازار تو مانگوں کیسے

کون آواز یہاں دے گا کسے تاب ہے یہ
دل پہ جو گذرے اسے کون رقم کرتا ہے
درد کی لہر میں لپٹے ہوئے کتنے انساں،
دیکھتے دیکھتے چپ چاپ گذر جاتے ہیں
زندہ لاشیں ہیں، بگولوں میں سسکتے پتّے
خاک بن بن کے سرِ راہ بکھر جاتے ہیں

جمیل ملک

نروان سے پہلے

فضا میں یہ کیسی چبھن ہے!
ستارا کوئی اپنے مرکز سے ٹوٹا ہے
یا میرے دل کی صدا ہے!

یہ موجِ ہوا ہے کہ بجھتا دیا ہے!
پس و پیش سائے لرزتے ہیں
یا میرا دل کانپتا ہے

یہ موہوم سی سرسراہٹ ہے کیسی!
یہ کس کی ادا ہے!
فرشتہ کوئی میرے پہلو سے گزرا ہے
یا تیرے قدموں کی آہٹ ہے، کیا ہے

عجب وسوسوں میں گھرا ہوں
خلا میں خلا تا بہ حدِ نظر ہے
خیالوں میں کتنے بھنور پڑ رہے ہیں!
نہ اپنی خبر ہے نہ تیرا پتہ ہے
میں اُوپر ہی اُوپر اُڑا جا رہا ہوں
میں کس بُرج میں ہوں، یہ کیا مرحلہ ہے!
زمیں، چاند، سورج، ستارے
ہر اک چیز میرے تعاقب میں ہے
میں خلاؤں میں چکرا گیا ہوں
مرے سامنے کون سی انتہا ہے!
فنا یا بقا ہے!!

جمیل ملک

نروان

میں تیری چاہت میں کو بکو، در بدر پھرا ہوں
ہر ایک گھر سے مری صدا کا جواب
چُپ، اِک بسیطِ چپ تھا
سبھی نے پردے گرا دئے تھے، کوئی نہ بولا
کہ میری آشفتگی، مری بیکسی کا دامن بھی چاک تھا، میرے دل
کی صورت

کھنکتے سِکوں کا نغمۂ جانفزا سُنا
کِھلکِھلاتے نوٹوں کا رقصِ پیہم بھی مَیں نے دیکھا
مگر یہ وہ خواب تھا کہ جب آنکھ کھل گئی تو وہی خموشی
مہیب، گہری، اٹوٹ چُپ
اور مَیں
اُسی خوابِ دلنشیں کی حسین تعبیر ڈھونڈتا تھا

مرے خیالوں میں حشر برپا تھا
خود نمائی کی گونج تھی وہ کہ میرے ہی کان بج اُٹھے تھے؟
کہاں کہاں تھا مقام میرا
ہر اک زباں پر تھا نام میرا
وہ شور تھا کہ مری سماعت بھی سو گئی تھی
پھر ایک قاتل، مہیب چپ تھی جو میرا مقسوم ہو گئی تھی

اور اب
کہ میں خامشی کی لو سے چراغ دل کا جلا چکا ہوں
حجاب سارے اُٹھا چکا ہوں
کہیں بہت دور جا چکا ہوں
تو مجھ کو عورت بھی ڈھونڈتی ہے
تو مجھ کو شہرت بھی ڈھونڈتی ہے
مگر میں واپس نہ آسکوں گا
مگر میں واپس نہ آسکوں گا

شاذ تمکنت

دائرہ

پلکیں نیندوں کے چنور، آنکھیں شبستاں کے چراغ
سخن زیرِ لبی مشک کے جھونکے جیسے
لفظ نوشینہ تو لہجہ ہے شکر قند کی طرح
جملے اس چاؤ سے پورے ہوں کہ وعدے جیسے
پیاس کی آنچ سے چٹخے نہ بدن کا بلّور
قوسِ ملبوس میں جلتے ہوں شرارے جیسے
ہر بُنِ مُو ہے ہم آغوشیِ پنہاں کی پکار
تار کس دیں تو کھنک اُٹھتے ہوں پردے جیسے

:

اے دلِ زود فراموش خبر ہے کہ نہیں
زندگی آپ کو اس طرح بھی دہراتی ہے
کبھی نارنجی، کبھی سرخ، کبھی سبز قبا
وہی لڑکی ہے جو سو رنگ سے آجاتی ہے

تابش صدیقی

ایک شام

میں آج شام سے بیٹھا ہوں سر جھکائے ہوئے
کسی سے بھی تو نگاہیں ملا نہیں سکتا
وہ سر،
جو پانچ برس سے بلند و بالا تھا
پڑا ہے زینتِ آغوشِ فرش — یوں، جیسے
شفق کے پھول ستاروں کے بام سے گر کر
کثیف خاک کی جھولی میں خاک ہو جائیں
سمٹ گئے تھے جو،
وہ ہاتھ — پھر سے پھیل گئے
اندھیری رات میں بلی کی پتلیوں کی طرح

رقیبِ بزدل و مکار کی شبِ تیرہ
مسرتوں کے شراروں سے جگمگا اٹھی
گلے میں سوکھے ہوئے قہقہے کھنکنے لگے
گرسنہ، پچکی ہوئی توند سر اٹھانے لگی
رقیبِ زشت خصال
غلیظ دانت نکالے اچھلتا پھرتا ہے
سمجھ رہا ہے کہ میں وہ نہیں
جو کل تک تھا

میں آج ایک زبانِ خموش و ویراں ہوں
میں ایک دیدۂ غم آشنا و حیراں ہوں

میں اس کے چاہنے والوں میں تھا
(اور اب بھی ہوں)
ہزار چاہا، مگر
میں نہ اُس کو روک سکا
بس اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا جیسے
ازل سے میرے مقدر میں تھا یہی شاید
میں اس کا ہنستا ہوا عزم آفریں چہرہ
نگاہِ شوق لیے،
انتہائے شوق بنے،
دیکھتا رہا — لیکن
زباں پہ حرفِ محبت بھی آ سکا نہ کوئی

میں آج
شرم سے بیٹھا ہوں
سرنگوں
خاموش

امین راحت چغتائی

سرسراہٹ

دامنِ کوہ میں دیو قامت درختوں کا جنگل
کہ جس سے ہوا کا گزر ہو تو یوں سیٹیاں بجنے لگتی ہیں جیسے
کسی شہر کے کوچۂ خوش نظر سے
کسی بانوئے خوش ادا کا گزر ہو
تو کچھ منچلے بے ارادہ بجانے لگیں سیٹیاں جھوم کر

اِن درختوں کے سائے میں لیٹی ہوئی دوب میں سرسراہٹ سے
اک دخترِ دہقاں پریشاں پریشاں
یہی سوچتی جا رہی ہے :
اچانک کسی سمت سے سانپ آ کر نہ ڈس لے ،
کہ جنگل ہے اور ہر طرف ہُو کا عالم
جوانی کا دم خم
کہیں ٹوٹ کر خاک میں مل نہ جائے

مگر یہ بھی خواہش ہے دل کے کسی گوشۂ بے نشاں میں
اگر سانپ ڈس لے تو یہ روز کا خوف جاتا رہے
اور دیکھیں کہ اُٹھتی ہیں ٹیسیں سی کیسی بدن میں
رگوں میں تناؤ سا آتا ہے کیونکر
اثر کس طرح زہر کرتا ہے دل پر
نمودار کیوں ہونے لگتے ہیں آنکھوں میں نیندوں کے ڈورے

یہی سوچتی سوچتی راہ میں
رینگتے ، ہانپتے وقت کی پیٹھ پر بیٹھ کر
دیو قامت درختوں کے سائے میں لیٹی ہوئی دوب سے پوچھتی ہے :
'یہ لرزا سا طاری ہے کیوں جسم و جاں پر ؟
بھلا خوف کیسا !
کہ یہ سانپ تو دیکھے بھالے ہیں میرے ،

پروین فنا سیّد

ہنسی

چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہم کتنا ہنستے تھے
بے مقصد، بے بات ہنسی کا دھارا پھوٹا
تم نے پوچھا — یہ دیوانہ پن کیسا ہے
اتنی ہنسی تو راس نہیں آتی کلیوں کو
میں نے کہا تھا — آج مجھے کھُل کر ہنسنے دو
کھل کر ہنسنے کو برسوں گزرے صدیاں بیتیں
لمحہ لمحہ، پل پل، ہم چپ چاپ جلے ہیں
آج تو کھل کر ہنس لیں — کل پھر جلنا ہو گا

فریب

آج پھر تم مجھے کس محفلِ غم میں لائے
آج پھر میں نے سرِ بزم اندھیرا دیکھا
رنگ اور نور سے بہکی ہوئی اس دنیا میں
میں نے گمبھیر اداسی کا بسیرا دیکھا
کھلکھلاتے ہوئے چہروں کی صباحت میں چھپے
کتنی سوچوں کے الجھتے ہوئے افسانے تھے
یہ بظاہر جو تمھیں اپنے نظر آتے تھے
اصل میں اپنی حقیقت سے بھی بیگانے تھے

محمد علوی

پہلا خدا

اندھیرا تھا!
چاروں طرف
موت منڈلا رہی تھی!
نگاہوں میں
مایوسیاں بس گئی تھیں!
دلوں میں
کئی خوف گھر کر گئے تھے!
تو اُس وقت
ہم نے
نہایت عقیدت سے
پہلے خدا کو پکارا!

وہ پہلا خدا
جس نے ہم کو
اندھیروں سے باہر نکالا
اجالوں کی نعمت عطا کی
مگر ہم اسے بھول بیٹھے!
کہاں ہے
وہ پہلا خدا اب کہاں ہے؟
ہمیں پھر
ضرورت ہے پہلے خدا کی!!

ریت

سکوں ریت کا ایک ذرّہ ہے
جو ریت نے کھا لیا ہے!
اُسے ڈھونڈھنے کی نہ کوشش کرو
اُونٹ پر
اپنی تنہائیاں لاد کر
پا برہنہ
دہکتے ہوئے ریگ زاروں میں
بھٹکا کرو!
اور سرابوں کو دیکھو
تو آنکھیں چُرا لو
کہ سب ریت ہی ریت ہے
ریت ہی ریت ہے!
ریت ہے
ریت!!

اریب سہیل

شہرِ اُستخواں

اب تو ہر جلوۂ شگفتہ پر
جاگ اُٹھتا ہے کرب کا عالم
ناز جس پھول سے بدن پر تھا
وہ فسردہ ہوا ہے بے موسم

شاخِ گرویدگی میں جانے کیوں
سرد مہری کا لگ رہا ہے ثمر
اِک ستم ہے کہ اُس کے پہلو میں
ذہن کو کھینچتا ہے نقشِ دگر

جسمِ رعنا کے خواب دیکھتا ہوں
پیش ہے لیکن استخوان کا شہر
پُرکشش ہے تضاد کے باوصف
مشترک یہ نشاط و غم کا دہر

رہ کر اس عالمِ خزاں میں بھی
تازہ، یادِ بہار کرتا ہوں
بُعد محسوس جب بھی ہوتا ہے
اور شدت سے پیار کرتا ہوں

رحمان فراز

دوام

ہماری تہذیب کے نئے پھول جب کھلیں گے
تو ہم نہ ہوں گے
ہمارے خوں سے گندھی ہوئی
پائمال رستوں کی زرد مٹی
مہک اُٹھے گی، تو اس کی مہکار ہم بنیں گے

ہمارے جسموں کا سرخ سورج
زمین کو تابناک کر کے
چھُپا، تو اس کی شعاعوں کے یہ حسین ریزے
نکھار دیں گے ترے وطن کے حقیر ذرّے
سنوار دیں گے ترے چمن میں ہزار نغمے

ہماری روحیں بدن کا بوسیدہ پیرہن گر اُتار پھینکیں
تو ایک جوشِ نمو میں ہم بھی
حسین پھولوں سے ڈُھکتے شاخسار کی طرح لہلہائیں

ہماری قدریں اَمِٹ رہیں گی
ہماری تہذیب کے نئے پھول پھر کھلیں گے
تو کیا ہُوا، ہم اگر نہ ہوں گے
وہ تیز مہکار تو اُڑے گی
سراغ دیتی ہوئی پھرے گی
تیری اَنا کا — میری اَنا کا

رحمان فراز

رفتگاں

ہم سے پہلے بھی تو اِس مقتل میں لوگ
آئے تھے نعرہ بلب، شعلہ بجاں
اور رکھ دی اپنے اک اک حرف میں
دل کے دُکھتے زخم کی کھُلتی زباں
وقت کے دھارے پہ اُن کے خوں کی سطر
ایک عہدِ نَو کی رنگیں داستاں
اُن کے نقشِ پا کی ہر اِک جلی لکیر
عرصۂ شب پر تھی اک خطِ سحر
عہدِ ماضی کی وہ اک صوتِ خموش
اپنی ہر آواز سے تابندہ تر
کاش ہم بھی اپنے خوں میں ڈوب کر
لکھ سکیں ایسی ہی اک سطرِ تپاں،
لوحِ دُنیا پہ، بانداز دگر
اپنے پیکر چند چلتے پھرتے سائے
جن کو کھا جاتی ہے ہر تیرہ شبی
اپنی ہر آواز —— آوازِ شکست
اور بڑھ جاتی ہے جس سے خامشی
اپنے سینے پر کہاں وہ تازہ زخم
پھُوٹ نکلے جن سے صبحِ زندگی

قہقہے لب پر ہیں، دل افسُردہ ہیں
دوستو! ہم زندہ ہیں یا مردہ ہیں

ریاض مجید

رفتگاں کی منازل کی تکریم کر

جانے والے زمانے کے رستے میں آنکھیں بچھا کر
مہ و سال کی گرد کی تہہ میں ڈوبی فراموش یادوں کی آواز سن
اپنے پیاروں کی مٹی کو کحلِ بصر جان
اُس راہ پر بیٹھ جا
رفتگاں جس سے ہو کر گئے ہیں
(دعا مانگ وہ جس جگہ پر بھی ہوں خوش رہیں)

رفتگاں کی منازل کی تکریم کر
آنکھ سے حال کی بے مروّت چمک کو نکال اور دیکھ آج بھی ان
منازل میں تیرے لیے کیا خوشی ہے؟

پُرانی رُتوں کے تصور سے بھیگی ہوئی آنکھ میں تیرتے اشک سے
قیمتی کوئی شے ہے تو کہہ!
گئے لمحوں کی پُر فضا یاد میں ڈوب کر ایک حسرت بھرے بوڑھے
سینے سے باہر نکلتے ہوئے سانس سے زندگی بخش اگر کوئی اک
سانس ہے تو بتا!

یاد رکھ!
بھولے بسرے ہوئے راستوں کی زیارت سے بڑھ کر نظر
کے لیے کوئی جنّت نہیں ہے!

نظر کے تقاضوں کو پہچاننے کی سزا کون جھیلے

آزمائش کے اِس مرحلے سے گزر جا
ہم اک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں
ہم اک دوسرے کے لیے اجنبی ہی رہیں گے
ہم اک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو
مر جائیں گے
پھر بھی اک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے!

نگاہیں اٹھا
سامنے دیکھ
تیرے لیے کس قدر راستے ہیں

لیلیٰ عطاءاللہ

بے بسی

مجھ سے کہتی ہیں روایاتِ کہن
اور بتاتے ہیں بزرگوں کے چلن

شعر کہنا نہیں اچھا ہوتا
دل کی دنیا کا بیاں ٹھیک نہیں
لڑکیاں راز نہ کھولیں اپنے
لڑکیاں خود کو چھپا کر رکھیں

لڑکیاں پردوں میں مستور بھلی
مرد کی ذات ہے عنوانِ جلی

جسم تو خیر چھپا رہتا ہے
ہو سکے گر تو اسے اور چھپاؤ
دل کو بھی اپنی طرح قید رکھو
روح کے چہرے سے پردے نہ اُٹھاؤ

میں نے کب شاعری کی — محترمو!
مجھ کو تو اس کا تصور بھی محال
اتنی صدیوں کی چٹانوں کے تلے
کون کر سکتا ہے تخلیقِ جمال

اپنے پردے بھی اُٹھاتا ہے کوئی؟
کون ہے، خود کو جو عریاں کر دے
کون ہے! بن کے جو اک موجِ صبا
نکہتِ گل کو پریشاں کر دے
کیوں کہوں خالقِ اشعار ہوں میں
اپنی سوچوں میں گرفتار ہوں میں

سبط نبی صمیم

شیشوں کا شہر

گلی میں نہ اب تُو، نہ وہ زندگی ہے
دریچوں میں بیٹھی ہوئی خامشی ہے
عجب بات ہے، جانے کیوں آج ہر شے
مجھے حیرتی ہو کے یوں دیکھتی ہے
کہ جیسے میں اس کا شناسا نہیں ہوں
میں اک اجنبی ہوں!

یہی وہ گلی ہے ——
جسے سالہا سال سے آرزو تھی
کہ گزرا ہوا میرا ایک ایک لمحہ
یہ سینے میں محفوظ کر لے

مگر یہ گلی اب اُسی عکس سے اپنا دامن بچا کر
مرا عکس یوں مجھ کو لوٹا رہی ہے
کہ جیسے مرے چار سُو آئینے ہوں!

شبی فاروقی

رشتہ

ہمارے ابّا
زمیں کے پیوند ہو چکے ہیں
ہمیں بھی ہونا ہے دفن اک دن
زمیں کے نیچے
زمین ہی —
جبکہ آنے والی ہماری نسلوں کی
آخری خوابگاہ ٹھہری
تو پھر وہ ہم سے
جو اپنے ماں، باپ، بھائی، بہنوں کے مردہ جسموں کو
آگ، پانی، ہوا میں تحلیل کر رہے ہیں
جو ایک دن،
خود بھی آگ، پانی، ہوا میں تحلیل ہو رہیں گے
یہ کس عداوت میں کہہ رہے ہیں
"تمھارا رشتہ زمیں سے کیا ہے؟"

احمد ندیم قاسمی

کرب

کرب کی آخری حد ایک نہیں
ایک وہ ہیں جو بنے کرب کی شدت سے بُتِ سنگ نژاد
اور اک وہ ہیں جو اس درجہ ہوئے نرم و گداز
کہ کوئی قہقہہ مارے تو لرز جائیں
لرز کر رو دیں
کرب کے صید کچھ ایسے بھی ہیں
تلوے سے اگر خار نکالیں تو پکاریں
کہ بہار آئی ہے
اور وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں
کہ ہم کرب کا کندن ہیں
ہمیں کرب نے مارا ہے کہ ہم زندہ رہیں
اور اک میں ہوں
کہ جس کرب سے گزرا ہوں
اسے دوست بنایا ہے
جہاں جاؤں، اسے ساتھ لیے پھرتا ہوں

ڈاکٹر سید عبداللہ

دادِ سخن

ہماری پرانی تنقید بہت کم بولتی رہی۔ اس کا کام سمجھانے تک محدود رہا۔ فیصلے بھی ہوتے رہے اور اکثر صحیح ہوتے رہے لیکن فیصلے کی دلیلوں یا اصولوں کی بحث محض اشاروں اشاروں میں کر دی جاتی تھی خیال شاید یہ تھا کہ باخبر سب کچھ جانتے ہیں اس لئے ان سے کیوں کہا جائے۔ باقی رہے بے خبر سو ان سے کیا کہا جائے

باخبروں سے کیوں کہوں اور بے خبروں سے کیا کہوں

اس طریق کار سے قدیم زمانے کے طالبانِ علم کو نقصان پہنچا ہو گا مگر ہمیں جو نقصان پہنچا اس کی کوئی حد نہیں۔ اشارے یوں بھی اشارے ہی ہوتے ہیں مگر ان کی نارسائی اس وقت بیکراں ہو جاتی ہے جب ان اشاروں کے جاننے والے ہی ختم ہو گئے ہوں۔

غرض ہمارے ہاں تنقیدی اصولوں کی کتابیں کچھ زیادہ نہیں۔ اگر ہمیں آج ان اصولیات کو مدون کرنا ہو تو تذکروں کے سوا ہمارے پاس کیا ہے؟

دورِ مغلیہ میں اکبر کے زمانے میں شعر و ادب کا خاصا چرچا تھا۔ نکتہ رسی اور نکتہ دانی کی بھی کمی نہ تھی۔ اس زمانے میں ادب کے بڑے بڑے مسئلے پیدا ہوئے اور بڑی بڑی اختلافی باتیں سامنے آئیں مگر آج ان کی تفصیل تو کیا ان کے اجمال تک کے لئے ہم ترس رہے ہیں۔ بعد کے زمانے کا بھی یہی حال ہے۔

ایسے حالات میں اصولی تنقید کی طرف معمولی سی پیش قدمی بھی غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ فیضی کے خطوط (لطیفۂ فیاضی) اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے مکاتیب (چہار باغ)۔ اور ایک حد تک ابوالفضل کے شذرات (انشائے دفتر سوم) کو بنیادی باتوں کے لئے بے حد مفید اجمال سمجھنا چاہئے۔

بعد کے زمانے میں میر محسن اکبرآبادی کی کتاب محاکمات الشعرا (جس کا ایک ناقص نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں ہے) اور خان آرزو کا ایک مختصر سا رسالہ دادِ سخن عملی تنقید کی طرف پیش قدمی کی قابلِ قدر کوشش ہے۔

خان آرزو عہد محمد شاہ کے بعد کے بزرگ تھے۔ تاریخ وفات [illegible] ہے۔ ہندوستانی فارسی کے بڑے حامی اور فارسی دانانِ ہند کے بڑے طرفدار۔ میر و مرزا کے زمانے کے اکثر اردو شاعر ان سے فیضیاب اور ان کے علم و فضل کے معترف تھے۔ شعرائے فارسی کا ایک جامع تذکرہ (مجمع النفائس) لکھا۔ فارسی کے دو تین لغات مدون کئے۔ فقہ اللسان پر مثمر نام کی ایک کتاب لکھی۔ اور ان سب کے علاوہ شعری علوم اور بیان و معانی پر رسالے لکھے ...... انہی میں ایک مختصر سا رسالہ دادِ سخن بھی ہے جس میں منجملہ دیگر مطالب کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شعر فہمی کے اصول کیا ہیں؛

اس رسالے کی تیسری فصل (مقدمہ سوم) میں خان آرزو نے شعر فہمی کے چھ راستے یا طریقے بتائے ہیں:

۱۔ خان آرزو کے نزدیک پہلا طریقہ "طریق عامہ اہلِ زبان" یعنی خاص و عام لوگ جس فطری طور پر شعر کو سمجھنے کی جتنی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے مطابق مفرد اور مرکب الفاظ کے جو معنی ہر شخص پر منکشف ہیں ان تک رسائی خود بخود ہو جاتی ہے۔ شعر کی دوسری لطافتوں کا علم تو مطالعہ اور اکتساب پر منحصر ہے۔

۲۔ دوسرا راستہ "دریافت اربابِ معانی" ہے۔ اربابِ معانی سے علمِ معانی کے ماہرین مراد ہیں اور یہ وہ علم ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہے یا نہیں۔ تجربہ یا خیال جس طرح بیان ہونا چاہئے (کمالِ ابلاغ کے نقطۂ نظر سے) اس طرح بیان ہوا ہے یا نہیں۔ کلام میں قدرتی ترتیب (تقدیم و تاخیر)

منظر رکھی گئی ہے یا نہیں۔ جہاں بیان تفصیل چاہتا ہے تفصیل اور جہاں اختصار و ایجاز کی ضرورت ہے وہاں اختصار و ایجاز ہے یا نہیں۔

خان آرزو کا کہنا ہے کہ جو لوگ شعر فہمی کے لیے صرف علم معانی پڑھنا۔ لکھتے ہیں۔ وہ قدرتی طور پر شعر فہمی کے دوسرے ذرائع اور وسائل کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتے مثلاً انھیں تشبیہ و مجاز مرسل اور کنایہ و استعارہ کے رموز اور لطافتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ غرض یہ طریقہ بھی ناقص رہتا ہے۔

۳۔ اس کے برعکس کچھ اور لوگ ہیں، جو شعر میں کنایہ و استعارہ ہی ڈھونڈتے رہتے ہیں اور باقی ہر چیز سے قطع نظر کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ شعر کو علم بیان کا غلام سمجھتے ہیں۔

۴۔ اسی طرح کا ایک اور گروہ ہے، جو شعر اور صنعت گری کو ایک چیز سمجھتا ہے۔ یہ حضرات صنائع بدائع کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ وہ باقی ہر چیز کو ہیچ خیال کرتے ہیں بلکہ اس خیال کے ایک نقاد نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے

شعرے کہ نباشد دو محل   باگوز شتر بود برابر

(جس شعر کے دو معنی نہ نکلیں اسے گوز شتر سمجھنا چاہیے) یہ دراصل صنعت ایہام سے غیر معتدل دلچسپی کا نتیجہ ہے اور عالم یہ ہے کہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ التفات صنعت نہیں علم معانی کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح یہ کہ استعارہ علم بدیع سے متعلق نہیں، بلکہ اس کا تعلق علم بیان سے ہے۔

۵۔ خیر یہ لوگ پھر بھی غنیمت ہیں۔ ایک اور طبقہ ایسا بھی ہے جو سابق الذکر سے بھی زیادہ غضب ڈھاتا ہے۔ وہ ہے مدرسوں کا طبقہ۔ یہ لوگ محض زبردستی سے نقاد بن جاتے ہیں اور اپنی منصبی بالادستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے تئیں سے ادبی فیصلے صادر کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں یہ معلوم ہے کہ ان کی جہالت کا راز فاش نہیں ہوگا، اور وہ جو کچھ کہیں گے ان کے شاگرد اس پر اعتراض نہیں کر سکیں گے۔

خان آرزو نے اس موقع پر ایک مثال دی ہے۔ ایک مدرس نے سعدی کا یہ شعر پڑھا:

بنام خداوند جاں آفریں   حکیم سخن بر زباں آفریں

اور کہا کہ اس کا دوسرا مصرع غلط ہے اور صحیح یوں ہے کہ   چہ گویم سخن بر زباں آفریں

پہلی صورت اس لئے غلط ہے کہ اگر حکیم اور سخن ... زباں کا آپس میں مضاف مضاف الیہ کا تعلق ہے تو یہ بڑی قبیح بات ہے کیونکہ مضاف مضاف الیہ کے مابین اجنبی حائل نہیں ہونا چاہیے لیکن معترض کو یہ خیال نہیں آیا کہ فاصلے والا اعتراض مان بھی لیا جائے تو بھی یہ کس طرح معلوم ہوا کہ مقابل مصرع بالکل صحیح ہے اور صحیح یہ ہے کہ اصل کے بدلے میں جو مصرع تجویز ہوا ہے وہ بالکل مہمل ہے لیکن ملا صاحب کو اس پر برابر اصرار رہا۔ بہرحال اکثر مدرسوں کی شعر فہمی اسی قبیل کی ہے۔

۶۔ فہم سخن موافق مذاق شعرا: مذاق شعرا سے مراد وہ معیار اور تجربے ہیں جو شعرا کے مدنظر ہوتے ہیں اور جن کی روشنی میں یا جن کی تحریک سے وہ شعر کی تخلیق کرتے ہیں۔

خان آرزو نے یہ بڑے کام کا اصول بتایا کہ شعر فہمی کے اصول خود شعروں کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے نقاد کو تشریح یا فیصلہ کرتے وقت یہ دیکھ لینا چاہیے کہ خود صاحب سخن کے مدنظر کیا ہے؟   مراعات طریقے کہ صاحب سخن را منظور بود۔

یہاں طریقے سے مراد اسلوب بھی ہے اور جذباتی تجربہ اور شاعرانہ مسلک اور نصب العین بھی چنانچہ خان آرزو نے اس کی تشریح کرتے ہوئے خود لکھا ہے اور اگرچہ ظاہرا اسلوب و الفاظ و ترکیب پر زیادہ زور دیا ہے تاہم مثالوں سے اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ مذاق شعرا سے مراد معیار بھی ہیں اور تجربے بھی ہیں۔

خان آرزو کے نزدیک مذاق شعرا سے باخبر ہونے کے لئے چند باتیں ضروری ہیں مثلاً روزمرہ کا علم۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ شاعر کے اظہار میں لطافتوں کا ایک عنصر روزمرہ کے ذریعے داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظوں کی شناخت بھی لازمی ہے۔ شاعری ایک لحاظ سے لفظوں کا کھیل یا جادو ہے۔ لفظوں کی جذباتی، فکری، تصویری اور صوتی قیمت ہوتی ہے۔ ہر شاعر کا انتخاب الفاظ اپنے موضوع اور اپنے "مذاق شعر" کے مطابق ہوتا ہے۔ نقاد اگر "قیمتوں" پر نظر نہیں رکھے گا تو وہ ان لطافتوں سے باخبر نہ ہو سکے گا جو شاعر کے مدنظر تھیں۔

اسی طرح علم بند و بست الفاظ" اور "علم ترکیب الفاظ" بھی لازمی ہے .... اور آخر میں طرز اور مسلک کی شناخت یعنی یہ کہ شاعر کا ذوق کسی خاص مسلک کے تابع ہے؟ وہ خیال سے خاص دلچسپی رکھتا ہے یا ادا بندی کا دلدادہ ہے؟ یا تمثیل اور مثالیہ کا عاشق ہے؟

خان آرزو نے اپنے اس رسالے میں قدسی اور شیدا کی مشہور ادبی نزاع کے بارے میں جو محاکمہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر میں ابلاغ (بلاغت) کی کامل رسائی کو لازمی مانتے ہیں۔ جو شعر اپنے سامع کو فوراً اپنے مطلب سے آگاہ نہ کر سکا، وہ مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ شعر میں ابہام و خفا کا عنصر آ ہی جاتا ہے لیکن ابہام وہی دلکش ہوگا جو فوراً منکشف ہو جائے۔ اس علاوہ عقلی قرینہ بھی بے حد ضروری ہے۔ جس مضمون کی تصدیق عقل یا حقیقت واقعی سے نہیں ہوتی اس پر سامع آسانی سے ایمان نہیں لاتا۔ اس کی نظر میں ایسا مضمون محض کمیں یا اختراع لایعنی سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

قرینہ عقلی کی وضاحت کے لئے قدسی کے ایک ہی شعر کے محاکمہ سے کچھ نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ قدسی نے لکھا تھا ؎

عالم از نالۂ من بے تو چناں تنگ فضاست　　　که سپند از سر آتش نتواند برخاست

(ترجمہ: میرے نالہ (و فریاد) کی وجہ سے دنیا اتنی تنگ فضا ہو گئی ہے کہ آگ میں ڈالا ہوا سپند جس کی فطری خاصیت ہی یہ ہے کہ تاؤ کھا کر اچھلے اور باہر نکل آئے مگر فضا اس درجہ تنگ ہو گئی ہے کہ وہ بھی، آگ سے اچھل کر باہر نہیں آ سکتا۔) قدسی جس دور کا شاعر ہے اس میں اس طرح کے معانی عام ہیں۔ مگر ایرانی ہندی جھگڑا میں بے چارے ہندی اکثر بدنام کئے جاتے تھے کہ ان کے اشعار میں خیال بافی و حقیقت سے دور باتیں بہت ہوتی ہیں۔ مگر قدسی تو مشہد سے آیا تھا۔ اس کے کلام میں یہ خیال بافی کیوں؟

اسی کو بے نقاب کرنے شیدا ہندی (شاہجہاں کے زمانے کا ہندوستانی شاعر) اٹھا اور اس نے قدسی کے اشعار کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس پر بڑی بحث ہوئی۔ ملا ابوالبرکات منیر لاہوری۔ ملا طباطبائی اور دوسرے لوگوں نے زور شور سے حصہ لیا۔ اور یہ بحث اپنے زمانے سے نکل کر خان آرزو کے زمانے تک آ گئی۔ میں نے قدسی کا جو شعر نقل کیا ہے، اس پر شیدا نے اعتراض یہ کیا ہے کہ مضمون میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے۔ وہ عقلی لحاظ سے درست نہیں۔ شیدا نے لکھا ؎

نالہ در سینہ ہوائے است کہ پیچاں شدہ است　　　چوں ز لب گشت جدا گیر ہم است جنس ہواست

(نالہ تو ایک قسم کی ہوا کا نام ہے جو سینے سے اٹھتی ہے جو لبوں کے توسط سے جب باہر فضا میں پھیل جاتی ہے تو پھر بھی ہوا ہی رہتی ہے)

عالم از مے نشود تنگ و لیکن ز ملال　　　اہل عالم گر از و تنگ نشینند رواست

(پس جب یہ ہوا ہے تو ہوا سے عالم کیسے تنگ فضا میں ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے اہل عالم افسردہ و ملول و حزیں ہو جائیں)

اعتراض یہ ہے کہ کسی کے آہ و نالے سے عالم گنجائش کے معنوں میں، تنگ ہو جائے یہ بیان واقع نہیں یعنی حقیقت واقعی کے خلاف ہے۔

اس پر دوسرے لوگوں کے علاوہ منیر لاہوری نے بھی لکھا اور قدسی کی حمایت میں یہ کہا کہ لفظ تنگ لیلور ایہام آیا ہے اس لئے قدسی کا شعر ٹھیک ہے لیکن خان آرزو کا محاکمہ یہ ہے کہ ایہام میں بھی قرینہ عقلی لازمی ہوتا ہے ورنہ ایہام سے شعر مہمل ہو کر رہ جائے گا۔

اس کے علاوہ کیفیت الگ شے ہے اور کمیت الگ حقیقت، لہذا کیفیات کے لئے کمیات کا اور کمیات کے لئے کیفیات کا استعمال درست نہیں۔

ان تمام بحثوں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شاعری میں تخیل، استعارہ اور ایہام اپنی جگہ درست اور برحق ہے مگر سامع کے نقطۂ نظر سے، وہ شاعری ناکام ہے جو مضمون کو سامع تک فوراً پہنچا نہ سکے، اور سامع کے دل میں وہی شاعری اترتی ہے جو جذباتی صداقت کے علاوہ عقلی اور واقعی حقیقتوں کے زیادہ قریب ہو۔

خان آرزو نے اس قسم کی بحثیں اپنی اور کتابوں میں بھی اٹھائی ہیں خصوصاً سراج منیر میں ـــ اور ہم ان کے غائر مطالعے سے بہت سے عمدہ تنقیدی اصولوں کا استخراج کر سکتے ہیں۔

سید علی عباس جلالپوری

رُوحِ عصر

(آخری قسط)

روحِ عصرِ حاضر

اس بدیہی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائنس کی ترقی سے انسان کے سوچنے کے انداز بدل گئے ہیں اور صنعتی انقلاب کے شیوع نے زرعی معاشرے کی قدروں اور نصب العینوں کو بدل کر رکھ دیا ہے کیمسٹری اور طبیعیات نے قانونِ سبب و مسبّب کی اہمیت واضح کی ہے اور اس طرح نوعِ انسان کو سیکڑوں توہمات سے نجات دلائی ہے۔ اب یہ حقیقت مسلّم ہو چکی ہے کہ کوئی مسبّب بغیر سبب کے معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا نتیجۃً خوارقِ عادات کا وجود صرف صوفیہ کے تذکروں میں باقی رہ گیا ہے موسمیات نے قدیم ضنیاتی اوہام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب ہم بارش، زلزلے، طوفان وغیرہ کی علمی توجیہہ کرتے ہیں اور انھیں کسی ما فوق الطبع ہستی سے منسوب نہیں کرتے۔ علم طبقات الارض نے اُن تبدیلیوں کا انکشاف کیا ہے جو لاکھوں برسوں سے زمین کے بطن میں واقع ہو رہی ہیں۔ علم الحیوان نے ثابت کر دیا ہے کہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے انسان حیوانات کے کنبے سے ہی تعلق رکھتا ہے اور انہی کی ایک ترقی یافتہ نوع ہے۔ علم الانسان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اقوام و ملل تاریخ کے کسی نہ کسی دَور میں وحشت و بربریت کے احوال سے گذر چکی ہیں اور اس دَور کی روایات بعد کے تمدّنوں کے اجزائے ترکیبی بن چکی ہیں۔ نفسیاتِ جدید نے ذہنی واردات کے متعلق اکثر غلط فہمیوں کو رفع کر دیا ہے اب ہسٹریا یا ممسوخ ذہن کو کسی فوق الفطرت مخلوق کی کارفرمائی نہیں سمجھا جاتا بلکہ دماغی عوارض سمجھ کر ان کا علاج کیا جاتا ہے۔ علم ہیئت کے انکشافات نے آفرینش و تکوینِ کائنات کے قدیم نظریات کا ابطال کیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ کائنات کی لا متناہی وسعتوں میں کرۂ ارض کو کم و بیش وہی مقام حاصل ہے جو صحرائے اعظم میں ریت کے ایک ذرّے کو یا بحر الکاہل میں پانی کے ایک قطرے کو۔ کہکشاں کے بعض ستارے ہم سے اتنی بے پناہ مسافت پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہوئی دو لاکھ بیس ہزار "روشنی کے سالوں" میں ہم تک پہنچ سکتی ہے سورج سے نزدیک ترین ستارے الفاسنٹاری کی دُوری چار روشنی کے سالوں سے زیادہ ہے۔ کہکشاں میں تیس لاکھ ستارے ہیں۔ ایسے ہی تین ملین اور کہکشاں ہیں جو دوربین کی مدد سے دریافت کئے جا چکے ہیں۔ ایک کہکشاں سے دوسرے کہکشاں کی مسافت بیس لاکھ "روشنی کے سال" ہے اور سب برق رفتاری سے ایک دوسرے سے دور ہٹتے جا رہے ہیں۔ کائنات کی ان ہوشربا وسعتوں کے پیشِ نظر کلیسائے روم کا تصورِ کائنات محض گڑیا کا گھر ہے۔ ڈینٹے کرۂ ارض کو تمام کائنات کا مرکز سمجھتا تھا جس کے گرد نو بیضوی کُرے موجود ہیں۔ چنانچہ اس کائنات کی سیر سے وہ صرف چوبیس گھنٹوں میں فارغ ہو جاتا ہے۔ پروٹسٹنٹ مذہب کے پیروؤں کے عقیدے کے مطابق کائنات کی تکوین سنہ ۴۰۰۴ ق م میں عمل میں آئی تھی۔ آرچ بشپ اشر نے تو یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ کائنات ۲۳ اکتوبر کو صبح کے نو بجے معرضِ وجود میں آئی تھی۔ ڈینٹے کی تحقیق یہ تھی کہ تخلیقِ آدم سنہ ۵۲۰۰ ق م میں ہوئی تھی اور قیامت سنہ ۱۸۰۰ء بعد از مسیح برپا ہوگی۔ آج علم ہیئت کے انکشافات کی روشنی میں یہ عقاید مضحکہ خیز دکھائی دیتے ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں سائنس کو خاص طور پر حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ ہوائی جہاز، سینما، بے تار برقی، ایکس رے، ریڈار، ٹیلی ویژن، ریڈیائی عمل وغیرہ کی ایجادات سے کہیں زیادہ اہم طبیعیات کے انکشافات ہیں۔ لائب نتس نے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی پیش قیاسی کی تھی۔ اس نے نیوٹن کے نظریۂ کشش ثقل پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ زمان و مکان محض اضافی علائق پر مشتمل ہیں۔ تمام حقائق ذہنی ہیں اور جس چیز کو ہم مادہ کہتے ہیں وہ نفسیاتی اکائیوں پر مشتمل ہے۔ ان اکائیوں کو اس نے MONADS کا نام دیا تھا۔ آئن سٹائن نے لائب نتس کی تائید کی ہے اور مکان زمان کی وحدت کا اثبات کیا ہے۔

ایٹم کے تجزیے سے مادے کا قدیم تصور بدل گیا ہے۔ شرڈنگر اور ہائزن برگ کی تحقیقات نے جبریت کی نفی کی ہے مادے کے جوہری قوت میں تحلیل ہو جانے اور قوت کی لہروں کی آزادروی نے طبیعیات کی دنیا میں انقلاب برپا کیا ہے۔ پلانک کے نظریہ مقادیر عنصری کی رو سے بھی قدر و اختیار کے تصور کو تقویت بہم پہنچی ہے اور مادیت کے ساتھ جبر کا جو خیال وابستہ تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ بقول برٹرنڈ رسل ٹھوس اشیاء محض واقعات کی ہی محسوس و مرئی صورتیں ہیں۔ ڈاکٹر جانسن کے متعلق مشہور ہے کہ اُسے کسی نے بتایا کہ بشپ بارکلے مادے کے وجود کا منکر ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے گلی میں جاتے ہوئے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری اور کہا "میرے لئے مادے کے وجود کا یہی ثبوت کافی ہے" اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے برٹرنڈ رسل لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر جانسن کو کیا معلوم تھا کہ اُن کا پاؤں اور پتھر جس کو انھوں نے ٹھوکر ماری تھی دونوں واقعات کے ہی مجموعے تھے۔ اب میز، کرسی، اینٹ پتھر وغیرہ اشیاء کو ٹھوس نہیں کہا جا سکتا یہ چیزیں دراصل چند قوانین کی نشان دہی کرتی ہیں جن کے ماتحت یہ واقعات صورت پذیر ہوئے ہیں۔

ان انکشافات کی رو سے ایک طرف مادہ نذرِ کائنات میں تبدیل ہو گیا ہے تو دوسری طرف نفسیات میں "انا" غائب ہو گئی ہے اور شخصیت واقعات کا ربط سبب و مسبب بن کر رہ گئی ہے۔ مادے اور ذہن کا امتیاز اب ناقابل قبول ہے۔ کائنات جس چیز سے بنی ہے اُسے یا طبیعی کہا جا سکتا ہے یا ذہنی یا یہ کہ دونوں سے مل کر بنی ہے یا یہ کہ دونوں میں سے کوئی بھی اس کی ساخت و تکوین میں شامل نہیں ہے[۵] ہمارے زمانے کے بعض متکلمین نے طبیعیات جدید کے ان انکشافات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس سے تصوف اور مثالیت کے نظریات و عقاید کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ یہ غلط فہمی ایٹم کے اجزا کو روحانی کہہ کر پیدا کی جا رہی ہے۔ ان کے خیال میں مادہ کالعدم ہو گیا ہے اور روحانیت کی تصدیق و توثیق کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادہ کالعدم نہیں ہوا بلکہ اس کے جوہری قوت کی لہروں میں تحلیل ہونے کا راز دریافت کیا گیا ہے اور مادے اور قوت کے باہم متبادل ہونے کا ثبوت ملا ہے۔ متکلمین نظریۂ اضافیت سے اس بات کا ثبوت اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اب معروض (object) کا وجود ختم ہو چکا ہے اور سب حقائق موضوعی subjective ہیں۔ جدید طبیعیات کی رو سے مادے کے قدیم اور عمومی خصائص بے شک باقی نہیں رہے لیکن طبیعی عالم کی معروضی حقیقت بدستور برقرار ہے۔ مادہ جوہری قوت کی لہروں میں تحلیل ہو سکنے کے باوجود ایک معروضی حقیقت ہے جو ہمارے ذہن سے علیحدہ اور آزاد طور پر موجود ہے۔ اشیاء کی حقیقت ان کے مظاہر سے مختلف سہی لیکن انسان کے لئے بہرحال ناگزیر ہے کہ وہ اپنے اور فطری مظاہر یا خارجی حقایق کے درمیان مفاہمت پیدا کرے۔ اس کوشش میں اسے طبیعی یا خارجی مظاہر کو تبدیل کرنے پر قدرت حاصل ہو گی اور یہی حقیقت دوگونہ یعنی خارجی اور داخلی یا موضوعی اور معروضی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لارڈ برٹرنڈ رسل لکھتے ہیں:

> "جو لوگ مادیت کے حامی ہیں وہ اب بھی ایسا فلسفہ مرتب کر سکتے ہیں جو کم و بیش اُن کے سابقہ موقف کی تائید کرتا ہو۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ طبیعیات کا سلسلۂ سبب و مسبب بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور واقعات طبیعی قوانین کے تابع ہیں۔"

سائنس کے مخالفوں کی طرف سے بسا اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ سائنس کا تعلق اسباب و علل سے ہے، مقاصد کا تعین اس کے بس کی

---

[۵] An Outline of Philosophy by Bertrand Russel

بات نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس دانوں نے آج تک مقاصد کے تعین کی کوشش ہی نہیں کی کیونکہ مقاصد اور نصب العین سائنس دانوں کے حلقۂ تحقیق سے خارج ہیں۔ یہ کام فلسفہ کا ہے جو سائنس کے انکشافات کی ترجمانی کر کے مقاصد کا تعین کیا کرتے ہیں۔ اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ جو فلسفی کسی نہ کسی شعبۂ سائنس میں بصیرت تامہ نہیں رکھے گا اُسے حقائق علمی کی ترجمانی کے قابل ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ اب مجرد صداقتوں یا اٹل حقایق کو فلسفیانہ استدلال کی اساس قرار نہیں دیا جا سکتا اور وہی مقاصد قابل قبول اور قابلِ حصول سمجھے جاتے ہیں جو سائنس کے انکشافات کے منافی نہیں ہوتے بلکہ اُن کی تائید کرتے ہیں۔ ان حقایق کے پیشِ نظر کائنات اور زندگی کے مسائل کا سائنٹفک نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا ہی روحِ عصرِ حاضر ہے۔ اس نقطۂ نظر کو فطری طور پر حقیقت پسندی کے نظریۂ حیات پر منتج ہونا چاہیئے تھا اور حقیقت پسندی کا تقاضائے اولیں یہ تھا کہ یورپ کے باشندوں کے ساتھ اقوامِ عالم کو سائنس کے برکات سے استفادے کے مواقع بہم پہنچائے جاتے لیکن مغرب کے تاجروں اور ملوکیت پسندوں کی خود غرضی مانع ہوئی اور سائنس کی ترویج و اشاعت سے انسان دوستی کے نصب العین کی عملی ترجمانی کا جو خواب دریں فرانسیسی قاموسیوں نے دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور اہلِ مغرب کا تنزل پذیر تمدن، سائنٹفک نقطۂ نظر اور حقیقت پسندانہ نظریۂ حیات کے درمیان عملی اور حرکی ربط و تعلق قائم کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔ دوسرے الفاظ میں جس حقیقت پسندانہ اور معروضی اندازِ نظر سے علمی عقدے حل کیے گئے تھے، اُسے معاشرتی مسائل کے سلجھانے میں بروئے کار نہ لایا جا سکا۔ اہلِ مغرب سائنس کے عقدوں کو حل کرنے کی کوشش میں معروضی طرزِ تحقیق سے کام لے رہے ہیں لیکن معاشرے کے مسائل کو موضوعی اندازِ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں نتیجۃً مغرب میں موضوع کا رشتہ معروض سے، فرد کا رشتہ جماعت سے، متقدر طبقے کا رشتہ عوام سے اور ادبا، شعرا اور فن کاروں کا رشتہ ماحول کے جاندار تقاضوں سے منقطع ہو چکا ہے۔ فرد کی ذہنی اور ذوقی صلاحیتوں کو جماعت کے مفاد کے لیے وقف کر دینے کی بجائے جماعت کے مفاد کو فرد کے مفاد کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ فردیت کا آغاز رومانیت کی ترویج سے ہوا تھا۔ مرورِ زمانہ سے یہ فردیت، موضوعیت، تنزلیت، تشکک، وحاصلیت، جبریت، داخلیت اور موجودیت کی تنزل پذیر کیفیات پر منتج ہوئی جن کا مطالعہ ہم اہلِ مغرب کی سیاسیات سے لے کر آن کے فلسفے، ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں کر چکے ہیں اور جن کی ترویج نے اہلِ مغرب کی حیات افروز اور تعمیری صلاحیتوں کو یکسر سلب کر لیا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اہلِ مغرب سے یہ توقع وابستہ کرنا وہم باطل سے کم نہ ہوگا کہ وہ انسانیت عالیہ کے نصب العین کی پابندی کریں گے یا متعلقہ اخلاقی قدروں کی ترجمانی کر سکیں گے۔ اب روحِ عصرِ حاضر کی عملی ترجمانی یا سائنس کے طرزِ تحقیق اور حقیقت پسندانہ نظریۂ حیات کے ربط و تعلق کی بحالی مشرق کے ترقی پذیر معاشرے میں ہی ممکن ہے۔

ایک مورخ کا قول ہے کہ تہذیب ایشیا سے یورپ کو گئی تھی۔ وہاں چند صدیوں کے قیام کے بعد امریکہ کو ہجرت کر گئی اور اب بحرالکاہل کو عبور کر کے دوبارہ اپنے وطن کو لوٹ آئی ہے لیکن بعض سادہ لوح ایشیائی ابھی تک تہذیب کے انتظار میں مغرب کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھے ہیں —— اُس عاشقِ شوریدہ سر کی طرح جو اپنے صدر دروازے میں بیٹھا عالمِ خود فراموشی میں اپنی محبوبۂ دلنواز کی آمد کا انتظار کھینچ رہا ہو اور اس خوش آیند حقیقت سے بے خبر ہو کہ اُس کے خوابوں کی ملکہ عقبی دروازے سے اُس کے شبستان میں داخل ہو چکی ہے۔

جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

نیرہ اسلمی :

ڈاکٹر وزیر آغا

ایک تازہ ادبی مسئلہ

پچھلے دنوں اردو کے ایک ادیب نے اس بات پر گہری تشویش کا اظہار کیا کہ اردو ادبا ڈیڑھ ہی برس میں جنگ اور اس کے تجربات کو بھول گئے ہیں۔ اور اب اردو ادب اسی ڈگر پر رواں دواں ہے جس پر وہ پچھلے اٹھارہ برس سے گامزن تھا۔ ان کے نزدیک اردو ادبا کی یہ روش ملکی مسائل سے کوتاہی اور بے اعتنائی کے مترادف ہے۔ آخر میں انھوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اردو ادبا جنگ کے موضوع پر از سرِ نو لکھنا شروع کر دیں۔

میری رائے میں ان صاحب کی یہ تشویش "بے بنیاد" اور ان کا قیمتی مشورہ ادب کے طریق کار سے ناآشنائی کا مظہر ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ کیسے؟

قصہ یہ ہے کہ جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں دشمن کی فوجوں نے کوئی الٹی میٹم دیے بغیر رات کی تاریکی میں ہمارے وطن پر حملہ کیا تو ہم پاکستانی آناً فاناً میں ایک ایسی مستحکم قوم میں تبدیل ہو گئے جو کسی داخلی انتشار سے گویا آشنا ہی نہیں تھی۔ اس اتحاد و اتفاق کے پس پشت تحفظِ ذات کی ضرورت کے علاوہ اپنے وطن، اس کی ثقافت، اپنے مذہب اور اس کی روایات کو دشمن کی یلغار سے محفوظ رکھنے کا ایک عزم بھی پنہاں تھا۔ گویا جب دشمن نے حملہ کیا تو ہم نے ان تمام اشیا کا باوازِ بلند نام لیا جو ایک زبردست خطرے کی زد میں تھیں اور اس لئے نام لیا کہ جب کسی شے کے مجروح ہونے یا چھن جانے کا خطرہ درپیش ہو تو اس شے سے جذباتی وابستگی فوراً سطح پر آ جاتی ہے۔ اس ضمن میں ہم نے سیالکوٹ، لاہور، قصور اور سرگودھا کے ترانے گائے کہ ان شہروں کو دشمن سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور ان کے مقابلے میں میانوالی، جھنگ اور لائل پور کا اس لئے نام نہ لیا کہ یہ شہر ابھی دشمن کی زد سے محفوظ تھے۔ پھر چونکہ ہمارے وطن کی سالمیت خطرے میں پڑ گئی تھی اس لئے ہم نے حب الوطنی کا بھرپور اظہار کیا اور چونکہ دشمن کی صفوں میں ایسے عناصر موجود تھے جو تاریخ کی صورت میں ہماری مذہبی روایات سے کسی قسم کی رواداری کا سلوک نہ کرتے اس لئے ہمیں محسوس ہوا کہ یہ حملہ ہمارے وطن کے خلاف ہی نہیں ہمارے مذہب کے خلاف بھی تھا۔ چنانچہ ہم نے بآوازِ بلند پوری شدت سے اپنے مذہب اور اس سے وابستہ تعلیمات کا ذکر کیا کہ یہ سارا بیش بہا سرمایہ دشمن کی یلغار کی زد میں تھا۔ مختصر یہ کہ ہماری جنگ دفاعی نوعیت کی تھی اور اس جنگ میں جس شے کو سب سے پہلے یا سب سے زیادہ خطرہ پیش آیا وہ اسی قدر جلد اور اسی نسبت سے ہمارے لئے ایک متاعِ عزیز بن گئی۔ جس طرح عام زندگی میں ماں اپنے بچے کو اکثر کوستی اور بددعائیں دیتی ہے لیکن بچہ ذرا علیل ہو جائے تو ممتا اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگتی ہے۔ بعینہٖ عام حالات میں قومیں امن و آشتی کی فضا میں اس قدر ڈوبی ہوتی ہیں کہ سطح پر نظر رکھنے والوں کو ان پر اہلِ وطن سے بے اعتنائی اور کوتاہی کا گمان ہونے لگتا ہے لیکن جب وطن کسی بیرونی حملے سے دوچار ہوتا ہے تو یہی قومیں ایک زبردست داخلی استحکام کا مظاہرہ کرتی ہیں اور وطن کے لئے بے پناہ محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر فی الفور میدانِ عمل میں نکل آتی ہیں۔ ستمبر کی جنگ اس بات کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے کیونکہ ان سترہ روز میں ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ارضِ پاکستان، اس کی ثقافت اور خود ہمارے مذہب کی بقا اور تحفظ کے لئے ہمارے دلوں میں کیسے ارفع جذبات دبکے پڑے تھے!

دفاعی جنگ کے دوران وطن کا تحفظ اولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ ایک عام سا کلیہ ہے۔ مگر بات شاید یوں ہے کہ دفاعی جنگ کی صورت میں تمام تر قوتیں ارضی اور غیر ارضی، دفاع کا جزو بن جاتی ہیں یعنی سپاہی بندوق اور توپ سے لڑتا ہے، ادیب اپنے قلم سے، موسیقار اپنی آواز اور ساز سے اور ہر شخص اپنے طور سے جنگ میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس وقت سپاہی سے کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ کیا اس نے اپنے بوٹوں اور وردی کو چمکایا ہے یا نہیں۔ نہ ادیب سے کوئی پوچھتا ہے کہ اس نے

جو کچھ کہا اس میں ادب کے مقتضیات کا احترام مفقود تھا یا نہیں؟ دفاعی جنگ میں قوم اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنا تحفظ کرتی ہے اور لحظہ بھر کے لئے باقی تمام باتیں ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہی کچھ ہم نے بھی کیا۔ ہمارے شعرا اور ادبا دل کے سپاہی بن گئے اور ایک زبردست قومی جذبے کے تحت انھوں نے افسانوں، نظموں اور مضامین کے انبار لگا دیئے۔ بعد ازاں حکومت پاکستان نے بھی ادیبوں کی اس قومی خدمت کا اعتراف کیا۔ یہی حال موسیقاروں، ملازموں اور عام شہریوں کا تھا کہ انھوں نے اپنی ننھی منی آوازوں کو توپوں کی گھن گرج میں ملا کر ایک ایسی گمبھیر آواز میں تبدیل کر دیا جو بہت دور تک سنی گئی اور جس نے دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

پھر سترہ روز کے بعد جنگ ختم ہو گئی سپاہی محاذ سے واپس آنے لگے۔ ملک میں بلیک آؤٹ ختم کر دیا گیا، ریڈیو پر جنگی پروگرام میں بتدریج تبدیلی آ گئی، عوام آہستہ آہستہ زندگی کی نارمل سطح کی طرف چلتے چلے گئے اور ادیبوں اور ادبا نے بھی قومی ادب پیدا کرنے کے بجائے آہستہ آہستہ عام قسم کا ادب تخلیق کرنے کی طرف اپنی توجہ منعطف کر دی۔

اور اب ڈیڑھ برس کے بعد اردو کے ادبا دو اہم سوالوں کی زد میں ہیں۔ ان میں سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ جنگ کے ان سترہ دنوں میں انھوں نے جو کچھ تخلیق کیا ادب کے نقطۂ نظر سے وہ کس حد تک کارآمد تھا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ ادیب اس قدر جلد جنگ اور اس کے تجربات کو فراموش کر کے عام قسم کے ادب کی طرف کیوں راغب ہو گئے۔

پہلے سوال کا جواب میں نے اوپر لکھ دیا ہے۔ دراصل ان سترہ دنوں میں ہمارے ادبا نے جو کچھ لکھا وہ ملک کے دفاع کا ایک قابل قدر اور مؤثر حربہ تھا اور جنگ لڑنے کے لئے اس کی اشد ضرورت تھی۔ اگر اس ادب میں سے ایک سطر تک زندہ نہ رہے تو بھی ہمیں اس کا کوئی افسوس نہ ہوگا۔ دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ ایک خاص وقت میں اس نے قوم کی خدمت سرانجام دی یا نہیں، سو جنگ کے دوران میں ہمارے ادبا نے جو کچھ لکھا وہ ایک مقدس اثاثہ ہے اور اسے تنقید کی خوردبین کے نیچے رکھ کر اس کا جائزہ لینا ہرگز مستحسن نہیں!

دوسرے سوال کا جزوی جواب بھی اوپر آ گیا ہے مگر اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ بات یہ ہے کہ جنگ کے دوران ایک زبردست قومی اور ملی جذبے کے تحت اردو کے ادبا اور شعرا نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور یہ اظہار ان کی حب الوطنی کا ایک اہم ثبوت ہے۔ ان جذبات کی حیثیت ایک "ابال" کی سی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب دشمن سامنے ہو تو اسے للکارا جاتا ہے اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے تو جوش کا دم پڑ جانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ جنگ کے بعد ہمارے ادبا کے ہاں ملی اور قومی سطح پر اصناف ادب کے ذریعے جنگ لڑتے چلے جانے کا رجحان بتدریج کم ہوتا چلا گیا لیکن اس کا یہ مطلب لینا کہ ان کے دل سے وطن اور قوم کی محبت بھی مٹ گئی، بیحد افسوسناک ہے۔ جنگ کوئی اچھی چیز نہیں اور ہم پاکستانی تو صرف دفاعی جنگ کے قائل ہیں کہ اس سلسلے میں ہمارے مذہبی احکام بالکل واضح ہیں لیکن اگر کبھی آئندہ ہمارے دشمن نے حملہ کیا تو اس بات کو طے سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے ادبا اسی ملی اور قومی جذبے کا اظہار کریں گے جس کا مظاہرہ وہ ستمبر کی جنگ میں کر چکے ہیں جس طرح آج ہمارے فوجی جوان جنگ کے عمل میں مبتلا نہیں لیکن ان کی وطن دوستی اور وفاداری پر کوئی حرف نہیں آ سکتا، اسی طرح اگر آج ہمارے ادبا اور شعرا جنگی نظمیں اور ترانے نہیں لکھ رہے تو اس سے ان کی حب الوطنی معرض بحث میں نہیں لائی جا سکتی۔ اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ محض اپنی "لیڈری" کو چمکانے کی فکر میں ہے ہمیں اس کے اس کاروبار سے کوئی سروکار نہیں۔

اب رہا سوال کا یہ حصہ کہ آج کے اردو ادبا جنگ کے تجربات کو اپنی تخلیقات میں کیوں نہیں سموتے تو اس سلسلے میں جنگ کے واقعہ پر سرسری ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ستمبر کی یہ جنگ صرف سترہ روز جاری رہی اور صرف سرحدی علاقے تک محدود تھی۔ ہمارے ادبا میدان جنگ سے بہت دور اپنے اپنے شہروں میں اقامت پذیر رہے۔ یہاں تک کہ ہم میں سے شاید ایک ادیب بھی ایسا نہیں تھا جو پھٹتے ہوئے بموں کی زد میں آیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے لئے یہ جنگ ایک عظیم الشان قومی سطح کا تجربہ تھی! اور اس لئے ہم نے جو کچھ لکھا اس میں قومی جذبات کا برملا اظہار ہی غالب حیثیت رکھتا تھا۔ شخصی سطح پر ہم میں سے بہت کم ادبا جنگ کی تباہ کاریوں، اس کی ہولناکی اور کرب سے آشنا ہوئے اور اس لئے شخصی تجربہ ہماری تخلیقات کا جزو اعظم نہ بن سکا۔ تقسیم ملک کے موقعہ پر جو فسادات ہوئے تھے وہ نہ صرف کئی ماہ پر پھیلے ہوئے تھے بلکہ ان کے کربناک مراحل سے ہمارے بیشتر ادبا خود گزرے ہوئے تھے۔ نتیجۃً ان تخلیقات کی صورت میں سامنے آیا جن میں شخصی تجربات، ان کی سچائی اور کرب صاف طور پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے مگر اردو ادبا کے لئے ستمبر کی جنگ کا تجربہ شخصی کم اور ملی اور قومی زیادہ تھا۔ ہمارے بیشتر ادبا نے دفتروں کی کھڑکیوں سے جنگ کا نظارہ کیا اور بعض تو تہہ خانوں سے شاذ ہی باہر آتے۔ ظاہر ہے کہ جب تک جنگ سے شخصی سطح پر تعارف حاصل نہ ہو، ادبی تخلیقات میں اس کی پرچھائیں پوری طرح ظاہر

نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جنگ کے بعد جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے بارے میں جو ادب تخلیق ہوا اس میں بیشتر کی پیداوار تھا۔ اصل ادیب کا کام یہ نہیں کہ وہ شعوری طور پر مستعار تجربات کو اپنی تخلیقات میں سمیٹ بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے فن کو تجربات کی اساس پر استوار کرے۔ اگر کسی ادیب کی زندگی میں کوئی تجربہ موجود ہی نہیں تو وہ تخلیق کیا کرے گا؟ فسانۂ آزاد میں جب سرشار نے خوجی اور آزاد کو جنگ لڑنے کے لئے سمندر پار بھیجا تو تجربے کے فقدان نے داستان کو بے رنگ کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جن ادبا نے محض مستعار تجربات سے اپنی تخلیقات میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے ان کے فن کے انبار گاہے گاہے نظر آتے ہی رہتے ہیں۔ اس ضمن میں فنون کے پچھلے شمارے میں جناب انتظار حسین صاحب کا افسانہ "سوئے کے تار" بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں انتظار حسین صاحب کے اس افسانے کا خاص طور پہ ذکر نہ کرتا (کیونکہ اپنے موقف کی حمایت میں بعض اور تخلیقات کی طرف بھی اشارہ کر سکتا تھا) مگر—— مگر چونکہ یہ مضمون "فنون" کے لئے لکھا گیا ہے اس لئے اس افسانے کا تذکرہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ بہرکیف اس افسانے کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ جب ادیب شعوری طور پر کسی ایسے موضوع کو اپنانے کی کوشش کرے جو اس کے تجربے کی دسترس سے باہر ہو تو اس کا نتیجہ بڑا دردناک ہوتا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ کسی تجربے کو تخلیقات میں سمونے کا مشورہ دینے میں ہم حق بجانب نہیں کہ ادیب کا مسلک ہی یہ ہے کہ وہ کسی مشورے کے زیر اثر تخلیق نہیں کرتا بلکہ سدا اپنی ذات کے اظہار کی طرف مائل رہتا ہے اور وہی کچھ لکھتا ہے جس کا "حکم" اسے "اندر" سے موصول ہوتا ہے۔ اب اگر ادیب کے اس دیار میں کسی شے سے متعلق کوئی تجربہ موجود ہے تو وہ تخلیق میں ظاہر ہو کر رہے گا۔ اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اور اگر یہ تجربہ موجود ہی نہیں تو پھر چاہے آپ اس موضوع پر اس سے ہزاروں صفحات لکھوا ڈالیں، یہ جذبے کی گرمی اور سچائی کی رمق سے ناآشنا ہی رہیں گے۔

جنگ کے سلسلے میں شخصی تجربے کی کمی کا احساس تو بہرحال ہم سب کو ہے اور اس کی بڑی وجہ محض یہ ہے کہ جنگ مختصر تھی اور ہمارے ادیب اس کے کرب سے گزرنے نہیں پائے۔ دوسری طرف جنگ نے ہمیں ملی اور مذہبی سطح پر متحرک کیا۔ چنانچہ لازم تھا کہ جنگ کے بعد کی تخلیقات میں ایسی علامتیں ابھر آتیں جن کا انسان کی ( ) سے گہرا تعلق ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اجمل صاحب نے خلیل، کلیم اور مسیح کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ستمبر کی جنگ نے ان علامتوں کو معنوی کشادگی عطا کی ہے اور وہ پاکستان کے مجروح شہروں پر محیط ہو گئی ہیں۔ مگر دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ یہ علامات پہلے ہی سے اردو ادب میں رائج ہیں اور ہر لکھنے والے نے اپنی ضرورت کے مطابق ان کے مفاہیم میں کشادگی پیدا کی ہے۔ کبھی یہ صوفیانہ تصورات کے سلسلے میں رائج ہوئیں۔ کبھی درباری اور جاگیرداری ماحول کے ضمن میں اجاگر ہوئیں، اور ابھی کل کی بات ہے کہ علامہ اقبال نے انھیں اپنی فکری پرواز کے سلسلے میں اور ترقی پسند تحریک نے اپنے مسلک کی تشہیر کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ جب جنگ کے سلسلے میں انھیں ایک بار پھر استعمال کیا گیا تو یہ اقدام مستحسن ضرور تھا لیکن نیا ہرگز نہیں تھا۔ پھر علامتوں کا سلسلہ ( ) کی مختلف پرتوں مثلاً ( ) سے لے کر مایا تو پٹا زم کی بنیادی جہت تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور جب یہ سائکی سے ابھرتی ہیں تو خود کو تلمیحات کی صورت میں نہیں بلکہ ( ) کی زبان میں ظاہر کرتی ہیں۔ دراصل سائکی کے کئی مدارج ہیں جب کسی شخص کے داخلی نظام کو کوئی دھچکا لگتا ہے یا کوئی قوم بحران یا جنگ کی زد میں آتی ہے تو دھچکے کی شدت کے مطابق ہی سائکی کے ایک خاص حصے کو بے نقاب کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دھچکا صرف سائکی کی بالائی سطح کو متاثر کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سائکی کے سارے تالاب میں ایسی ہلچل اور اضطراب پیدا کرنے کہ اس کی تاریک ترین سطحوں کے خزانے بھی لپک کر بالائی سطح تک آ جائیں۔ بہرکیف یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ ستمبر کی جنگ نے اردو ادبا کے ہاں سائکی کو برانگیختہ کرنے کا کام سرانجام دیا یا نہیں اور اگر سرانجام دیا ہے تو علامتیں سائکی کے کس دیار سے نازل ہوئی ہیں نیز ان کی شکل و صورت اور نوعیت کیا ہے؟ اگر کوئی صاحب ان علامتوں کی نشاندہی کریں اور جنگ سے پہلے کی علامتوں سے انھیں ممیز اور جدا کر کے دکھائیں تو اس سے جنگ کے دور رس اثرات کا کچھ اندازہ ہو مگر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جسے اخباری کالم میں حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے تو کوئی ڈاکٹر اجمل صاحب ایسا ماہر نفسیات ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

فتح محمد ملک

میراجی کی کتابِ پریشاں

ایک زمانہ ہوا جب میراجی نے انگلستان کی شاعر بہنوں کو اردو دنیا سے متعارف کراتے وقت ادبی نقاد کو خبردار کیا تھا کہ:

"کسی شاعر کے سوانحِ حیات اس کے کلام کے مطالعے میں اسی حد تک معاون ثابت ہو سکتے ہیں جس حد تک وہ اس کی ذہنی نشو و نما کو سمجھنے میں مدد دیں۔ ذاتی حالات میں دلچسپی سے یہ نقصان کا پہلو نکل سکتا ہے کہ ہم افسانہ پرست بن کر رفتہ رفتہ اس کے کلام کی حقیقت سے دور ہوتے جائیں گے اور پھر کلام کی صحیح جانچ میں الجھن پیدا ہو جائے گی۔"

آج خود میراجی کی شخصیت اسی فریب انگیز دھندلکے میں گم ہے جیسے برونٹی خاندان کی شخصیات کے اردگرد دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے تھے۔ میراجی کی ذاتیات میں حد سے بڑھا ہوا انہماک رکھنے والے نقادوں کے ہاتھوں یہ دھندلکا روز بروز زیادہ گہرا اور زیادہ فریب انگیز ہوتا جا رہا ہے۔ یہ قرار دینے کے بعد کہ میراجی جنسی کجرویوں اور جسمانی آلودگیوں کے پجاری تھے، اب اردو تنقید میراجی کے ان مفروضہ سماجی جرائم کی سزا تجویز کرنے میں مصروف ہے۔ چنانچہ میراجی کے تازہ ترین نقاد اعجاز احمد نے خود کو سارتر جانا اور میراجی کو ژاں ژینے، اور پھر وہ سب کچھ اگل ڈالا جو سارتر نے ژینے کی شان میں کہہ رکھا ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ سارتر نے بودلیئر کے بارے میں جو کچھ کہہ رکھا ہے وہ میراجی پر کب چسپاں ہوتا ہے:

He was an antisocial male, suffering from syphilis and an overdraught at the bank.

جدید اردو تنقید کی اہم دستاویز "مشرق و مغرب کے نغمے" کے مصنف کے نقطۂ نظر سے اس تنقیدی اندازِ نظر کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہاں فن کار کو اس کے ماحول سے الگ کر کے خلا میں جانچا گیا ہے۔ یہ ستم میراجی پر ڈھایا جائے تو المیہ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ میراجی نے شعر و ادب پر عملی تنقید کے دوران جو فنی نظریات پیش کئے ہیں، میراجی کو تختۂ مشق بناتے وقت ان سے قطعِ نظر کرنا نامناسب بھی ہے اور ضرر رساں بھی۔ اپنے عہد کی ادبی تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے میراجی لکھتے ہیں:

"حالی نے دیکھا کہ جس ماحول میں ان کی ہستی کا انحصار ہوا اس میں اسے کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جو تکلف سے بری اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو۔ چنانچہ اس کی طبیعت حالات سے برگشتہ ہو گئی، اور وہ نیچرل شاعری کا بانی بن گیا۔ اردو کے موجودہ انقلابی شاعر بھی حالات سے بدظن ہو کر اپنی علیحدہ دنیا بسائے بیٹھے ہیں جس میں اشتراکیت ہے، مساوات ہے۔ نہ جانے کیا کچھ ہے۔ وہ دنیا بھی ویسی ہی ناکارہ ہے جیسی کہ پرانے شاعر کی خیالی دنیا کیونکہ اس میں عمل کا فقدان ہے اور باتوں کی کثرت۔ اس لحاظ سے صرف اقبال اردو کا ایک ایسا شاعر ہے جو صحیح راہ پر چلتے ہوئے ایک نئی دنیا بسانا چاہتا ہے کیونکہ وہ ہر وقت،

عمل پر مصر رہتا ہے۔"

معصر ادبی رجحانات پر ان خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ میراجی کو اپنے بزرگ معاصرین میں سے اقبال کا شاعرانہ مسلک پسند تھا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میراجی نے اقبال کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے کی بجائے اس رَو کا ساتھ دیا جو اقبال کے متوازی چل رہی تھی۔ اس کی وجہ بھی میراجی نے اپنے مذکورہ مضمون میں ہی بتا دی ہے۔ ان کا کہنا ہے:

"ماحول کے ناپسندیدہ ہونے کی صورت میں اگر اس کی صورت باغیانہ نہ ہو تو شاعر صوفی یا بیراگی بن جاتا ہے اور باغیانہ صورت میں عمل کے ساتھ مصلح ملک و قوم بن جاتا ہے۔"

میراجی کی فطرت باغیانہ نہ تھی اس لیے انھوں نے صوفی بننے کی ٹھانی۔ وہ ایک زندہ اور توانا ذہن رکھتے تھے اس لئے انھوں نے کسی جامد نظریہ کے پُرفریب سکون سے آشنا ہونے کی بجائے اس اضطراب کو اپنایا جو حقیقت کی تلاش میں انھیں نئے سے نئے ویرانوں کی سیر کراتا رہا اور جس کے باعث ان کا دل عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا بن گیا۔ صوفی کی ذہنی کیفیات بیان کرتے ہوئے میراجی اپنے ایک مضمون میں بتاتے ہیں کہ:

صوفی یا بیراگی ایک ایسی سرزمین میں بستا ہے جو اس دنیا سے الگ ہوتی ہے۔ وہ زمین تمام تر آسمان کی طرح صاف اور منزہ فضا بھی نہیں ہوتی اور تمام تر اس دنیا کی آلودگی میں بھی نہیں ہوتی اور اس جگہ بستے ہوئے وہ اس جہان کی زبان و بیان اور تصورات اور استعاروں کو مفہوم کی ایک روحانی نفاست کا لباس پہنا کر ان کیفیات کا اظہار کرتا ہے جن کے بیان کے لئے حقیقتاً اس دنیا کی زبان میں الفاظ ہی میسر نہیں آتے —— اس بلند درجے تک پہنچنے کے لئے صوفی کو بعض دفعہ مختلف ذرائع سے اپنی ذہنی زندگی میں ایک سادگی پیدا کرنی پڑتی ہے یہ ذرائع فاقہ کشی، عزلت نشینی، منشیات کا استعمال اور اسی طرح کے ذرائع بے خودی ہیں جن کے وسیلے سے ایک مجتمع و فرد کیفیت ذہن پر چھا جاتی ہے۔ صوفی یا بیراگی کو انتہائی درد یا انتہائی مسرت اس منزل تک پہنچاتی ہے جس کا تعلق کلیتہً جسم سے ہے نہ دل سے ——"

اس طرز فکر کے علاوہ میراجی کا طرز حیات اور شاعرانہ کمال اس حقیقت کا غماز ہے کہ میراجی ایک صوفی شاعر ہیں اور انھوں نے ایمیلی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ خود ان کے بارے میں بھی سچ ہے:

"ایمیلی کی فطرت میں سب سے بڑا تضاد یہ ہے کہ وہ گھرستی طبیعت کے باوجود اپنے دل کی گہرائی میں ایک صوفی تھی ایک بیراگن تھی۔ وہ میرا بائی کی طرح یہ نہیں کہتی کہ "کہاں جاؤں سہیلی نہ جاؤں" وہ گھر کی ہر بات میں دلچسپی لیتی ہے لیکن وہ تصوف میں ایک احساسِ مذہبی رکھتی ہے۔ اس کے لئے وجد و حال کی کیفیت جانی پہچانی بات ہے.... ایمیلی اپنے نفس کی خیالی دنیا میں جس محبوب سے ملنے کی مشتاق تھی وہ روحِ ابد تھی۔ یہ سب نظریہ اگرچہ تصور کا کرشمہ ہے لیکن اس کی حقیقت کو اس سائنٹفک زمانے میں بھی آسانی سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہ زندگی کا تصور کوئی غیر مرئی چیز نہیں جسے سادھو سنت خدا کی رحمت سے کبھی کبھار دیکھ لیتے ہیں بلکہ ایک معین تصور ہے جسے ہر طبیعت اپنے لئے از سر نو تخلیق کرتی ہے۔"

میراجی نے اس معین تصور کو اپنے لئے از سر نو تخلیق کیا جس کے ثبوت کے طور پر میراجی کی خوبصورت ترین نظم "خدا" پیش کی جا سکتی ہے۔ یہاں میراجی نے روحِ ابد سے ہم آہنگ ہونے کی واردات پیش کی ہے:

میں تجھے جان گیا روحِ ابد
تو تصور کی تمازت کے سوا کچھ بھی نہیں

چشمِ ظاہر کے لئے خوف کا سنگیں مرقد
اور مرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو دیو مالا سے دلچسپی اور خاص انداز کی وسیع المشربی کے باوجود میراجی کے اندر جو شدید مذہبی احساسات ہیں ان پر اسلام کی گہری چھاپ ہے۔ موت سے چند برس پہلے جب میراجی سے ان کے ترکِ اسلام کی وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے احتجاجاً کہا تھا:

"یہ بات[1] غلط ہے کہ میں نے اسلام کو ترک کیا۔ میں ایک خدا کو اب بھی مانتا ہوں مگر میں نے حضرت عمر فاروقؓ تک اسلام کو سمجھا ہے اس کے بعد مجھے اسلام کی اصلی شکل نظر نہیں آئی لیکن مجھے قرآن پڑھ اور سن کر اب بھی غش آ جاتا ہے۔"

اُن کی عزیز ترین آخری[2] تمناؤں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ جرمنی جا کر قرآنی اختال پر تحقیق کریں تاکہ دنیا قرآن کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہو سکے زندگی کے آخری دور میں جب وہ کرشن چندر کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ کرشن چندر[3] اس انکشاف پر بھناّ اُٹھے تھے:

"میراجی مسلمان ہیں بلکہ پکے مسلمان ہیں۔ ان کا ہندو نام ایک دھوکا ہے۔ صبح سویرے وہ جے جے ونتی کا جو راگ الاپتے ہیں وہ بھی محض فریب ہے۔ در اصل وہ مسلمان ہیں۔"

کرشن چندر نے آزاد خیالی اور وسیع المشربی کے جس جرم کی پاداش میں اپنے مہمان کو فریبی اور دھوکے باز کہا ہے، صوفیا اپنے اسی دامنِ تر پر ہمیشہ نازاں رہے ہیں۔ اگر محض نام بدل لینے سے قومی بدل جاتا تو سولہویں صدی کے مشہور صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی الکھ داس کے نام سے برج بھاشا میں نہ لکھتے —— ہاں تو ہم نے میراجی کے دین و مذہب کا ذکر ان کی نظم 'خدا' کو سمجھنے کے لئے اٹھایا تھا۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے:

میں نے کب دیکھا تجھے روئے ابد
اُن گنبد گہرے خیالوں میں ہے تیرا مرقد
صبح کا شام کا نظارہ ہے
ذوقِ نظارہ نہیں چشمِ گداگر کو مگر

'صبح کا شام کا نظارہ ہے' —— اس میں حضرت ابراہیمؑ کے عرفانِ حقیقت کی واردات کو بیان کرنے والی قرآنی حکایت واضح طور پر موجود ہے۔ جوں جوں نظم آگے بڑھتی ہے تخلیقِ آدم اور تخلیقِ حیات، دکھ' ساعت کے اسلامی تصورات موج در موج پھیلتے سمٹتے نظر آتے ہیں اور بالآخر نظم ان مصرعوں پر ختم ہوتی ہے:

اور مرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

میراجی کے دل میں محبت کے سوا کچھ نہیں لیکن میراجی کو اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا میں یہ محبت، یہ نورِ ازل کہیں نظر نہ آیا۔ نظم "سلسلۂ روز و شب" ملاحظہ ہو:

---

[1] "میراجی" از مظہر ممتاز مطبوعہ "نقوش" لاہور
[2] 'میراجی کے مشن' از مظہر ممتاز مطبوعہ 'ہم قلم' کراچی

خدا نے الاؤ جلایا ہوا ہے
اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے
ہر اک سمت اس کے خلا ہی خلا ہے
سمٹتے ہوئے دل میں وہ سوچتا ہے
تعجب کہ نورِ ازل مٹ چکا ہے

بہت دور انسان ٹھٹھکا کھڑا ہے
اسے ایک شعلہ نظر آ رہا ہے
مگر اس کے ہر سمت بھی اک خلا ہے
تخیل نے یوں اس کو دھوکا دیا ہے

عدم اس تصور پہ جھنجھلا رہا ہے
نفس دو نفس کا بہانہ بنا ہے
حقیقت کا آئینہ ٹوٹا ہوا ہے
تو پھر کوئی کہہ دے یہ کیا ہے، یہ کیا ہو گیا ہے؟
خلا ہی خلا ہے، خلا ہی خلا ہے

نورِ ازل کے مٹ جانے کے بعد کی تیرہ و تار فضا میں میراجی نے حقیقت کی طرف اپنا سفر شروع کیا مگر یہ وہ دنیا ہے جس کا مجازی رنگ پہلے سے مختلف ہے کیونکہ بقول میراجی "سگمنڈ فرائیڈ کے نظریوں نے حضرت یوسفؑ کے فن کو ایک گئی گذری بات بنا دیا ہے لیکن بیداری کے خوابوں کی دلکشی ابھی تک قائم ہے" چنانچہ میراجی کے ہاں بیداری کے خوابوں کے سہارے مجاز سے حقیقت کا سفر شروع ہوتا ہے لیکن جب وہ منزل پر پہنچتے ہیں تو حقیقت کا آئینہ تڑاخ سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ ان بکھری ہوئی کرچیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوششوں میں میراجی کی انگلیاں فگار ہوئیں اور خامہ خونچکاں۔ تب درد و دل لکھنے کا کام موقوف ہوا اور ان کی فسردہ سی ہڈیاں[1]، اور فسردہ سی خاکستر بے نشان نے 'فسردہ فضا' میں جذب ہو کر سکون پایا لیکن یہ تو وہ منزل ہے جس کے میراجی مسافر تھے اور جو بالآخر میراجی کو مل گئی اور ہمیں اس وقت ان کے اس صوفیانہ اور شاعرانہ سفر کے احوال و مقامات جاننے کی آرزو ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنا سفر یہاں سے شروع کرنا پڑے گا کہ میراجی نے ناساعد حالات سے ڈر کر تصوف کے دامن میں پناہ لی۔ اگر ان میں باغیانہ جذبہ اور عمل کی قوت ہوتی تو وہ اسلام کی ابتدائی سادگی اور پاکیزگی کے متلاشی اقبال کے ہمنوا بن جاتے۔ اس خاص طرح کے جذبہ اور خاص طرح کے عمل کے فقدان کی وجہ سے وہ خود اپنے لفظوں میں عشق کے طائر آوارہ کا بہروپ بھرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے ناساعد حالات ہیں جن سے پنجہ آزما ہونے کی طاقت خود میں نہ پا کر میراجی راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میراجی کا ہندی مسلمان ہونا اس ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ میراجی کے مصائب سراسر ذاتی ہوتے ہوئے بھی برطانوی ہندوستان میں رہنے والے عام مسلمان نوجوان کے نمائندہ مصائب ہیں۔ میراجی ۱۹۱۲ء میں ایک ایسے شخص کے ہاں پیدا ہوئے جو کام کے

---

[1] فسردہ سی کچھ ہڈیاں ہیں، فسردہ سی خاکستر بے نشاں ہے
فسردہ سے کنکر، فسردہ فضا میں سکوں ہے

(تنہائی از میراجی)

اعتبار سے برطانیہ کی سب سے بڑی کالونی کا وفادار ملازم، مذہباً کٹر مسلمان اور طبعاً شاعر تھے (بحوالہ مولانا صلاح الدین احمد اور جناب کاملی)، جس زمانے میں میراجی پیدا ہوئے، سن شعور کو پہنچے اور اپنے باپ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف ریلوے سٹیشنوں پر زندگی کے چل چلاؤ کا مشاہدہ کرنے اور ریل کی پٹڑیوں کے دونوں جانب پھیلی ہوئی بنجر اداسیوں اور ڈراؤنے سناٹوں میں زندگی کے ہنگاموں سے بھرپور، پُر رونق شہروں کے خواب دیکھنے میں مصروف تھے۔ وہ زمانہ ہماری تاریخ کا عجیب و غریب باب ہے۔ سیاسی طور پر یہ عہد ہندو مسلم اتحاد اور ادبی طور پر ہندوستانیت کی بڑھتی ہوئی لے کا منظر پیش کرتا ہے۔ تحریکِ خلافت، اور جمعیۃ العلمائے ہند کی رہنمائی میں تمام ہندی مسلمان کانگرس کے دوش بدوش ملکی آزادی کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ ادبی محاذ پر بابائے اردو مولانا عبدالحق، مولانا شرر اور تاجور نجیب آبادی کے رسالوں میں اردو نظم و نثر کی اصلاح کے متعلق اس قسم کے پروگرام شائع ہو رہے ہیں:

۱۔ اردو سے عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ نکال کر اسے عام فہم ہندی زبان بنانا۔

۲۔ آئندہ عام ہندوستانی زبان کے مطابق گریمر تیار کرنا۔

۳۔ اردو نظم کو ہندی وزنوں میں منتقل کرنا

۴۔ اردو نظم میں ہندی مضامین، ہندی خیالات اور ہندوستانی واقعات کو بیان کرنا۔

مولانا تاجور کے لفظوں میں اس اصلاح کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اردو شاعری ہندوستانی شاعری بن جائے گی۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب بابائے اردو گاندھی جی کے زیر اثر یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ اردو زبان ہندو مسلمانوں کے ملاپ کا پھل اور اتحاد کی ضامن ہے۔ مگر یہی وہ زمانہ ہے جس میں ہندی مسلمان کے ذہن میں یہ کشمکش بھی اپنے عروج پر ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اس بڑی اسلامی دنیا کا اٹوٹ انگ ہے جو ہندوستان کے مغرب میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا۔

میں بیک وقت ایک ہی قطر کے دو متحارب دائروں میں گھرا ہوا ہوں جن میں سے ایک کا نام ہند ہے اور دوسرے کا اسلامی دنیا!

اس کشمکش کا نتیجہ تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد ہندو مسلم نفاق، مسلمانوں کی پُر مصائب ہجرت اور مسلمانوں کے ذہن کی بے حد پیچیدہ ذہنی الجھنوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ سنہ تیس میں مولانا جوہر کی وفات کے بعد مسلمانوں کا کوئی رہنما ہی باقی نہیں رہتا اور ہندوستان کی آزادی یقینی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں عام مسلمان اس الجھن میں گرفتار ہے کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان میں اس کی ہستی کی بقا کیسے ممکن ہے؟ — اقبال جن رجحانات کے نمائندہ تھے وہ سیاست کی دنیا میں ابھی زیر زمین کام کر رہے تھے اس لئے اس کشمکش کو حل کرنے کا آسان ترین حل ابوالکلام جیسے سیاسی رہنماؤں اور میراجی جیسے شاعروں کو یہ نظر آیا کہ وہ ہندوستانی قومیت کے تصور کو اپنا کر ہندوستان میں ضم ہو جائیں۔ چنانچہ میراجی مستقبل کا تصور تک نہیں کر سکتے:

مستقبل سے میرا تعلق بے نام سا ہے۔ میں صرف دو زمانوں کا انسان ہوں۔ ماضی اور حال۔ یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور میری عملی زندگی بھی انہی کی پابند ہے۔ (دیباچہ — میراجی کی نظمیں)

خالصتاً ذاتی سطح پر میراجی کے مستقبل سے بے نیاز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے باپ کے سب سے بڑے فرزند تھے جو ریٹائر ہو چکے تھے اور گھر بھر کی امید بھری نظریں انہی پر مرکوز تھیں مگر ان کی سنگ دل خون سکھاتی ہوئی بیکار سماج محض اس بنا پر انہیں کوئی قابلِ عزت مقام دینے سے انکاری تھی کہ ان کے پاس اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود میٹرک تک کی سند نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ میراجی ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئے جو اس دنیا سے الگ تھی،

مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ دنیا مٹ جائے
مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ بیکار سماج

اپنی پابندی سے دم گھٹ کے فسانہ بن جائے
میری آنکھوں میں تو مرکوز ہے روزن کا سماں
اپنی ہستی کو تباہی سے بچانے کے لئے
میں اسی روزنِ بے رنگ میں گھس جاؤں گا
لیکن ایسے تو وہی بت نہ کہیں بن جاؤں
جو نگاہوں سے ہر اک بات کہے جاتا ہے
چھوڑ کر جس کو صنم خانے کی محبوب فضا
گھر کے بے باک و المناک سیہ خانے میں
آرزوؤں پہ ستم دیکھنا ہے گھلتا ہے
میں تو روزن میں نہیں جاؤں گا، دنیا مٹ جائے
اور دم گھٹ کے فسانہ بن جائے
سنگ دل خون سکھاتی ہوئی بے کار سماج
میں تو اک دھیان کی کروٹ لے کر
عشق کے طائرِ آوارہ کا بہروپ بھروں گا پل میں
اور چلا جاؤں گا اس جنگل میں
جب میں تو چھوڑ کے اک نخلِ فسردہ کو اکیلے چل دی
راستہ مجھ کو نظر آئے نہ آئے پھر کیا
ان گنت پیڑوں کے میناروں کو
میں تو چھوتا ہی چلا جاؤں گا
اور پھر ختم نہ ہو گی یہ تلاش
جستجو روزنِ دیوار کی مرہون نہیں ہو سکتی
میں ہوں آزاد مجھے فکر نہیں ہے کوئی
ایک گنگھور سکوں، ایک کڑی تنہائی،
میرا اندوختہ ہے

(شام کو — راستے پر)

گھر کے بے باک، المناک، سیہ خانے میں، آرزوؤں پہ ستم دیکھنے، گھلنے، اور اپنی ہستی کو تباہی سے بچانے کی خاطر میراجی نے عشق کے طائرِ آوارہ کا بہروپ تو بھر لیا مگر اس بہروپ کے نیچے میراجی کا بدن کراہتا رہا، روح تلملاتی رہی۔ اس بہروپ کو اتار کر دیکھا جائے تو میراجی لاہور کی بنگالی لڑکی دلی کی مسلمان لڑکی، بمبئی کی پارسی لڑکی اور لکھنؤ کی بہو خاتون سے بے نیاز دکھائی دیں گے۔ وہ کسی مثالی حسن کے طلبگار نہیں۔ کوئی سی لڑکی ان کی

محبوبہ بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ ان کی دلہن بن کر ان کا گھر آباد کرنے پر آمادہ ہو۔ میرا جی کے ہاں محبوبہ کا تصور منکوحہ کا تصور ہے۔ اپنی کتاب "اس نظم میں" سید علی منظور کی بے حد معمولی نظم "برادرِ نسبتی" کے مطالعہ کے دوران میرا جی بڑے جذباتی لہجے میں اس امر پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ نئے شاعر بیاہتا زندگی اور گھریلو محبت میں رومان کی دل کشی کیوں نہیں دیکھ پاتے؟ اسی طرح اپنی غیر مطبوعہ کتاب "اجنتا کے غار" کے نامکمل دیباچہ میں میرا جی نے بتایا ہے کہ:

> میری ایک عزیزہ ہیں۔ انھیں میرے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہیں۔ ایک روز باتوں باتوں میں انھوں نے عورت کو ستون کہہ کر اپنا مفہوم ظاہر کیا۔ آج میں غور کرتا ہوں تو ان کی یہ بات مجھے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ خیالی زندگی میں شاعری کرتے ہوئے ہم عورت کو غزل، نظم یا جو کچھ چاہیں کہہ لیں لیکن عملی زندگی میں تو عورت مرد کے گھر میں ایک ستون ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے چھت قائم ہے اور آرام کے لئے سر چھپانے کی جگہ مہیا رہتی ہے۔ اس کے ہونے سے بچے پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہونے سے نظمیں، خصوصاً میری نظمیں اس لئے پیدا ہوئیں کہ اپنے گھر میں اس ستون کی غیر موجودگی میں تخلیق کا کام مجھی کو کرنا پڑتا۔"

میرا جی کی شاعری تنہائی، ناآسودگی اور نارسائی کی جن کیفیات کی ترجمان ہے وہ میرا جی کے ذاتی المیہ سے پھوٹی ہیں۔ بیداری کے جن خوابوں کے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکنے سے یہ المیہ وجود میں آیا ہے وہ بے حد عام، معمولی اور بیش پا افتادہ قسم کے خواب تھے۔ میرا جی زندگی کے سمندر سے صرف ایک قطرہ کے طلبگار تھے۔ یعنی سر چھپانے کے لئے گھر اور گھر کا ستون —— مگر ذاتی زندگی زندگی اس تخیل پر بھی رضامند نہ ہو سکی۔

چنانچہ میرا جی نے اپنی شاعری کی وساطت سے جس خیالی دنیا کو پیدا کیا اس میں زندگی کے عام مظاہر ایک انوکھی دل کشی کے حامل نظر آتے ہیں۔ یہ دنیا کچھ رنگ کے ذرے، کچھ آوازوں اور کچھ سایوں کی دنیا ہے۔ میرا جی کے گیتوں اور نظموں میں دلہن، بہن، ماں اور بچوں کے لہجوں اور مکالموں کا آہنگ شنید ہے تو ایک اچھوتی، انجان، کنواری دلہن کی تصویر دید ہے۔ یہ دلہن پری زاد نہیں، متوسط طبقے کی عام سی عورت ہے جو ہماری دیکھی بھالی ہے اور جس میں ہمیں شاعری اور رومان کی کوئی ادا نظر نہیں آتی مگر میرا جی کے ہاں وہ بے حد دلکش کردار ہے۔ خوشیوں کے جھیلے میں جھولنے کی ترنگوں کو سینے میں چھپائے یہ دلہن میرا جی کی شاعری میں ہر جگہ موجود ہے کہیں پس منظر میں تو کہیں پیش منظر کے طور پر۔ اس کے کانوں میں بندے ہیں، ماتھے پر بندی، ہاتھ میں گجرا، گلے میں ہار اور زرتار ریک دوپٹہ سر پہ لئے اور آنچل کو تہ بہ تہ کئے "رِم جھم رم جھم" سندر سنگھاروں سے سنوارے، سجی سجائی سیج پر بیٹھی دولہا کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی دولہا کی بہن خوشی میں سرشار ہے:

کیوں بہن، ہم نے سنا ہے کہ دلہن کی آنکھیں
آنکھ بھر کر نہیں دیکھی جاتیں
اور کہتی ہے بہن
میرے بھیا کو بڑا چاؤ ہے، کیوں پوچھتا ہے
اب تو دو چار ہی دن میں وہ ترے گھر ہو گی (تفاوتِ راہ)

مگر المیہ یہ ہے کہ دولہا اس دلہن تک نہیں پہنچ سکا۔ گھر بسانے کے لئے جن مادی وسائل کی ضرورت ہے وہ اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ میرا جی کے ایک گیت سے لفظ مستعار لوں تو دولہا اور دلہن کا فاصلہ دو پربتوں کا فاصلہ ہے۔ یہ پربت ایک دوسرے کو صرف بادل بن کر ہی مل سکے۔ مگر پربت بادل کیونکر بنے؟ ——

میرا جی کی شاعری میں یہ پربت بادل بنا ہے اور "آدمِ سیج" اور "سنجوگ" سے لے کر اجنبی انجان عورت رات کی" اور "لب جوبارے" تک برسا ہے۔ "لب جوبارے"

میرا جی کی بدنام ترین نظم ہے کہ مجھے زمانہ بینی، سفاک حقیقت نگاری اور بے رحم بیباکی کے باوجود اس لئے پیاری لگتی ہے کہ میرا جی تخیل کی دنیا میں بھی کسی عورت کے حسن کو برتتے ہیں تو پہلے اس کو منکوحہ بنالیتے ہیں:

.......جس کے اس پار جھلکتا نظر آتا ہے مجھے
منتظر، سجائی، اچھوتی سی دلہن کی صورت
ہاں تصور کو میں اب اپنے بنا کر دولہا
اسی پردے کے نہاں خانے میں لے جاؤں گا۔ (لب جوئبارے)

میرا جی نے اس الزام کی تردید کرتے وقت کہ زندگی کا محض جنسی پہلو ہی ان کی توجہ کا مرکز ہے لکھا تھا کہ "وہ جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو قدرت کی سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتے ہیں۔ قدرت کی اس سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی اس سب سے بڑی راحت اور برکت سے دائمی محرومی کا احساس میرا جی کی شاعری میں دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے، چھت پر لٹکتے ہوئے پیراہن اور دور سے نظر آتی ہوئی مسہری کے آغوش کی لرزشوں کے مناظر کو لبریز بلاغت کر دیتا ہے اور ان میں نئے تلازمات کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ تہذیب و تمدن نے جنس کے اردگرد جو دوری قائم کر رکھی ہے اور جس کی وجہ سے قدرت کی یہ سب سے بڑی نعمت جنسِ بازار بن کر رہ گئی ہے، اس پر میرا جی کے ہاں بعض اوقات بے انتہا تلخی اور کراہیت سے لبریز تصویریں بھی نظر آجاتی ہیں مگر مجموعی طور پر وہ جنسی جذبات کو عبادت کی حد تک پاکیزہ سپردگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

ایک ہی بات جو پہلو میں چھپائے ہوئے سویا اُن کو
رات کو دن کی طرح نور سے بھر دیتی ہے
دل پہ اک سحر سا کر دیتی ہے (اجنتا کے غار)

زندگی کے جنسی پہلوؤں ہی پر تخلیقی غور و فکر کے دوران میرا جی رات اور دن کے قدیم اور اپنے زمانے میں مقبول عام تلازمات میں کایا کلپ کر دیتے ہیں۔ میرا جی کے ہاں دن ظلم کی علامت ہے اور رات تخلیقی جوش و نمو اور انبساط کی علامت۔ "آمدِ صبح" اور "سنجوگ" جیسی نظموں میں رات اور چاند پریم اور پریمی ہیں اور سورج رقیب ــــ اور غروبِ آفتاب سے لے کر طلوعِ آفتاب تک کے بے حد دلکش وقفۂ زماں میں انسانی عشق کا ڈراما سارے رنج و راحت سمیت دیکھا جا سکتا ہے۔ رات اور دن کی یہ علامات ذاتی اور رومانی ہی نہیں اجتماعی اور سیاسی رنگ بھی رکھتی ہیں:

رات کے سائے ہی خاموش رہا کرتے ہیں
دن کے سائے تو کہا کرتے ہیں
بیتی لذت کی کہانی سب سے
اور مری ہستی بھی اب دن کا ہی اک سایہ ہے
جس کے ہر ایک کنارے کو شعاعِ سوزاں
اتنی شدت سے جلانے پہ، مٹانے پہ تلی بیٹھی ہے
کاش آ جائے گھٹا، چھائے گھٹا، اور بن جائے
بڑھتے سورج کا زوال (دن کے روپ میں رات کہانی)

یہاں مجھے میراجی کے مصرعے ملکہ معظمۂ انگلستان کے چڑھتے سورج کے زوال سے دست و بے نوا آتے ہیں۔ بلاشبہ میراجی نے زندگی کی سفاک حقیقتوں سے خواب و خیال کی دنیا کی طرف گریز ہی کے لئے شعر کہے تھے مگر آوارہ کا بہروپ بھرا تھا مگر اس بہروپ کی مستوری کے دوران میراجی نے بیسویں صدی کے نصف اوّل کے برعظیم ہند کے بے چین اور بے راہ رو نوجوان کی پوری جذباتی سرگزشت بیان کر دی ہے:

میری آنکھیں ہیں کہ بازو اپنے
جیسے اک پیڑ کے ٹہنے ہوں کہیں پھیلے ہوئے
جن پہ طائر کا نشیمن کبھی بنتا ہی نہ ہو
سوکھتے جاتے ہوں ٹہنے غم محرومی سے (دہندلے نغمات)

یہ نوجوان جس نئی شہری تنظیم اور صنعتی اضافیات کا شکار ہے وہ گھریلو زندگی کی تخریب نے بد اذیت اور آسودگی کے نت نئے ڈھنگ پیدا کرتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے باوجود یہ نوجوان زندگی کی دوڑ میں زیادہ سے زیادہ کلرک بن سکتا ہے۔ میراجی نے اس کلرک کا نغمۂ محبت لکھا ہے۔ اس نوجوان کو مشینی زندگی کے سکون آہنی سے نجات نہ پاسکنے کے غم کو دفتری فائلوں میں غرق کرنا پڑتا ہے مگر افسر ——— اس کی زبان ہی اور ہے:

جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپڑاسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے، دوں کہتا ہے لیکن بیکار ہی رہتا ہے
میں اس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں تھک جاتا ہوں
پل بھر کے لئے اپنے کمرے کو فائل لینے آ جاتا ہوں
اور دل میں آگ سلگتی ہے: میں بھی جو کوئی افسر ہوتا
اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا پھر گھر ہوتا
اور تو ہوتی!
لیکن میں تو اک منشی ہوں، تو اونچے گھر کی رانی ہے
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے (کلرک کا نغمۂ محبت)

اس نوجوان کی تشنہ تمنائیں نظم کے پردے پر پوری ہو سکتی ہیں یا عکس تخیل سے یا کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کی جیب اور طوائف کے دامن کی دوری مٹ جاتی ہے، اعصاب آسودہ ہو جاتے ہیں مگر روح کی تیرگی نہیں مٹتی نتیجہ یہ کہ بازار حسن کے اونچے مکان کے سینے میں بھی بیتاب روح منعکس نظر آتی ہے اور وہاں کے گیتوں میں بھی بیداد کا جوش اور فریاد کا عکس و راز جھلکتا ہے۔ اپنے زمانے کے نوجوان کی اس مجبوری اور بے بسی پر میراجی نے صنعتی تہذیب اور نئی شہری تنظیم پر جو صدائے احتجاج بلند کی ہیں، انہیں سن کر میراجی کے اس دعویٰ کو ماننے بغیر چارہ نہیں کہ فی الحقیقت موجودہ صدی کی بین الاقوامی سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی کشمکش ان کا مرکز نظر رہی ہے (بحوالہ "میری پسندیدہ نظم" مرتبہ حسن عسکری)۔ "اونچا مکان"، "اخلاق کے نام"، "بلندیاں"، "ترقی پسند ادب" اور "اداکار" ان کے اس دعویٰ کا مکمل ثبوت ہیں۔

میراجی ذہنی خیالی دنیا میں گھر بار بنانے، جڑیں پکڑنے اور اپنے لواحقین کی خدمت کا حق ادا کرنے کی حسرتوں کے علاوہ مذکورہ بالا کشمکش کو

بھی ور آتے دیکھتے ہیں اور اسی کشمکش کے پس منظر میں ذاتی مصائب سے نجات پانے میں سرگرم رہتے ہیں اور ساتھ ہی عشق کے طائر آوارہ کا بہروپ بھی قائم رکھتے ہیں۔ یہ عشق ان کی ذاتی محرومیوں میں آفاقی وسعتیں سمیٹ لاتا ہے:

میں ہوں اک بیوپاری دکھوں کا، میرے پاس خزانہ ہے
میں نے اوروں کے دکھ میں اپنے دکھ کو پہچانا ہے
(بیوپاری)

میرا جی نے قیوم نظر اور اپنی ہمشیرہ کے نام جو خط لکھے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غمِ روزگار میرا جی کا سب سے بڑا غم ہے۔ منشی مہتاب دین کے اندھا ہونے، فوت ہو جانے، میرا جی کے ان کی خدمت نہ کر سکنے کے غم اور اس غم کو غلط کرنے کے لئے پڑھنا لکھنا چھوڑ کر جوتوں اور اسٹرول کی تجارت کرنے کے منصوبے اور آخر میں اپنی کمال تک پہنچ کر بھائی بہنوں کے حقوق ادا کرنے کی تمنائیں ـــــ یہ اور ایسی ہی دوسری کئی پریشانیوں کو کسی پر ظاہر کرنا میرا جی اپنی غیرت کے منافی سمجھتے ہیں لیکن پریشانیاں ان کی شاعری پر اپنا سایہ ڈالے بغیر نہیں رہتیں۔ زندگی سے گریز اور ستیز کی اس کشمکش کا نکتۂ عروج نظم "اجنتا کے غار" ہے جس میں اس بات پر غور کرتے کرتے کہ:

کیوں مجھے وقت کی رفتار نے الجھایا ہے؟

میرا جی، راجہ جانکی میں کپل وستو کی "جلوۂ نسب جہاں" دیکھتے ہیں اور ان پر کھلتا ہے کہ نجات کی راہ گوتم کی راہ ہے، سوتی ہوئی منکوحہ کو چھوڑنے اور گھر بار تیاگنے کی راہ:

دھیان تو آتے ہی بہہ گیا مری آنکھوں کو
سیب اک اور ہی شے جن کے نظر آتا ہے
اور تو ـــــ سامنے لیٹی ہوئی ہندی عورت
جنستا سوور محظوظ
جس نے بیتی ہوئی صدیوں میں مجھے الجھایا
تمری داسی ہے، تو ہی رانی ہے
مات کی مہلت یک لمحہ کو انبار بنا دیتی ہے
مات کے جاتے پہ بیزار بنا دیتی ہے
میرے دل کو مرا دل راجہ ہے
اس کنول تال کے پژمردہ کنارے پہ نشستہ ہے مگر
بات اس کی نہیں سنتا کوئی
اور یہ بیٹھے ہوئے سوچ کی لہروں میں بہا جاتا ہے
تیری بے باک اداؤں کا جلوس
دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے نکل جاتا ہے
اور پھر دھیان مجھے آتا ہے

لیٹے لیٹے جو تری آنکھوں میں نیند آجائے
میں تجھے چھوڑ کے چل دوں — چپ چاپ
اک اچٹتی سی نظر، جاگ نہ اٹھے، چل دوں (اجنتا کے غار)

اس راہِ نجات پر چلتے چلتے میراجی غار کے اندر پہنچے تو یہ بھید پایا کہ یہاں بھی چین نہیں:

نوعِ انساں بھی تو اک غار کی مانند ہے تاریک مقام
اس کی تاریکی اجالے کو دبا سکتی نہیں ہے لیکن
کیا اسی واسطے کچھ گیانی یہاں آئے تھے
تاکہ ان غاروں میں چپ چاپ — جہاں والوں سے
ہو کے روپوش — سفر طے کرلیں
دوش و فردا کا سفر طے کرلیں
لیکن افسوس یہاں بھی ان کو
نہ ملا پایۂ نروان — یہی دیواریں
ان کے افسردہ دلوں کی غماز
آج تک دشت میں سر مارتی ہیں (اجنتا کے غار)

یہ نظم ۱۹۴۱ء کی ہے اور اس حقیقت کی غماز کہ میراجی نے اب دنیا میں رہ کر ترکِ دنیا کا فن سیکھ لیا ہے۔ چنانچہ وہ نوعِ انسان کے غار کی مانند تاریک مقام پر پایۂ نروان حاصل کرنے کی جدوجہد کو تیز تر کردیتے ہیں اور بمبئی جیسے شہر کے ہجوم میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ جب تک میراجی اپنے مجاہدے سے فارغ ہوتے، اس قوم نے اپنی ہستی کی بقا کا مسئلہ حل کرلیا جس کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ اس کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ اور میراجی کے دوست، دانشگردی کی بیروزگاری کو میراجی ذاتی مسئلہ سمجھتے تھے۔ پاکستان کے مرکز اطلاعات و نشریات کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔

پاکستان کا قیام میراجی کے ہاں ایک بہت بڑا جذباتی تجربہ بن گیا اور انھوں نے قیوم نظر کو لکھا:

"یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ میرا دل اس آتشیں ہنگامے سے متاثر ہوکر حیاتِ تازہ سے ایک بار پھر زندگی کی کشمکش کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوا ہے۔"[1]

یہ حیاتِ تازہ میراجی کو بمبئی کے تاریک غار سے باہر اور دنیا کی روشن فضاؤں سے رابطہ قائم کرنے پر اکساتی ہے۔ "خیال" منظرِ عام پر آتا ہے اور میراجی "قدِ آدم"، "سلسلۂ روز و شب"، "یگانگت"، "تنہائی" اور "عدم کا خلا" جیسی نئی نظمیں تخلیق کرتے ہیں۔ یہ نظمیں اس قدر نئی ہیں کہ خود میراجی کے ہاں رنگِ تازہ کی نمود کی مثال ہیں۔ ان میں حرف و معنی، ہر دو اعتبار سے میراجی کے ہاں ابتدائی ہندی نواز شاعری سے عجمی اسلامی شعری روایت کی طرف گریز کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ اس دور میں میراجی نہ صرف نئی پابند نظمیں اور غزلیں کہتے ہیں بلکہ پرانی پابند نظموں اور غزلوں کو شائع کرنے کے لئے بھی بے قرار نظر آتے ہیں۔ دامودر گپت کے ساتھ ساتھ عمر خیام کا ترجمہ بھی کرتے ہیں اور دامودر گپت کی نظم شائع کرتے وقت "خیال" کے اداریے میں یہ لکھنا نہیں بھولتے:

---

[1] "میراجی کے چند خطوط" از الطاف گوہر، مطبوعہ "نئی تحریریں" نمبر ۲

"داموودرگپت کی پیروی میں آج ہم ایسی چیز ہرگز نہ کہیں گے لیکن ایسی چیز پڑھیں گے ضرور تاکہ ہماری دنیا میں وہ ماحول ہی نہ بننے پائے
جو محض لذت کو حیات بناتا ہے۔"

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں گھر یاد آنے لگتا ہے، ماں کی آواز سنائی دیتی ہے:

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے
مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
کبھی ایک پل کو، کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی
ندا آ رہی ہے
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید
تھکے گا
"مرے پیارے بچے" "مجھے تم سے کتنی محبت ہے" "دیکھو
اگر یوں کیا تو برا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہوگا"
"خدایا خدایا!"
کبھی ایک سسکی، کبھی اک تبسم، کبھی صرف تیوری
مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
انہی سے حیاتِ دو روزہ ابد سے ملی ہے
مگر یہ انوکھی ندا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
یہ ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیے جا رہی ہے
(سمندر کا بلاوا)

یہ وہ زمانہ ہے جب میراجی کا جسم جواب دے چکا تھا اور وہ "کتاب پریشاں" کے عنوان سے ہمیں اپنے ادبی، فنی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی نظریات سے روشناس کرانے کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اور لاہور آ کر اپنا علاج کرانے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ مگر ان کی بجائے صرف یہ خبر[1] لاہور پہنچ سکی کہ بسترِ مرگ پر دم توڑتے ہوئے میراجی کے ہاتھ میں جو کتاب تھی اُس کا نام ہے: The Defeat of Baudelaire
(بودلیئر کی شکست)

---

[1] میراجی کے آخری لمحات" از اختر الایمان "شبیہ" نقوش نمبر

منیر احمد شیخ

تنقید کی اخلاقی اقدار

نظریاتی تنقید کے بنیادی مسائل میں اخلاقی اقدار کے تعین کا مسئلہ ایک مدت سے یورپ میں ادبی تنقید کا دلچسپ موضوع رہا۔ ہمارے ہاں تنقید کی روایت، خاص طور پر جدید تنقید کا انداز نظر مغرب کے تنقیدی نظریات کے زیر اثر مرتب ہوا۔ اردو ادب کے نقادوں نے جانچنے پرکھنے کے پیمانے مغرب ہی سے مستعار لئے اور نقد و نظر کا خالصتاً مشرقی نقطۂ نظر جو مشرق کی اخلاقیات سے پیدا ہوا تھا، محلِ نظر ٹھہرا۔ تنقید کے اخلاقی پیمانے معاشرے کے تہذیبی اور سماجی حالات سے جنم لیتے ہیں۔ مغربی تنقید کا نظریہ مغربی معاشرے کی تہذیبی اقدار کا حامل ہے اور مشرق کے جانچ پرکھ کے پیمانے مشرق کی مخصوص تہذیبی روایت سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں جدید تنقید نے یہ ٹریجیڈی عرصے سے اردو ادب کے ساتھ روا رکھی ہوئی ہے کہ ایک مختلف معاشرے کی تنقیدی اقدار کو جوں کا توں اٹھا کر ایک مختلف معاشرے کے ادب پر عاید کر دی جاتی ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ نہ صرف نادانی کی بات ہے بلکہ ایک لحاظ سے جہالت اور گمراہی کی دلیل ہے۔ ہمارا اپنا اخلاقی نقطۂ نظر جو مشرق کی بصیرت سے نکلا ہے۔ کم از کم تنقید کی حد تک شعر و ادب کی پہچان میں سراسر غائب نظر آتا ہے۔

مولانا حالی سے پہلے اردو تنقید، ادب کی ایک الگ صنف کی حیثیت نہ رکھتی۔ تاہم شعر و ادب کی جانچ پرکھ کا ایک انداز ضرور تھا، یہ تنقید شعر کے رستے سے، خطوط کے ذریعے یا تذکروں میں کسی نہ کسی صورت موجود تھی، اگرچہ کسی شاعر ادیب کا کوئی مکمل اور تفصیلی جائزہ ان میں نہ ہوتا تھا مگر اشاروں اور رمز و کنایہ میں تنقیدی آراء کا اظہار ضرور ہوتا تھا۔ اس دور میں تنقید ذات سے الگ نہ تھی یعنی رائے دینے والے کے یہاں پہلے سے کوئی بندھے ٹکے نظریات نہ ہوتے تھے۔ جن کی روشنی میں وہ ہمعصر تخلیقات کو جانچتا۔ تنقید ابھی تک پیشہ نہیں بنی تھی اور کسی شاعر کے بارے میں گفتگو کرنے والے اُس کی ذات کو اُس کے کلام سے الگ نہ کرتے تھے بلکہ اکثر اوقات تو جانچ پرکھ میں ذاتی تعصبات یا کبھی کبھی تعلقات بھی در آتے تھے، وہ تنقید شاعر کی پوری شخصیت اور اُس کے کلام پر تبصرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ ایک لحاظ سے خوبی بھی تھی اور ایک لحاظ سے کمزوری بھی۔ خوبی ان معنوں میں کہ تنقیدی اخلاقیات مبنی بنائے اصولوں اور نظریات کی محکوم نہ تھی۔ شاعر اور اس کا کلام مل کر ایک تہذیبی علامت بنتے تھے اور ایک زندہ روایت کا متحرک عنصر۔ خرابی کی بات صرف یہ تھی کہ بعض اوقات تعصبات اور معاصرانہ چشمک کلام کی خوبیوں کو سامنے نہ آنے دیتے۔

اردو تنقید میں تعصب اور چند مروجہ اخلاقی نظریات نے ایک مدت تک ادبی روایت میں نئے عناصر کو تسلیم نہ کیا۔ نظیر اکبر آبادی اس ضمن میں خاص مثال ہیں۔ اُن کی شاعری جو ادب کی مروجہ روایت سے الگ تھی، تنقید ادب کے مروجہ اخلاقی نظام کی نذر ہو گئی۔ یوں کہئے کہ تنقید ادب کا ایک اخلاقی نقطۂ نظر روایت سے انحراف کا متحمل نہ ہو سکا اور ایک اچھے بھلے باندار شاعر کو تاریخ ادب کی اخلاقیات نے شہر بدر کر دیا۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا تنقیدِ ادب میں صرف خارجی پیمانے ہی ہونے چاہئیں یا اس میں داخلیت کی بھی کچھ نہ کچھ کارفرمائی ضروری ہے۔ یہ مسئلہ تنقید کا

اہم بنیادی مسئلہ ہے اور اس معاملے میں محض داخلیت اور محض خارجیت کی دو انتہائیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس معاملے میں ہمیں تخلیق ادب کے نظریے کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ "تخلیق ذات سے شروع ہوتی ہے"۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی حوالے کے بغیر ادب، ادب نہیں بنتا لفظی بازی گری رہ جاتا ہے۔ ذاتی حوالے سے میری مراد ادیب کی ذہنی ذات اور اس کے اردگرد کی فضا ہے جس میں وہ جیتا ہے اور اس کے وہ مسائل ہیں جن کا اسے سامنا کرنا پڑتا ہے یہ مسائل تہذیبی، اقتصادی اور تاریخی عوامل سے وجود میں آتے ہیں اور ادب کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر انہی مسائل میں سے پیدا ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری کو اس کے تہذیبی تاریخی اور اقتصادی پس منظر بغیر پڑھیے اور دیکھیے کہ پڑھنے والے کے حصے کیا آتا ہے؟ یہ صرف غالب ہی کی بات نہیں، ہر ادبی کسوٹی لکھنے والے کے دور ہی میں موجود ہوتی ہے، اسے اپنے دور سے الگ نہیں کیا جا سکتا یعنی تنقیدی اقدار کی ترتیب میں ادیب کا ذاتی حوالہ ابدی ہے۔ دور کے تخلیقی شعور کو سمجھنے میں بہت اہم ہے۔ ایک دور کا انفرادی اور اجتماعی شعور تخلیقِ ادب کے راستے سے اظہار پاتا ہے اسی لئے ادب اپنے دور کا آئینہ کہا جاتا ہے کہ اس میں پورے عہد کی جذباتی اور ذہنی کشمکش اور اس کے اخلاقی تقاضے موجود ہوتے ہیں۔ یہ ایک دور کا ذاتی حوالہ ہے، چنانچہ جس طرح تخلیقِ ادب میں ذات تخلیق سے جدا نہیں ہوتی اسی طرح اس کے پرکھنے کے معیار متعین کرتے وقت لکھنے والے کی ذات اور اس کے زمانے کا شعور تنقیدی اقدار کا لازمی حصہ ہوتا ہے تخلیقِ ادب اور تنقیدِ ادب دراصل ایک ہی اخلاقی نظام کے تابع ہوتی ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ادب کی تخلیق تو ایک اخلاقی نظام کے تحت ہو رہی ہے اور اس کی قدر و قیمت کے معیار ایک اور اخلاقی نظام سے متعین ہوں۔ یہی اخلاقی قدریں باہم اخلاقی نظام ہی پیدا کرتا ہے اور یہیں سے اس دور کے ادبی شعور کی بنا پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا قدیم طرزِ تنقید، جدید طرزِ تنقید سے افضل ہے کہ وہ اس شعور سے عاری نہیں۔

میں نے شروع میں مولانا حالی کا حوالہ دیا تھا کہ اردو تنقید میں انھوں نے ایک باقاعدہ شعوری سطح پر ادب کو جانچنے پرکھنے کے معیار متعین کرنے کی طرح ڈالی۔ حالی اگرچہ اسی دور سے تعلق رکھتے تھے جس میں تذکرہ نویسی تنقیدِ ادب کا موثر ذریعہ تھی، مگر انھوں نے بھی خالصتاً داخلی معیارات کو شعر و ادب کے لئے کافی نہ سمجھا اور کچھ خارجی پیمانے بھی بنائے جو ان کی شاعری کی طرح اخلاقیات کے چند مخصوص سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ہر چند کہ تنقیدِ ادب میں اخلاقی اقدار کا تعین کوئی گالی نہیں لیکن ہمارے جدید ناقدین نے مولانا حالی کی اخلاقیات کو نشانہ بنایا اور ان کی شاعری اور ان کی تنقید اسی حوالے سے زیرِ عتاب رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی نے اردو تنقید میں جس نئے دور کی بنیاد رکھی وہ خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلی عناصر کی یکسر نفی نہیں کرتا۔ اگر ایسی بات ہوتی اور وہ ذاتی پسند اور ناپسند کو تخلیقِ ادب میں آلۂ نہ سمجھتے تو یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی اور حیاتِ جاوید جیسی کتابیں نہ لکھی جاتیں۔ مولانا حالی کا کام یہ ہے کہ انھوں نے ذاتی تعصبات کے عناصر کو تنقید میں ختم کیا اور چند خارجی معیاروں کی طرف اشارے کئے کہ تنقیدِ ادب کو انہی معیاروں پر اپنی عمارت تعمیر کرنا تھی تاکہ یہ ایک الگ صنف کی حیثیت سے پہچانی جا سکے۔ ان کام کا فائدہ یہ ہوا کہ حالی کے بعد محض ادب ہی نہیں، ادیب کی ذات بھی موضوعِ ادب بن گئی۔ جدید تنقید میں ادیب کے تہذیبی و اقتصادی پس منظر کے علاوہ اس کے نفسیاتی تجزیئے بھی ہونے لگے اور نفسیاتی تنقید بھی نقد و نظر کا ایک جزو قرار پائی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ناقدین علم النفسیات کے کچے پکے شعور کی وجہ سے بہت سی برائیاں کر جاتے ہیں اور ادب و شعر کو لیے گور کھ دھندوں میں لے جاتے ہیں کہ ادبی ذوق کی تربیت کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہے

بہرحال اب آہستہ آہستہ بات یہاں تک پہنچی ہے کہ ادبی تنقید بہت سے اخلاقی نظریات میں سے گزرتی ہوئی ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں ادیب کی ذات اور اس کا ادب لفظِ معظم کے چکر سے نکل آئے ہیں۔ اب لکھنے والے کا پورا تجزیہ، اس کی گرائیں اور اس کی کمزوریاں نیز ادبی شعور کے لئے اتنی ہی اہم ہو گئی ہیں جتنی کسی زمانے میں اس کی خوبیاں، نیکیاں اور تقدس اہم ہوا کرتا تھا۔ جدید تنقیدِ ادب، ادیب کے احترام سے ہٹ کر نکل کر حقیقت پسندی کے زیادہ قریب ہو گئی ہے۔ اب اخلاقی قدریں جدید اقتصادی، سماجی اور نفسیاتی عناصر ہی کے زیرِ اثر مرتب ہوتی ہیں اور انہی کے حوالے سے نئے ادبی محاکمات دیکھتے ہیں

آنے لگے ہیں۔

ہماری ادبی نگارشات کو جانچنے پرکھنے کے مغربی معیاروں کے سلسلے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ ہمارے جدید لکھنے والے فنِ تخلیق میں مغرب ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ مثلاً فنِ افسانہ نویسی ہے۔ ۱۹۳۵ء کے بعد کی پود مغرب کی دی ہوئی لائنوں پر ہی کہانی کے خطوط بناتی رہی گویا ان سب کے پیرو مرشد امریکہ، فرانس، انگلستان اور روس ہی تھے۔ منٹو کی مثال اس ضمن میں دی جاتی ہے کہ اس نے آوسکر وائلڈ اور موپساں کے تتبع میں لکھا چنانچہ منٹو کے افسانوں کو پرکھنے کے اصول بھی وہی ہوں گے جو مغرب میں رائج ہیں۔ یہ استدلال بظاہر بہت اپیل کرتا ہے اور الزام کو ناقدین سے ہٹا کر ادیبوں کے سر پر تھوپ دیتا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ اعتراض صرف تکنیک کے تتبع کی حد تک درست ہے۔ اُردو افسانہ تکنیک کے اعتبار سے مغرب کی افسانہ نویسی کی روایت میں لکھا گیا لیکن اردو افسانے کے موضوعات اور ان کی بُنت مشرق ہی کے ماحول میں ہوئی۔ ان میں تمام تر جذباتی اور ذہنی مسائل اپنے یہاں کے انفرادی اور اجتماعی مسائل ہیں۔ ہمارے افسانہ نگاری کی تحریک کا مرکز مغرب نہیں مشرق ہی رہا ہے اور اسی پس منظر میں لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیتوں نے جنم لیا ہے۔ لہٰذا اپنے افسانے کے خالصتاً مشرقی موضوعات، کو محض اس لئے مغربی پیمانوں سے ناپنا کہ ان موضوعات کو برتنے میں مغربی افسانے کی تکنیک کو استعمال کیا گیا ہے کچھ صحیح طرزِ عمل نہیں ہے۔

تنقید کی اخلاقی اقدار کے سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جدید ناقدین کو کوئی ادبی محاکمہ دینے سے پہلے اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ہے کہ لکھنے والوں نے اپنے دور کی اخلاقی قدروں کو کس حد تک قبول کیا اور کس حد تک رد کیا۔ رد و قبول سے اس عہد کے لکھنے والوں کی جذباتی اور شعوری کیفیات کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مخصوص وقت میں ادبی رخ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ لکھنے والوں نے مروجہ اخلاقی قدروں کو کبھی جوں کا توں قبول نہیں کیا ان سے بغاوت کی ہے یا ان میں تبدیلیاں لائے ہیں۔ بغاوت کی صورت میں ادیب کو مروجہ اخلاقی اقدار کے مقابلے میں ایک دوسرا اخلاقی نظام پیش کرنا پڑتا ہے جیسے مارکسی ادیبوں نے روحانی اقدار کے متبادل مادی اقدار کی اخلاقیات کا نظام پیش کیا۔ یہ متبادل اور مخالف قوتیں، اخلاقیات کی شکست و ریخت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ادبی رجحانات انہی قوتوں کے حوالے سے جانچے اور پرکھے جاتے ہیں۔ مروجہ اخلاقی نظام کو من و عن قبول کرتے ہیں لکھنے والا ایک جامد روایت کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے اور اپنی انفرادیت قائم نہیں رکھ پاتا۔ روایت اسی طرح آگے بڑھتی ہے کہ اس میں سے مردہ حصوں کو رد کر دیا جائے اور زندہ اور جاندار حصوں کو قبول کرکے انھیں آگے چلایا اور بڑھایا جائے

ممتاز احمد

اقبال کا اصل کارنامہ

یہ مضمون یقیناً مصنف کے وسیع اور گہرے مطالعے کا نتیجہ ہے اور اقبالؔ کے کارناموں کو ایک نئے زاویے سے سمجھنے کی عمدہ کوشش ہے، مگر ہماری رائے میں مصنف نے سرسیدؔ کی تحریک کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ محلِ نظر ہے۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی مزید بحث کا مستحق ہے کہ اقبالؔ نے فقہ اور اسلامی الٰہیات کی تشکیل کے سلسلے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا انور شاہ کے علاوہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی بھی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس مضمون کا آخری فقرہ بھی ایک مفید اور تعمیری بحث کا موضوع بن سکتا ہے۔

اہلِ قلم سے اور خاص طور سے ماہرینِ اقبالیات سے گزارش ہے کہ وہ اس مضمون کو مذاکرے کا موضوع قرار دے کر اپنے ارشادات سے "فنون" کو نوازیں ——— ادارہ

ایک فرانسیسی نقاد کا قول ہے کہ ہر بڑا شاعر اپنے زمانے سے بلند بھی ہوتا ہے لیکن اپنے زمانے کے چیلنج کا جواب بھی ہوتا ہے۔ یہ بات دُنیا کے دوسرے شاعروں کی طرح اقبال کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ پس ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اقبال کے فکر و فن کو سمجھنے کے لئے اُن حالات کو بھی نگاہ میں رکھیں جو ان کے دور میں برصغیر اور برصغیر سے باہر کی دنیا کی تشکیل میں ایک اہم حصّہ ادا کر رہے تھے۔ ان حالات کے حوالے سے ہی اقبالؔ کا اصل کارنامہ اپنی واضح ترین صورت میں سامنے آ سکتا ہے۔

آج بیسویں صدی کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر جب ہم اس صدی کے آغاز میں برصغیر اور دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی حالت پر دوبارہ نظر کرتے ہیں تو ہمیں اقبالؔ کے ساتھ ہمنوا ہو کر یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں برصغیر میں مسلمانوں کا بچا کھچا سیاسی اقتدار بھی ختم کیا جا چکا تھا، اور انگریز پوری طرح ہندوستان کے سیاہ و سپید کے مختار بن چکے تھے تاہم مسلمانوں کا معاشی و مادی ابتلاء کا شکار ہو جانا کوئی اتنا بڑا حادثہ نہ تھا جو بطورِ امت کے اُن کے اجتماعی شعور میں بنیادی تبدیلیوں کا سبب بنتا۔ اس طرح کے حادثات قوموں کی زندگی میں ہوتے ہی رہتے ہیں اور زندہ قومیں بحرانوں سے مضمحل اور ضعیف نہیں ہوتیں بلکہ انہیں اپنی قوت و شوکت کے لئے ایک چیلنج سمجھ کر عروج کے لئے بحرانوں کو بطور زینے کے استعمال کرتی ہیں۔ اصل حادثہ اور اصل المیہ معاشی و مادی نقصانات کے علاوہ تھا اور وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے اختتام اور انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے آغاز کی درمیانی مدت میں مسلمانوں کے اندر کوئی ایسا بالغ رشید پیدا نہیں ہوا جو ایک کی تعمیر اور دوسرے کی تخریب کے اصل وجوہ سے باخبر ہوتا اور تہذیبی انتشار کی اس فضا میں مسلمانوں کیلئے

ایک ایسا لائحہ عمل تجویز کرتا جو انھیں غیر ملکی استحصال کے خلاف سینہ سپر ہونے اور دینِ حق کا علمبردار ہونے کی راہ دکھاتا۔ برعکس اس کے اس دور میں مسلمانوں کے اندر سے جو افراد اٹھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو انگریز کی سیاسی غلامی سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا بلکہ تہذیبی دائرے میں بھی ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کی۔ سرسید اور ان کے رفقا کی کوششوں سے اس دور کے مسلمان نوجوان کو ڈگری اور اس ڈگری کے نتیجے میں کلرکی اور پھر اس کے نتیجے میں ڈبل روٹی تو حاصل ہو گئی لیکن یہ نوجوان اس انقلابی روح سے محروم ہو گیا جو ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے لئے مہمیز بنتی تھی۔ میکالے نے کہا تھا کہ ہم ہندوستان میں ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج کریں گے جو نام کے مسلمان تو باقی رکھے گا لیکن ان کی روح انگریزوں جیسی ہو گی۔ سرسید نے کہا کہ ایک غیر قوم ہمارے نوجوانوں کا جھٹکا کیوں کرے، ہم خود ہی انھیں ذبح کئے دیتے ہیں، چنانچہ علی گڑھ تعلیمی تحریک نے جو نسل تیار کی وہ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم اور زندگی کے ہر دائرے میں مغربی تہذیب کی مقلد تھی۔

دوسری طرف مسلمان قوم کی سب سے زندہ جاندار، بھرپور اور عمل کے میدان میں سرگرمِ کار رکھنے والی روایت جہاد تھی جسے انگریزوں کے اقتدار کے مستقل تحفظ کی خاطر ختم کرنے کی بھی ایک کوشش کی گئی۔ اس سیاسی و تہذیبی انتشار نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جس طرح غلبہ پایا وہ یہ تھا کہ ایک طرف تو سیاسی فلسفے پر مغرب کا پوری طرح غلبہ ہو گیا اور مغربی تصورِ قومیت اور لادینی جمہوریت مسلمانوں کے آئیڈیل قرار پائے۔ دوسری طرف معاشرتی شکلوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں عمل میں آنے لگیں۔ لباس، رہن سہن، زبان ہر چیز پر مغربیت کا غلبہ ہو گیا اور مادیت نے اخلاقی اور روحانی اقدار کی جڑیں ہلا دیں۔ ان حالات نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے برصغیر کے مسلمانوں میں تہذیبی انتشار کی جو کیفیت پیدا کرنی شروع کر دی تھی اس کا نتیجہ اقبال ہی کے ایک شعر میں یہ تھا:

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

برصغیر سے باہر مسلمانوں کی حالت اس سے کچھ بہتر نہ تھی۔ ایران میں رضا شاہ اور افغانستان میں امان اللہ خاں کی آمریت مسلط تھی، عرب دنیا مغرب کے سیاسی استحصال کے آگے دم توڑ رہی تھی اور ترکی میں مصطفےٰ کمال اوجِ ثریا کی قربت کا عزم رکھنے والی قوم کو مغرب سے قریب ہونے کا حکم دے رہے تھے۔ عالمِ اسلام کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک اور بالخصوص مغربی ممالک بھی وطنی قومیت کے متعصبانہ نظریئے کی پیروی کے نتیجے میں ایک بڑی جنگ کے غار کے دہانے پر کھڑے تھے۔ طبیعی علوم میں نئے نئے انکشافات قدیم نظریاتی سانچوں کو ڈھا کر ایک نئی دنیا کے طلوع کی خبر دے رہے تھے۔ فکر کی دنیا میں کانٹ چھانٹ کا ایک وسیع سلسلہ جاری تھا۔ فرد کی بے قید آزادی کے ردِعمل کے طور پر اشتراکی اور فاشی نظریات جنم لے رہے تھے۔ غرضیکہ تعمیر و تخریب کا ایک وسیع سلسلہ تھا جو سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جن کے درمیان اور جن کے مقابلے میں اقبال نے اپنی فکر کا چراغ روشن کیا۔ اقبال خود مشنری اسکول اور مغرب کے تعلیمی اداروں کے تعلیم یافتہ تھے لیکن ان کے دل و نگاہ مسلمان تھے اور مغربی افکار کا وسیع و عمیق مطالعہ کرنے کے باوجود وہ اس دور کے دوسرے نوجوانوں کی طرح اس کے طلسم کا شکار نہ ہو سکے۔ اسلام کے عالمگیر پیغام نے ان کے دل میں اس طرح گھر کر لیا کہ پھر اس کے بعد ان کی شاعری اسلام اور مسلمانوں کے شعور ملی کی ترجمان بن گئی۔ مغرب میں ایک نئے دور کی تعمیر اور مغربی ممالک کی مادی ترقی جہاں دوسرے مسلمانوں کو مرعوب اور مسلمانوں کے اندر پیدا ہونے والی اجتماعی انتشار کی کیفیت انھیں مایوس کر رہی تھی، وہاں اقبال ان حالات سے مایوسی کے بجائے رجائیت کا سبق لیتا ہے اور علی وجہ البصیرت اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ حالات مسلمانوں میں ایک بڑی تبدیلی کا سبب بننے والے ہیں:

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

دیکھ چکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں — جس نے نہ چھوڑے کہیں عہدِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی، عصمتِ پیرِ کنشت — اور ہوئی عقل کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد، کہنہ پرستی سے پیر — لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اسلام کے لئے اقبال کے دل میں بے پناہ تڑپ اور ایک شدید جذبہ موجود تھا لیکن ابتدا میں اس جذبے نے باقاعدہ ایک آئیڈیالوجی کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اسلام کو بطور ایک آئیڈیالوجی کے پیش کرنے کا آغاز اُن کی "بانگِ درا" کی آخری طویل نظموں "شکوہ"، "جوابِ شکوہ"، "طلوعِ اسلام" اور "شمع و شاعر" سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد کا دور، اُن کی فکر کی تشکیل کا دور ہے جس میں وہ اسلام کو بطور ایک عالمگیر صداقت اور مکمل نظریۂ حیات کے سامنے لاتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جس میں اُنھوں نے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنی فکر کے اظہار کے لئے شعر ہی کو ذریعہ بنانا کیوں پسند کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی بنیادی ایمانیات تو اپنی خالص شکل میں موجود تھیں لیکن اُن کا خیال تھا کہ بطور امتِ وسط کے، مسلمانوں پر جو فرائض عائد کئے گئے تھے اور تاریخِ عالم میں امت کو جس مشن کی تکمیل کرنی تھی، ان فرائض اور مشن کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا اصل مرض بے عملی، جمود اور سکون کا مرض تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان اس وقت تک دوسروں کی سیاسی اور فکری غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنی ایمانیات کا ایک گہرا، مضبوط اور اٹوٹ رشتہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے استوار نہ کریں۔ گویا مسلمانوں کو اس وقت ایمان کی ضرورت نہیں تھی بلکہ سرچشمۂ ایمان سے زندگی کو متحرک کرنے والے پیغام کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ زندگی بخش اور حرکت و جدوجہد پر اُبھارنے والا پیغام فکری بحثوں سے نہیں بلکہ جذباتی اپیل کے ذریعے ہی پہنچایا جا سکتا تھا اور یہ جذباتی اپیل صرف شعر ہی میں ممکن ہے۔ التشبیہ بلا مشبہ، یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہئے کہ قرآن پاک گو شعر تو نہیں لیکن شعری نثر کا وہ اعلیٰ ترین نمونہ ضرور ہے جو آج تک انسان نے دیکھا ہے۔ قرآن پاک کی اس شعری نثر سے تفلسف کے بجائے عملیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی آیات پڑھ کر آدمی کو منطقی اور عقلی نکتہ طرازیوں کی نہیں سوجھتی بلکہ اس کے دل میں کچھ کر گزرنے کا عزم بیدار ہوتا ہے۔ اقبال نے بھی مسلمانوں کو حرکت اور جدوجہد پر اُکسانے کے لئے اپنے محدود انسانی دائرے میں اس اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی۔

"اسرارِ خودی" فرد کی بازیافت، "رموزِ بے خودی" امت کی بازیافت کی نہایت کامیاب کوششیں ہیں۔ ان میں اقبال نے اپنے نظریۂ خودی اور بے خودی کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ رائج الوقت تصوف پر، جو مسلمانوں کو بے عملی اور رہبانیت کی طرف لے جا رہا تھا، تنقید کی۔ اُن انفرادی اور اجتماعی صفاتِ عالیہ کی نشان دہی کی جو حالات کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو [illegible] تھیں۔ ساتھ ہی اسلام کو انسان کے وضع کئے ہوئے باطل نظریات پر غالب کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد پر زور دیا۔ اقبال کی فکر میں یہی دو کتابیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ اُن کے دوسرے مجموعوں میں انہی کے خیالات کو مزید توضیح و تشریح کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اقبال نے بتایا کہ اسلام کا مقصد

زندگی کو جامد اور ساکن کرنا نہیں بلکہ متحرک اور سرگرمِ کار رکھنا ہے اور جد و جہد اور کشمکش کے شعلوں کی آنچ ہی میں زندگی تخلیقی، موثر اور فعالی عناصر کو پروان چڑھا سکتی ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش — ز خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

اقبال کی اس انقلابی دعوت اور جذباتی اپیل کو بہت جلد ہی اپنے اظہار کا موقع مل گیا۔ خلافت تحریک برصغیر پاک و ہند میں اس جوش و خروش سے اٹھی کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس تحریک کے بہت جلد ہی ناکام ہو جانے سے جو دور رس اثرات مسلمانوں پر مترتب ہوئے، وہ بھی کچھ کم نقصان دہ نہ تھے۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی نے پوری مسلمان قوم کو مضمحل اور مایوس کر دیا۔ انتشار اور تہذیبی خلا کی اس کیفیت نے اقبال کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنے طریقِ علاج پر Re thinking کرے۔ خلافت تحریک سے اقبال نے جو سبق سیکھا اس کے مطابق اس نے جذبات سے قوم کو اٹھانے کے ساتھ ساتھ بیان کی قوت پر بھی زور دینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد سے اقبال مسلمانوں کی فکری بنیادوں کی مضبوطی کے لئے ٹھوس کام کا آغاز کرتے ہیں۔ نئے کام کے آغاز میں سب سے زیادہ اہمیت وہ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی مسئلے کو دیتے ہیں، متحدہ قومیت کے نظریے پر ضرب کاری لگاتے ہیں اور ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں مسلمانوں کے تہذیبی تشخص کے تحفظ کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی وہ دوسرا اہم کام جو انجام دیتے ہیں، وہ فقہ اور اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ نو کا کام ہے۔ اس کے لئے وہ سید سلیمان ندوی، مولانا انور شاہ کاشمیری اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دور میں اُن کا اہم ترین کام ان کے وہ خطبات ہیں جو بعد میں تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے شائع ہوئے۔ ان خطبات کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ان میں اقبال نے مذہبی تجربے کو وجدان سے بلند ہو کر سائنسی تجربے کی اصطلاحات میں بیان کیا، اسلامی فکر کے بعض پہلوؤں کی نہایت حکیمانہ انداز میں تشریح کی اور اس بات پر زور دیا کہ دین و دانش، مذہب و سائنس میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اسلام کی الٰہیاتی فکر کی تدوینِ نو اور اسلامی فقہ کی تشکیلِ جدید کے سلسلے میں اقبال کی کوششیں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کم از کم فقہ کی تدوینِ نو کی ضرورت کا احساس تو انہیں اسی وقت ہو گیا تھا جب انھوں نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک دوست کے مطابق اگر اقبال زندہ رہتے اور پاکستان کے سربراہ بنتے تو چھٹے خلیفۂ راشد کہلاتے کیونکہ دیکھا جائے تو اس وقت عالمِ اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ ہی خلافت کی بازیافت ہے۔ آج مسلم ممالک میں بادشاہت، آمریت، جمہوریت، سب کچھ ہے لیکن خلافت کہیں نہیں ہے۔ اقبال نے اس کام کو اپنی عمر کے بالکل آخری حصے میں شروع کیا تھا۔ افسوس کہ عمر نے انہیں مہلت نہ دی اور یہ اہم کام ادھورا اور غیر منظم رہ گیا لیکن اقبال جو کام کر گئے تھے، بعد میں اُٹھنے والی تحریکوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اگر اقبال کے کارنامے کے دو حصے کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ اقبال کی جذباتی اپیل سے قائد اعظمؒ نے اور اقبال کی فکری تحریک سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے احیائے اسلام کے کام کو آگے بڑھایا۔

ڈاکٹر نبی ہادی

اکبرِ اعظم کا دوسرا ملک الشعراء — شیخ فیضی

— ۲ —

اس بات کو خاطر میں رکھنا پڑے گا کہ یہ پوری نسل تیموری دور کے فنونِ لطیفہ کی وارث تھی۔ تیموری شاہزادوں کی بدولت جمالیات اور زیبائی سے تعلق رکھنے والے تمام ہنر ہرات، کابل، بدخشاں اور خراسان کے مختلف شہروں میں پروان چڑھے تیموری عہد کے مشہور شاعر جن کے نغموں نے بعد کی نسل کے ذوقِ سخن کو تربیت دی، فغانی، ہلالی چغتائی، امیر شاہی سبزواری، وحشی یزدی وغیرہ شمار ہوتے ہیں۔ فغانی نے تمام شاعروں پر بلاشبہ گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ایران کے بعد معاصر دانشوروں کے نزدیک فغانی غزل کے جداگانہ مکتب کا بانی ہے اور مغل عہد کے سارے شاعر اسی مکتب کے پروردہ ہیں۔ مگر دوسرے شاعروں کی دی ہوئی روایات کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ہلالی چغتائی کی ایک غزل پوری نسل کے ذہنی رجحانات میں منعکس نظر آتی ہے۔ ابوالفضل کشمیر کے عبادت خانے کے لئے کتبہ لکھتا ہے اور اسی غزل کا سہارا لے کر عبارت تراشتا ہے:

"پروردگارا بہر جائے کہ می روم جویائے تو اند و بہر خانہ کہ می نگرم گویائے تو:

اے تیرِ غمت را دلِ عشاق نشانہ — خلقے بتو مشغول تو غائب زمیانہ
گہ معتکفِ دیرم و گہ ساکنِ کعبہ — یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ"[1]

اس غزل کا ایک اور شعر ہے:

مقصودِ من از کعبہ و بتخانہ توئی تو — مقصود توئی، کعبہ و بت خانہ بہانہ

وحشی یزدی ایک طولانی ترجیع بند کہتا ہے۔ ہلالی کی غزل کا تاثر اور انعکاس صاف نمایاں ہے: (۱) شاعر کی انانیت بلبل کے پیکر میں عشق و محبت کے جہان کی سیر کے لئے پرواز کرتی ہے اور تیرِ غم کا نشانہ بن جاتی ہے۔ (۲) دنیا کے تماشے سب قصے ہی قصے ہیں کس کے زمانے میں کیا ہوا کون جانتا ہے اور کون سنتا ہے):

جز عشق و محبت گنہم چیست کہ کردم — "اے تیرِ غمت را دلِ عشاق نشانہ"
بلبل ہدفِ تیر نمودن کہ پسندند — خاصا کہ بود بلبلِ مشہورِ زمانہ
در دور کہ بود دست و کہ یکبار شنود ست — تاریخ زماں ہست فسانہ بفسانہ

کامل جہرمی جہانگیری عہد کا شاعر ہے۔ وہ بھی اپنے مضمون کے لئے یہی قافیے مستعار لیتا ہے۔ افکار اس کے شخصی تجربے کا نتیجہ ہیں ۔

---

[1] ملاحظہ ہو: تعین مقدمہ آئین اکبری بحوالہ تذکرہ ذرا النشعرہ تالیف محمد عسکری حسینی بلگرامی۔ ص ۵۵

اس کے ذہن میں ایک ایسی ناگوار دنیا کی تصویر ہے جہاں کوئی کسی کا نہیں سب حرص و ہوس کے دیوانے ہیں۔ مگر زیادہ کا لہجہ اس سے زیادہ شیریں اور دلکش کیا ہوگا:

از حرص و اہل ہست جہاں زاہل زمانہ　　پُر عربدہ و شور چو حمّام زنانہ
خود حامیٔ خود باش کہ کس را غم کس نیست　　ما اہل زمانہ ست ہمہ عذر و بہانہ
از اہل جہاں ہیچ تمتع نتواں یافت　　گفتم بتو ایں حرف کہ تیراست و نشانہ[1]

مندرجہ بالا اشعار یہ دکھانے کے لئے انتخاب کئے گئے کہ مغل دور کی روشن فکر جماعت کا ذہنی رجحان کس طرف تھا۔ ان اشعار میں تنگ اور جامد تصورات کو مسترد کرنے کا اشارہ موجود ہے۔ کعبہ اور بت خانہ دونوں کو حقیقت تک رسائی کا وسیلہ کہا جا رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان لوگوں کے پاس زندگی کا ایک عرفان اور ایک بصیرت نظر آتی ہے۔ ان کی نظر میں دنیا کے تمام انقلابات انفرادی ہوں یا اجتماعی، ایک عبرت انگیز فسانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ بے اعتقادی اور تشکیک کے مرحلے سے چل کر یہ لوگ اعتقاد کی منزل تک رسائی میں کامیاب ہو جاتے ہیں

گفتم بتو ایں حرف کہ تیراست و نشانہ

دنیا کے ہر معاشرے میں بعض افراد کی مثال فضاؤں کے آوارہ شہاب کی سی ہوتی ہے جو بظاہر کون و مکاں کے نظام سے بالکل بے تعلق، بیگانہ اور آزاد گھومتے ہیں۔ ویسے ان کا کوئی قرینہ اور کوئی مقام و مدار نہیں ہوتا۔ مگر وہی لوگ اجتماعی خیالات کی تبلیغ کا سب سے موثر وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے آہنگ میں قلب روزگار کی دھڑکن کہیں زیادہ صاف سنائی دیتی ہے۔ نمونے کے طور پر اکبری عہد کا ایک شاعر جس کی بابت معاصرین کہتے ہیں کہ درویش بہرام کے نام سے مشہور ہے، کسی مخصوص جماعت اور مخصوص حلقے سے تعلق نہیں رکھتا۔ پورے ہندوستان میں آزادی سے سیاحت کرتا پھرتا ہے۔ انداز بیان کی بیباکی اور صفائی توجہ کے قابل ہے:

اساس پارسائی را شکستم تا چہ پیش آید　　سر بازار رسوائی نشستم تا چہ پیش آید
بترسا زادۂ دل دادم و سر رشتۂ دیں ہم　　دریں پیرانہ سر زنار بستم تا چہ پیش آید[2]

(۳)

فیضی کے سوانح میں ابوالفضل کی داستان حیات اس طرح پیوستہ اور مربوط ہے کہ دونوں کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں بھائی ایک ہی منزل مقصود کے رہ نورد اور نصب العین کے اعتبار سے ہر قدم پر ایک دوسرے کے شریک تھے۔ عقاید کی یکجہتی میں دونوں کا میدان ایک، البتہ طریقۂ کار میں دونوں کی روش جداگانہ۔ ایک بھائی سیاستدان اور مدبر تو دوسرا بھائی مفکر و شاعر کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا۔ ایک نے فلسفہ و شعر کے مشاغل میں زندگی بسر کی۔ دوسرا جہانبانی کے امور اور ملک گیری کے مسائل میں لگا رہا۔ مفکر کا منصب یہ ہے کہ نئے نظام کی جستجو، پرانے مسلمات کی تنقید، اور تازہ عقاید کی تشکیل میں مشغول رہے۔ اس کی شخصیت میں وہ پرانا آدم جلوہ افروز ہوتا ہے جو ہنوز جنت کی شاداب فضا سے باہر نہیں آیا تھا۔ زندگی کا نقشہ اور نصاب اس کے لئے صرف اتنا ہے کہ

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

صدیوں کی عقل و دانش کے معطر گلدستے ہر وقت اس کے چاروں طرف بکھرے اور پھیلے پڑے رہتے ہیں۔ کتابیں ایک لمحہ اس کا

---

[1] میخانہ۔ عبدالنبی فخر الزمانی ص ۵۰۴، مطبوعہ لاہور
[2] طبقات اکبری، نظام الدین احمد ص ۵۰۹ ج ۲

دامن نہیں چھوڑتیں۔ وہ بھی ان کی تنہا سا ندیم اور رفیق ہوتی ہیں، وہ رفیق جن سے دھوکے کا کوئی کھٹکا نہیں۔ جن کی صحبت میں آدمی تنہا نہیں رہتا اور جن کی خاموشی گفتگو سے زیادہ تازہ و رنگین ہے۔ فیضی ایک جگہ کہتا ہے کہ میرے ذہن میں افکار کی جگمگاہٹ اور فنون کی نکتہ ریزی کا یہ عالم رہتا ہے گویا چھلنی میں سے ستارے چھن رہے ہیں۔ یہ جگمگاہٹ مفکر کے اندیشے کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس میں آفاقی حقیقت اور لازوال سچائی محفوظ ہوتی ہے جو اندیشے کو لازوال زندگی بخشتی ہے:

کردہ ز فنون نکتہ ریزی   چہ ما یزن ستارہ بیزی

دوسری طرف سیاستدار کی ہستی ہے جو بھرپور انداز میں افتادہ آدم کے کرشمات کا مظہر ہوتی ہے۔ اس کے لئے زندگی عمل اور عمل زندگی کا نام ہے۔ ہر حادثہ اس کی زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کے افکار شیریں کلمات اور نازک اصطلاحوں میں ڈھلنے کے بجائے ٹھوس حادثات کی شکل میں ظہور کرتے ہیں۔ وہ اپنی توانائی سے واقعات کی صورت اور حادثات کی سمت متعین کرتا ہے۔ اس کی زندگی لمحۂ موجود کے ہنگاموں پر مرکوز ہوتی ہے اور نصب العین صرف یہ ہے کہ

حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

اس کی تدبیر اور کوشش کی آخری حد نوع بشر کے لئے امن و عافیت کی برقراری پر ختم ہوتی ہے۔ اور اس حد تک رسائی کے لئے ایک آہنی ارادہ اس کے پاس ہوتا ہے۔ مشکلات سے پنجہ آزمائی کرتا ہے اور ایک ہمت عالی جو طوفانی دریا کی طرح موجزن اور بے قرار رہتی ہے شیخ ابوالفضل اپنے بارے میں کہتا ہے کہ میں نے اپنے لئے گفتار کا دروازہ بند اور کردار کا دروازہ کھلا پایا: "چوں در گفتار بستہ دیدم درگاہ کردار کشادہ یافتم"[۱]

ابوالفضل ایک کامیاب مدبر اور انسانی مسایل کا زبردست دانشمند ہے۔ وہ پورا احساس رکھتا ہے کہ ملک گیری کے امور اور بہبودیٔ بشر کی راہ میں عمل اور عقیدہ دونوں کی درستی اور دیانت لازم ہے۔ اس کے بغیر ایک قدم بھی صحیح نہیں ہوتا۔ محض انسان کے ذریعہ معاشرہ خلل سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ خلق خدا عدل و داد کے بغیر عافیت کا منہ نہیں دیکھتی۔ خود غرضی اور خود پرستی اور تنگ نظری ایسے سنگین وزن ہیں جن سے معاشرے کے رشتے میں ہمیشہ تناؤ اور حد سے زیادہ کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے اور آخر یہی وزن رسی کو توڑ بھی دیتے ہیں۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ عملی امور کی پیچیدگی کہاں انسان کو راہ راست سے ہٹا دیتی ہے اور کہاں ٹھوکر کھلا دیتی ہے۔ وہ انفرادی لغزشوں سے درگذر کا قائل ہے اور کبھی افراد کو سرزنش کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس کا دل فرد کے لئے رحم و کرم کے احساس سے لبریز ہے۔ ایک موقع پر کہتا ہے: "آدمی زاد معجونے است از مستی و ہشیاری سرشتہ"[۲]

شیخ اکبرنامے کے صفحات میں کہیں بھی شخصی نفرت اور ذاتی دشمنی کا اظہار نہیں ہونے دیتا۔ وہ حریفوں کے مقابلے میں اپنے مرتبے کی بلندی اپنی طاقت اور اپنی بے پناہ استعداد پر اس قدر اعتماد رکھتا ہے کہ ذرا سی شکایت اور ملال اور افسردگی اس کے لہجے سے معلوم نہیں ہوتی۔ اس کو بھرپور بھروسہ ہے کہ میرے قلم کی ہلکی سی ضرب بڑے سے بڑے محاذ کا شیرازہ بکھیر دے گی۔ وہ بغیر کسی کی طرف اشارہ کئے ایک نظر میں اپنے حریفوں کا جائزہ لیتا ہے ان پر ایک لمبی سی حقارت کی نظر ڈالتا ہے اور معمولی سی بات کہہ کے گذر جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے: الحمد اللہ گیتی خدا کی دوربینی اور ژرف نگاہی کا نتیجہ یہ ہے کہ "بد گوہران جمع اند" آج کل کساد بازاری کا شکار ہیں۔ پھر کہتا ہے: "دو کانچہ ریا و بازار چہ تزویر کساد یافتہ"[۳]

شاہنشاہیت کے نظام کی ہزار کوتاہیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ آدمی کی شخصی استعداد، دانشمندی، تدبر اور برجستہ کارنامے کوئی اہمیت اور وزن نہیں رکھتے جب تک ایک فرد واحد یعنی بادشاہ کے نام کا کلمہ نہ پڑھا جائے۔ یہی وہ علت ہے جو مشرق کے عمومی کردار میں آزاد خیالی کا گلا گھونٹ کر چاپلوسی، حیلہ سازی اور روباہ بازی کی صفات کو داخل کرتی ہے۔ ابوالفضل بھی خوشامد پر اترتا ہے تو جی بھر کے حق ادا کرتا ہے۔

---

[۱] اکبرنامہ ص ۳ جلد اول مقدمہ   [۲] اکبرنامہ ص ۱۲۷ ج ۲   [۳] اکبرنامہ ص ۳۶۶ ج ۲

البتہ خوب جانتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور لب و لہجہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آستین کی آڑ میں مسکرا رہا ہے۔ کہتا ہے: لوگ مجھے خوشامدی کہیں گے کہ ذکر ہوں اس لیے آقا کی قصیدہ خوانی کر رہا ہوں۔ کاش ذکر نہ ہوتا پھر دیکھتا کہ میرا قلم اس برگزیدۂ الٰہی کے کمالات صوری و معنوی کی تعریف میں کیا گل افشانی کرتا ہے: "کاشکے در سلک ملازمان ظاہر مسلک نگشتے تا ہر چہ گفتے و نوشتے ظاہر بینان کور باطن ایں کس را از گروہ خوشامد گویاں ندانستندے"[۵۱]

ابوالفضل کی شخصیت کا باریک نکتہ یہ ہے کہ ظاہری طمطراق کے پردے میں ایک فنکار کی روح مصروف عمل نظر آتی ہے۔ اس کا ذہن امور سیاسی میں مبتلا رہنے کے باوجود تخلیقی عمل سے غافل نہیں ہوتا۔ فنکار کی یہ عادت ہوتی ہے کہ عرصہ روز کی رستاخیز میں رہنے کے باوجود اپنے کو ادبیت میں گم کئے رہتا ہے اور بقول معروف جریدۂ عالم پر اپنے نام کا نقش دوام کندہ کرنے کی آرزو اسے ایک لمحہ عافیت اور چین نہیں دیتی۔ اس زاویۂ نظر سے ابوالفضل کو دیکھیے۔ اس کو اقتدار کی آخری بلندی نصیب تھی۔ اکبر کا ہر شخصی اقدام اس کے مشورے کا رہین تھا۔ امورِ سلطنت کی ہر گرہ اس کے اشارے سے کھلتی تھی۔ دارالوزارہ میں اس کی زبان کا ہر جملہ قول فیصل کا حکم رکھتا تھا۔ اس کا گھر خاص و عام کی نگاہوں کا مرکز اور اہل حاجت کی سب سے بڑی آماجگاہ تھا۔ قدرت نے اس کے ہمہ گو خستگی ناپذیر توانائی بخشی تھی۔ اس کے فرائض منصبی میں فوجوں کی سپہ سالاری اور جنگی مہمات کے کام بھی شامل تھے۔ بظاہر اس کی سیمابی شخصیت دیوانِ خاص سے لے کر لشکر گاہ کے خیمے تک ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود شیخ کا قلم اکبر نامے کی تالیف میں مشغول ہے۔ یہ کاوش اس کی غیر معمولی استعداد کا زبردست ثبوت ہے۔ اکبر نامے کا ہر جملہ اس بات کی شہادت ہے کہ شیخ ابوالفضل پیدائشی طور سے ایک اہل قلم اور فنکار تھا جس کو اتفاقات کی دستبرد نے علم و تحقیق کے گوشہ عزلت سے نکال کر دربار سیاست اور امورِ سلطنت کے ہنگاموں میں جا پھینکا۔

اکبر نامہ شیخ کے سیاسی اور اخلاقی افکار کا ایک صحیفہ ہے جس میں زندگی کے نشیب و فراز کا ہر منظر موجود ہے۔ وہ کتاب کے ابتدائی حصے میں جہانبانی کے اصول ہشتگانہ پیش کرتا ہے اور ان اصولوں کو مثالی مملکت کی اساس و ضمانت قرار دیتا ہے: "اول بخت بلند دوم ہمت ارجمند سوم قدرت کشورکشائی چہارم ملک داری پنجم کوشش در معموری بلاد ششم صرف نیت بر فاہیت عباد ہفتم خوش دل ساختن سپاہی ہشتم ضبط ایشاں از تباہی"[۵۲] شیخ کا دعویٰ ہے کہ یہ آٹھ اصول ملحوظ رکھے جائیں تو یقیناً خلقِ خدا کے لیے امن، آسودگی، آسایش اور خوشحالی فراہم کی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں میں مثالی مملکت کا تصور خلافت راشدہ کے ساتھ وابستہ ہے جس کو خلافت الٰہیہ کا لقب دیا گیا، مگر وہ تیس برس سے آگے نہ چل سکی۔ اس کے بعد دو راستے تھے۔ ایک یونان کے سیاسی عقاید اور مغربی رومۃ الکبریٰ کے قوانین و روایات کی راہ جس تک مسلمانوں کی رسائی نہ ہو سکی۔ دوسری ایران اور بازنطین کا نظام شاہنشاہیت جس کو انھوں نے اختیار کر لیا۔ ابتدا میں کچھ آوازیں جو قیصر و کسریٰ کی سنت اختیار کرنے کے خلاف بلند ہوئیں، خاموش کر دی گئیں۔ بلاشک یہ ایک خونی راستہ تھا جس پر چلنے کی پاداش میں مسلمانوں کی تاریخ بقول شخصے قصاب کی دوکان کا نقشہ بن گئی۔ شاہنشاہیت کا ادارہ ایک فردِ واحد یعنی بادشاہ کے گرد وجود میں آتا ہے۔ بادشاہ کی ذات قدیم ایرانی عقاید کے مطابق "فرِ الٰہی و شکوہ ایزدی" کا مظہر تھی۔ ابوالفضل ان اصطلاحوں کو بار بار استعمال کرتا ہے۔ یا نبان اور نگہبان کی تشبیہات جو رعیت اور بادشاہ کا رابطہ ظاہر کرنے کے لیے مروج تھیں اکبر نامے میں تکرار کے ساتھ ملتی ہیں۔ وہ شاہنشاہیت کے نظام کا دل کھول کے حامی ہے اور ایک سیاسی عملداری کی حیثیت سے اس کے نفاذ و استحکام میں اپنی پوری قوت لگا دیتا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے: "بادشاہی را با باغبانی نسبت داده اند"[۵۳]

---

۵۱ اکبر نامہ ص ۳۴۸ ج ۲ ۔ ۵۲ اکبر نامہ ص ۱۱۸ ج ۱ ۔ ۵۳ اکبر نامہ ص ۲۳۲ ج ۲

شیخ کے نزدیک بادشاہ کی اولین ذمہ داری اور سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ "آسودگیٔ رعایا و ترفیۂ حالِ زیر دستاں و شکستہ پایاں" کی خاطر اپنی پوری کوشش اور جان لگائے رہے۔ اس کے ذہن میں رعایا کی آسودگی کا تصور ایک مرکزی نکتہ ہے جو اس کے ہر اقدام کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ بار بار تاکید کے ساتھ کہتا ہے کہ عوام اللہ کی امانت ہیں: "بدایع و ودایع حضرت جہاں آفرین اند"[1] البتہ یہ بھی اصرار کرتا ہے کہ امور ملکی اور مسائل جہانبانی میں جمہور کی رائے اور جماعتی اقدام پر کبھی زیادہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ لوگ: "گمساں دور کانچہ علوائی اند"[2]

ابوالفضل کی نظر میں مجموعی طور پر جہانبانی اور حکمرانی کے دو مقصد ہیں: "تا در میان خلایق سربلندی حاصل آید و موجب گرد آوریٔ رضائے ایزدی گردد"[3] حکومت گویا خدا کی خوشنودی اور بندوں کے درمیان بزرگی حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اہل اقتدار کے عمل کا معیار یہ ہے کہ خدا کی خلقت سے سچے دل سے خرد مندان کی عزت کرے۔ شیخ نصیحت کرتا ہے کہ اہل اقتدار کو چاہیے کہ ان دو نکتوں کو دستور العمل قرار دیں۔

ایک مدبر کی حیثیت سے ابوالفضل کا شایستہ کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے دیرینہ اخلاقی نظریات کو ہندوستان کی سیاست پر عاید کرنے کی تدبیر نکالی اور بادشاہ کو ایک عملی تجربے کی طرف توجہ دلائی۔ مسلمان مفکرین بہت پہلے سے اس عقیدے کا اظہار کرتے آئے تھے کہ اجتماعی تعمیر کی ہر کوشش باہمی اعتماد کے بغیر بیکار اور ہر انسانی ادارہ خصوصاً یگانگت کی بنیاد کے بغیر خلل پذیر ہوتا ہے۔ "گر بنائے محبت کہ خالی از خلل است" ہم کہہ سکتے ہیں اور اکبرنامے کا مطالعہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ ابوالفضل پہلا آدمی ہے جس کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ فقط طاقت کا استعمال کسی پائیدار نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے افکار کی بدولت سلاطین کی جنگجویانہ روش کروٹ بدلتی ہے اور عام مسلمانوں میں ہندوستان کو دارالحرب سمجھنے کا تصور اپنی جگہ سے جنبش کھاتا ہے۔ رفاہ عام و بہبودیٔ کل کی ضمانت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بلا امتیاز دین و مسلک خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں شریک بنایئے۔ اور یہ کہ عوام کا تعاون جتنا زیادہ حاصل ہو مملکت کی بنیاد اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی۔ یہ تازہ عقیدہ صلح کل کے نام سے پیش کیا گیا: "بیمن عشق نکو زین صلح کل کردیم"۔ مسلمانوں کی اب تک کی کیفیت یہ تھی کہ ہندوستان کے بارے میں دارالحرب والے نظریے کو آسانی سے بدلنے کے لئے تیار نہ تھے۔ شیخ کو اس مشکل کا احساس تھا۔ کہتا ہے کہ کلمۂ حق اکثر تلخ ہوتا ہے اور خلق سے نیچے نہیں اترتا: "کلمۂ حق بس تلخ باشد در راہ جہ و طبایع اکثر ناگوار آید"[4] یہ دو عقیدے ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت سے میدان میں موجود تھے۔ حالات کی صورت یہ ہوئی کہ نیا عقیدہ حکمت عملی کی شکل اختیار کرنے لگا۔ یہ حکمت عملی جن لوگوں کے ہاتھوں تشکیل پا رہی تھی ان کے خلاف اعتراضات کا طوفان ایک لازمی نتیجہ تھا۔ بدایونی ایک رات کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ میں نے ابوالفضل سے پوچھا آخر تمہارا کوئی دین و مذہب بھی ہے اور اس نے جواب دیا کہ میں تو ابھی تک الحاد کی وادی کا سیاح ہوں: "شبے با شیخ ابوالفضل مرا مجالست روی داد ... پرسیدم کہ میل شما ازیں مذاہب مشہورہ بکدام بیشتر باشد؟ گفت می خواہم روزے چند در وادی الحاد سیرے بکنم"[5]

شیخ اپنے ذہن میں ایک متحرک دنیا کا تصور رکھتا ہے جو بہت جلد بدلتی اور آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے اور جس میں نہ خوشی رکتی ہے اور نہ غم ٹھہرتا ہے: "نہ شادی را مجال ایستادن نہ اندوہ را در آں رخصت اقامت"[6] اس کے سیاسی افکار کا ماحول اس اصول پر مرتب ہوتا ہے کہ دنیا کا ہر حادثہ انسانی علم اور تجربے کے خزانے میں ایک نقد اضافے کی حیثیت رکھتا ہے: "ہر سیم مزید آگاہی و تنبیہ احرار است"[7] اب یہ احرار کی ذمہ داری ہے کہ آگاہی اور تنبیہ قبول کرنے میں ذرا بھی غافل نہ رہیں۔ مصایب اور محرومیوں سے عبرت حاصل کر سکنے، تعمیری منصوبے تشکیل کرنا اور خلق خدا کو فلاح و بہبودی کی طرف لے جانا "احرار" کا منصب ہے۔ شیخ کے نزدیک مثالی انسان وہ ہے جس کی ذات میں دو صفات یعنی "مردانگی و فرزانگی" باہم موجود ہوں۔ معاشرہ اپنے دوام و استحکام کی خاطر

---

[1] اکبرنامہ ص ۲۵۶ ج ۱
[2] ایضاً ص ۲۵۹ ج ۱
[3] ایضاً ص ۱۸۸ ج ۱
[4] ایضاً ص ۱۹۱ ج ۲
[5] منتخب ص ۲۶۲ ج ۲
[6] اکبرنامہ ص ۳۱۲ ج ۲
[7] اکبرنامہ ص ۱۲۸ ج ۱

ہر زمانے میں کچھ مثالی افراد کا محتاج ہوتا ہے۔ ابوالفضل اس مقصد کے لئے بار بار "مردانگی و فرزانگی" کے جامع خصایل پر زور دیتا ہے۔

دنیا کے سارے ہنگامے انسان کے باطنی تضاد اور جدلیت کا کرشمہ ہیں "آدمی نژاد را دو امر غریب در نہاد است اول طبیعت کہ تیز دارد دویم چشم دوم عقل دوربین کارشناس"[1] آدمی کی سیرت "نہاد" کے یہ دو "امر غریب" ہیں جس کی بدولت تاریخ کا تمام تر تماشا نظر آتا ہے۔ واقعات کو عرق ریزی کے ساتھ سمجھنے اور قلمبند کرنے کا مقصد شیخ کی نظر میں یہ ہے کہ انسانی شعور بیدار ہو، لوگ عبرت قبول کریں، زندگی کو ہشیاری سے گذاریں اور مجموعی طور پر نیک عمل کو نصب العین قرار دیں: "تا جویائے آگہی پذیرائے عبرت گشتہ بہ نیروئے بخت بیدار زندگانی را ہشیار دلی و نیک عملی سپری کند"[2]

اوپر کی سطریں ابوالفضل کی شخصیت اور افکار کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتی ہیں۔ مگر یہ جستجو رہی جاتی ہے کہ اس کی شخصیت کے خدوخال کس طرح مرتب ہوئے دیکھنا یہ ہے کہ الہام و اثر قبول کرنے کے لئے تاریخ کی کون سی ہستیاں شیخ کی نظر میں رہی ہوں گی۔ اکبر نامے کی تدوین کے ضمن میں ایک جگہ ادبیات عرب سے وابستگی اور تبحر کا دعویٰ کرتا ہے اور نہایت معذرت کے لہجے میں کہتا ہے کہ دراصل مجھے عربی زبان کی عادت ہوگئی تھی۔ فقط اس کتاب کی تالیف کے سبب فارسی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ بدایونی کا قول اگرچہ بر سبیل شکایت ہے۔ مگر کم از کم ایک عرب فاضل سے ابوالفضل کے روابط کا ثبوت ضرور ہاتھ آتا ہے۔ وہ شیخ حسن علی موصلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "چندگاہ شیخ ابوالفضل نیز خفیہ از و تعلیم فن ریاضی ... و دقایق و غوامض علوم کسب کرد و باوجود این ہرگز بہ تعظیم او پیش نیامد"[3] یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ خود شیخ مبارک ہی عربی زبان کی مہارت میں کسی اہل کمال سے کم تھے۔ یہ قیاس سراسر عبث ہوگا کہ ابوالفضل نے محض خودستائی، وہ فضیلت نمائی کی خاطر یہ کہہ دیا کہ: "آغاز آگہی بتازی زبان خوئے گرفت، زبان پارسی کمتر سرائیدے"[4] اکبرنامہ شیخ کے دعوے کی بولتی ہوئی شہادت ہے یقین اس بات کا ہے کہ عرب مورخین کے آثار ضرور اس کی نظر میں رہے ہوں گے۔ کیا بعید ہے کہ اکبرنامے کی تالیف کے محرکات وہیں سے فراہم ہوئے ہوں۔ عربی نثر کا انتہائی قیمتی ذخیرہ مورخین کے آثار پر مشتمل ہے، ناممکن ہے کہ ابوالفضل جیسا ذہین آدمی، جو کہ بقول خود عربی زبان کی عادت بھی رکھتا ہو، عرب مورخین کے آثار سے متاثر ہوئے بغیر رہ جائے گا۔ شوق کے سمند ناز کو تازیانہ چاہیے دوسری بات یہ کہ مغل سلطنت کی ذمے داریوں کا بوجھ الگ مجبور کئے تھا کہ تقلید اور مثال کے لئے نظریں تاریخ کی نامور ہستیوں پر جمی رہیں۔ المقریزی کے بیان کے مطابق وزیر کا عہدہ بنی عباس کے زمانے میں وجود میں آیا، یحییٰ برمکی پہلا بڑا وزیر ہے جس نے تدبر اور دانش مندی کی روایات کو قائم کیا۔ پھر نظام الملک طوسی کا نام ایک ضرب المثل بن گیا۔ اس کی کتاب "سیاست نامہ" اصول جہانبانی اور تدبیر ملکی پر ایک اہم دستاویز شمار کی جاتی ہے ان جملوں کا مقصد اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ اخذ و اکتساب کے معاملے میں صاحب اکبرنامہ کا ذہن کم و بیش کہاں تک گیا ہوگا دراصل ابوالفضل کو سرسری نظر سے پڑھنے کے لئے بھی مہینوں کا وقت چاہیئے۔ کوئی اس کام پر ذرا سا جم جائے تب محسوس ہوتا ہے کہ شیخ کے آہنگ میں جگہ جگہ عرب و عجم کے بے شمار صنادید کی آوازیں گونجتی ہیں۔ البتہ زبان کے اعتبار سے کمال کی بات یہ ہے کہ اکبرنامہ خالص فارسی نثر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ عبارت کے ہر جملے میں عربی کلمات و ترکیبات کے بجائے قدیم پہلوی زبان کے لفظ اور بندشیں جڑاؤ نگینوں کی طرح چمکتے نظر آئیں گے۔ یہ اس کی ندرت پسند طبیعت کا کرشمہ تھا یا پھر فیضی کی صحبت کا فیض سمجھئے۔ اس لئے کہ بقول خود جو کچھ لکھتا تھا وہ برادر گرامی کو دکھاتا تھا اور برادر گرامی عبارت پر اصلاح دیتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ نادر اسلوب برادر گرامی کی خاطر دشوار پسند کا نتیجہ ہو: "تا سال نہم نگاہے بر نگاشتہ ہیچمدان مخلل دانائی فرمودہ بودند، لیکن دو آنچنانکہ دل آسمان پیوند ایشان تسلی داشت کہ زمانہ چنیں نیرنگی نمود"[5]

---

[1] اکبرنامہ ص ۱۰۹ ج ۲
[2] اکبرنامہ ص ۱۹۵ ج ۱
[3] منتخب ص ۱۳۲ ج ۳
[4] اکبرنامہ ص ۳۷۶ ج ۲
[5] اکبرنامہ ص ۳۸۴ ج ۲

ہندی مسلمان کی تاریخ کا حیرت انگیز نکتہ یہ ہے کہ صدیوں کا جائزہ لیتے چلے جائیے، فکر و عمل کے کسی میدان میں بادقار ہستیاں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ ادب کے ساتھ ملحوظ رہے کہ اس جائزے سے وہ بزرگ مستثنیٰ ہیں جن کے ناموں کے ساتھ زہد و عرفان اور کشف و کرامات کے کارنامے وابستہ ہیں۔ فطرت اپنی فیاضی کے اظہار میں زمان و مکان کی قید سے بالکل آزاد ہے۔ کرۂ ارض پر بے شمار ہرے بھرے نقاط وہ ہیں جہاں انسان تھوڑی سی جد و جہد میں زندگی کے ہر عیش اور فراوانی سے دامن بھر لیتا ہے اور ایسے خطے بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں آدم کی اولاد کے لیے زندگی سراسر جہنم اور عذاب بنی ہوئی ہے بیشتر مقامات پر آج تک آدمی اپنے تمام وحشیانہ خصائل کو تمدن کی ہلکی سی پوست کے نیچے چھپائے پھرتا ہے۔ اس وسیع پس منظر میں برصغیر کے مسلمان کی اجتماعی سیرت اور کارناموں پر نظر کیجیے۔ گستاخی نہ ہوگی اگر سوال کیا جائے کہ صدیوں تک معاشی وسائل کی زبردست فراوانی اور سیاسی استحکام کے باوجود یہاں وہ روایات کیوں نہ بن سکیں جو مثال کے طور پر ہسپانوی عربوں کے ہاتھوں تھوڑی مہلت میں قائم ہوگئیں۔ ترکستان میں سامانی خاندان کے اقتدار کی بدولت بخارا صدیوں تک علم و دانش کا مرکز بنا رہا۔ مصر میں فاطمی سلسلے کا استحکام الازہر کی تاسیس اور قاہرہ کی مرکزیت کا باعث بن گیا۔ ہندی مسلمانوں کو فطری طور سے دوسری فوقیت یہ حاصل تھی کہ اس برصغیر میں قدیم زمانے سے علمی اور فکری روایات موجود تھیں۔ یہ روایات بھی یہاں کے مسلمان نہ پکڑ سکے اور ان سے استفادہ یا تقلید کا سلسلہ بھی قائم نہ رہ پایا۔ سوال یہ ہے کہ وہ ابن سینا اور وہ ابن رشد جو بخارا اور اندلس میں پیدا ہوئے بالآخر دلی اور آگرہ اور لاہور میں کیوں نہ پیدا ہوئے۔ ہندی مسلمانوں میں امیر خسرو کے بعد فیضی اور ابوالفضل ہی ایسے افراد نظر آتے ہیں جن کے کردار و شمائل میں ذرا بہت "تاریخ کے بڑے لوگوں کی جھلک ملتی ہے۔ حکمائے متقدمین کا وقار اگر کسی کے تیور میں نمایاں ہے تو وہ فیضی ہے۔ اس کی شخصیت میں علوم کے تنوع اور کمالات کی جامعیت کی وہی شان ہے جو قدیم مفکرین کی امتیازی صفت تھی۔ علمی انہماک میں سخت جفاکشی اور شدید عرق ریزی قرون وسطیٰ کے عالموں کا وصف تھا۔ فیضی نے اس میراث کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ سواطع الالہام اسی جفاکشی اور عرق ریزی کی عادت کا نتیجہ ہے۔ اس کی عجیب و غریب فکری تربیت اور توانائی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک نامعلوم سرعت کے ساتھ وہ شاعری سے حکمت اور حکمت سے الٰہیات و تفسیر کی متفاوت راہوں میں گھومتا پھرتا ہے اور جس میدان میں قدم رکھتا ہے وہاں تمکین و کمال کی یہ شان ہے کہ مولانا جامی کا قول ہر جگہ صادق نظر آتا ہے ؎

گر صحبتِ گل پیشہ کنی گل باشی

واقعہ یہ ہے کہ عظیم ہستیوں کے فقدان کا احساس اب سے پہلے بھی موجود تھا۔ بدایونی نہایت سپاٹ زبان میں اس بات کا اقرار کرتا ہے: "از آں زمانے کہ بنائے اسلام در ہندوستان واقع شدہ، حق سبحانہ اعیان و اشراف ایں دیار را ہمیشہ رعیت سرشت بحکم طبیعت و پست فطرت آفریدہ است۔۔۔"[1] پھر یہ کہ ان لوگوں میں وہ اعلیٰ درجے کا جنگی سلیقہ اور عسکری مزاج بھی پیدا نہیں ہوا جو مجموعی طور سے اسلامی ایشیا کی دوسری قوموں کا شعار ہے۔ تاریخ کی بڑی اور فیصلہ کن لڑائیاں صرف عربوں اور ترکوں نے لڑی ہیں۔ بدایونی کا خیال اس معاملہ میں بھی غلط نہیں ہے "جاہ و جلال و دولت ایشاں ہرگز بضرب شمشیر نبودہ جز بہ تزویر و مکر و نفاق ذاتی و بدنامی۔۔۔" ممکن ہے بدایونی کے نظریات میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو۔ وہ ایک شدید رجحان کا آدمی تھا۔ پھر بھی باتیں غور کرنے کے قابل ہیں: "بجانہ سروری و سرداری برقامت ہمت ایشان کوتاہ آمدہ است"[2] ابوالفضل نہایت متین اور سنجیدہ آدمی ہے وہ بھی احتیاط سے کسی قسم کے اشارے کرتا ہے۔ شیخ کی نظر اس طبقے کی طرف گئی جو مدد معاش کی مفت خوری کا عادی تھا: "اگر چہ ایں گروہ در ہر ملکے باشند و ہیچ اقلیمے ازیں طائفہ خالی نباشد، اور ولایت ہندوستان از ہمہ جا بیشتر اند۔"[3]

(مسلسل)

---

[1] منتخب ص ۲۹ ج ۲

[2] اکبر نامہ ص ۲۴۷ ج ۲

ڈاکٹر سید محمد عقیل

اُردو میں ہمزہ کا استعمال

مقالہ نگار ہندوستان کی الہ آباد یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔ انھوں نے اردو میں ہمزہ کے استعمال کے مسئلے پر ہندوستان میں اردو کی صورتِ حال کے حوالے سے بحث کی ہے۔ اردو الفاظ کی مروجہ ہیئت کو بدلنے کے حامی پاکستان میں بھی موجود ہیں اور یہ بحث ان کے لئے بھی مفید ہے ——— مدیر

مئی ۸۲ء کے ایک تعلیمی سیمنار میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا کہ اردو میں ہمزہ کا استعمال بے معنی اور فضول ہوتا ہے۔ روایتی لکھنے والے اپنی پرانی عادت کے مطابق اس حرف کو لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی کہی گئی کہ ہمزہ کا کام صرف کسرہ یا 'ی' سے لیا جا سکتا ہے لیکن روایتی طور پر لکھنے والے ایک طرف ہمزہ کا استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف 'ی' میں نقطے بھی لگاتے ہیں۔ اس بات کی تحریک ان چند ہوشیار اور لسانیات سے واقفیت رکھنے والے مدرسین نے کی جو حال ہی میں امریکہ سے صوتیات (PHONOLOGY) کی تربیت حاصل کر کے آئے ہیں۔ اپنی بحث میں انھوں نے ہجاؤں اور آوازوں کی ساخت کے متعلق بہت سے فارمولے بھی بیان کئے اور زبان کو سائنٹفک ڈھنگ سے پڑھانے کا مطالبہ بھی کیا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سی باتیں اردو والوں کے لئے بالکل نئی تھیں اور کارآمد بھی۔ طرزِ تعلیم میں صوتی آہنگ، زیر و بم، لفظوں کے اتار چڑھاؤ سے عبارت میں جو ایک حسن پیدا ہوتا ہے ان سب باریکیوں اور خوبیوں سے باخبر معلم، طریقۂ تعلیم کو نہ صرف کارآمد بلکہ اور دلچسپ بنا سکتا ہے لیکن اردو طرزِ تحریر سے ہمزہ کو الگ کر دینے سے اور بہت سی صوتی، تحریری اور مخرج کی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ ان دانشمندوں نے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔

یہ درست ہے کہ اردو کے حروفِ تہجی کا نظام صوتی ترتیب پر قائم نہیں ہے اور اگر اسے صوتی ترتیب پر کسی طرح لے آیا جائے تو مبتدیوں کے لئے شاید کچھ تعلیمی آسانیاں بھی نکل آئیں لیکن ہمزہ کو نکال دینے پر بعض لفظوں کو صحیح طور پر لکھنا اور انہیں آوازوں کے ساتھ جو کہ ان کے تلفظ کی ... آوازیں ہیں پڑھنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا اور خاص طور پر شعر میں ایسے الفاظ نظم کرتے وقت صوتی آہنگ اور وزن کے قیام دونوں میں سخت مشکل پیش آئے گی۔ عربی زبان میں ہمزہ کا استعمال جس طرح ہوتا ہے اس کا بدل تو ممکن ہی نہیں لیکن اردو میں بھی یہ دقت تقریباً اسی طرح کی ہوگی۔

عربی میں ہمزہ کی واضح صورتوں کا استعمال دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ پہلا طریقہ بندشی POLOSIVE CONSONANT کا ہے اور دوسرا حلقی بندشی آوازوں GLOTTAL STOP کا۔[1] لیکن اردو میں ہمزہ کا کام مصوتہ کا ہے جو کبھی اکیلے اور کبھی جڑواں مصوتہ DIFTHONGIC استعمال ہوتا ہے۔ ہمزہ قاطع کا استعمال اسی لئے تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ ایسی صورت میں اسے بالکل عربی ... آواز اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اکثر پرانی اردو میں ایسے نمونے بھی ملتے ہیں جب ہمزہ القاطع اضافت کے لئے بھی لکھا جاتا تھا جیسے خلفائے اسلام کے بجائے خلفاءِ اسلام بھی لکھ دیا جاتا تھا۔ ہمزہ کی اس کثرتِ استعمال

[1] The Phonetics of Arabic by W. H. T. Gairdner P. 30-31, 1925 Edition.

نے اردو کی رسم تحریر میں اختصار اور ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کیا ہے جو عربی میں ہے اور نہ اسے چھوڑ کر اردو والے اپنی عبارت میں وہ صوتی حسن پیدا کر سکیں گے اور بعض لفظوں نے تو ایسی مرکب صورتیں اختیار کر لی ہیں کہ ہمزہ سے دست بردار ہو کر ہم ان الفاظ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ یہ صورت اگر کسی بہتر تبدیلی کے لئے ہوتی تو چنداں برا نہ تھا کیونکہ الفاظ صوتیاتی اور لسانی تاریخ کے طویل و عریض سفر میں برابر بنتے بگڑتے رہتے ہیں لیکن اپنا بہتر بدل لا کر زبان کے مزاج … رچلن کو وہ صورت اختیار کرلینے پر مجبور کرتے ہیں جن میں سہل انگاری کے ساتھ ساتھ حسن صرف اور خوبی آواز بھی شامل ہوتی ہے لیکن جدید صورتیں جو ہمزہ کے بغیر تجویز کی جا رہی ہیں وہ شاید زبان اور الفاظ اور زبان کے ان … یخی جانے پہچانے راستوں پر گامزن نہیں ہوتیں جن سے لسانی اور صوتی تغیرات مانوس ہیں۔

جو لوگ ہمزہ کے استعمال کے حق میں نہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم عملی طور پر ہمزہ کے بغیر کام چلا سکتے ہیں۔ الفاظ کو آواز کی حرکت اور SYLLABLES کے نقاط تقطیع سے الگ کر کے تحریری شکلوں میں لا کر مثال کے طور پر مسئلہ کو مس الا مس الہ لکھیں گے اور سیاق و سباق سے صحیح پڑھ لیں گے (کیونکہ اسے MISS ALLAH پڑھ لینے کے بھی امکانات ہیں) ہم سمجھتے ہیں کہ ہمزہ کے استعمال کے بغیر لکھنؤ، مئو، کیکئی، پیئے، سیئے پور (ضلع اناؤ کا پرانا نام) عجائب، امراؤ القیس، آناؤ، لڑکائے، بہرائچ، خانۂ خدا (خانۂ خدا کہاں ہے)، ہیئت، زائران حرم لاؤ (اس میں واؤ کی خفیف آواز کا اظہار)، آؤ (اس میں واؤ کی الگ دو ٹکڑوں کی آواز کا اظہار)، آئینہ (دو آوازوں کے ساتھ) منارۂ عظمت اور اسی طرح کے بہت سے الفاظ بغیر اپنی ہمزہ کی ترکیبوں کے نہیں لکھے جا سکتے۔ اس طرح کہ ان کی وہی صورت و آہنگ باقی رہے لیکن جو لوگ ہمزہ کے استعمال کے منکر ہیں وہ ایسے تمام الفاظ کو حسب ذیل طریقوں پر لکھنے کو تیار ہیں۔ نئے طرز تحریر میں (ہمزہ کے بغیر) متذکرہ بالا الفاظ اس طرح لکھے جائیں گے:

لکھنؤ = (۱) لکھ نا و (۲) لکھ ن او

مئو = (۱) ما و (۲) م او (پہلا طریقہ قدیم اردو میں رائج تھا بعد کو متروک ہو گیا[۱])

کیکئی = (۱) کے کی ی (۲) کے۔ک۔ای

پیئے = (۱) پی اے (۲) پ۔اے

سیئے پور = (۱) سیے پور (جو یقیناً सयेपुर پڑھا جائے گا) (۲) س اے پور

اناؤ = (۱) انا او (۲) ان ن او (حالانکہ آخری ہجے میں واؤ اور ہمزہ کی ملی ہوئی آواز برقرار نہیں رہ جاتی)

لڑکائے = (۱) لڑکا ے (۲) لڑکا یے (लड़काये)

بہرائچ = (۱) بہرا اچ (۲) بہرایچ (बहरायच)

خانۂ خدا = (۱) خانہ اے خدا (۲) خانا اے خدا (۳) خانا ے خدا (खानाय खुदा) (۴) خانہ یہ خدا (खानाये खुदा)

ہیئت = (۱) ہے اے (۲) ہے یت (جو صحیح تلفظ جاننے والے پڑھتے بھی ہیں) (۳) ہا اے یت (۴) ہا اے یت

زائران حرم = (۱) زا اے ران حرم (۲) زایران حرم (जायराने हरम)

لاؤ = (۱) لا و (واؤ کی خفیف آواز اور یکبارگی کٹ جانے کے ساتھ) (۲) لا او (واؤ کی کھینچی ہوئی آواز) اسی طرح آؤ کو بھی سمجھنا چاہیئے۔

---

[۱] انہیں اعراب بالحروف کہتے تھے جیسے پونا میں پ کے پیش کو واؤ سے ظاہر کرنا اگر چہ کہ کچھ لوگ بھی لکھی ہیں زیر کو اسی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح … کی صورتیں بھی مختصر طریقہ کی ہیں پہنچی بجائے پہنچی، چوست تا بجائے چست تا، جیست تا بجائے جیتا (ملاحظہ ہو مقدمہ کربل کتھا … مرتبہ مالک رام اور مختار الدین۔ ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ)

آئینہ ـ (۱) آ ای نا (۲) آیئے نا (۳) آ ئی نا دونوں طرح کی آوازوں میں)

(۱) ؎ آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب ...

(۲) ؎ آئینہ ناشا ہستی کو دکھاتی ہوئی

منارۂ عظمت ـ (۱) منارہ اے عظمت (۲) منارہ یے عظمت

ان میں سے اکثر الفاظ اور ترکیبوں کو جدید تحریر میں اگر نثر کی صورت میں لکھا گیا تو تمام عروضی پابندیاں جس میں حسن آرائی، زحافات اور لفظی انضمام جیسے شکستِ ناروا وغیرہ شامل ہوں گے، برقرار نہیں رہ سکتیں۔ بحر کے ساتھ صوتی ہم آہنگی بھی باقی نہ رہے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ الفاظ پر صحیح اعراب کی یادداشت از بسکہ ضروری ہوگی جس کی پہل اردو میں کبھی نہیں کی گئی اور پھر مختلف اوقات میں مختلف لہجے ان الفاظ کے لئے بھی لکھنے پڑیں گے جنھیں ہم ایک ہی طرح لکھ کر حسبِ موقع دونوں طرح پڑھ لیتے ہیں۔ مثال کے لئے ایک شعر لیا جاتا ہے ؎

کہا بڑھ کے الیاس نے آؤ آؤ   پڑھانے لگے خضرِ منعم کی ناؤ

یہ شعر دراصل بحرِ متقارب میں ہے اور اس کے ارکان فعولن فعولن فعولن فَعَل (فعولُ) ہوتے ہیں۔ نئے طرزِ تحریر میں اس کے ارکان فعولن فعولن فعولن فعولن بھی ہوں گے۔ صوت کی حرکت، سکون اور کشش کا احساس ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ اوپر ایک جگہ ہمزہ ساکن ہے جبکہ دوسری جگہ متحرک ہو جاتی ہے۔ دراصل واؤ میں اس کی آواز کے ساتھ ہمزہ کی خفیف صوتی کیفیت شامل ہے جو جدید طریقے میں ادا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے آؤ ([illegible]) نہ لکھا جائے اور اس طرح فعول / فَعَل پھر فعولن میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسی طرح کے ہاں اب بھی جو منارۂ عظمت ہے وہ حسین ہے کو دو طریقوں کو پڑھنا پڑے گا۔

(۱) ہاں اب بھی جو منارہ اے عظمت ہے وہ حسین ہے جسے عام طور پڑھنے والے منارہ اے عظمت ([illegible]) پڑھیں گے۔

(۲) ہاں اب بھی جو منارہ اے عظمت ہے وہ حسین جسے عام پڑھنے والا جس کو ہمزہ کے خفیف صوتی آہنگ کی مزاولت ہی نہ رہ جائے گی [illegible] پڑھے گا)۔ (۳) ہاں اب بھی جو منارہ یے عظمت ہے وہ حسین ہے۔ ایک صورت یہی ہے (جسے عام پڑھنے والا [illegible] پڑھے گا)۔ کچھ مصرعوں میں ندائیہ صورت پیدا ہو جائے گی اور ان کے معنی بالکل مختلف ہو جائیں گے مثال کے طور پر چند مصرعے ہمزہ کے ساتھ اور بغیر ہمزہ کے استعمال کر دیکھئے اور ان کے معانی پر غور کیجئے

؎ گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

؎ ہم کو منظور تنگ ظرفیِ منصور نہیں

؎ دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں

؎ وصلِ زنگارِ رُخِ آئینۂ حسنِ یقیں

انہیں بالترتیب یوں لکھیں گے

؎ گفتہ اے غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں (اے! غالب)

؎ ہم کو منظور تنگ ظرفی اے منصور نہیں (اے! منصور)

؎ دہر جز جلوہ اے یکتائی اے معشوق نہیں (اے! معشوق)

؎ وصل زنگار رخ آئینہ اے حسن یقیں (اے! حسن یقیں)

ان مصرعوں کے مطالب میں بغیر ہمزہ کے استعمال کے کیا تبدیلی ہوگئی یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اُردو کے لب و لہجے سے واقف شخص ایک نظر ڈال کر سمجھ سکتا ہے۔

کچھ الفاظ ایسے ہیں جنہیں ہمزہ ہٹا کر 'ی' سے کام چلانے کا مشورہ ہے۔ ایسے الفاظ کے تلفظ تبدیل ہو جانے کا غلط حد تک امکان ہے حالانکہ اردو والوں نے بہت سے الفاظ کے تلفظ بدلے ہیں لیکن یہ صورتیں کثرتِ استعمال سے خود ہی بدلتی گئیں، جیسے آئینہ لکھنے کی جو مختلف صورتیں اوپر بتائی گئیں ان میں ایک صورت 'آیینہ' اسے کو منقوطاً اس لئے کرنا پڑے گا کہ کہیں 'آیے' نا نہیں 'آے' کے مترادف نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ آئینہ میں خفیف 'ی' کی آواز کو واضح کرنے کے لئے بھی، اسی طرح ہیئت، چاہیئے، خانۂ خدا کو بالترتیب ایسے تلفظ کے ساتھ لوگ پڑھنا شروع کر دیں گے۔

आयेना , चाह ये (چاہیے) है यत , खाना ये खुदा

یہ درست ہے کہ اکثر لوگ اب بھی ایسے کچھ الفاظ اسی طرح پڑھتے ہیں لیکن انہیں ویسا ہی سمجھنا چاہیئے جیسے کہ کچھ لوگ انگریزی حروف A کو 'یے' ادیل پڑھتے ہیں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ہیئت اور چاہیئے کی ہمزہ میں 'ا' اور 'ی' کی ملی جلی آواز شامل ہے۔ ایک طرح کی DIPTHONGIC آواز جیسے 'چاہیے' یا 'چاہ اے' کی تحریروں سے واضح نہیں کیا جا سکتا لکھنے کی یہ صورتیں کہ "بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل" کو "بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگ ناے غزل" لکھیں گی جسے ایک طرف تو قاری ندائیہ پڑھے گا اور دوسری طرف ہمزہ کے استعمال کی نیرنگیوں سے بے خبر ہو کر तंग ना ये ग़ज़ल پڑھے گا یعنی 'ی' کے بعد سے غزل کی رخ تک جو ایک پیسٹ وار تنازع کی آواز ہے اسے چھوڑ کر 'ی' سے آواز کا سلسلہ توڑ دے گا اور ہمزہ کی آواز کو الگ الف کی رکاوٹی آکانہ میں بدل دے گا یا پھر اس کو तंग नाये ग़ज़ल پڑھ پڑھ کر ہندی والوں کی طرح اردو میں واؤ عطف کو بھی واؤ والا ان عادتاً پڑھنے لگے گا۔

ہر زبان کی تحریری تاریخ میں ایسی صوتی ناہم آہنگی کی کچھ مثالیں ضرور ملتی ہیں، بلکہ پہلوی اور چند کردی قبائل کی تو ایسی زبانیں بھی ہیں جو لکھی تو دوسری طرح جاتی ہیں لیکن پڑھنے میں ان کا تلفظ بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ غیر مشتق زبانوں کے گروہ میں جہاں کوئی اصول نہیں بلکہ الفاظ کے ذخیروں کی یادداشت ہی زبان کی تاریخ کے مسافر کو آگے بڑھا سکتی ہے، وہاں علاقائی اثرات صوتی غیر ہم آہنگی سے کیا کیا تبدیلیاں پیدا کرتے ہوں گے؟ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی، طرزِ تحریر اصول صوت کا زیادہ پابند نہیں چنانچہ (کاف) اور (لو)، (بٹ) اور (پٹ) ایسے صوتی تغیرات ہیں جن کی تبدیلیوں کی وجہیں معلم حیرت زدہ طالب علموں کو نہیں سمجھا سکتا۔ لیکن یہاں "آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا" والی بات نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر بغیر کسی نقصان اور تحریری پیچیدگیوں کو بڑھائے ہوئے زبان صوتی آہنگ کے لحاظ سے ضبطِ تحریر میں آ سکے تو بہت اچھا ہے۔ پرانے لکھنے والے بھی بہت سی بے جا غلطیاں کرتے رہتے ہیں 'کئے' خالی ہمزہ سے لکھا جا سکتا ہے اسے مان لینا چاہیئے 'سے' میں نقطے لگانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اکثر لوگ بلا سبب ہمزہ اور دوچشمی 'ہ' کے صوتی آہنگ کا خیال نہ کر کے 'کہا' بجائے 'کا' لکھتے ہیں۔ 'جہاں' بجائے 'جہاں' لکھتے ہیں۔ کئی کئی لفظ ایک ساتھ ملا کر لکھنے کا رواج ان ہی کے چلا ہی جاتا ہے جبکہ بہت سے الفاظ کو عجب دھوکا پیدا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ 'بے' دوچشمی 'ہ' سے لکھتے ہیں اور پھر اس کے نیچے 'بے' کا نقطہ بھی لگاتے رہتے ہیں 'بھے' اس شکل میں دیکھ خود بھی غلطی کبھی کبھی کرتا ہوں، اس لئے تحریری اور ممکن العمل تبدیلیوں کو مان لینا چاہیئے لیکن محض توڑ مروڑ سے گتھیوں کو اور الجھا دینا کوئی دانائی کی بات نہ ہوگی۔ ہمزہ کے استعمال کو ترک کرنے سے مشکلات اور بڑھ جاتی ہیں، حل نہیں ہوتیں۔

جدید طرزِ تحریر جو ہمزہ کو ہٹا کر مختلف صورتیں لفظوں کی بتائے گا۔ علاوہ ان تحریری اور صوتی مشکلات کے جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا، چند اور دقتیں پیدا کرتا ہے۔ اس ترکیب تحریر سے ایک جدید تحریر میں لایا ہوا لفظ تین تین الفاظ کی جگہ گھیرے گا۔ ان لوگوں کے لئے جو ٹائپ مائنڈ لکھنے پر قادر نہیں، اس طریقۂ تحریر میں متعدد بار قلم اٹھانے سے وقت کا صرف بھی کافی ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں اردو کی طلاوت کا حسن ہی

ختم ہو جائے اور ایک وقت وہ آئے کہ ہر حرف الگ الگ ہو کر اپنی ملاوٹ کا اصول ہی فراموش کر دے۔ پھر ایسی زبان کے لئے جس کی اشاعت، طباعت اور قوتِ خرید میں، انگریزی اور ہندی جیسا اژدہام بھی نہیں۔ وقت اور کاغذ کے کثرتِ استعمال کا خرچ کیوں برداشت کیا جائے گا کیونکہ پبلشر اپنے خرچ اور منافع پر نظر رکھتا ہے۔ اردو کی اشاعت یا رسم تحریر سے اسے کم دلچسپی یا بالکل دلچسپی نہیں ہوتی یہی نہیں بلکہ پھر اردو کو جس کی اشاعت روز بروز زیادہ ہی ایک مسئلہ بنتی جاتی ہے اس طرزِ تحریر کے لئے نئے کاتب (اگر مصنف کو ٹائپ پسند نہیں اور زیادہ تر مصنفین اور قارئین ایسے ہی ہوتے ہیں) تربیت کرنے پڑیں گے جو اس طرزِ املا و انشا سے واقف ہوں۔ بچوں کو پڑھانے کے لئے عام معلم نہیں بلکہ اصول صوتیات کے ماہر پروفیسر تلاش کرنے ہوں گے جو سب کے بس کا کام نہیں۔ اپنے بچوں کو دو چار پیسے دے کر اس دور میں ایک غیر منافع بخش زبان پڑھانے والا فرد نہ اس کا دماغ رکھتا ہے اور نہ وسعت (کیونکہ زبان بغیر لوگوں کے پڑھے ہوئے صرف اصولوں کی بنیاد پر نہیں بڑھتی) اور اس طرح املا و انشا کا طریقہ صرف مدرسہ اور طریقۂ تعلیم کا مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ معاشی اور اقتصادی مسئلہ بھی بن جاتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب اس نئی طرزِ تعلیم سے واقف ہو کر لوگ نکلیں گے تو پرانا طریقۂ املا و انشا خود بخود ختم ہوتا جائے گا۔ دوسری زبانوں کے لئے یہ خیال شاید صحیح ہو (حالانکہ امریکی طرزِ تحریر آج تک ہجے کے معاملہ میں، انگریزی دنیا کو زیادہ متاثر نہیں کر سکی) لیکن اردو جس دور سے ہندوستان میں گزر رہی ہے۔ زبان کورس میں اردو کی معمولی تعلیم کا تو ٹھیک انتظام ہوتا نہیں، بھلا یہ سائنٹفک لسانی اصول کون سکھائے گا (ابھی تک جو کتابیں پاکستان سے چھپی ہیں ان میں بھی ایسی رسم تحریر دیکھنے میں نہیں آتی جہاں اردو کے لئے یہ مجبوریاں اور دقتیں نہیں ہیں)

اردو میں اس طریقۂ جدید کی ترویج و تبلیغ کی کوشش خاص اس وقت پر غالباً اس مسئلے سے شروع ہوتی ہے جو آج کل دو چار غیر ملکی طالب علم کبھی کبھی بھولے بھٹکے اردو پڑھنے آ جاتے ہیں اور جو عام طور پر ایسی یورپی زبانوں کے بولنے والے ہوتے ہیں جن کا رسم خط اور زبان کا کینڈا زیادہ سائنٹفک سمجھا جاتا ہے۔ ہندی والوں نے بھی اپنے طرزِ املا کو تبدیل کیا ہے لیکن ہم اردو والوں کا مسئلہ بالکل مختلف ہے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہوگی کہ چند غیر ملکی طلبہ کی آسانی کی خاطر اپنے ملکی محبانِ اردو کو آسانیوں سے محروم کر دیا جائے جو وقت، معاشیات اور اقتصادیات کی کشاکش نے ان کو محدود طریقے پر دے رکھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ رسم تحریر جس کی ایک روایت رہی ہے اور جو اپنا سلسلہ آج بھی دور دور سے ملائے ہے اس کے ڈھانچے کو بھی متزلزل کر دیا جائے۔ ترقی کی راہیں نکالنا بڑی اچھی بات ہے لیکن ترقی کے ایسے راستے جو اور مشکلوں میں پھنسا دیں انہیں صرف ایڈونچر سمجھنا چاہیئے اور اردو جس منزل سے گزر رہی ہے اسے اپنی روایات چھوڑ کر ایڈونچر کرنے کا ہرگز موقع نہیں جس ڈھرّے پر وہ چل رہی ہے فی الحال وہی اس کے لئے سب سے بہتر اور سیدھا راستہ ہے۔

اسی بحث کے ساتھ ایک سوال اور اٹھتا ہے۔ دنیا میں اس رسم خط کے جاننے والے جس میں اردو لکھی جاتی ہے، جزیرۂ عرب کے علاوہ مراقش، مصر، ٹیونس، الجیریا، سوڈان، ایتھوپیا، سومالی لینڈ، زنجبار، لبنان، شام، عراق، افغانستان، ایران، کردستان، ملایا، جاوا، روس کے چند حصے، اسرائیل اور چین کے کچھ حصے ہیں۔ سب کی رسم تحریر کم و بیش یہی ہے۔ ابھی تک ایران[1] و عرب کے چھاپے خانوں سے جو کتابیں شائع ہو کر آ رہی ہیں وہ بھی تقریباً اسی طرز املا و انشا کے ساتھ ہیں۔ تو کیا ہمارے ہمزہ کو چھوڑ دینے سے تمام ملک جو سامی رسم خط رکھتے ہیں اپنا رسم خط بدل دیں گے؟ اگر نہیں تو ہم اپنے بچوں پر سامی علوم کے دروازے بند کریں گے (مصری ر، گ کی تبدیلی نئی بات نہیں ہے) یا پھر بچوں کو ہمزہ کا استعمال بھی بتایا جائے اور جدید طرز انشا بھی جو اتنا آسان کام نہیں جتنی آسانی سے سوچا جاتا ہے۔ کیونکہ جدید طرزِ انشاء اور املا کا عادی آسانی کے ساتھ نہ تو ان تحریرات کو پڑھ سکے گا اور نہ ان الفاظ

[1] ایران میں بھی ایک مرتبہ ہمزہ ہٹانے کی تحریک چلی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔

ی صحیح صوتی آہنگ کو اپنی ذہنی گرفت میں لے سکے گا۔

دو ایک دشواریوں کی طرف اور توجہ کر لینی چاہیئے۔ نئے طرزِ املا میں مروجہ اعراب کے ساتھ ساتھ بہت سے صوتی اعراب کو بھی پابندی کے ساتھ استعمال کرنا ہوگا۔ مثلاً کہاں "ی" کی آواز کو کھینچ کر پڑھنا ہے اور کہاں نہیں۔ کہاں حرف ساکن ہے اور کہاں متحرک۔ "کیکئی" لکھنے کے لئے "ک" کے "ی" کو ی لکھا جائے گا اگر کہ بعد زیر نہ لگا تو متحرک اور ساکن حرفوں پر علامت دیکھنے کا عادی اسے ساکن سمجھ بیٹھے گا اور پھر کیک ای بڑھ لینے کے بھی امکانات ہیں (یہ درست ہے کہ موقع استعمال کچھ مدد کرے گا مگر ہمیشہ نہیں) اور اس طرح ایک طرف تو لفظوں کا تلفظ بگڑے گا اور دوسری طرف کتاب کا صفحہ اعراب سے اس قدر بوجھل ہوگا کہ عبارت سے زیادہ نقش و نگار نظر آئیں گے۔ اردو میں پہلے بھی کچھ کتابیں جزم اور مد، سکون و حرکت کے نشانوں کے ساتھ چھپتی تھیں لیکن چھپائی اس قدر بھدی اور بدنما ہو جاتی تھی کہ لوگوں نے اس طریقے کو چھوڑ دیا۔ پھر اردو میں ابھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو الفاظ کے صحیح اعراب سے زیادہ واقف نہیں بلکہ بغیر اعراب لگے الفاظ کو صحیح جانئے "ٹھیک پڑھتا" ہے اور ان الفاظ کو نہ جاننے والا کھتا تو اسی مروجہ طریقے سے ہے لیکن پڑھتا اس طرح ہے جس آواز کے ساتھ لفظ اس کی زبان پر چڑھا ہے۔ اب جب کہ ہمزہ کو ہٹا کر اس کی آواز کو اعراب سے ظاہر کرنا ہوگا تو لامحالہ دوسرے الفاظ کو بھی لکھنے والا معرب کرنے لگے گا اور اس طرح لفظوں کے غلط اصوات جو اس کی زبان پر چڑھے ہیں اسی آواز میں معرب ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں اردو الفاظ کے صوتی، نحوی اور تحریری نظام میں غلطیاں بے انتہا ہونے لگیں گی اور ایک غلط قسم کا جاہلانہ تغیر بھی رونما ہوگا۔ ہمزہ یا کسرہ کے خفیف صوتی تغیر کی کیفیت سامانیاں ختم ہو جائیں گی اور اردو میں بھی بعض الفاظ کے نہ لکھ سکنے کی مجبوری پیدا ہو سکتی ہے۔

اس طرح ہمزہ کو ہٹا کر اس کو مختلف قسم سے صوتی آہنگ کی بنیاد پر لکھنے کی کوشش کرنا کسی خوشگوار تبدیلی کی بشارت نہیں۔ اردو کے حروف اور اعراب، اس کے صوتی، صرفی اور ترکیبی نظام میں کوئی گمراہی پیدا نہیں کرتے۔ جو لوگ زبان کی اور صورتوں کو برداشت کرتے ہیں وہ محض اس لئے اردو زبان کو سیکھنے سے پرہیز نہیں کریں گے کہ انہیں ہمزہ کا وجود بیکار اور لکھنے میں مشکل معلوم ہوتا ہے اور اردو کے طالب علم سے یہ امید کرنا کہ وہ ماہر علم زبان اور علم صوت عنقریب ہو جائے گا اور جب اسے ہمزہ کا مصرف بیکار اور مشکل معلوم ہوگا، اردو والوں کی موجودہ محدود توقعات سے بہت آگے سوچنا ہے ـــــ اتنا آگے کہ جب یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ زبانیں کیا بدل لیں گی۔

ڈاکٹر شوکت جہاں تیموری

ہمارا تہذیبی ورثہ

برصغیر پاکستان و ہند تاریخِ عالم میں تہذیب و تمدن کے قدیم گہواروں میں شمار ہوتا ہے۔ چین اور مصر کی طرح اس کے تہذیبی کارنامے بھی ماضی کے دھندلکوں میں ہزاروں سال کی تاریخ میں جھلکتے ہیں۔ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے آثار بتاتے ہیں کہ آج سے کم و بیش پانچ ہزار سال پہلے جو لوگ ان بستیوں میں آباد تھے ان میں اجتماعی زندگی کا شعور پوری طرح موجود تھا۔ وہ زراعت پیشہ تھے اور صنعت و حرفت کو بھی انہوں نے جلا بخشی تھی۔ ان میں لوہار بھی تھے اور سنار بھی اور وہ صناع بھی جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے کی حسیناؤں کی زینت و آرائش کے لئے سونے، چاندی، جواہر اور ہاتھی دانت کے زیورات اور دیگر لوازم تیار کرتے تھے۔ ان میں رقاص بھی تھے اور مصور بھی۔ ان کی بنائی ہوئی رقاصاؤں کی مورتیاں اور مہروں پر کھدے ہوئے نقوش ان کی فن کاری کی سند ہیں۔ ان کی کوزہ گری ایک اعلیٰ تہذیبی دور کی ترجمان ہے۔ ان کی بستیوں اور مکانوں کی ترتیب تعمیر۔ شہر میں پانی کے نکاس کے لئے زمین دوز نالیاں اور نالے۔ اجتماعی تقریبات کے لئے بڑے بڑے کمرے اور تالاب اس دور کی مکمل تہذیب کی یادگار ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ابھی تک تسلی بخش طور پر وادی سندھ کی تہذیب کا رسم الخط پڑھا نہیں جا سکا اور بہت سے آثار قدیمہ ابھی دریافت کے منتظر ہیں۔ اگر ہمارے حالات نے اجازت دی اور بازیافت کا یہ تحقیقی سلسلہ شروع ہوا تو مزید انکشافات کا پورا امکان ہے۔

وادی سندھ کی تہذیب کے وارث وہ آریا تھے جو برصغیر میں آج سے کوئی چار ہزار سال پہلے داخل ہوئے۔ ان کے تہذیبی کمالات کا اندازہ ان ویدوں سے ہوتا ہے جن کی ابتدائی تدوین کوئی ساڑھے تین ہزار سال پہلے شروع ہوئی اور صدیوں تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ نو وارد آریا وادی سندھ و پنجاب سے گزر کر گنگا اور جمنا کے دوآبہ تک پہنچ گئے اور یہ مدھ دیش ان کی تہذیب و ثقافت کا مرکز قرار پایا۔ یہی آریائی تہذیب ہے جو برصغیر کی تہذیب و ثقافت کی اساس بنیاد ہے۔ آریوں کے بعد مختلف وقفوں کے لئے اور بیرونی تہذیبی اثرات نے بھی اس تہذیب و ثقافت کے پروان چڑھانے میں حصہ لیا ہے۔ مثلاً سکندر اعظم کے حملے کے بعد جب برصغیر کے شمال اور شمال مغربی علاقوں میں کچھ عرصہ کے لئے یونانی سرداروں کی حکومت قائم رہی اور ان کے تہذیبی اثرات نے مقامی عناصر میں دخل پایا تو اس ہندی تہذیب و ثقافت کو یونانی ثقافت کی آمیزش و آویزش سے توانائی و تقویت نصیب ہوئی۔ یونانیوں کا یہ سیاسی اقتدار دیرپا نہ تھا لیکن ان کے تہذیبی اثرات بعد بہت نتیجہ خیز اور دور رس ثابت ہوئے۔ آج بھی سوات، اورکزئی، کافرستان، گلگت اور آس پاس کے علاقوں سے آثار قدیمہ کی دریافت سے جو کھدائی ہوئی ہے اس سے ان یونانی اثرات کی تصدیق ہوتی ہے۔ خاص طور پر مجسمہ سازی میں یونانی اثر صاف جھلکتا ہے۔

برصغیر پاکستان و ہند کی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں مسلمانوں کی آمد غالباً سب سے اہم واقعہ ہے۔ پچھلے ایک ہزار سال میں اس تہذیب و ثقافت کو جو فروغ نصیب ہوا ہے وہ ان ہی مسلمانوں کا رہینِ منت ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات سندھ سے لے کر دہلی میں مسلمانوں کی سلطنت کے

حکومت کے مستقل قیام اور استحکام تک یہ اثرات آہستہ آہستہ یہاں کی تہذیبی زندگی میں سرایت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ مغلوں کے دور میں یہ اثرات ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی ہندلمانی تہذیب کے انتہائی عروج کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ یہ تہذیب نہ خالص ہندوانہ ہے نہ خالص مسلمانی بلکہ دو تہذیبوں اور ثقافتوں کی صحت مند آمیزش کا نتیجہ ہے۔ یہی تہذیب و ثقافت ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اور اسی کا مطالعہ ہماری تہذیب و معاشرت کا تاریخی مطالعہ ہے۔ اس طرح کی مختلف تہذیبوں اور معاشروں کی آمیزش ارادی اور جبری نہیں ہوا کرتی۔ اس کی رفتار ابتدا میں سست ہوتی ہے۔ بعض ادوار ایسے آتے ہیں جب سیاسی اثرات اس رفتار کو تیز کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی اس تبدیلی اور آمیزش سے گریز اور احتیاط کی تحریکیں بھی زور پکڑتی ہیں اور ثقافتی تبدیلیوں کا رُخ موڑنے یا قدیم تہذیب کی طرف رجعت کرنے کا جذبہ بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تحریکات اور جذبات دیرپا نہیں ہوتے اور نہ اس قوت کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو نئی جنم لیتی ہوئی تہذیب میں موجود ہوتی ہے۔ اسے تعصب سے زیر نہیں کیا جا سکتا، نہ رجعت پسندی اس کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روک سکتی ہے، نہ ماتم کرنے والوں کے نوحے اس کو متاثر کر سکتے ہیں۔ تبدیلی اور تبدیلی سے توانائی حاصل کرنا تہذیب کا مزاج ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بعض بنیادی اختلافات کے باوجود برصغیر پاکستان و ہند میں ایک ایسی تہذیب نے جنم لیا جس میں دونوں کے تہذیبی عناصر اور عوامل کارفرما تھے۔

ان عوامل کا تجزیہ کرنے کے لئے ہند و مسلم ثقافت کے بعض بنیادی اختلافات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی عنصر مذہب ہے۔ ہندو مذہب کثرت پرستی اور اصنام پرستی کا مذہب ہے۔ دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش سے بڑھ کر جانوروں، درختوں اور حشرات الارض تک کی پرستش جزو مذہب ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے اور اصنام پرستی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ ہندو مذہب میں برہمنوں کا ایک طبقہ اس مذہب کا اجارہ دار ہے اور بغیر ان کے واسطے اور وسیلے کے کسی زندہ انسان کی دعا اور عبادت مقبول نہیں ہو سکتی اور نہ کسی مردے کے نجات کی توقع ہو سکتی ہے۔ بتوں اور مورتیوں کے لئے ایک پراسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش میں ہندو مندروں کی تعمیر میں اس کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا کہ جگہ تنگ و تاریک ہو اور روشنی کا گزر یا تو بالکل نہ ہو یا اس طرح ہو کہ نیم تاریکی یا نیم روشنی کی آنکھ مچولی میں پوری فضا پراسرار بن جائے اور پھر ان مندروں کے پجاری جو قربانیاں اور چڑھاوے وصول کر کے اسے دیوتاؤں اور دیویوں کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور انسانوں کے ان گھروں کے نگہبان سمجھے جاتے تھے، لیکن نگہبانی کی بجائے یہ اپنی قیام گاہوں کو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے اڈے بنا لیتے تھے۔ غرض ہندو مندر اپنے فنی تعمیر کے اعتبار سے ایک قسم کی بند بند گھٹی گھٹی فضا پیش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی مساجد جو عام داخلے کے لئے کھلی ہوتی ہیں، دراصل مسلمانوں کی حیثیت اجتماعی کے ایک سماجی مرکز کا کام دیتی ہیں۔ نماز باجماعت کے لئے جو مسلمان ان مسجدوں میں جمع ہوتے ہیں وہ روزانہ پانچ وقت آپس میں ملتے اور تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ہر مسجد میں ایک درمیانی گنبد ہوتا ہے اور اس کے چاروں طرف دالان ہوتے ہیں اور ایک بڑا حصہ بطور کشادہ صحن اس میں شامل ہوتا ہے۔ فراخی، کشادگی، روشنی مسجد کے فنِ تعمیر کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان کی خوبصورتی مورتیوں اور بتوں کی مرہونِ منت نہیں ہوتی، بلکہ ان کا حسن سادہ اور پرشکوہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بلند مینار ہوتے ہیں جن پر مؤذن پانچ وقت خدا کے نیک بندوں کو نماز اور صلاح و فلاح کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے۔ چونکہ مسجد مسلمانوں کے فنِ تعمیر میں ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے اس لئے مساجد کی تعمیر کے فن نے بالعموم مسلمانوں کے فنِ تعمیر کو متاثر کیا ہے۔ محرابیں، گنبد، مینار وغیرہ وہی امتیازی خصوصیات ہیں جو ایک ہی نظر میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارات کو غیر مسلم تعمیرات سے ممیز و ممتاز کر دیتے ہیں۔

عمارتوں کی اندرونی تزئین و آرائش کے لئے نقش و نگارت سے کام لینے کا رواج بہت قدیم ہے۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں جب انسان

قدرتی غاروں میں رہتا تھا اور مکان بنانے کا فن اس نے نہیں سیکھا تھا۔ وہ ان قدرتی غاروں کو سادہ نقوش سے مزین کرتا تھا۔ یہ نقوش اپنی اولین صورت میں عہد حجری میں ملتے ہیں اور اس طرح اس کے آغاز کی تاریخ میں کم و بیش بیس ہزار برس قرار پائی ہے۔ اس قسم کے نقوش میں اریگنا کے نمونے قابل ذکر ہیں جو فرانس میں واقع اس نام کے غار سے منسوب ہیں۔ اسی دور میں آہستہ آہستہ ہڈیوں اور پتھروں سے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے مجسمے بھی ملنے لگتے ہیں۔ غرض صناعی کے اس فن نے جس قدر ترقی کی، اس کا ایک اندازہ ان یونانی مجسموں سے ہی کیا جا سکتا ہے جو آج تک دنیا کے عجائب خانوں اپنے فن کاروں کی صلاحیتوں کی شہادت دے رہے ہیں۔ مسلمان نہ شبیہ پرست ہو سکتے ہیں اور نہ بت گر، اس لئے ان کی عمارتوں کی تعمیر میں تزئین و آرائش کے دیگر ذرائع اور وسائل ختیار اور استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً بجائے انسانوں اور جانوروں کی شبیہیں اور مجسمے تیار کرنے کے مسلمان صناعوں اور فن کاروں نے گلکاری کے فن کو ترقی دی اور اسے اس معراجِ کمال کو پہنچایا جس کا ایک نمونہ تاج محل کی لاثانی اور لافانی گلکاری میں موجود ہے۔ صنعت کاری اور پچی کاری کے فنون کا ارتقا مسلمانوں کے اسی ذوقِ جمال کی تسکین کی راہیں تلاش کرنے کا مرہونِ منت ہے۔ اسی طرح مسجدوں، مقبروں اور دوسری یادگار عمارتوں آیات قرآنی کندہ کرنے یا ابھار کر لکھنے کے فنون کو ترقی ہوئی جو مسلمانوں کے فن خطاطی کی ترقی کا ایک پہلو ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں مصوری کی طرف توجہ نہیں کی لیکن اس کی کمی انہوں نے خطاطی میں کمال حاصل کر کے پوری کر دی۔ خطاطی کی تاریخ میں کوئی دوسری قوم اس فن میں مسلمانوں کے مقابلہ کا دعویٰ نہیں کر سکتی اور ایران و ہندوستان کے مشہور خطاطوں کی لکھی ہوئی وصلیاں، قطعات، کتابیں اور متفرق تحریریں آج بھی ہیروں کے مول بکتی ہیں۔ افسوس ہے کہ طباعت کے جدید میکانکی ذرائع نے مسلمانوں کے اس قدیم فن کو بڑا صدمہ پہنچایا ہے۔ اب اس کے فن کاروں کو اپنے اسلاف سے کوئی نسبت نہیں، بس سسک رہے ہیں اور شاید اس نسل کے ساتھ ہی یہ فن بھی رخصت ہو جائے گا لیکن اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلمانوں نے اس میں جن کمالات کا اظہار کیا، وہ کتب خانوں اور عجائب گھروں میں مستقبل کے نقادانِ فن کی دلچسپی اور توصیف کا مرکز رہیں گے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا تہذیبی فرق اور بھی بہت سی چیزوں میں نمایاں ہے۔ ان میں سب سے اہم ذات پات کی تمیز ہے جو ہندو سوسائٹی کی اساس ہے اور جس کے لئے مسلمانوں میں کوئی گنجائش نہیں۔ اگرچہ آریوں کے ہندوستان میں داخلہ سے پہلے ذاتوں کی واضح تقسیم کا پتہ نہیں چلتا اور ہندوستان میں داخلہ کے بعد بھی آہستہ آہستہ تقسیم صرف تقسیم کار کے اصول پر مبنی تھی لیکن رفتہ رفتہ برہمن، چھتری، ویش اور شودر ایسی سماجی اکائیاں بن گئے جو ایک ہی ملک کے باشندے ہونے اور ایک ساتھ رہنے سہنے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ شودروں کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کا وجود مطلق ناپاک تھا، خود چھتری اور ویش برہمنوں سے نیچے درجے کی مخلوق سمجھے جاتے تھے اس لئے برہمنوں کو ہی سماج میں سب سے بلند مرتبہ حاصل تھا۔ چھتریوں کا ذمہ دفاع اور جنگی خدمت گذاری تھا۔ ویش، زراعت، تجارت اور کاروبار کے ذمہ دار تھے اس لئے صرف برہمن ہی علوم و فنون کے سرپرست بن سکتے تھے۔ اور یہ روایت اس حد تک بڑھی کہ بالآخر وہی آریوں کی مقدس زبان سنسکرت کے محافظ اور امین قرار پائے۔ برہمنوں نے صدیوں کی کوششوں سے اپنی اس اجارہ داری کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا لیکن اس کا نتیجہ تھا کہ بہت جلد سنسکرت زبان ایک زندہ اور بولی جانے والی زبان کی حیثیت سے ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ان پراکرتوں نے لے لی جو عوامی بولیاں تھیں اور جن پر آگے چل کر برصغیر پاک و ہند کی جدید ہند آریائی زبانوں، و بولیوں کی بنیاد رکھی جانے والی تھی۔ ان حالات کے برعکس مسلمانوں میں ذات پات کی اس طرح کی کوئی تفریق نہ تھی۔ قرآن حکیم میں مسلمانوں سے صاف کہا گیا ہے کہ بزرگی اور بڑائی کا اصلی معیار تقویٰ اور نیکی ہے اور اللہ کے نزدیک وہی سب سے بڑا ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ انسانیت اور اخوت، مساوات اور برابری کی اسلامی تعلیم محض کتابی نہ تھی۔ مسلمانوں نے عملاً اسے اپنے قول و فعل سے ثابت کیا تھا۔ چنانچہ خود برصغیر پاک و ہند کی ابتدائی تاریخ میں پہلی باقاعدہ سلطنت قائم ہوئی تو اکثر ان لوگوں کو بادشاہت

اور حکومت سونپی گئی جو غلام تھے اور ان ہی کی نسبت سے اس خاندان کو جو اصلاً نسلاً ترک خاندان تھا 'غلام خاندان' کہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر صاحبِ اقتدار بنے تھے۔ مسلمانوں میں آزادی اور مساوات کی یہی روح تھی جو اُن کے تہذیبی مزاج کی ایک بڑی پہچان ہے۔ شاعری ہو یا ادب کی کوئی دوسری صنف، فنِ تعمیر ہو یا خطاطی، مسلمانوں کا آرٹ ان کی اجتماعی کوششوں کا مرہونِ منت ہے اس لیے اس میں زندگی کی ایسی وسعت، ہمہ گیری اور ولولہ پایا جاتا ہے جو انسانیت کو خانوں میں تقسیم کرنے سے کمزور پڑ جاتا ہے اور فنی تخلیقات کو محدود اور بے اثر بنا دیتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو گائے کی پرستش کرتا ہے اور مسلمان اسی گائے کو ذبح کر کے کھا جاتا ہے۔ اگرچہ ہندوؤں میں بھی جانوروں خصوصاً بیل اور گھوڑے کی قربانی کا پتہ چلتا ہے اور ابتدائی ویدک دور میں اس کا رواج موجود تھا لیکن آگے چل کر ہندو بنیادی طور پر ایک سبزی خور قوم بن گئے تھے۔ مسلمانوں میں گوشت خوری کا رواج عام تھا اس لئے قدرتی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کھانوں اور سامان خور و نوش میں بہت فرق پیدا ہو گیا۔ اگرچہ اسلام میں صرف ایک احتیاط لازمی ہے کہ جن چیزوں کو واضح طور پر حرام قرار دیا گیا ہے ان سے پرہیز کیا جائے لیکن اس کے علاوہ ان کو دنیا کی نعمتوں سے پوری طرح متمتع ہونے کی اجازت دی گئی ہے اور قرآن حکیم میں اجازت ہے کہ کھاؤ پیو ہاں اسراف نہ کرو۔ اس کھانے پینے کے سلسلے میں مسلمانوں نے اسے بھی ایک فن بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کے دور میں روٹی، چاول اور گوشت سے تیار ہونے والے ہزاروں کھانے تیار ہو گئے کہ ان کی لطافت اور نفاست اب صرف ادبی دستاویزوں میں باقی رہ گئی ہے اور جن کی تفصیل کا پتہ لغت کی کتابوں میں بھی نہیں چلتا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس تہذیبی ورثہ کو محفوظ کر لیا جائے ورنہ کچھ زمانہ اور گزر گیا تو پھر ان کی تشریح اور توضیح کی کوئی اور صورت باقی نہ رہے گی۔

بابر کا وہ قول بہت مشہور ہے جو اس نے اپنی "تزک" میں اپنے عہد کے ہندوستان کی تہذیبی حالت کے بارے میں کہا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس ملک میں اچھے گھوڑے نہیں ہوتے، اچھے پھل نہیں ملتے، اچھے لباس کی طرف لوگوں کو توجہ نہیں، اچھی غذا اور کھانوں کا پتہ نہیں چلتا، ٹھنڈا پانی نہیں ملتا، سیب، انار، انگور نہیں ملتے۔" اس سلسلے میں بابر نے آخری بات بڑی پُرلطف کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے "یہاں فانوس نہیں، شمع نہیں، شمعدان نہیں۔ لکڑی کا ایک ڈیوٹ ہوتا ہے جو شاہی محلسرا میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب کبھی راجہ یا مہاراجہ کو قریب سے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے، یہی ڈیوٹ اس کے سرہانے لا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس پر سرسوں کے تیل کا ایک چراغ روشن ہوتا ہے۔ بقول بابر اس کا دھواں دربار کو دماغ پریشان کرنے کے لئے کافی ہے۔ برتنوں کا یہ حال تھا کہ عام طور پر لوگ درختوں کے پتوں پر کھا لیتے تھے۔ سبب اس کا یہ تھا کہ چھوت چھات کی وجہ سے جو برتن ایک مرتبہ استعمال ہو جائے اور جھوٹا ہو جائے اس کا دوبارہ استعمال ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں کسی قسم کے قیمتی ظروف کا استعمال غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ مٹی کے چند برتن کافی سمجھے جاتے تھے جن کو استعمال کے بعد پھینک دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے جہاں انواع و اقسام کے کھانوں کی ایجاد میں اپنے کمالات دکھائے وہاں ان کے کھانے کے لئے برتنوں اور متعلقہ سامان کو بھی رواج دیا اور اس اعتبار سے ہمارے اکثر و بیشتر روزمرہ کے استعمال کے ظروف مسلمانوں کے تہذیبی دور کی یادگار ہیں جن سے ان لوگوں کی نفاستِ طبع، سلیقے اور رکھ رکھاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہی حال لباس کا تھا۔ کچھ یہاں کے موسم اور آب و ہوا کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ سیاسی یا تہذیبی اعتبار سے ایک مدت تک برصغیر پاک و ہند میں ایک قومی وحدت کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا تھا، عام طور پر ایک لنگوٹی مردوں کے لئے کافی تھی اور عورتوں کے لئے ایک بغیر سلا کپڑا جو دھوتی یا ساڑی کی طرح بدن پر لپیٹ لیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے لباس پر بھی ایسی توجہ کی اور اس میں ایسے ایجادات سے کام لیا کہ اسے بھی ایک فن بنا دیا۔ مسلمان

کاریگروں نے کپڑوں کی بہت سی نئی قسمیں رائج کیں ان میں سے کچھ ایسے کپڑے تھے جو وہ ایران سے اپنے ساتھ لائے تھے لیکن بہت بڑی تعداد ایسے کپڑوں کی تھی جو انھوں نے اس ملک میں آکر رائج کئے۔ پورے ملک میں مسلمان کاریگروں کی بڑی بڑی بستیاں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کی صناعی اس درجہ کی تھی کہ ان کے بنائے ہوئے کپڑے دور دراز ملکوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ غیر ملکی تجار جو یہاں آتے تھے یہاں کے گرم مصالحوں اور نیل کے ساتھ یہاں کے کپڑے بھی بطور سوغات لے جاتے تھے اور یورپ کے شاہی خاندانوں اور امراء کے محلوں میں منہ مانگے دام پاتے تھے۔ برطانوی دور اقتدار کے آغاز تک مسلمانوں کا یہ فن ترقی کرتا رہا لیکن یورپ میں کپڑا بننے کی کل ایجاد ہونے پر جب سستا کپڑا بننا شروع ہوا اور انگریزوں کو اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی تو ان صناعوں اور کاریگروں کو مٹانے کے لئے باضابطہ کوششیں کی گئیں اور اب یہ داستانیں تو اب بہت مشہور ہیں کہ ڈھاکہ کی ململ تیار کرنے والے کاریگروں کے ہاتھ قلم کر دیئے گئے۔ اس طرح اعلیٰ درجے کے کپڑے کے لئے بہت جلد برصغیر پاک و ہند کے لوگ یورپ کی سستی مصنوعات کے محتاج ہو گئے۔ اب یہ کپڑے کہیں کہیں عجائب گھروں میں ہی نظر آتے ہیں اور وہ بھی آزادی کے بعد بھارت میں رہ گئے ہیں۔ ہمارے قومی عجائب خانوں میں بھی ان کے نمونے باقی نہیں۔ ہاں زبان، شاعری اور ادب میں ان کے نام محفوظ ہیں اور شاید اسی ذریعے سے یہ تاریخ میں باقی رہیں گے۔

تہذیبی زندگی میں میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کو بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے تہوار صرف دو ہیں یعنی عیدین۔ ایک عید رمضان اور ایک عید قربان۔ یہ دونوں عیدیں مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں کہ دونوں کا مقصد ایک فرض کی ادائیگی پر اظہار شکر اور احساس مسرت ہے۔ عید رمضان سے پہلے خدا کے نیک بندے اس کے احکام کی تعمیل میں پورے ایک مہینہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک بغیر کھائے پیئے روزہ تہذیب و تزکیۂ نفس کرتے ہیں۔ اسلام میں رہبانیت کی گنجائش نہیں اس لئے ترک دنیا اور فقر و فاقہ نہ مذہبی نقطۂ نظر سے اور نہ ثقافتی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی زندگی داخل ہو سکتے ہیں لیکن رمضان کے تیس روزوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی ہر طرح کی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہیں۔ ان کو ایک طرف تو ان معمولی کھانے اور پینے کی نعمتوں کی اہمیت کا احساس ہو سکے تاکہ وہ ان نعمتوں کے مہیا کرنے والے کا شکریہ ادا کر سکیں۔ دوسری طرف ان میں کچھ احساس اس تکلیف اور تشنگی کا بھی پیدا ہو سکے جو ان چیزوں کی محرومی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تاکہ سماج میں جو لوگ زیادہ خوش قسمت نہیں ہیں ان کی تکالیف اور درد دکھ کا احساس انسان کو سماجی بہبود کے کاموں کی طرف متوجہ کرے۔ اسلام میں لازمی زکوٰۃ کا بھی منشا رہے اور خاص طور پر رمضان کا مبارک مہینہ ہی زکوٰۃ اور صدقات کی تقسیم کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ تقریب بنیادی طور پر اظہار شکر اور اعتراف کرم ہے اور عملی طور پر ایک ایسی اجتماعی تقریب جس میں چھوٹے بڑے امیر غریب سب شریک ہوتے ہیں، اور جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور کرم ہے وہ اپنے حاجتمند بھائیوں کی اعانت اور استعانت کر کے انھیں بھی اس خوشی میں شریک ہونے کا موقع بخشتے ہیں

دوسری عید۔ عید قربان ہے جو ایک تاریخی واقعہ کی یادگار ہے۔ یہ واقعہ جو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی سے متعلق ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو حکم ملتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں۔ یہ وقت بڑے ضبط، صبر و استقلال اور امتحان و آزمائش کا ہے کہ ایک بوڑھے باپ سے کہا جائے کہ وہ اپنے جوان بیٹے کو اپنے ہی ہاتھ سے قربان کر دے لیکن ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خدا کے نیک بندوں میں تھے اور انھوں نے فرمان الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا۔ لیکن اصل مقصد تو صرف ایمان کے استحکام کی آزمائش تھی جس میں دونوں باپ بیٹے پورے اترے۔ یہ اسی مبارک دن کی یادگار ہے کہ صاحب نصاب، صاحب استطاعت مسلمان اس روز خدا کی راہ میں کوئی جانور قربان کرتے ہیں۔ خدا کو ان جانوروں کا گوشت پوست اور خون یا ہڈی نہیں پہنچتی بلکہ اس طرح قربانی کرنے

والے اپنے جذبۂ ایمانی کی تجدید کرتے ہیں اور اس طرح سنتِ ابراہیمی کو فروغ دیتے ہیں۔ ایثار اور قربانی کی یہی وہ دینی رسم ہے جس کی تائید اور تجدید کی بکثرت مثالیں تاریخ اسلام میں ملتی ہیں جن میں ایک واقعۂ کربلا بھی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی قربانی کی اس مثال کو بے نظیر اور بے مثال سمجھا جاتا ہے۔ خود برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہو یا ۱۹۴۷ء کا انقلاب، ٹیپو سلطان شہید کے معرکے ہوں، یا سراج الدولہ کی شہادت، بہادر شاہ ظفر ہوں یا مولانا محمد علی، اور مولانا حسرت موہانی اس قربانی اور ایثار کی روایت کے نشانات مسلسل ملتے ہیں۔

تو یہ تو وہ تہوار مسلمانوں کے مذہبی تہوار ہیں لیکن عام تہوار اور تقریبات مختلف ملکوں میں موسموں فصلوں یا تاریخی واقعات کی یادگار کے طور پر منائے جاتے ہیں۔ ان میں سے سوائے ان تہواروں کے جو خالص غیر اسلامی تھے، مسلمانوں نے ہندی تہواروں اور تقریبوں میں بلا تکلف حصہ لیا اور انھیں اپنی معاشرت کا جزو بنا لیا۔ بلکہ ایسے تہوار جن میں ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی، ان کی بھی پوجا کو چھوڑ کر تفریحی عنصر کو قبول کر لیا۔ ان تہواروں اور تقریبوں میں مسلمانوں کی شرکت کا اندازہ اردو ادب کی تاریخ سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اردو زبان خود بھی برصغیر میں ہندی اور اسلامی تہذیب کی آمیزش اور آویزش سے بروئے کار آئی تھی۔ حضرت امیر خسرو کی، ابتدائی نصف ہندی اور نصف فارسی شاعری سے لے کر دکن میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام تک (جس میں مقامی تہواروں اور تقریبوں پر کئی نظمیں شامل ہیں) اور پھر نظیر اکبر آبادی کی کلیات میں اس کلچر کی بڑی نمایاں تصاویر موجود ہیں جس کو ہند لمانی (Indo Muslim) کلچر کا نام دیا جا سکتا ہے

یہ ہند لمانی کلچر مسلمانوں اور ہندوؤں کے کلچر کے میل جول اور ایک پر دوسرے کے عمل اور ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوا لیکن خود مسلمانوں کے کلچر میں مختلف عناصر موجود تھے کیونکہ تمام مسلمان جو اس ملک میں کسی نہ کسی حیثیت سے پہنچے ہیں، ایک ہی شہر یا ملک کے رہنے والے نہ تھے اور نہ ایک وقت میں برصغیر میں داخل ہوئے تھے۔ محمد بن قاسم سے لے کر بابر تک فاتحین کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اصلاً اور نسلاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں عرب بھی ہیں، ایرانی بھی، افغانی بھی، مغل بھی، اور ان میں ہر ایک اپنی ایک الگ کلچر اور ثقافت کا نقیب ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خالص مسلمانی کلچر بھی مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ البتہ درست ہے کہ اس تہذیب و ثقافت پر، جسے مسلمانی کلچر کہہ سکتے ہیں، شباب اور نکھار مغلوں کے دورِ حکومت میں آتا ہے کیونکہ سیاسی اور تاریخی اعتبار سے بھی یہی دور ان کی حکومت اور سلطنت کے شباب اور عروج کا دور ہے۔ اس دور میں تان سین جیسا مغنی پیدا ہوتا ہے تاج محل جیسی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ دلی کا لال قلعہ۔ دیوان خاص۔ ایوان عام۔ لاہور کا شالامار باغ اور شاہی مسجد وجود میں آتے ہیں۔ اسی دور میں فارسی زبان مغلوں اور ایرانیوں کے کلچر کا سب سے بڑا نشان، اس ملک کی سرکاری، عدالتی اور تہذیبی زبان قرار پاتی ہے اور اسی دور میں مغلوں کی فیاضی اور علم پرستی کی داستانیں سن سن کر عالمِ اسلام سے ارباب علم و فن کشاں کشاں دہلی چلے آتے ہیں اور بلاشبہ دہلی مرحوم کو فخر البلاد بنا دیتے ہیں۔ ان سے مسلمانوں کے فاتح کلچر کی چھاپ نہ صرف تہذیب و تمدن پر بھی لگ جاتی ہے اور دوسری طرف اس ملک میں رہتے رہتے میل ملاپ سے یہاں کے تمدن اور معاشرت سے متاثر ہونے اور اجنبیت بہت جلد انس و محبت میں بدل جاتی ہے خاص طور پر اکبر کے دور سے جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی اور سماجی اتحاد بہت بڑھتا ہے اور ہندو شہزادیاں مغل حرم سرا میں داخل ہوتی ہیں تو یہ اثرات اور بھی زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتے ہیں چنانچہ ان ہی محلات میں وہ تہذیب جنم لیتی ہے جو دورِ آخر میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت ہے جس میں مسلمانی اور ہندی دونوں عناصر شامل ہیں۔

مسلمانوں نے تو اس طرح سے تہذیبی اور ثقافتی میل ملاپ کو آسانی سے قبول کر لیا لیکن بدقسمتی سے ہندو اس ردِ عمل کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہندوؤں میں ذات پات اور چھوت چھات نے جو شدت اختیار کر لی تھی وہ عام سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے محض تہذیبی میل ملاپ کے لئے بھی کوئی مفید صورت پیدا نہیں کر سکی۔ جو ہندو مسلمان کے ہاتھ کا کھانا نہ کھا سکے۔ اس برتن کو ناپاک سمجھے جسے مسلمان نے چھو لیا ہو، جو اپنے

کنویں سے مسلمان کو پانی نہ بھرنے دے، وہ ثقافتی اور تہذیبی ادغام کو کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ چنانچہ صدیوں کی کوششوں کے باوجود مسلمان اس ملک میں ایک مشترک کلچر اور ثقافت کی بنیادوں کو استوار نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنی زبان (عربی۔ ترکی۔ فارسی) کو چھوڑ کر یہاں کی اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کو اختیار کر لیا۔ اپنے لباس اور وضع قطع میں وہ ہندی کہلانے لگے۔ ان کے تہواروں، تقریبوں، میلوں ٹھیلوں میں مشترک تہذیب کے آثار ملنے لگے لیکن ہندوؤں نے اپنے آپ کو الگ تھلگ ہی رکھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی سلطنت میں ضعف آتے ہی یہ قومیں مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئیں شمالی ہند میں سکھوں اور جاٹوں نے مغلیہ سلطنت کا شیرازہ برہم کرنے کا منصوبہ بنایا اور دکن سے مرہٹوں نے اس کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلیہ سلطنت کمزور پڑ گئی لیکن کسی ہندوستانی قوم کو اس سلطنت کی وراثت نصیب نہیں ہوئی اور یہ ملک کم و بیش دو سو سال کے لئے انگریزوں کی غلامی پر راضی رہا۔ اس طویل عرصہ میں یہ بات روز بروز واضح ہوتی چلی گئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا راستہ الگ [illegible] ہے اور اگرچہ سیاسی اتحاد کے لئے بہت سی کوششیں کی جاتی رہیں لیکن ان سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ خلاف کی یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی کیونکہ اس کی بنیاد دو ایسی ثقافتوں پر تھی جن میں سے کوئی ایک دوسرے کو قبول کرنے یا سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ تھی۔ یہی تہذیبی اور ثقافتی اختلاف دو قوموں کے نظریے کی اصل اساس اور بنیاد ہے اور اسی نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ برصغیر میں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک آزاد وطن کا مطالبہ کریں۔ یہ وطن انھیں پاکستان کی صورت میں ملا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس تہذیب اور ثقافت کے تحفظ کے لئے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا، اس کے لئے ہم نے کیا کیا اور کیا کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد

ارتقائے اِنسان

پچھلی صدی کے نصف آخر میں جب ڈارون نے "ارتقائے و نزاعِ حیات" اور پھر "نسبِ انسان" پر اپنی کتابیں شائع کیں تو انگلستان کا وضعدار اور با وقار طبقہ بلبلا اُٹھا۔ بہت سے جلسے جلوس اُس کے خیالات کی تردید اور مذمت میں برپا کئے گئے۔ ڈارون جو بڑا شرمیلے مزاج کا آدمی تھا، خود تو پبلک جلسوں اور مناظروں میں شامل نہ ہوتا تھا لیکن اس کی طرفداری میں تومس ہنری ہکسلے اکثر ان بحثوں کے میدان میں اتر آیا کرتا تھا۔ ان مناظروں کی تلخی کا کچھ اندازہ اس ایک واقعے سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ جب ہکسلے کا مقابل اوکسفورڈ کا لاٹ پادری سیموئل ولبر فورس تھا تو ولبر فورس نے کہا "ہکسلے صاحب یہ تو میں نے مان لیا کہ بندر ہی آپ کا مورثِ اعلیٰ تھا لیکن یہ بھی تو فرمایئے کہ اس سے آپ کا رشتہ ننھیال کی طرف سے ملتا ہے یا دوھیال کی جانب سے؟"

ڈارون کا نظریۂ ارتقا چاہے کچھ بھی ہو، اس کے مخالفوں کے پاس یہ حربہ بڑا کارگر تھا کہ اس کے حلیفوں پر وہ بندر کی اولاد ہونے کی پھبتیاں اڑاتے اور ان کا منہ بند کر دیتے۔ اصل بات یہ تھی کہ انسان قدیم زمانوں سے اپنے آپ کو کائنات کا مرکز سمجھتا رہا تھا اب جب سائنس نے فیصلہ دیا کہ وہ بھی دوسری چیزوں کی طرح قوانینِ فطرت کا تابع ہے تو لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا "ان کی مسند توقیر و سیادت چھین لی گئی ہے۔ جب انگریزی تعلیم ہمارے یہاں آئی تو تاریخ انسانی کی مزعومہ تذلیل کا یہی پروپیگنڈہ یہاں بھی اثر انداز ہوا۔ لوگوں کو یہی سمجھایا گیا کہ اگر انسان نے بندر سے ارتقا پایا ہے تو پھر روحانی بلندی اس کا حصہ کبھی نہیں ہو سکے گی۔ اکبرالہ آبادی جن کا اثر ہمارے قدامت پسند طبقے پر بہت گہرا تھا۔ فرماتے ہیں:

کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈارون بولا بوزنا ہوں میں
سن کے کہنے لگے مرے اک دوست — فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

حالانکہ یہی دلیل دوسری طرف بھی لے جا سکتی تھی۔ کہا جا سکتا تھا کہ اگر عرصۂ امکان میں اتنی ترقی ہو سکتی ہے کہ بندر بڑھ کر انسان بن جائے تو پھر انسان کیا نہیں بن سکے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دلیل بڑی قوت کے ساتھ دی بھی جا چکی ہے۔ مولانا روم کے خاصے مشہور شعر ہیں جو انسانی ارتقا کا بیان کرتے ہیں اور یوں شروع ہوتے ہیں ؎

آمدہ اول بہ اقلیمِ جماد — وز جمادی در نباتی اوفتاد

یعنی ہم اقلیم جمادی سے نباتی میں اور پھر نباتی سے اقلیم حیوانی میں آئے اور آخرکار حیاتِ انسانی میں داخل ہوئے۔ دلیل مولانا روم کی یہ ہے کہ ہمارا ہر نیا مقام پچھلے مقام سے ارفع ہے۔ پس پیچھے دیکھنا ہمیں بکار آمد نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم آگے چل کیا ہو جائیں گے۔ میں یہاں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر روحانی مدارج کے خیالات کے بارے میں ہمیں اکبر الہ آبادی یا مولانا روم میں سے کسی ایک کی بات ماننی پڑے تو کم از کم میں تو مولانا روم کی بات کو ترجیح دوں گا۔ اور کیا قرآن شریف میں کئی جگہ نہیں آیا کہ انسان جو زمین پر خلیفۃ اللہ ہے اس کی اصل اور پیدائش ایک گندگی سے ہے۔ تو پھر کیا ہم اپنی اصل ہی کو اپنی ساری

حقیقت سمجھیں! اس سے تو لازم آئے گا کہ ہمیں ہر طرح گندہ ہی رہنا چاہیئے، گندے افکار، گندی گفتار اور گندے عمل ــــ تو میرے کہنے کا ما حصل یہ ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ ہماری ابتدا ادنیٰ تھی تو اس سے بدکنا نہیں چاہیئے بلکہ یہ تو ایک خوبی ہے کہ عملِ ارتقا ہمیں سطحِ ادنیٰ سے سطحِ اعلیٰ کی طرف لے جا رہا ہے۔

انسان کے تدریجی ارتقا کے نظریے کے خلاف اہلِ مذہب تو تھے ہی، شروع میں کچھ اہلِ سائنس بھی اس کے خلاف رہے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں لینیئس کا، جو ذوالحیات کی سائنسی قسم بندی کا بابا آدم مانا جاتا ہے، یہ حتمی فیصلہ تھا کہ انواعِ حیات، بالکل الگ الگ ہے، کسی ایک کا کسی دوسری سے کوئی جوڑ نہیں، بلکہ ان کی تعداد بعینہٖ اتنی ہے جتنی کہ کبھی کشتیِ نوح میں داخل ہوئی تھی۔ چنانچہ انسان بھی بطور ایک الگ نوع کے پیدا ہوا تھا اور دوسری انواع سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا نہ ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان کا پورا بدن اس نظریے کے خلاف ایک شہادت ہے۔ اگر انسان سچ مچ ایک الگ مخلوق پیدا کیا گیا تھا تو اس کے بدن میں کوئی ایسی فالتو شے نہ ہونی چاہیئے جو اس کے تو کسی کام کی نہ ہو لیکن اس کے نزدیکی جانوروں میں بکار آمد ہو۔ انسان میں دم نہیں ہوتی تو پھر کیوں دُم کی ہڈی کچھ مہروں کی صورت میں اس کی ریڑھ کے نچلے سرے پر موجود ہے؟ انسان اپنے کان نہیں ہلا سکتا اور اس کی اسے کوئی ضرورت بھی نہیں تو پھر کیوں کانوں کے ہلانے والے سارے عضلات اس کے سر کی طرفوں پر موجود ہیں؟ کچھ اسی طرح کی شے عقل ڈاڑھ ہے۔ پچیس سال انسان کی عمرِ عزیز کے گذر جائیں تو تب یہ نمودار ہوتی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ اب کیا اسے چنے چبانے تھے جو یہ نکل آئی ہے تو کوئی جواب نہیں ــــ اور یہ بال کیا وبال ہیں، ہمارے کس حیاتیاتی مصرف کے ہیں؟ دوسرے جانوروں میں تو یہ سردی روکنے کا ذریعہ تھے۔ کیا ہماری سردی بھی ان سے رُک سکتی ہے؟ انسانی جنین کا مطالعہ کریں تو وہاں بیکار چیزوں کا ٹھکانہ نہیں بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ایک ایسا مکان ہے جو بیکار چیزوں کا ٹھکانہ ہے۔ انسانی جنین کو دیکھیں تو وہاں مچھلی کے سے گلپھڑے دکھائی دیں گے، لمبی دم ہوگی اور سارا جسم بالوں سے ڈھنپا ہوا ہوگا۔ آخر ان سب بے مصرف اور بیکار چیزوں کے وجود کی کوئی معقول توجیہہ بھی ہے؟ اگر ہے تو صرف یہی کہ انسان بھی دوسری مخلوق کی طرح بتدریج اپنی موجودہ شکل اور عقل کو پہنچا ہے اور وہ ان سے الگ نہیں بلکہ وہ سب ایک ہی خون کے وارث ہیں۔

انسان کے بندروں سے خونی رشتہ رکھنے کی دوسری دلیل ان کی باہمی مماثلت ہے۔ مماثلت کی دلیل دوسرے ذوالحیات کے رشتوں کے بارے میں تسلیم کی جا چکی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں وہ قبول نہ کی جائے۔ دور نہ جایئے صرف چڑیا گھر تک چلیئے۔ تماشائیوں کی بھیڑ سب سے زیادہ بندروں، لنگوروں اور بن مانسوں کے کٹہروں کے گرد آپ کو نظر آئے گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف ان جانوروں کی جسمانی ساخت بلکہ ان کی حرکات و سکنات اور عادات بھی تماشائیوں کو اپنے جیسی دکھائی دیتی ہیں۔ چمپنزی کی ماں نہ صرف اپنے بچے کو گود میں لے کے بیٹھتی ہے بلکہ انسانی ماؤں کی طرح کسی وقت اسے جھلاتی بھی ہے۔ اس کا منہ چومتی ہے اور اس کے سر پر ہاتھ بھی پھیرتی ہے۔ پھر چمپنزی اور گوریلوں کے ہاتھ اور ان کی انگلیاں انسانی ہاتھوں اور انگلیوں سے اور ان سے جو کام لئے جاتے ہیں ان سے بے حد مماثل ہیں۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کتوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو سدھایا اور بہت کچھ سکھایا جا سکتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ خود کوئی نئی بات پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کا دماغ ایک حد تک چلتا ہے، اس سے آگے نہیں جاتا۔ لیکن چمپنزی کئی دفعہ انسان کی طرح بغیر کسی پرانے تجربے کے نئی چیز اپنے تخیلے سے پیدا کر سکتا ہے۔ پروفیسر کوہلر نے ایک چمپنزی کو دو ایسی چھڑیاں دیں جن کے سرے آپس میں جڑ سکتے تھے۔ پھر کوئی کھانے کی مرغوب شے چمپنزی کی ایک چھڑی کی دسترس سے باہر رکھ دی۔ کچھ دیر کی اُلٹ پھیر کے بعد چمپنزی نے ایک چھڑی میں دوسری چھڑی لگالی اور ان کی مدد سے اس کھانے والی شے کو اپنے تک کھینچ لیا۔ بالغ انسان اور بالغ چمپنزی میں جو مماثلت بیان کی گئی ہے، ان کے جنین کی مماثلت اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا جنین بہت چمپنزی نما اور چمپنزی کا جنین بہت انسان نما ہے۔

شاید کوئی کہے کہ انسان کی غایت درجہ مشابہت چمپنزی وغیرہ سے تو ہم مان لیتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان ان سے پیدا ہوا کیونکہ مشابہت سے دلیل دوسری طرف بھی جا سکتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسانوں سے پیدا ہوئے ہوں۔ اس شبے کے رد کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے

کہ معلوم کیا جائے کہ کون پہلے وجود میں آئے انسان یا ایپس؟ اگر اوراق الارض کے مطالعہ پر ایپس ہمیں پہلے نظر آئیں اور اس وقت انسان کا کہیں مذکور بھی نہ ملے تو معقول نتیجہ یہی نکالا جائے گا کہ انسان اپنے مشابہ ترین ایپس سے نکلا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج تک یہ کھوج نہیں لگایا جا سکا کہ وہ کون سی خاص نوع تھی جس کی تبدیلی اور ارتقاء سے انسان بنا۔ سائنس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ بندروں کی موجودہ انواع میں سے کوئی ایک نوع، نوعِ انسان کی مورث ہے۔ سائنس کی رو سے موجودہ ایپس کو انسان کے چچیرے بھائیوں کی مثال سمجھنا چاہیے۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ مختلف ایپس اور انسان کسی ایک ہی بڑے تنے سے ابھرے ہیں لیکن اس تنے کی وہ کون سی خاص شاخ تھی جس سے انسان نکلا، ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ بندروں اور ایپس کی شاخیں اس کے پاس کی شاخیں ہیں۔ بس انھی سے کچھ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود اس کی رفتہ و گزشتہ شاخ کی شکل و صورت کیسی ہوگی لیکن براہِ راست ابھی تک اس کے متحجر آثار نہیں دیکھے گئے۔

محققین کے نزدیک قدیم ایپس اور نوعِ انسان کے درمیان واقعی ایک کڑی تھی جسے وہ PITHECAN THAPS کے نام سے پکارتے ہیں PITHECAN THAPS آج سے کئی لاکھ سال پہلے زندہ تھا۔ اسے انسان تو نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ اپنی شکل و صورت، قد کاٹھ اور چال ڈھال کے لحاظ سے ایپس سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس کی کھوپڑی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دماغ ایپس سے بڑا تھا اور اس کا قد بھی سیدھا تھا۔ وہ ایپس کی طرح آگے کو جھک کر نہ چلتا تھا۔

مجھے توقع ہے کہ آپ جینس اور اسپیشیز کا فرق جانتے ہیں۔ اب تک جن مختلف بن مانسوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ابھی تک اس جینس کو نہیں پہنچے جسے "ہومو" کہا جاتا ہے جینس ہومو کی تین انواع یا اسپیشیز تھیں جو معدوم ہو چکی ہیں۔ ایک جرمنی کی ہومو اور دوسری جنوبی افریقہ کی HOMO RHODIMENSIS تھی اور تیسری Homo Reanderthalensis یا انسانی اینڈرتھل تھی۔ یہ تینوں انواع پچھلے پانچ لاکھ سال کے اندر اس دنیا میں موجود تھیں۔ ان میں سے تیسری نوع ایک ایسی معدوم انسانی نوع ہے کہ اس کی بہت سی باقیات ہمارے پاس ہیں۔ اس نوع کی یہ ایک عجیب و غریب رسم تھی کہ وہ اپنے مردوں کو بجائے یونہی پھینک دینے کے باقاعدہ دفن کیا کرتے تھے۔ اور ان کی قبر میں ان کے پتھر کے بنے ہوئے اوزار اور دوسری چیزیں رکھ دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے ڈھانچے اور ان کے استعمال کی بہت سی چیزیں آج کل بھی ملتی ہیں۔ اگرچہ ان کے ایک قسم کے انسان ہونے میں شبہ نہیں لیکن ان کی شکل و صورت موجودہ انسان یعنی ہومو سیپینز سے ایک درجہ مختلف تھی۔ ان کی بھنوؤں کی ہڈی بڑی نمایاں ہوتی تھی اور ٹھوڑی تقریباً غائب تھی۔ گردن بڑی موٹی اور ذرا آگے کو بڑھی ہوئی اور ٹانگیں کمان کی طرح ذرا باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً ہم سے زیادہ طاقتور جسم رکھتے ہوں گے کیونکہ ان کے ہتھیار اتنے بھاری ہیں کہ ہم انھیں بس چوم کر چھوڑ دیں بعض حکما کا خیال ہے کہ ہماری اپنی نوع یعنی ہومو سیپینز ان انسانوں کے ساتھ بھی کچھ عرصہ رہی ہے اور ان کا کچھ نہ کچھ خون ہماری رگوں میں بھی چلتا ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہماری موجودہ نوعِ انسانی جینس ہومو ہی کی ایک نوع ہے اور اس کا سائنسی نام محققوں نے ہومو سیپینز رکھا ہے جس کا اردو ترجمہ "عقل والا انسان" کیا جا سکتا ہے۔ یہ نام اس خیال سے ہمیں عطا ہوا ہے کہ ہم اور ہماری نوع میں وہ محقق بھی شامل ہیں جنھوں نے یہ نام رکھا ہے۔

بہرحال موجودہ نسلِ انسانی کی عمر زیادہ نہیں۔ بہت ہوگی تو پانچ لاکھ سال ہوگی ورنہ دو ایک لاکھ سال، جو حیواناتِ مقادمہ کی پچاس کروڑ اور ہمالیہ کی پندرہ کروڑ سالہ عمر کے سامنے کچھ بھی تو نہیں۔ اور باقاعدہ بستیوں میں رہنے اور دستکاری اور زراعت کاری کی مدت تو دس بارہ ہزار سال سے زیادہ نہیں۔ آنے والے وقت کا کوئی انت نہیں۔ زمین کی سطح کے حالات سازگار ہیں اور ارتقاء کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ انسانی نوع کی تھوڑی سی عمر دیکھ کر نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کیا کیا امکان پوشیدہ ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کی رسائی کہاں تک ہوگی اور وہ کیا سے کیا بن جائے گا۔ سائنس اور شعر میں بڑا فاصلہ ہے لیکن آج کی بات اقبال کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

ڈاکٹر محمد اجمل

نفسیات — ایک سائنس

آخر یہ نفسیات ہے کیا بلا؟ عوام کے لئے اور بہت سے طلباء کے لئے نفسیات "جادو" کی طرح کوئی کالا علم ہے۔ بہت سے لوگوں کے لئے نفسیات لوگوں کو تنویم کی کیفیت میں لانے کے ملکہ کا نام ہے۔ بہت سے لوگ ماہرین نفسیات سے ڈرتے کتراتے ہیں کہ کہیں پہلی ہی ملاقات میں وہ ہمارے خیالات کا اندازہ نہ کر لیں یا ہمارے سینے کے راز ہائے سربستہ معلوم نہ کر لیں۔ کچھ لوگ نفسیات اور روزمرہ کی سوجھ بوجھ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ وہ محض کونین کی گولی پر شکر کا لیپ دینے کو نفسیات تصور کرتے ہیں۔ پھر ہر کارآگاہ اور کارپرداز اپنے آپ کو ماہر نفسیات سمجھتا ہے اور اس لئے ماہر نفسیات کو یا تو ایک بیکار اور فاضل وجود سمجھا جاتا ہے یا اسے ایک شعبدہ باز کا مقام عطا کر دیا جاتا ہے۔

آج ہم جس نفسیات کا ذکر کرنے والے ہیں وہ ایک سائنسی علم ہے جو نہ جادوگری ہے، نہ شعبدہ بازی۔ ماہرین نفسیات جب نفسیات کو سائنس کہتے ہیں تو وہ خوب جانتے ہیں کہ نفسیات کو سائنس کا درجہ دینے کا کیا مطلب ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس علم کے نتائج قطعی ہیں، یا اس کے اطلاق سے وہی معرکہ آرا کرشمے ظہور پذیر ہوں گے جو طبیعیات اور کیمیا کے اطلاق سے پیدا ہوئے ہوں۔ نفسیات کو ہم سائنس اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے اسالیب مطالعہ، سائنس کے اسالیب ہیں۔ ان اسالیب کی بنیادیں دو ہیں۔ ایک مشاہدہ، دوم تجربہ۔ ان اسالیب کے اصولوں کو ہم یوں بیان کرسکتے ہیں۔

ہر ذہنی کیفیت اور خارجی عمل کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔

انسان اس امر کی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ ان اسباب کا مشاہدہ کرسکے، ان کا تجزیہ کرسکے، ان کی پیمائش کرسکے اور ایسے کلیے قائم کرسکے جن کی مدد سے ہم انسانی اور حیوانی کردار کے متعلق پیش گوئی کرسکیں۔

وہ کلیات جو ہم اس کردار کے بارے میں قائم کرتے ہیں وہ اس آسان پیرائے میں بیان ہوسکتے ہیں جس کی وہ توجیہ کرتے ہیں۔

یہ اصول تمام سائنس کے اصول ہیں۔ ان اصولوں کی پیروی میں ضروری ہے کہ کچھ مفروضے بنائے جائیں اور پھر مشاہدے اور تجربے کے ذریعے ان مفروضوں کی صحت یا عدم صحت کا تعین کیا جائے۔ مثلاً چند ماہرین نفسیات نے یہ مفروضہ بنایا کہ غیر ملکی زبانیں پڑھانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جب طلبا تنویم کی حالت میں ہوں تو ٹیپ ریکارڈ انھیں کسی غیر ملکی زبان کا درس دیا کرے۔ چنانچہ اس مفروضے کی صحت کے تعین کے لئے تجربہ کیا گیا کہ چند طلبا پر تجربہ گاہ میں تنویم کی حالت طاری کر دی گئی اور انھیں کسی غیر ملکی زبان کا درس دیا گیا۔ تنویم کی حالت سے باہر آنے پر ان سے اس زبان کے متعلق سوالات کئے گئے۔ لیکن یہ دیکھا گیا کہ طلبا اس نوعیت کے درس و تدریس کے باوجود اس زبان سے نابلد رہے جیسے یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا۔

جہاں مفروضوں کے صحیح ہونے کی تاریخ ہے، وہاں سائنس اور نفسیات کی تاریخ بہت سے مفروضوں کے غلط ثابت ہونے کی تاریخ بھی ہے۔ کسی سائنس نے اس طرح ترقی نہیں کی کہ ترقی کے شاہراہ مستقیم پر گامزن رہی ہو۔ راہ میں ہزاروں نشیب و فراز آئے، پائے تجسس کو ہزاروں ٹھوکریں لگیں اور پھر کہیں حقیقت نے اپنا ایک رخ بے نقاب کیا۔ نفسیات جب پیش گوئی کا ذکر کرتی ہے تو اس تصور پر کئی پابندیاں عاید کرتی ہے۔ یہ پیش گوئی قطعی اور مطلق کبھی نہیں ہوتی۔ اس میں ساتھ ساتھ کچھ شرائط

بھی لگا دی جاتی ہیں کہ اگر حالات یوں ہوئے تو ممکن ہے یہ واقعہ رونما ہو، اگر حالات یوں نہ ہوئے تو ممکن ہے یہ واقعہ یوں رونما نہ ہو۔ پھر نفسیات غالباً ایک واحد علم ہے جو پیش گوئی کے تصور کے علاوہ پس گوئی کے تصور سے بھی کام لیتا ہے۔ مثلاً آپ کسی بالغ شخص میں حد سے زیادہ اکڑ فوں یا بار بار تکبر دیکھتے ہیں، اس تکبر کی موجودہ کیفیت کے متعلق پوری معلومات حاصل کر کے آپ یہ فرض کرتے ہیں کہ اس شخص کے بچپن میں ضرور ایک دو ایسے واقعات ہوئے ہیں جن کی وجہ سے وہ شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ اس "پس گوئی" کی تصدیق کے لئے اس سے یا اس کے اعزہ و اقارب سے اس کے بچپن کے حالات معلوم کرتے ہیں۔ اگر ایسے واقعات مل جائیں تو یہ پس گوئی صحیح ثابت ہوئی، اگر نہ ملیں تو غلط۔ نفسیات کی ایک شاخ جسے ہم بچوں کی نفسیات کہہ سکتے ہیں "پس گوئی" کی تصدیق کے عمل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ کچھ دیر تو لوگوں نے بلوغت کی کیفیات ہی سے بچپن کے حالات کا اندازہ لگانے کو کافی سمجھا لیکن اس کے بعد ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ بچپن کا بھی براہِ راست مطالعہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ برطانیہ اور امریکہ میں کئی جگہ ماہرینِ نفسیات، بچے کا پیدائش ہی سے نفسیاتی مطالعہ شروع کرتے ہیں تاکہ اگر بعد میں کوئی بچہ ایک عظیم ہستی بن جائے تو ہمیں اس کے سوانح نویسوں کے تخیل کا رہینِ منت نہ بننا پڑے اور اگر وہ کوئی مجرم بن جائے تو دستاویزوں میں اس کا سبب موجود ہو۔

فطرت کا مطالعہ کسی قدر آسان ہے کیونکہ فطرت ایک خارجی حقیقت ہے اور انسان اس کا خارجی مشاہدہ کرتا ہے لیکن انسان جب انسانی ذہن کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ خود ہی شاہد ہے اور خود ہی مشہود۔ اس لئے اس کے مطالعہ میں کچھ الجھی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن بعض ماہرینِ نفسیات ان مشکلات سے بالکل پریشان نہیں ہوئے بلکہ ان کی وجہ سے اُن کی ہمت اور تجسس کو ایک تازیانہ لگا اور انھوں نے انسانی ذہن کے متعلق بہت نادر اور قیمتی انکشافات کئے۔ فرائیڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے انسانی ذہن کے متعلق جیسے بھی انکشافات کئے وہ اپنے آپ کے مشاہدے سے کئے۔ اس نے پہلے اپنے خوابوں کا تجزیہ کیا، اپنی ذہنی بیماریوں کا مطالعہ کیا اور اس مشاہدے سے پیدا شدہ مفروضوں کو اپنے مریضوں پر بھی آزمایا لیکن کچھ ماہرینِ نفسیات ایسے بھی تھے جنھوں نے ان مشکلات کا حل یہ نکالا کہ انسان اپنا مشاہدہ بالکل نہ کرے، بلکہ دوسرے انسانوں کا مشاہدہ کرے اور اس کے ساتھ حیوانوں کا بھی مطالعہ کرے اور جو نتائج اس مطالعے سے مرتب ہوں، وہ اپنے آپ پہ عائد کرے۔ اس طرزِ فکر کا موجد واٹسن تھا جو طبیعیات اور کیمیا کی چکاچوند سے بہت متاثر تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ نفسیات بھی ستاروں پر کمند پھینک سکتی ہے۔ وہ شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ یزداں پر کمند پھینکنے کے لئے پہلا اسلوب مشاہدہ بہتر ہے۔

نفسیات کے لئے مشاہدہ کی وہی شرائط ہیں جو کسی اور سائنس میں ہیں۔ مثلاً یہ کہ مشاہدہ غیر جانبدار، اور حتی الامکان تعصب سے عاری ہونا چاہیئے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایک ہی عمل کا بار بار مشاہدہ ناممکن ہے کیونکہ قدرت اتنی فیاض نہیں ہے کہ ایک ہی واقعہ کو جوں کا توں دہرائے اس لئے ہمیں تجربہ کرنا پڑتا ہے۔ نفسیات میں تجربے کی نوعیت یہ ہے کہ ایک شخص شاہد بنتا ہے اور دوسرا مشہود۔ شاہد یا عامل، معمول کو کوئی خاص کام کرنے کو کہتا ہے مثلاً یہ کہ چند بے معنی آوازوں کو یاد کرو، پھر وہ یہ دیکھتا ہے کہ کتنی مرتبہ کی تکرار سے وہ بے معنی الفاظ کی ایک فہرست یاد کرتا ہے۔ اس تجربے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معمول کے حافظے کی قوت کیسی ہے۔ افراد سے گذر کر اجتماع پر بھی تجربے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی پچاس آدمیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر کے ایک ہی مقام پر چند دن رہنے کا موقع دیا۔ اس کے بعد ان گروہوں کو مختلف قسم کے لباس پہنا دیئے۔ ان کے علیحدہ علیحدہ نام بھی رکھ دیئے۔ ان کے رہنے کی جگہوں کو مختلف قسم کی آسائشوں سے آراستہ کر دیا۔ اس کے بعد ان کے آپس میں میچ کرائے حتیٰ کہ ان میں باہمی مخالفت اور عناد کے جتنے بھی بیج بوئے جا سکتے ہیں بو دیئے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ پھر یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر لڑ پڑتے ہیں۔ اس قسم کے تجربات سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ تعصب اور عناد کیوں کر پیدا ہوتے ہیں۔ اور کیسے پھیلتے پھولتے ہیں۔ اب تو نفسیات کی ہر شاخ میں تجربے ہونے لگے ہیں۔ ولیم جیمز نے کہا تھا کہ نفسیات ابھی سائنس نہیں ہے محض سائنس کی امید ہے لیکن یہ بات پرانی ہو چکی۔ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نفسیات بہت حد تک سائنس بن چکی ہے۔

منٹو بھائی

عطیہ فیضی

کہتے ہیں کہ ایک بار ایک پٹواری کی بڑی چہیتی گھوڑی مر گئی۔ اس گھوڑی کا افسوس کرنے کے لئے دور دراز سے لوگ آئے۔ سات روز تک صفیں بچھی رہیں، پھر ایک روز خود پٹواری فوت ہو گیا مگر گھوڑی کی فوتیدگی پر افسوس کرنے والوں میں سے کوئی بھی ماتم پرسی کو نہ آیا کیونکہ بدقسمتی سے اسی روز تحصیلدار کی گھوڑی مر گئی تھی۔

مذکورہ بالا حکایت کا مندرجہ ذیل حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے

بیگم عطیہ فیضی فوت ہو گئیں

مگر صرف عطیہ بیگم ہی فوت نہیں ہوئیں۔

علم و ادب کی ایک صدی بھی ختم ہو گئی ہے۔

فنون لطیفہ کا ایک ادارہ بھی ویران ہو گیا ہے۔

علم و حکمت کی ایک دانش گاہ بھی اُجڑ گئی ہے

مشرق کا ایک افتخار بھی لٹ گیا ہے

برصغیر کا ایک اعزاز بھی چھن گیا ہے۔

۴ جنوری کو کراچی کے ایک ہسپتال میں اتنے سارے سانحے ایک دم اور ایک ساتھ کیسے رونما ہو گئے؟ میری محدود علم اور مختصر عمر کی نسل اس سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اسے تو شاید ان حادثات کے رونما ہونے کی خبر اور ان نقصانات کا احساس بھی نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب علامہ اقبال، مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور قائد اعظم محمد علی جناح جیسی احسان مند ہستیوں کے آنسو ہی دے سکتے تھے۔ جو عطیہ بیگم کی موت کی قسمت میں نہیں تھے۔

اس سوال کا جواب استنبول کے رئیس حسن علی فیضی دے سکتے تھے جنہوں نے اپنی روشن دماغ بیٹیوں کو مغربی اور مشرقی علم، ادب اور فن کی دولت سے مالا مال کیا مگر وہ غروب آفتاب کی خونی رنگ شفق کا منظر نہ دیکھ سکے۔

اس سوال کا جواب سلطان عبد الحمید دے سکتے تھے جنہوں نے اپنے ہاتھ سے عطیہ بیگم کو خواتین کا سب سے بڑا اعزاز "شفقت نشان" دیا تھا، مگر وہ ہاتھ اب "شفقت نشان" کی قبر پر پھول نہیں چڑھا سکتے۔

اس سوال کا جواب بڈاپسٹ، میونخ، لندن اور کیمبرج کی وہ علمی ادبی اور ثقافتی مجلسیں دے سکتی تھیں جن کی روح رواں عطیہ بیگم تھیں اور جن محفلوں میں نطشے اور افلاطون سے فلسفے، شاعری، موسیقی اور مصوری پر بحث کی جاتی تھی۔ یہی وہ محفلیں تھیں جن سے علامہ اقبال نے فکر و نظر کی گہرائی اور گیرائی، لطافت کی انا اور گرمی خیال کی فکر مجنوں

۱۲۔ عطیہ بیگم کی کتابیں، اقبال اور عطیہ اور اقبال کے چند خطوط کے سوا اور کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

اس سوال کا جواب فکری ہیجانات کی انقلابی تبدیلیوں کے حال کا جائزہ لینے والے وہ ماہرین ادب دے سکتے ہیں جنہیں جاننا چاہیئے کہ لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی؟ لکھنے والے بانگ درا کے مصنف اقبال کو "پیام مشرق" اور "جاوید نامہ" کا خالق علامہ اقبال کس نے بنایا، اور مولانا شبلی جیسے علم و فضل کے بوجھ تلے دبے ہوئے انتہائی سنجیدہ مفکر کو فارسی کی انتہائی شگفتہ غزلیں لکھنے پر کس نے مجبور کیا۔ مگر یہ ماہرین گندے اور ناپاک جنسی ہتھکنڈوں سے مسموم فضا میں عورت اور مرد کے درمیان جسمانی رشتے کے علاوہ اور کسی تعلق کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس سوال کا جواب مولانا شبلی کا وہ مضمون دے سکتا ہے جس میں عطیہ بیگم کو پرستش کے لائق قرار دینے میں صرف ایک رکاوٹ محسوس کی گئی تھی اور وہ یہ کہ اسلام میں خدا کے علاوہ اور کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ مگر یہ مضمون شبلی کی حیات معاشقہ کے مصنف کی .... قدر ناشناسی اور احسان فراموشی کی نذر ہو گیا۔

اس سوال کا جواب امریکہ کی وہ دانش گاہیں دے سکتی ہیں جہاں بیگم عطیہ نے مشرقی تہذیب و ثقافت پر ۵۵ لیکچر دیئے یا پھر پیرس کی سوربون یونیورسٹی جہاں عطیہ بیگم کے لیکچرز علمی خزانے میں نوادر کی حیثیت سے محفوظ ہیں مگر ہماری دانش گاہیں ان علمی خزانوں سے محروم ہیں۔

اس سوال کا جواب بمبئی کا لاکھوں کی مالیت کا "ایوانِ رفعت" دے سکتا ہے جسے عطیہ بیگم قائد اعظم کے ایک اشارے پر قربان کر کے کراچی تشریف لے آئیں اور یہاں اپنے نئے وطن میں نیا "ایوانِ رفعت" قائم کیا جو عالموں، سیاست دانوں، ادیبوں اور فن کاروں کا مسکن تھا۔ مگر آج کراچی کا ایوان بھی بمبئی کے ایوان کی طرح ویران ہے۔

اس سوال کا جواب قربانی کا وہ جذبہ دے سکتا ہے جس کے تحت عطیہ بیگم نے ۱۹۵۷ء میں اپنا تمام اثاثہ حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا تھا مگر قربانی کے اس جذبے کی کوئی قدر و قیمت ہمارے دلوں میں نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب وہ مائیں دے سکتی ہیں جو اپنی بچیوں کا نام عطیہ محض اس امید پر رکھتی تھیں کہ اُن میں عطیہ بیگم کی صفات کی کوئی جھلک آ جائے، مگر وہ مائیں بھی اب قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔

اس سوال کا جواب جارج پنجم شاہ بھی دے سکتے تھے جنہوں نے مشرق کو عطیہ بیگم جیسی عظیم خاتون پیدا کرنے پر خوش قسمت قرار دیا تھا۔

خوش قسمتی سے مغرب کا یہ عظیم دانشور جو کسی کی تعریف کرنے میں انتہائی کنجوس تصور کیا جاتا ہے۔ آج اس دنیا میں نہیں ہے ورنہ وہ اُس مشرق کی اُس نسل کو ضرور بدقسمت قرار دیتا جو صدر کینیڈی کے قاتل اوسوالڈ کو قتل کرنے والے جیک روبی کے بارے میں عطیہ بیگم سے زیادہ معلومات رکھتی ہے۔ مروت بہت ظالم ہے مگر اتنی ظالم نہیں جتنی احساسِ زیاں سے محرومی!

(بشکریہ "اخبارِ جہاں")

افضل منہاس

(نذرِ شکیب)

○

خوں بھرے ہاتھوں کو جانے کون آکر دھو گیا
ایک چہرہ سرخ پانی کی تہوں میں کھو گیا

چار جانب سے لگے پتھر تو ٹوٹی شاخ شاخ
پیڑ یوں گھائل ہوا، زخموں سے دُہرا ہو گیا

پہلے موجوں کی فصیلیں ہر طرف تھیں مُستعد!
ایک کشتی ڈوبتے ہی کیوں سمندر سو گیا

دام جب پھیلے ہوئے دیکھے زمیں پر چار سُو
ایک طائر آسماں کی وسعتوں میں کھو گیا

ایسی پتھرائی ہوئی آنکھیں کبھی دیکھی نہ تھیں
جس نے بھی جا کر انھیں دیکھا وہ پتھر ہو گیا

میں نے رو رو کر پڑھی ہے آخری اس کی غزل[1]
جس کو سوچا تک نہ تھا وہ حادثہ بھی ہو گیا

آج سرگودھا کی مٹی کتنی افضل ہو گئی
اُس کے دامن میں شکیب ایسا سخنور سو گیا

[1] مطبوعہ فنون ۲۸

اقبال منہاس

شکیب کی منفرد غزل

شکیب کا تعلق اس دور سے ہے جب غزل کی نشاۃ الثانیہ کے بعد اس کا زوال شروع ہوا۔ اردو غزل کے لئے یہ دور اضطراب، کشمکش اور بے چینی کا دور تھا مسلسل تدریجی ارتقا کے بعد بلندی سے پستی کی جانب یہ سفر غزل کی صدیوں پرانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ زندگی کے دیئے ہوئے مسائل کو سمونے والی غزل محدود دائرے میں سمٹنے لگی تھی۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ غزل انحطاط کے سبب شخصی رجحان کے زیر اثر سطحی مسائل کے اظہار کا وسیلہ بننے لگی تھی۔ غزل گو شاعر کی داخلی زندگی کے محرکات، خارجی دنیا کے تقاضوں اور مشینی دور کے انسان کی بدلتی ہوئی ذہنی کیفیات کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ غزل کی رہی سہی عظمت کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے غزل کے مخالفین نے تابڑ توڑ حملوں کا آغاز کیا اور بحیثیت صنف سخن غزل کو پامال کرنے کے لئے ایک منظم مہم کی تشکیل کی۔ بے یقینی کے اس دور میں غزل کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا دینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس سے نئے ایسے نابغۂ روزگار کی ضرورت تھی جو عقلی دلائل، قلم کی حرکت اور معاشرتی شعور کے سہارے غزل میں بنیادی تبدیلیوں کی ملاحیت رکھتے ہوں۔ جو ماضی اور حال کے ساتھ ساتھ مستقبل قریب میں پیدا ہونے والے اہم مسائل کو سمجھنے اور پرکھنے کا بھی شعور رکھتے ہوں جو ایثار کی برقی مروانت مرد جرأت سے پیدا ہو کر صدیوں پرانی اس کی نامعلوم کیفیت کو نئے ڈھانچے میں ڈھال دیں گے۔

اسے اردو غزل کی خوش قسمتی کہیے کہ ٹھیک اس وقت جبکہ مخالفین غزل کے تنومند ہاتھ غزل کے شاہی محلات پر دستک دے رہے تھے۔ غزل کے دھندلاتے ہوئے افق پر یکایک کچھ روشن نام طلوع ہوئے۔ جدید تر غزل گو شعراء نے مختلف محاذوں پر طبع آزمائی شروع کی۔ اس دور میں اردو شاعری کے افق پر کئی نئے نام ابھرے۔ نئے شعری تجربے ہوئے، غزل میں نئے علائم اور نئے رموز، اور نئی لفظیات تشکیل ہونے لگے اور یہیں سے تخریب کے بعد اردو غزل کی تعمیر کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ بہرحال یہ دور بھی تعمیر کا دور نہیں تھا۔ جدید تر غزل گو شعرا مختلف مکاتب فکر سے متعلق تھے۔ اور غزل کے احیاء کے لیے ان کے سامنے واضح نصب العین نہیں تھا۔ جدید غزل گو شعرا نے غزل کی لمحہ لمحہ گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کے لئے ہندی دیومالا اور اساطیر کا سہارا لیا۔ اگرچہ یہ طریق کار اپنی جگہ درست تھا۔ لیکن انہوں نے اسے ہی اپنا مخصوص تہذیبی تصور کر لیا۔ اگر کرنے کا رجحان ان کے راستے کی دیوار بن گیا۔ اس طرح اردو غزل شعری اور قومی سطح پر کامیاب ہونے کے باوجود اجتماعی سطح پر کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ برصغیر کی آزادی کے بعد پیش آنے والے خونیں واقعات سے متاثر ہو کر ہمارے ہاں سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی غزلیں کہنے والے شاعر دراصل اپنی ذات کے خول میں سمٹ گئے۔ یہ چونکہ زبردستی تھی، ان کی تخلیقی قوتوں کو تحریک دینے کا ذریعہ ہوئی۔ اسی دوران میں ایک المناک حادثہ یہ ہوا کہ جاندار غزل کی تخلیق کرنے والے بیشتر شاعروں نے بدلتے ہوئے حالات کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور جدت پسندی کا یہ جنون کسی شاعر کو کمال یا نام کی تلاش میں اس حد تک لے جاتا رہا، اور وہ اس کے مشغلے سے بالاتر ہو کر بھی انتہا کو پہنچ گئے۔ سرمایہ دار طبقے کی سنگ آمیز سطح کو نظرانداز کرنا یہ سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ اکثر شاعروں نے غزل کی منجمد سطح کو روایتی دیئے کے ساتھ جس عجب منظر پیش کیا۔ اور اپنے داخلی تنہائی کے نئے رنگ کے الفاظ و معانی کا استعمال کچھ اس ڈھب سے کیا کہ غزل نکھرنے کے بجائے بکھرنے لگی۔ اور دبستان لکھنؤ کی غزل میں لکھنؤ والا مزاج نہ بن سکا۔ روایت ایک بار پھر جانب داری سے ...

سنجیدہ اور اعتدال کے اس اُمڈتے ہوئے سیلابِ بے اماں کو روکنے کے لئے شکیب کی تنومند آواز اُبھری اور نشاۃ الثانیہ کے بعد معرضِ زوال میں آنے والی غزل کے سنبھلنے کے امکانات واضح ہونا شروع ہوئے۔ اس دور کے متعلق جناب احمد ندیم قاسمی کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ "اگر اس دور میں شکیب جیسے شاعر پیدا نہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ اردو غزل ایک دم دو سو سال پیچھے چلی جاتی اور آئندہ نسل میں اس کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہتا۔" شکیب کی غزل نے اردو شعر و ادب کے قاری کو بتایا کہ غزل گو بیسویں صدی کے نصف آخر کا ایک باشعور ذہن ہو تو کیسی غزل کہہ سکتا ہے۔ وہ ایسی غزل کہہ سکتا ہے جس میں عصرِ رواں کی روح بول رہی ہو اور جو اس کے باوجود غزل ہو۔

جہاں تک غزل کے روایتی فنی لوازمات کا تعلق ہے شکیب کے ہاں ایسے کسی فنی انحراف یا بغاوت کی مثال نہیں ملتی لیکن اس التزام کے باوجود روایتی غزل کے پرستاروں کو شکیب کی غزل یقیناً مایوس کرے گی۔ وہ اس لئے کہ انہیں اس میں نہ تو پٹے ہوئے موضوعات کی تکرار ملے گی اور نہ ہی لب و رخسار، زلفِ عنبریں، کاکلِ مشکبو، گیسوئے سیاہ اور گل و بلبل کی بھرمار۔ شکیب کے ہاں ان سب چیزوں کی تلاش سعیِ لاحاصل کے مترادف ہے۔ روایتی غزل کے پرستاروں کے لئے میرے پاس وہی جواب ہے جو نامور مفکر جبران نے اپنی اولین کتاب کی اشاعت کے وقت اپنے معترضین کو دیا تھا۔ جب جبران کی کتاب شائع ہوئی تو عربی ادب میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ جبران کی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے اُسے پاگل ٹھہرایا۔ منفی تنقید کے اس بپھرے ہوئے اور بے ہنگم طوفان میں جبران کی آواز گونجی:

"میں اس دور کے ہر باشعور فرد سے پچاس پچاس گنا اونچا ہوں۔"

یہی بات شکیب کی غزل کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اس وقت جبکہ بحیثیت مجموعی غزل تقلید کی زد میں ہے شکیب یقیناً اپنے ہم عصر غزل گو شعراء میں پچاس پچاس گنا اونچا نظر آتا ہے۔ اور یہ کیفیت اس منفرد طرزِ احساس کی مرہونِ منت ہے جو اُسے ودیعت کی گئی تھی۔ اس وقت جبکہ نظریات میں ہم آہنگی اور نصب العین کا فقدان غزل کو کشمکش اور بیزاری کے ایک عجیب سنگم پر لے آیا تھا۔ شکیب نے اسے بے کیف اور بے رنگ فضاؤں سے نکالنے کی بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا نام تخریب کے دور میں تعمیر کی علامت بن گیا۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے جدید شاعری کا محاسبہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے "جدید شاعری کا آہنگ انجنوں کے شور کے مترادف ہے۔" انجنوں کا شور یعنی صنعتی انقلاب۔ دراصل اس کے پس منظر سے ابھرنے والے ان گنت اور پیچیدہ مسائل کی طرف اشارہ ہے جو مشینی دور کے مسائل آج کے انسان کا سب سے بڑا [illegible] ہیں اور کوئی بھی باشعور لمحہ انہیں نظر انداز کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن جہاں تک اردو غزل کا تعلق ہے اس کے مدتوں پرانے سکہ بند اسلوب کو نئے [illegible] کے اظہار کے لئے استعمال کرنا کچھ آسان نہیں تھا۔ اس کے لئے غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کی ضرورت تھی جو بدقسمتی سے بہت کم جدید غزل گو شعراء کو میسر تھی۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ جب آغاز میں اردو غزل نے میکانکیت کے پس منظر سے ابھرنے والے مسائل کو سمونے کی کوشش کی تو اس کی روایتی رمزیت، غنائیت [illegible] دھیما پن، بوجھل بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ سے اُلجھ کر اپنا سا ہی آبرو کھو بیٹھی۔ غزل اپنے مشینی دور کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کا تجربہ بنانا کام رہا تو غزل کے مخالفین نے ایک بار پھر اس کی فرسودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کی۔ غزل پر پے در پے حملوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر غزل گو شعراء نے تھک ہار کر قدیم متغزلین کے [illegible] پر بیعت کر لی۔ اور حسنِ یار کی روایتی اور صدیوں پرانی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گئے۔ کسمپرسی کے اس دور میں شکیب نے غزل میں کامیاب تجربے کئے۔ اور اس کا ترو تازہ ذہن ایسے اشعار کی تخلیق میں کامیاب رہا جن کا آج کے جیتے جاگتے انسان کی روزمرہ زندگی اور اس کے داخلی اور خارجی مسائل سے گہرا ربط و ضبط ہے۔ شکیب کے ان اشعار پر غور کیجئے۔ بظاہر ہیئت کے لحاظ سے قطعی مختلف ہوتے ہوئے بھی یہ اشعار غزل ہی کے ہیں۔ ان اشعار میں شکیب کے مخصوص اسلوبِ فکر نے غزل کو ایک نیا پیرہن بخشا ہے ؎

ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے　　چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

ہر موڑ پر ملیں گے کئی راہزن شکیب ۔۔۔ چلیے چھپائے غم بھی زر و مال کی طرح!

اس شورِ تلاطم میں کوئی کس کو پکارے ۔۔۔ کانوں میں یہاں اپنی صدا تک نہیں آتی

کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہوئی ۔۔۔ وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں

سماجی سطح پر یہ میکانکی دور ہزاروں برس پرانی اخلاقی قدروں کے زوال کا دور ہے۔ آج دنیا کی آبادی پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور تیز رفتار وسائلِ آمد و رفت کی وجہ سے فاصلے سمٹ آئے ہیں لیکن جہاں تک تنہائی کے احساس کا تعلق ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ کربناک ہے۔ آج کا انسان ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور ہے۔ جب ہم شخصی غم کے علاج کے لئے گلی گلی کے اژدحام ہوتے سیلاب میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ سڑکوں پر، ملوں اور گلیوں میں سینے زخمی انسان محض واہمہ ہیں۔ شکیب کے ہاں جب یہی تاثر شعر کے سانچوں میں ڈھلتا ہے تو جمالیاتی وساطت کا امین بن جاتا ہے۔

یہ آدمی ہیں کہ سائے ہیں آدمیت کے ۔۔۔ گزر ہوا ہے مرا کس اجاڑ بستی میں

ہمارا ماننے لوگوں کی عیب جوئی کا ۔۔۔ انہیں تو دن کا بھی سایا دکھائی دیتا ہے

مگر وقتاً فوقتاً شکیب کی سوچ کے دھارے بدلتے ہیں اور وہ ایک تلخ حقیقت کی طرف بھرپور اشارہ کرتا ہے۔ یہ تلخ حقیقت ہوتے ہوئے بھی مضطرب احساسات کو سکون بخشتی ہے اور اس طرح جذباتی دھچکے کا اثر بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے:

بٹ گئے ہیں ہمدردی کسی کا درد کبھی ۔۔۔ یہی بہت ہے کہ چہرے سے آشنا ہے کوئی

بس ایک رات ٹھہرنا ہے کیا گلہ کیجیے ۔۔۔ مسافروں کو غنیمت ہے یہ سرائے بہت

جہاں شجر پہ لگا تھا تبر کا زخم شکیب ۔۔۔ وہیں پہ دیکھ لے کونپل نئی نکلنے لگی

مجموعی طور پر شکیب کی غزل میں یاسیت کا عنصر زیادہ ہے لیکن یہ رجحان قنوطیت کی حدود کو نہیں چھوتا۔ شکست خوردگی پیدا نہیں کرتا۔ شکیب کے ہاں یاسیت کا تیرہ اتنی دبیز نہیں کہ روشنی دب جائے۔ قاری ان شعروں کو پڑھنے کے بعد یہی تاثر لیتا ہے کہ موسم کی نرم نرم سی دھوپ اور چمکتے ہوئے دالانوں پر سے سیاہ بادلوں تک چھا جانے سے کرتا ہے۔ شکیب اپنے قاری کو ہر امید بندھاتا ہے کہ یاسیت کے گھنے تاریک بادل بارانِ رحمت کی نوید ہیں

ادھر سے بار با گزرا مگر خبر نہ ہوئی ۔۔۔ کہ زیرِ سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا

وہ دوریوں کا رہِ آب پر نشان کھلا ۔۔۔ وہ پیچھے کئی کشتی وہ بادبان کھلا

وہیں پہ نغمے گراتے گئے ادھر ہوا اب تو ۔۔۔ وہ دور زندگی سر سبز دکھائی دیتا ہے

جب بھی نکلا ستارۂ امید   کہر کے درمیان سے نکلا

کیوں رو رہے ہو راہ کے اندھے چراغ کو   کیا بجھ گیا ہوا سے لہو کا شرار بھی

شکیب کی غزل محض ریزہ خیالی نہیں بلکہ اس کی غزل کے بکھرے ہوئے شعروں میں ایک مربوط نظریۂ حیات ملتا ہے۔ شکیب کے نزدیک زندگی ایک مسلسل سفر اور مسلسل حرکت ہے۔ اسی چیز کے فقدان کو وہ موت کا نام دیتا ہے۔ اسی فلسفے کی رو سے ایک مردہ انسان کا متحرک نام بھی زندگی کی علامت اور ایک زندہ انسان کی غیر متحرک زندگی موت کی دلیل بن جاتی ہے۔ شکیب کے ہاں کسی مخصوص منزل کا حصول ایک نئے سفر کا پیش خیمہ ہے :

اتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا   زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

ان فاصلوں کے دشت میں رہبر وہی بنے   جس کی نگاہ دیکھ لے صدیوں کے پار بھی

اور جب عرصۂ حیات پر پھیلے ہوئے سایے مہیب ہونے لگتے ہیں تو شکیب کی آواز ایک نئے زاویے سے ابھرتی ہے وہ علائم و رموز کے سہارے وہ بات بڑی آسانی کے ساتھ کہہ جاتا ہے جو سب کے دلوں کی آواز ہے :

پھر ہوا سے سلگ اٹھے پتے   پھر دھواں گلستاں سے نکلا

رستہ بھی : اپسی کہیں بن میں کھو گیا   اور بجھ ہوئی نگاہ سے ہرنوں کی ڈار بھی

کیا جانیے منزل ہے کہاں جاتے ہیں کس سمت   بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں

ان حوصلہ شکن حالات میں شکیب کی سوچ شکست قبول نہیں کرتی بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ کروٹ لیتی ہے :

ہم ابھرے بھی ڈوبے بھی سیاہی کے بھنور میں   ہم سوئے نہیں شب ہمہ شب سوچ رہے ہیں

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور   رستے میں جو کھڑا تھا وہ کہسار ہٹ گیا

علامتیں شکیب کی غزل کی آبرو ہیں۔ جہاں تک اردو غزل میں علامتوں کے استعمال کی روایت کا تعلق ہے شکیب نے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ شکیب کی علامتیں الفاظ کے حقیقی مفہوم اور رامزانہ تاثر کو مجروح نہیں کرتیں بلکہ قاری کے ذہن میں موجود کسی خاکے کے نقش و نگار کو اور بھی واضح کر دیتی ہیں۔ نئی نسل کے شعراء جنسی جذبے کے اظہار کے لئے علامتوں کا جو مضحکہ خیز اظہار کر رہے ہیں شکیب نے اس کے خلاف بھرپور احتجاج کیا اور ملیح اشعار سے یہ ثابت کر دیا کہ غزل میں علامتوں کا صحتمند استعمال سوچ کے نئے دروازے کھول سکتا ہے۔ اس لحاظ سے میں شکیب کو جدید اردو غزل میں صحتمند علامت پسندی کا محرک کہوں گا۔ شکیب کی اسی منفرد خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی نے "فنون" میں لکھا تھا "شکیب کا سب سے موثر ہتھیار اس کے سمبل ہیں۔ شکیب کے سمبلوں میں نہ وہ کنگی ہے کہ چھو دو تو بکھر جائیں، نہ وہ جدت ہے (برائے جدت) کہ شاعر حسن آفرینی کی ذمہ داری سے الگ ہو کر محض چونکانے پر کمر باندھ لے۔ یہ سمبل قاری کے ذہن میں ایک مکمل تصویر ابھارتے ہیں اور اس تصویر کے پس منظر میں چھپا ہوا خیال یا جذبہ پورے حسن سے جگمگا اٹھتا ہے

اگرچہ شکیب کے ہاں علامتوں کی بہتات ہے لیکن اُس کے اشعار میں دو علامتیں بار بار اُبھرتی ہیں۔ یہ علامتیں "صحرا" اور "پانی" سے عبارت ہیں۔ صحرا کی علامت شکیب کی شاعری میں موجودہ مادی دَور کی پیدا کردہ گھٹن اور فرد کی بے بسی کے اظہار کے طور پر اُبھرتی ہے اور پانی کی علامت لق و دق صحرا میں زندگی کی تلاش کی علامت بن جاتی ہے۔ ان علامتوں میں نہ صرف شاعر کا ذاتی احساسِ تنہائی سمٹا ہوا نظر آتا ہے بلکہ ان کے پس منظر میں آج کے ہر باشعور فرد کو اپنا وجود جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے ۔۔۔ مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

عجب نہیں جو اُگیں یاں درخت پانی کے ۔۔۔ کہ اشک بوئے ہیں شب بھر کسی نے دھرتی میں

وہ کون تھا جو تمہارا سراغ پا نہ سکا ۔۔۔ کہ میں تو اپنے ہی صحرا کے پار جا نہ سکا

گزری ہے بار بار مرے سر سے موجِ خشک ۔۔۔ اُبھرا ہوں ڈوب ڈوب کے تصویرِ آب میں

جینے کے ساتھ موت کا ڈر ہے لگا ہوا ۔۔۔ خشکی دکھائی دیتی ہے سمندر کو خواب میں

ترقی پسند تحریک کے آغاز میں اردو شاعری پر جو اعتراضات ہوئے ان میں سے مجتبیٰ حسین کا اعتراض سب سے زیادہ چونکا دینے والا ہے۔ اُن کے خیال میں سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد شاعری نے سوچنا چھوڑ دیا۔ اس اعتراض نے مجھے اکثر اردو کی قدیم شاعری میں سوچ کے عنصر کی تلاش پر اُکسایا ہے۔ اگر سوچ کے دھارے چوٹی کر، زلف، مانگ، لب، ناف وغیرہ سے بہتے ہیں تو پھر مجتبیٰ حسین کا اعتراض فی الواقع صحیح ہے۔ اس اعتراض کی ضرورت غالباً اُس وقت محسوس ہوئی جب فلسفیانہ خیالات کے زیرِ اثر غزل کی شعریت کے مجروح ہونے کا خدشہ پیدا ہوا۔ چونکہ غزل کی صدیوں پرانی روایت میں یہ ایک نیا تجربہ تھا اس لئے اجنبیت کا احساس قدرتی بات تھی۔ غالب کے سے قادر الکلام شاعر نے غزل کی تنگیِ داماں کا شکوہ شاید اسی لئے کیا ہو گا کہ ذہن کی عمیق سطحوں میں پیچ و تاب کھانے والے افکار کا اظہار غزل میں اُن کے لئے ممکن نہیں تھا۔ خیال اور اظہار کی درمیانی خلیج کو پاٹنے کے لئے اجتہاد کی ضرورت تھی اور اس اجتہاد کے لئے نابغہ ذہنوں کا وجود ناگزیر تھا۔ شکیب کی غزل میں خیال اور اظہار کے درمیانی بُعد کو سمیٹنے کا عمل بڑا واضح ہے۔ وہ عہدِ حاضر کے فلسفیانہ خیالات کو اپنے فکر و تخیل کی روشنی میں بڑی خوبصورتی سے منتقل کرتے ہیں۔ بوجھل خیالات کے باوجود اُن کی شاعری کہیں بھی معمہ نہیں بنتی یا اُن کے فلسفیانہ اشعار اس حد تک دقیق نہیں ہوتے کہ اُن پر گنجلک ہونے کا گمان ہونے لگے۔ رمزیت و اشاریت جو بنیادی شعری حسن ہے شکیب کے ہاں ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ شکیب اپنی غزل میں جب فلسفیانہ خیالات کو سموتا ہے تو اس کا رنگِ تغزل کچھ اور بھی نکھرنے لگتا ہے۔ انسانی روح کا سراغ ذہن و فکر کے لئے ایک معمہ بنا رہا ہے۔ روح سے متعلق خواہ ہمیں شکیب کے خیال سے اتفاق نہ ہو لیکن اس ضمن میں اُس کا نقطۂ نظر ہمیں سوچنے پر مجبور ضرور کرتا ہے:

کب تک رہے گا روح پہ پیراہنِ بدن ۔۔۔ کب تک ہوا اسیر رہے گی حباب میں

یا پھر ان اشعار پر غور کیجئے:

یہ کون بتائے عدم آباد ہے کیسا! ۔۔۔ ٹوٹی ہوئی قبروں سے صدا تک نہیں آتی

عالم میں جس کی دھوم تھی اُس شاہکار پر
دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی اگر دھار گرے

ان اشعار کی روشنی میں شکیبؔ کی شاعری منطقی استدلال کی شاعری کے طور پر اُبھرتی ہے۔ شکیبؔ کے آخری دور کی غزلوں پر اس نظامِ فکر کی چھاپ خاص طور پر بہت نمایاں نظر آتی ہے لیکن یہاں بھی شعر و ادب کی جمالیاتی قدروں کا مکمل احترام ہے اور کہیں بھی کھردرے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ شاید اس لئے کہ

تیشے کا کام ریشۂ گل سے لیا شکیبؔ
ہم سے پہاڑ کاٹنے والے ہوئے نہیں

تشبیہیں، استعارے، اور کنائے اردو غزل کی روایت کا خاص جزو ہیں۔ شکیبؔ نے عصرِ جدید کے بیشتر شعراء کی طرح اس روایت سے انحراف نہیں کیا بلکہ اس کے دامن کو وسیع کرنے کے لئے نئے استعاروں اور کنایوں کا استعمال بڑی چابکدستی کے ساتھ کیا ہے۔ خصوصاً جاندار تشبیہیں شکیبؔ کا خاص سرمایہ ہیں۔ ان اشعار پر ایک لمحہ کے لئے غور کیجیے۔ شاعر کے ذہن میں جھلملانے والا تصور ایک تصویر کی شکل میں آپ کی نگاہوں کے سامنے ابھرنے لگے گا:

اک یاد ہے کہ چھین رہی ہے لبوں سے جام
اک عکس ہے کہ کانپ رہا ہے شراب میں

اک یاد ہے کہ دامنِ دل چھوڑتی نہیں
اک بیل ہے کہ لپٹی ہوئی ہے شجر کے ساتھ

وہ اس کا عکسِ بدن تھا کہ چاندنی کا کنول
وہ نیلی جھیل تھی یا آسمان کا ٹکڑا تھا

ہوا نے توڑ کے پتّا زمیں پہ پھینکا ہے
کہ شب کی جھیل میں پتھر گرا دیا ہے کوئی

شکیبؔ کی غزل میں منظر نگاری خاص طور پر دیدنی ہے:

وہی جھکی ہوئی بیلیں وہی دریچہ تھا
مگر وہ پھول سا چہرہ نظر نہ آتا تھا

قریب تیر رہا تھا بطوں کا اک جوڑا
میں آبِ جو کے کنارے اداس بیٹھا تھا

وہ الوداع کا منظر وہ بھیگتی پلکیں
پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے

منظر کو دیکھ کر پس منظر بھی دیکھئے
بستی نئی بسی ہے پرانے کھنڈر کے ساتھ!

شکیبؔ کی غزل ایک غیور اور خوددار انسان کی غزل ہے۔

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں پہ گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

خوددار ہوں کیوں آؤں درِ اہلِ کرم تک
کھیتی کبھی خود چل کے گھٹا تک نہیں آتی!

رگ کہتے ہیں کہ شکیب نے خودکشی کرلی۔ اختلاف کا حق محفوظ رکھتے ہوئے میں اس خیال سے اتفاق نہیں کروں گا۔ میرے نزدیک اس غیور انسان کی موت ایک حادثے کا نتیجہ تھی۔ اس حادثے کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؟ — یہ ایک الگ سوال ہے۔ شکیب کی بے وقت موت کے پس منظر سے واقف ہوتے ہوئے بھی میں اس بحث میں نہیں اُلجھوں گا مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ شکیب کا انجام اس کی موت سے بہت پہلے اس کی غزل میں جھلکنے لگا تھا:

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں   حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

لہو لہو ہوں سلاخوں سے سر کو ٹکرا کر   شکیب بابِ قفس کیا کہوں کس آن کھلا

اگر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر   تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

جھکی چٹان، پھسلتی گرفت جھولتا جسم   میں اب گرا ہی گرا تنگ و تار گھاٹی میں

غزل کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد اس کے دورِ زوال کے آغاز میں پروفیسر حمید احمد خاں نے غزل سے متعلق اپنے ایک پُر مغز مقالے میں لکھا تھا۔ "متمدن دنیا پر ایک ہزار سال کی فرمانروائی کے بعد غزل آج تنقید کے دربار میں جواب دہ ہے۔" میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر شکیب کو جو بقول احمد ندیم قاسمی غزل کی "امید گاہ" ہے۔ تنقید کے دربار میں طلب کیا جائے تو غزل شرمندہ نہیں ہوگی!

انور سدید

ایک اور شہیدِ مَے

جب بھی کسی ادیب کے مرنے کی خبر آتی ہے میرا دل یکبارگی دھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ شریانوں میں دوڑتا ہوا سیال لہو رکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے میری اپنی زندگی کے درخت سے ایک پتا سوکھ کر نیچے گر گیا ہے۔ ہر ادیب کی موت سوچ کے ایک نئے زاویے پر مہرِ سکوت ثبت کر دیتی ہے۔ حسن کی جستجو اور سچائی کی تلاش کا ایک سلسلہ رک جاتا ہے، ایک سقراط زہر کا جام تھام لیتا ہے اور ایک منصور سولی پر چڑھ جاتا ہے۔

شاد امرتسری بھی ایک سقراط تھا جس نے برسوں سے زہر کا جام ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور وہ دنیا سے اپنے دکھوں اور غموں کا انتقام لینے کے لئے اس زہر کا قطرہ قطرہ اپنی شریانوں میں اتار رہا تھا۔ شاد امرتسری وہ منصور تھا جو ہر شام سولی پر چڑھتا اور ہر صبح ہنستی مسکراتی زندگی کا سواگت کرنے کے لئے بیدار ہو جاتا ــــ لیکن کل ایک ایسا ہیبت ناک لمحہ آیا کہ وہ حسبِ معمول سولی پر چڑھا تو سولی اسے چاٹ گئی۔ اس کی رگوں میں زہر تو برسوں سے دوڑ رہا تھا لیکن کل اس زہر نے کڑیالے سانپ کا روپ دھارا اور اس کے دل ہی کو ڈس لیا۔

بارہ اکتوبر کی صبح کتنی سوگوار تھی!

میں انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک ایک گوشہ قتل و غارت، چوری اور ڈکیتی، اغوا اور عصمت دری، ریاست اور سیاست کی چکاچوند خبروں سے معمور تھا۔ اسی اخبار کے ایک گوشے میں لاوارث لاشوں کا ایک چھوٹا سا قبرستان بھی تھا ہے۔ نئی قبروں پر پھول چڑھانے کے لئے میں روزانہ اس قبرستان کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتا ہوں۔ لیکن اس روز میرا دل اداس تھا اور فرار حاصل کرنے کے لئے میں موٹی موٹی سرخیوں کے نخلستان میں کھو کر اس قبرستان کو بھول گیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقات ہوئی تو وہ بے طرح پریشان تھے۔

"سنا کچھ ــــ شاد امرتسری......"

یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی لیکن میں مفہوم سمجھ گیا۔ پھر سجاد نقوی اور نسیم شامل پوری آئے اور وہ بھی خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہم سب ایک دوسرے کے غم میں شریک تھے۔

شاد امرتسری کئی دنوں سے بیمار تھا۔ اس کے پاؤں سوج گئے تھے اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ شاید کثرتِ مے نوشی رنگ لانی تھی کہ اس کا جگر اپنا طبعی کام کرنے سے عاری ہو چکا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے میں لاہور گیا تو خواجہ بشیر سے شاد کا پوچھا۔ کہنے لگے "حیدر آباد سے آ گیا ہے۔ سخت بیمار ہے۔ اسے ضرور مل کر جانا۔ کوئی پتہ نہیں کب ہمیں چھوڑ جائے۔"

میں اسے ملنے کے لئے دل محمد روڈ والے مکان پر چلا گیا۔ بیماری نے اسے نڈھال کر رکھا تھا لیکن آنکھوں میں سکت تھی، بوتل اوندھی پڑی تھی، اور زندگی کی بشاشت اس کے چہرے پر پوری طرح مدفن اور روز تھی۔ بوتل کو دیکھا، کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا "میں نے توبہ کر لی ہے۔ اب پوری یکسوئی سے علاج کر رہا ہوں۔ بس

ذرا ٹھیک ہولوں تو سرگودھے آؤں گا۔ وہاں سے اکٹھے آغا صاحب کے فارم پر چلیں گے"!

پرسوں شاد امرتسری کی بیماری اسے الوداع کہہ چکی تھی اور وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا لیکن وہ پروگرام جو اس نے میرے ساتھ بنایا تھا سرے نہیں چڑھ سکا وہ اس سے پہلے ہی ایک اور لمبے سفر پر روانہ ہو چکا تھا اور جاتے جاتے پیغام دے گیا کہ:

ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا

اس روز میں ابھی سو رہا تھا کہ ساتھ کے کمرے میں زور کا چھناکا ہوا اور کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ ساتھ ہی پہلے بیوی کی زوردار آواز گونجی۔ پھر منجھلے بچے کی چیخ سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور اس قیامت کو دیکھنے کے لئے دوسرے کمرے کی طرف دوڑا۔ معلوم ہوا کہ بچے نے بلور کا ایک جگ توڑ ڈالا ہے اور بیوی اس نقصانِ مایہ پر برس رہی ہیں کہ حادثے کی اطلاع پڑوس میں ہو جائے اور شماتتِ ہمسایہ کی تقریب ضائع نہ ہو۔ میں نے کہا "بیگم! جگ ہی ٹوٹا ہے کوئی مر تو نہیں گیا۔ اس مار دھاڑ اور چیخ پکار کا فائدہ؟"

رو کر کہنے لگی: "آپ کو کیا پتہ، یہ جگ مجھے نسرین نے تحفہ دیا تھا جو اب اس دنیا میں نہیں!"

مجھے واقعی پتہ نہیں تھا کہ یہ جگ بیوی کو کیوں عزیز تھا لیکن اس شام جب سوگوار اور مغموم وزیر آغا نے مجھے "داغِ فراق" کا وہ نسخہ دکھایا جس کے اولیں ورق پر شاد امرتسری کے دستخط ثبت تھے تو مجھے پتہ لگ گیا کہ بچھڑ جانے والوں کے تحفے کیوں اتنے عزیز ہوتے ہیں۔

"داغِ فراق" کے سرورق پر شعلوں میں لپٹی ہوئی ایک دوشیزۂ جمال کا چہرہ ہے جس کی مغموم آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ شاد اسی سیم تن دوشیزہ کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو تھا۔ یہ لڑکی اس کے درمیان کی سطح پر ابھری اور ایک لمحے میں اپنی چھب دکھا کر اوجھل ہو گئی اور اسے آوارگی کے لیے چند صحرا میں چھوڑ گئی۔ شاد امرتسری کی ساری زندگی کا سرمایہ اسی لڑکی کی یاد ہے جس کے تعاقب میں دکھوں سے چور، زخموں سے معمور، شکستہ آمدوں سے بھرپور اور ناآسودہ تمناؤں سے ہمکنار وہ تمام عمر سرگرداں رہا۔ اس البیلی چھب اور نیاری شوبھا والی لڑکی کا تعارف اس نے یوں کرایا ہے:

لمبی چوٹی والی لڑکی جس کی آنکھیں کالی ہیں
اس کے گورے گال اور بھوری آنکھیں دیکھنے والی ہیں
خود کالج میں پڑھتی ہے اور بچیوں کی استانی ہے
سر سنگیت کی رسیا ہے اور شعروں کی دیوانی ہے
شعروں اور نغموں کی دھنیں وہ اکثر خود ہی بناتی ہے
مجھ سے ملنے آتی ہے تو اپنی دھنیں سناتی ہے
گاتے گاتے وہ میری آنکھوں کو تکتی رہتی ہے
میرا دل یہ کہتا ہے وہ دل کی باتیں کہتی ہے
گانا گا کر پھر وہ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے
اور پھر مجھ سے بائرن شیلے کیٹس کی باتیں کرتی ہے

اسے احساس تھا کہ:

محبت اک سفر ہے تندخو دریا کی موجوں کا
یہ موجیں اپنے سینوں میں کروڑوں آتش بگولوں کو

جنم دیتی ہیں خود ہی توڑتی ہیں حیلہ سازی سے
کرشمے پھوٹتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں رہ رہ کر
مگر موجیں کہ جن کی برق پائی برق رفتاری
چٹانوں کی سلوں کو ریزہ ریزہ کرتی رہتی ہیں

لیکن وہ ساری عمر اس تند خو دریا کی تیز موجوں سے سر ٹکراتا رہا۔ اسی بحث نے اس کے ذوقِ تجسس کو اُبھارا اور نروان کی تلاش میں جستجو کے راستے پر ڈال دیا۔ تلاش شاد امرتسری کی شاعری کا محور ہے۔ اس تلاش میں اس کے تلوے راستے کے خاروں سے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ ہمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو وہ بنتِ عنب کا سہارا لے لیتا ہے:

بزمِ گیتی سے بھاگنے والو — ٹھہرو ٹھہرو شراب باقی ہے

شراب اس کے دکھوں کا مداوا بنتی ہے تو وہ خود فراموشی کے عالم کو قائم رکھنے کے لئے زندگی کی موم بتی کو دونوں سے جلا دیتا ہے اور بے تحاشا پینے لگتا ہے اور بالآخر اپنی آگ میں خود ہی جل جاتا ہے۔ مرنے کو تو وہ اسی روز مر گیا تھا جس روز کالی زلفوں والی لڑکی ایک جاوداں لمحے کو جنم دے کر اس کی زندگی کو سوگوار کر گئی تھی لیکن جسم و جان کا رشتہ بہرحال برقرار رہا اور سانس کی آمد و شد جاری رہی اور وہ ننگ شگاف قہقہے لگا کر کہتا رہا:

شاد امرتسری کو دیکھو گے — اک نہ اک دن شہید ہے ہوگا

میں نے انگریزی اخبار پھر اٹھا لیا ہے۔ پانچویں صفحے کے قبرستان میں ایک نئی قبر تعمیر ہوئی ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں۔ میں اس قبر کی مٹی کو سونگھ رہا ہوں مجھے اس سے شاد امرتسری کی خوشبو آ رہی ہے اور میرے آنسو بہہ رہے ہیں اور بہتے ہی جا رہے ہیں۔

دیوندر اِسّر

پاپ آرٹ — اِشتہار یا نئی حقیقت پرستی؟

پھلوں کے رس اور سوپ کے ڈبّے، کوکا کولا، وہسکی اور بیئر کی بوتلیں، مارلن منرو کی تصویریں، کومکس اشتہاری بورڈ اور روزمرہ کے استعمال کی بے شمار چیزیں اور مختلف رنگ جب کینوس پر ایک مخصوص انداز اور توازن (اور غیر متوازن انداز) سے یکجا کر دیئے جائیں تو یہ پاپ (POP) آرٹ ہے۔

کوکا کولا کی بڑی بڑی بوتلیں، کئی فٹ لمبے سوپ کے ڈبّے (مصوّر: اینڈی وارہول)، ۲۶ فٹ لمبی اور ۸ فٹ اونچی تصویر (مصوّر: جیمز روزنکوئسٹ) اور تصویر میں گھاس کاٹنے والی مشین (مصوّر: ٹام ویسلمین) پاپ آرٹ کے ہی تو نمونے ہیں۔

جدید دور اشتہار کا دور ہے۔ روزمرہ کی ضرورت (اور غیر ضروری) کی چیزوں کے بڑے بڑے اشتہار بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت کے ذرائع سے ہر وقت ہماری نظر کے سامنے جھلملاتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے احساس و فکر کے لازمی اجزا بن چکے ہیں۔ ان اشیاء کی تصویریں ہمارے ذہن میں نئے نئے نمونوں اور نئی نئی علامتوں کو جنم دیتی ہیں۔ بس اسٹاپ اور ریلوے اسٹیشنوں پر، بازاروں اور عام گزرگاہوں پر ہر جگہ بڑے بڑے اشتہار ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ان کشش کے جادو سے بچنا مشکل ہو گیا ہے۔ فلم اسٹاروں کی بڑی بڑی نیم عریاں اور شہوت انگیز تصویریں، کوکا کولا، سافٹ ڈرنکس کی بڑی بڑی بوتلیں، ٹوتھ پیسٹ، صابن، پاؤڈر، سوپ اور رس اور آرائش و زیبائش کی طرح طرح کی پرکشش چیزیں۔ ہر شے پہلے اشتہار بن کر ہماری نظر کا مرکز بنتی ہے۔ ایک بڑی شکل اختیار کرکے — اور پھر ان چیزوں کے تصوّرات ایک دوسرے میں شامل ہو کر ہمارے ذہن میں کئی طرح کے پیٹرن (PATTERN) کا روپ دھار لیتے ہیں۔ پاپ مصوّر ان کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ کچھ نقاد پاپ آرٹ کو فنِ اشتہار بازی ہی کی ایک شکل قرار دیتے ہیں۔

کیا پاپ آرٹ اشتہاری فن ہے؟ شاید پاپ مصوّر بھی اس سے انکار نہیں کرتے کیونکہ یہ دور اشتہار کا دور ہے۔ اشتہاری بورڈ، اخبار، رسالے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم وغیرہ نے اشتہار کو فن کا درجہ دے دیا ہے۔ پاپ فن کاروں نے ان سب سے اور کومکس، فوٹوگرافس اور سوپر مارکٹ اور ٹریڈ مارک سے اپنے موضوع اور انداز حاصل کیا ہے۔ اس آرٹ نے اپنے تصوّرات کو ہر ذریعۂ تجارتی اور اشتہاری آرٹ سے حاصل کئے ہیں۔ اس لئے پاپ آرٹ ایک ایسا طرزِ فن ہے جو فنونِ لطیفہ سے کسی حد تک مختلف ہے کیونکہ یہ روزمرہ کی اشیاء کو ہی فن کا مواد بناتا ہے یا اُن کو فن کی سطح پر لاکر پیش کرتا ہے اُن کو حسن کی تمثیل تسلیم کرکے ان کی پرستش کرتا ہے۔

جب بھی پاپ آرٹ کی کوئی بھی نمائش ہوئی آرٹ کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی اور اس کے حق اور مخالفت میں دلیلیں پیش کی جانے لگیں۔ ایسی ہی ہلچل اس وقت پیدا ہوئی تھی جب دادازم اور سرریلزم اور کیوبزم کے مداح فن کاروں نے آرٹ کی دنیا میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔ پاپ آرٹ نے بھی دادازم اور سرریلزم سے انسپریشن لی ہے اور اُن سے متاثر ہو کر حقیقت کو نئے روپ اور معنی میں منعکس کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے اسے نئی حقیقت پرستی (نیا آرٹ، نیا دادازم یا نیا سرریلزم) کا پیش رَو تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ پاپ آرٹ حقیقت اور رومان کا ایک نیا امتزاج پیش کرتا ہے۔

آرٹ کی دنیا میں دو رجحان مختلف سمتوں میں جاری رہے ہیں۔ ایک رجحان ہے فنونِ لطیفہ کا اور دوسرا مقبول عام فن کا جس کو ماس کمیونی کیشن (MASS COMMUNICATION) اور ماس پروڈکشن (MASS PRODUCTION) سے بڑی تقویت ملی اور انہی کے عکس اس نئے آرٹ میں ملتے ہیں۔ اس کا انسپریشن فنونِ لطیفہ نہیں اشتہاری فن ہے۔ یہی باعث ہے کہ کچھ نقادانِ فن اسے آرٹ کی مملکت سے جلاوطن کرنے پر مصر ہیں محض اس لئے نہیں کہ پاپ آرٹ اشتہار ہے یا حقیقی اشیا کا مجموعہ، بلکہ اس لئے کہ اس میں مصور کی کوئی ذہنی یا جذباتی شمولیت نہیں کیونکہ وہ میکانکی از سرِ نو تشکیل کی غیر ذاتی تکنیک کا استعمال کرتے ہیں۔

اِن فن کاروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کمرشل فن کار رہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو فنونِ لطیفہ کے ماہر ہیں۔ جیسا کہ جاسپر جانس لیکن نقادوں میں اس بات پر اختلاف رائے ہے کہ جاسپر جانس پاپ آرٹسٹ ہے یا نہیں، البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پہلا فن کار ہے جس نے فن کاروں کو کچھ مخصوص اشیا کی عکاسی کی قید سے آزاد کیا۔ اس نے بتایا کہ فن کا مواد کوئی بھی شے ہو سکتی ہے۔ فن صرف رنگوں اور خطوط کے توازن تک ہی محدود نہیں۔ جاسپر جانس اور رابرٹ روشن برگ پاپ آرٹ کے صفِ اول کے فن کار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اینڈی وارہول، رائے لکنسٹائن، جیمز روزن کوسٹ، کلاز اولڈن برگ اور ٹم وائن جیسے مشہور فن کار بھی اس گروہ میں شامل ہیں اور اس تحریک کے پیرو کار آج ہر ملک میں موجود ہیں۔

ان فن کاروں کی تصویروں سے صاف واضح ہے کہ پاپ آرٹ کیا ہے یہ کہنا صحیح نہیں کہ پاپ آرٹسٹ حقیقی اشیا کو ہی ان کی اصل شکل میں پیش کر دیتے ہیں، چاہے وہ سوپ کا ڈبہ ہو یا کسی ماڈل لڑکی کی تصویر (شاید کبھی زندہ ماڈل بھی کینوس پر آ جائے) یا بیئر کی بوتل یا یہ کہ وہ ان اشیا ہی کو فن کا مواد سمجھتے ہیں۔ پاپ آرٹ تو اشیا کی ماس کمیونی کیشن کی تمثیلوں پر مبنی ہے۔ ان تمثیلوں سے حقیقت کا نیا احساس پیدا ہوتا ہے جو خارجی چیزوں ہی کی طرح حقیقی ہے یا اُن سے بھی زیادہ سچا۔ اس لئے اُن کے نزدیک رومان خارجی دنیا کی اشیا سے زیادہ حقیقت کا شعور دے سکتا ہے۔ خاص کر اس حالت میں جبکہ ہمارے جذبات اور خیالات دقیانوسی روایت بن چکے ہیں۔

پاپ آرٹ کوئی منظم تحریک نہیں۔ ان فن کاروں کا کوئی مشترکہ منشور نہیں۔ ان سب نے آزادانہ طور پر اپنا کام شروع کیا۔ وہ ایک دوسرے سے اپنے مزاج، نقطۂ نظر، پسند، صلاحیت اور طرزِ فن میں مختلف ہیں لیکن ان سب میں کچھ ایسی باتیں مشترک طور پر ملتی ہیں جس کے باعث وہ پاپ آرٹسٹ مانے جاتے ہیں۔ ان میں اظہار اور طرز کا تنوع ہے۔ مثلاً جیمز روزن کوسٹ کے فنی نمونے دیکھئے۔ ان کے نزدیک اشیا کے مکمل روپ بجائے اُن کے اجزا یا حصوں کے زیادہ اہم ہیں۔ اس کی ایک بہت بڑی تصویر کی ٹھوڑی اور پیشانی میں اکیس فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس تصویر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ چہرہ عجیب جغرافیہ بن گیا ہے اور ناک یوگوسلاویہ کے نقشے کی طرح دکھائی دیتی ہے اور ہم بڑی بڑی صورتوں میں اشیا کے صرف ٹکڑے ہی دیکھتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہم زندگی کی مکمل تصویر نہیں دیکھ پاتے بلکہ اُن کے کچھ ٹکڑوں کو ہی دیکھتے ہیں۔ اگر ہم کسی آسمانی قوت کے باعث زندگی کا مکمل اور جامع روپ دیکھ سکیں تو شاید فن کی تخلیق ہی ختم ہو جائے۔ روزن کوسٹ نے اپنی تصویروں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پاپ آرٹ کمرشل آرٹ کی نقل یا بازگشت نہیں بلکہ کامک (تمثیلی) تخلیق ہے۔ یہ آرٹ کا نیا بعد ہے۔ اس نے فنونِ لطیفہ اور کمرشل آرٹ کی حدوں کو مٹا دیا ہے اور ایک نئے طرزِ فن کو جنم دیا ہے۔

ماس کمیونی کیشن اور اشتہار کے اس دور میں پاپ آرٹ کی تحریک ناگزیر تھی۔ یہ جدید سرمایہ پرست دور کی پیداوار ہے۔ اس نے آرٹ کی دنیا کو نئے موضوعات اور مواد اور اشکال سے روشناس کرایا ہے۔ ایک نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس وقت سوال یہ نہیں کہ کیا پاپ آرٹ عظیم آرٹ ہے بلکہ یہ ہے کہ کیا یہ آرٹ اس دور کے نازک جذبات، شعور اور ماحول کی نمائندگی کرتا ہے یا نہیں یا یہ کہ اس فن کا مواد، موضوع اور تکنیک فن کے نقطۂ نظر سے موزوں اور جائز ہیں یا نہیں۔ پاپ آرٹ مکمل فن نہیں، اس کی کوئی آخری قدر متعین نہیں کی جا سکتی۔ یہی کیا کم ہے کہ پاپ آرٹ نے انسانی پہلو کو پھر سے

اہمیت دینا شروع کر دیا ہے۔ لیبرمن کے قول کے مطابق پاپ آرٹ میں وہی انسانی اقدار موجود ہیں جو کسی امن مورچے یا ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف مظاہرے اور بموں سے دہشت زدہ دنیا کے خلاف احتجاج اور بغاوت میں ہے۔

پاپ آرٹ کی پرورش شہری تہذیب میں ہوئی ہے۔ شہری اثرات ہی اس تحریک کا سرچشمہ ہیں اس لئے اس کی معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کئی پاپ فن کار اس تکنیک کو محض سنسنی پھیلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور وہ اس فن کی کافی مضحکہ خیز صورتیں پیش کرتے ہیں جن میں چمک دمک اور شور زیادہ ہے اور معنی کی گہرائی کم۔ ان کا فن سماجی تنقید یا طنز کے ناکام اور غیر واضح نمونے پیش کرتا ہے۔ ہیرلڈ روزنبرگ نے پاپ آرٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غیر مربوط اشیا کو ایک دوسرے سے جوڑ دینا فن کی تعمیری تخلیق کے لئے کافی نہیں۔ فن کار کو یہ اشیا اس طرح جوڑنی چاہئیں کہ دیکھنے والے کو ان کے ایک دوسرے کے ساتھ آنے سے تحیر اور تسکین کا احساس ہو۔ اگر ہمارے فن کی تخلیق خارجی شعور کے لئے انسانی احساس کے غیر لفظی اظہار کے لئے ہوئی ہے جیسا کہ میں مانتا ہوں، تو پاپ آرٹ حقیر آرٹ ہے کیونکہ اس پر لفظی خیالات حاوی ہیں۔ اس میں ہمدردی اور تنقید نہیں اس لئے یہ صحیح طور پر ابلاغ کی خوبی سے عاری ہے۔

پاپ آرٹ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ تہذیب کے موجودہ لمحے میں زندہ رہنے سے کیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس تہذیب کے ثبوت کا محض ایک حصہ ہے۔ اس کا سماجی اثر صرف یہی ہے کہ ہم بگاڑ نے حقیر اور غیر شائستہ دنیا سے سمجھوتا کر لیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا اثر اشتہاری فن سے مختلف نہیں۔ بلنٹ کی نظر میں یہ ایک ایسا سمجھوتا ہے جسے آج سب سے زیادہ رد کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے فن اور خود زندگی بناوٹی مقبول عام تمثیلوں اور ریاکارانہ تجارت سے بچایا جا سکتا ہے۔

پاپ آرٹ کا شور ہر سو سنائی دے رہا ہے۔ اس کے کئی مداح بھی ہیں اور کئی مخالف بھی۔ خطرہ یہ ہے کہ پاپ آرٹ نئی حقیقت پرستی کے پردے میں کمرشل فن کا شکار ہو کر نہ رہ جائے اور جدیدیت کے نام پر سنسنی پھیلانے کا سٹنٹ ثابت نہ ہو۔ اس لئے ایسے فن کاروں سے بچنے کی ضرورت ہے جو فن کے وفادار نہیں اور نہ ہی سنجیدہ ہیں، جو محض نقالی پر اپنا کاروبار چمکائے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں اس فن کی رو میں کبھی نئے سنجیدہ اور جدید تہذیب کے نمائندہ فن کی نشوونما ہو سکتی ہے جو اپنے دور کی زندگی اور فن میں ایک نیا توازن اور ربط قائم کر سکے گا۔

عالم میں جس کی دھوم تھی اُس شاہکار پہ — دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرہ ہے — سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی اگر دھار گرے

ان اشعار کی روشنی میں شکیب کی شاعری منطقی استدلال کی شاعری کے طور پر اُبھرتی ہے۔ شکیب کے آخری دور کی غزلوں پر اس نظامِ فکر کی چھاپ خاص طور پر بہت نمایاں نظر آتی ہے لیکن یہاں بھی شعر و ادب کی جمالیاتی قدروں کا مکمل احترام ہے اور کہیں بھی کھردرے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ شاید اس لئے کہ

تیشے کا کام ریشۂ گل سے لیا شکیب — ہم سے پہاڑ کاٹنے والے ہوئے نہیں

تشبیہیں، استعارے اور کنائے اردو غزل کی روایت کا خاص جزو ہیں۔ شکیب نے عصرِ جدید کے بیشتر شعراء کی طرح اس روایت سے انحراف نہیں کیا بلکہ اس کے دامن کو وسیع کرنے کے لئے نئے استعاروں اور کنایوں کا استعمال بڑی چابکدستی کے ساتھ کیا ہے۔ خصوصاً جاندار تشبیہیں شکیب کا خاص سرمایہ ہیں۔ ان اشعار پر ایک لمحہ کے لئے غور کیجئے۔ شاعر کے ذہن میں جھلملانے والا تصور ایک تصویر کی شکل میں آپ کی نگاہوں کے سامنے ابھرنے لگے گا:

اک یاد ہے کہ چھین رہی ہے لبوں سے جام — اک عکس ہے کہ کانپ رہا ہے شراب میں

اک یاد ہے کہ دامنِ دل چھوڑتی نہیں — اک بیل ہے کہ لپٹی ہوئی ہے شجر کے ساتھ

وہ اس کا عکسِ بدن تھا کہ چاندنی کا کنول — وہ نیلی جھیل تھی یا آسمان کا ٹکڑا تھا

ہوا نے آڑ کے چاند میں پہ پھینکا ہے — کہ شب کی جھیل میں پتھر گرا دیا ہے کوئی

شکیب کی غزل میں منظر نگاری خاص طور پر دیدنی ہے:

وہی جھکی ہوئی بیلیں وہی دریچہ تھا — مگر وہ پھول سا چہرہ نظر نہ آتا تھا

قریب تیر رہا تھا بطوں کا اک جوڑا — میں آب جو کے کنارے اداس بیٹھا تھا

وہ الوداع کا منظر وہ بھیگتی پلکیں — پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے

منظر کو دیکھ کر پس منظر بھی دیکھئے — بستی نئی بسی ہے پرانے کھنڈر کے ساتھ!

شکیب کی غزل ایک غیور اور خوددار انسان کی غزل ہے۔

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں پہ گروں — جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

خوددار ہوں کیوں آؤں درِ اہلِ کرم تک — کھیتی کبھی خود چل کے گھٹا تک نہیں آتی!

لوگ کہتے ہیں کہ شکیب نے خودکشی کر لی۔ اختلاف کا حق محفوظ رکھتے ہوئے میں اس خیال سے اتفاق نہیں کروں گا۔ میرے نزدیک اس غیور انسان کی موت ایک حادثے کا نتیجہ تھی۔ اس حادثے کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے — یہ ایک الگ سوال ہے۔ شکیب کی بے وقت موت کے پس منظر سے واقف ہوتے ہوئے بھی میں اس بحث میں نہیں اُلجھوں گا۔ مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ شکیب کا انجام اس کی موت سے بہت پہلے اس کی غزل میں جھلکنے لگا تھا:

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں　　　حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

لہو لہو ہوں سلاخوں سے سر کو ٹکرا کر　　　شکیب بابِ قفس کیا کہوں کس آن کھلا

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر　　　تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

جھکی چٹان، پھسلتی گرفت جھولتا جسم　　　میں اب گرا ہی گرا تنگ و تار گھاٹی میں

غزل کی نشاۃ ثانیہ کے بعد اس کے دورِ زوال کے آغاز میں پروفیسر حمید احمد خان نے غزل سے متعلق اپنے ایک پُر مغز مقالے میں کہا تھا۔ متمدن دنیا پر ایک ہزار سال کی فرمانروائی کے بعد غزل آج تنقید کے دربار میں جواب دہ ہے۔" میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر شکیب کو جو بقول احمد ندیم قاسمی غزل کی "امید گاہ" ہے، تنقید کے دربار میں طلب کیا جائے تو غزل شرمندہ نہیں ہوگی!

انور سدید

ایک اور شہیدِ مے

جب بھی کسی ادیب کے مرنے کی خبر آتی ہے میرا دل یکبارگی دھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ شریانوں میں دوڑتا ہوا سیال لہو رکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے میری اپنی زندگی کے درخت سے ایک پتا سوکھ کر نیچے گر گیا ہے۔ ہر ادیب کی موت سوچ کے ایک نا دیدہ پر مہرِ سکوت ثبت کر دیتی ہے۔ حسن کی جستجو اور سچائی کی تلاش کا ایک سلسلہ رک جاتا ہے، ایک سقراط زہر کا جام تھام لیتا ہے اور ایک منصور سولی پر چڑھ جاتا ہے۔

شاد امرتسری بھی ایک سقراط تھا جس نے برسوں سے زہر کا جام ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور وہ دنیا سے اپنے دکھوں اور غموں کا انتقام لینے کے لئے اس زہر کا قطرہ قطرہ اپنی شریانوں میں اتار رہا تھا۔ شاد امرتسری وہ منصور تھا جو ہر شام سولی پر چڑھتا اور ہر صبح ہنستی مسکراتی زندگی کا سواگت کرنے کے لئے بیدار ہو جاتا۔۔۔۔ لیکن کل ایک ایسا ہیبت ناک لمحہ آیا کہ وہ حسبِ معمول سولی پر چڑھا تو سولی اسے چاٹ گئی۔ اس کی رگوں میں زہر تو برسوں سے دوڑ رہا تھا لیکن کل اس زہر نے کوئی سانپ کا روپ دھارا اور اس کے دل ہی کو ڈس لیا۔

بارہ اکتوبر کی صبح کتنی سوگوار تھی!

میں انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک ایک گوشہ قتل و غارت، چوری اور ڈکیتی، اغوا اور عصمت دری، ریاست اور سیاست کی چکاچوند خبروں سے منور تھا۔ اسی اخبار کے ایک گوشے میں لاوارث لاشوں کا ایک چھوٹا سا قبرستان بھی تھا۔ نئی قبروں پر پھول چڑھانے کے لئے میں روزانہ اس قبرستان کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتا ہوں، لیکن اس روز میرا دل اداس تھا اور فرار حاصل کرنے کے لئے میں موٹی موٹی سرخیوں کے نخلستان میں کھو کر اس قبرستان کو بھول گیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقات ہوئی تو وہ بے طرح پریشان تھے۔

"تم نے کچھ سنا ۔۔۔۔؟ شاد امرتسری ۔۔۔۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھر آگئی لیکن میں مفہوم سمجھ گیا۔ پھر سجاد نقوی اور نسیم شمائل پوری آئے اور وہ بھی خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہم سب ایک دوسرے کے غم میں شریک تھے:

شاد امرتسری کئی دنوں سے بیمار تھا۔ اس کے پاؤں سوج گئے تھے اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ شاید کثرتِ مے نوشی رنگ لائی تھی کہ اس کا جگر اپنا جسمی کام کرنے سے عاری ہو چکا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے میں لاہور گیا تو خواجہ بشیر سے شاد کا پوچھا۔ کہنے لگے "حیدر آباد سے آگیا ہے۔ سخت بیمار ہے۔ اسے ضرور مل کر جانا۔ کوئی پتہ نہیں کب ہمیں چھوڑ جائے۔"

میں اسے ملنے کے لئے دل محمد روڈ والے مکان پر چلا گیا۔ بیماری نے اسے نڈھال کر رکھا تھا لیکن آنکھوں میں سکت تھی۔ بوتل اوندھی پڑی تھی، اور زندگی کی بشاشت اس کے چہرے پر پوری طرح مدفنا افروز تھی۔ بوتل کو دیکھا، کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا "میں نے توبہ کر لی ہے۔ اب پوری یکسوئی سے علاج کر رہا ہوں۔ بس

ذرا ٹھیک ہو لوں تو سرگودھے آؤں گا۔ وہاں سے اکٹھے آغا صاحب کے فارم پر چلیں گے!"

پندرہوں شاد امرتسری کی بیماری اسے الوداع کہہ چکی تھی اور وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا لیکن وہ پروگرام جو اس نے میرے ساتھ بنایا تھا پورا نہیں ہو سکا وہ اس سے پہلے ہی ایک اور لمبے سفر پر روانہ ہو چکا تھا اور جاتے جاتے پیغام دے گیا کہ،

ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا

اس روز میں ابھی سو رہا تھا کہ ساتھ کے کمرے میں زور کا چھناکا ہوا اور کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ ساتھ ہی پہلے بیوی کی زوردار آواز گونجی۔ پھر منجھلے بچے کی چیخ سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور اس قیامت کو دیکھنے کے لئے دوسرے کمرے کی طرف دوڑا۔ معلوم ہوا کہ بچے نے بلور کا ایک جگ توڑ ڈالا ہے اور بیوی اس نقصان مایہ پر برس رہی ہیں کہ حادثے کی اطلاع پڑوس میں ہو جانے اور شماتت ہمسایہ کی تقریب ضائع نہ ہو۔ میں نے کہا "بیگم! جگ ہی ٹوٹا ہے کوئی مر تو نہیں گیا۔ اس مار دھاڑ اور چیخ پکار کا فائدہ؟"

رو کر کہنے لگی: "آپ کو کیا پتہ۔ یہ جگ مجھے نسرین نے تحفہ دیا تھا جو اب اس دنیا میں نہیں!"

مجھے واقعی پتہ نہیں تھا کہ یہ جگ بیوی کو کیوں عزیز تھا لیکن اس شام جب سوگوار اور مغموم وزیر آغا نے مجھے داغ فراق کا وہ نسخہ دکھایا جس کے اولیں ورق پر شاد امرتسری کے دستخط ثبت تھے تو مجھے پتہ لگ گیا کہ بچھڑ جانے والوں کے تحفے کیوں اتنے عزیز ہوتے ہیں۔

"داغ فراق" کے سرورق پر شعلوں میں لپٹی ہوئی ایک دوشیزہ جمال کا چہرہ ہے جس کی مغموم آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ شاد اسی سیم تن دوشیزہ کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو تھا۔ یہ لڑکی اس کے دھیان کی سطح پر ابھری اور ایک لمحے میں اپنی چھب دکھا کر اوجھل ہو گئی اور اسے آوارگی کے لیے صحرا میں چھوڑ گئی۔ شاد امرتسری کی ساری زندگی کا سرمایہ اسی لڑکی کی یاد ہے جس کے تعاقب میں دکھوں سے چور، زخموں سے معمور، شکستہ آرزوؤں سے بھرپور اور ناآسودہ تمناؤں سے ہمکنار وہ تمام عمر سرگرداں رہا۔ اس البیلی چھب اور نیاری شوبھا والی لڑکی کا تعارف اس نے یوں کرایا ہے:

لمبی چوٹی والی لڑکی جس کی آنکھیں کالی ہیں
اس کے گورے گال اور بھوری آنکھیں دیکھنے والی ہیں
خود کالج میں پڑھتی ہے اور بچوں کی استانی ہے
سر سنگیت کی دنیا ہے اور شعروں کی دیوانی ہے
شعروں اور نغموں کی دھنیں وہ اکثر خود ہی بناتی ہے
مجھ سے ملنے آتی ہے تو دہی دھنیں سناتی ہے
گاتے گاتے وہ میری آنکھوں کو تکتی رہتی ہے
میرا دل یہ کہتا ہے وہ دل کی باتیں کہتی ہے
گاتا گا کر پھر وہ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے
اور پھر مجھ سے بارتی شیلے کیٹس کی باتیں کرتی ہے

اسے احساس تھا کہ:

محبت اک سفر ہے تند خو دریا کی موجوں کا
یہ موجیں اپنے سینوں میں کروڑوں رنگینیوں کو

جنم دیتی ہیں خود ہی توڑتی ہیں حیلہ سازی سے
کرشمے پھوٹتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں رہ رہ کر
مگر موجیں کہ جن کی برق پائی برق رفتاری
چٹانوں کی سلوں کو ریزہ ریزہ کرتی رہتی ہیں

لیکن وہ ساری عمر اس تند خو دریا کی تیز موجوں سے سر ٹکراتا رہا۔ اسی مجت نے اس کے ذوقِ تجسس کو اُبھارا اور نروان کی تلاش میں جستجو کے راستے پر ڈال دیا۔ تلاش شاد امرتسری کی شاعری کا محور ہے۔ اس تلاش میں اس کے تلوے راستے کے خاروں سے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ ہمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو وہ بنتِ عنب کا سہارا لے لیتا ہے:-

بزمِ گیتی سے بھاگنے والو　　　ٹھہرو ٹھہرو شراب باقی ہے

شراب اس کے دکھوں کا مداوا بنتی ہے تو وہ خود فراموشی کے عالم کو قائم رکھنے کے لئے زندگی کی موم بتی کو دونوں سے جلا دیتا ہے اور بے تحاشا پینے لگتا ہے اور بالآخر اپنی آگ میں خود ہی جل جاتا ہے۔ مرنے کو تو وہ اسی روز مر گیا تھا جس روز کالی زلفوں والی لڑکی ایک جاوداں لمحے کو جنم دے کر اس کی زندگی کو سوگوار کر گئی تھی لیکن جسم و جان کا رشتہ بہر حال برقرار رہا اور سانس کی آمد و شد جاری رہی اور وہ فلک شگاف قہقہے لگا کر کہتا رہا:

شاد امرتسری کو دیکھئے گا　　　اک نہ اک دن شہیدِ مے ہوگا

میں نے انگریزی اخبار پھر اٹھا لیا ہے۔ پانچویں صفحے کے قبرستان میں ایک نئی قبر تعمیر ہوئی ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں۔ میں اس قبر کی مٹی کو سونگھ رہا ہوں مجھے اس سے شاد امرتسری کی خوشبو آ رہی ہے اور میرے آنسو بہہ رہے ہیں اور بہتے ہی جا رہے ہیں۔

دیوندر اِسّر

پاپ آرٹ — اِشتہار یا نئی حقیقت پرستی؟

پھلوں کے رس اور سوپ کے ڈبّے، کوکا کولا، وہسکی اور بیئر کی بوتلیں، مارلن منرو کی تصویریں، کومکس، اشتہاری بورڈ اور روزمرہ کے استعمال کی بے شمار چیزیں اور مختلف رنگ جب کینوس پر ایک مخصوص انداز اور توازن (اور غیر متوازن انداز) سے یکجا کر دیئے جائیں تو یہ پاپ (POP) آرٹ ہے۔

کوکا کولا کی بڑی بڑی بوتلیں، کئی فٹ لمبے سوپ کے ڈبّے (مصوّر: اینڈی وورہول)، ۲۹۶ فٹ لمبی اور ۵۸ فٹ اونچی تصویر (مصوّر: جیمز روزن کوئسٹ) اور تصویر میں گھاس کاٹنے والی مشین (مصوّر: ٹم زاکین) پاپ آرٹ کے ہی تو نمونے ہیں۔

جدید دور اشتہار کا دور ہے۔ روزمرہ کی ضرورت (اور غیر ضروری) کی چیزوں کے بڑے بڑے اشتہار، بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت کے ذرائع سے ہر وقت ہماری نظر کے سامنے جھلملاتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے احساس و فکر کے لازمی اجزا بن چکے ہیں۔ ان اشیاء کی تصویریں ہمارے ذہن میں نئے نئے نمونوں اور نئی نئی علامتوں کو جنم دیتی ہیں۔ بس، شاپ اور ریلوے اسٹیشنوں پر، بازاروں اور عام گذرگاہوں پر ہر جگہ بڑے بڑے اشتہار ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس کشش کے جادو سے بچنا مشکل ہو گیا ہے۔ فلم اسٹاروں کی بڑی بڑی نیم عریاں اور شہوت انگیز تصویریں، کوکا کولا (سافٹ ڈرنکس) کی بڑی بڑی بوتلیں، شوکیس میں ٹوتھ پیسٹ، صابن، پاؤڈر، سوپ اور رس اور آرائش و زیبائش کی طرح طرح کی پرکشش چیزیں۔ ہر شے پہلے اشتہار بن کر ہماری نظر کا مرکز بنتی ہے۔ ایک بڑی شکل اختیار کر کے — اور پھر ان چیزوں کے تصورات ایک دوسرے میں شامل ہو کر ہمارے ذہن میں کئی طرح کے پیٹرن (PATTERN) کا روپ دھار لیتے ہیں۔ پاپ مصوّر ان کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ کچھ نقاد پاپ آرٹ کو فنِ اشتہار بازی ہی کی ایک شکل قرار دیتے ہیں۔

کیا پاپ آرٹ اشتہاری فن ہے؟ شاید پاپ مصوّر بھی اس سے انکار نہیں کرتے کیونکہ یہ دور اشتہار کا دور ہے۔ اشتہاری بورڈ، اخبار، رسالے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم وغیرہ نے اشتہار کو فن کا درجہ دے دیا ہے۔ پاپ فن کاروں نے ان سب سے اور کومکس، فوٹوگرافس اور سوپر مارکٹ اور ٹریڈ مارک سے اپنے موضوع اور انداز حاصل کیا ہے۔ اس آرٹ نے اپنے تصورات کئی ہر دلعزیز تجارتی اور اشتہاری آرٹ سے حاصل کئے ہیں۔ اس لئے پاپ آرٹ ایک ایسا طرزِ فن ہے جو فنونِ لطیفہ سے کسی حد تک مختلف ہے کیونکہ یہ روزمرہ کی اشیاء کو ہی فن کا مواد بناتا ہے یا ان کو فن کی سطح پر لا کر پیش کرتا ہے۔ ان کو حسن کی تمثیل تسلیم کر کے ان کی پرستش کرتا ہے۔

جب بھی پاپ آرٹ کی کوئی بھی نمائش ہوئی، آرٹ کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی اور اس کے حق اور مخالفت میں دلیلیں پیش کی جانے لگیں۔ ایسی ہی ہلچل اس وقت پیدا ہوئی تھی جب دادازم اور سرریلزم اور کیوبزم کے مداح فن کاروں نے آرٹ کی دنیا میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔ پاپ آرٹ نے بھی دادازم اور سرریلزم سے انسپریشن لی ہے اور ان سے متاثر ہو کر حقیقت کو نئے روپ اور معنی میں منعکس کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے اسے نئی حقیقت پرستی (نیا آرٹ، نیا دادازم یا نیا سرریلزم) کا پیش رو تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ پاپ آرٹ حقیقت اور رومان کا ایک نیا امتزاج پیش کرتا ہے۔

آرٹ کی دنیا میں دو رجحان مختلف سمتوں میں جاری رہے ہیں۔ ایک رجحان ہے فنون لطیفہ کا اور دوسرا مقبول عام فن کا جس کو ماس کمیونی کیشن (MASS COMMUNICATION) اور ماس پروڈکشن (MASS PRODUCTION) سے بڑی تقویت ملی اور انہی کے عکس اس نئے آرٹ میں ملتے ہیں۔ اس کا انسپریشن فنون لطیفہ نہیں اشتہاری فن ہے۔ یہی باعث ہے کہ کچھ نقادانِ فن اسے آرٹ کی مملکت سے جلاوطن کرنے پر مصر ہیں محض اس لئے نہیں کہ پاپ آرٹ اشتہار ہے یا حقیقی اشیا کا مجموعہ، بلکہ اس لئے کہ اس میں مصور کی کوئی ذہنی یا جذباتی شمولیت نہیں کیونکہ وہ میکانکی از سرِ نو تشکیل کی غیر ذاتی تکنیک کا استعمال کرتے ہیں۔

ان فن کاروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کمرشل فن کار ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو فنون لطیفہ کے ماہر ہیں۔ جیسا کہ جاسپر جانس لیکن نقادوں میں اس بات پر اختلاف رائے ہے کہ جاسپر جانس پاپ آرٹسٹ ہے یا نہیں، البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پہلا فن کار ہے جس نے فن کاروں کو کچھ مخصوص اشیا کی عکاسی کی قید سے آزاد کیا۔ اس نے بتایا کہ فن کا مواد کوئی بھی شے ہو سکتی ہے۔ فن صرف رنگوں اور خطوط کے توازن تک ہی محدود نہیں۔ جاسپر جانس اور رابرٹ روشن برگ پاپ آرٹ کے صفِ اول کے فن کار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اینڈی وارہول، رائے لکسٹن سٹائن، جیمز روزن کوسٹ، کلاز اولڈن برگ اور ٹام ویسل مین جیسے مشہور فن کار بھی اس گروہ میں شامل ہیں اور اس تحریک کے پیرو کار آج ہر ملک میں موجود ہیں۔

ان فن کاروں کی تصویروں سے صاف واضح ہے کہ پاپ آرٹ کیا ہے یکسر نتیجہ نہیں کہ پاپ آرٹسٹ حقیقی اشیا کو ہی ان کی اصل شکل میں پیش کر دیتے ہیں، چاہے وہ سوپ کا ڈبہ ہو یا کسی ماڈل لڑکی کی تصویر (شاید کبھی زندہ ماڈل بھی کینوس پر آجائے) یا بیئر کی بوتل یا یہ کہ وہ ان اشیا ہی کو فن کا مواد سمجھتے ہیں۔ پاپ آرٹ تو اشیا کی ماس کمیونی کیشن کی تمثیلوں پر مبنی ہے۔ ان تمثیلوں سے حقیقت کا نیا احساس پیدا ہوتا ہے جو خارجی چیزوں ہی کی طرح حقیقی ہے یا اُس سے بھی زیادہ سچا۔ اس لئے ان کے نزدیک یہ ماس خارجی دنیا کی اشیا سے زیادہ حقیقت کا شعور دے سکتا ہے۔ خاص کر اس حالت میں جبکہ ہمارے جذبات اور خیالات دقیانوسی روایت بن چکے ہیں۔

پاپ آرٹ کوئی منظم تحریک نہیں۔ ان فن کاروں کا کوئی مشترکہ منشور نہیں۔ ان سب نے آزادانہ طور پر اپنا کام شروع کیا۔ وہ ایک دوسرے سے اپنے مزاج، نقطۂ نظر، پسند، صلاحیت اور طرزِ فن میں مختلف ہیں لیکن ان سب میں کچھ ایسی باتیں مشترک طور پر ملتی ہیں جس کے باعث وہ پاپ آرٹسٹ مانے جاتے ہیں۔ ان میں اظہار اور طرز کا تنوع ہے۔ مثلاً جیمز روزن کوسٹ کے فنی نمونے دیکھئے۔ ان کے نزدیک اشیا کے مکمل روپ بجائے اُن کے اجزا یا حصوں کے زیادہ اہم ہیں۔ اس کی ایک بہت بڑی تصویر کی ٹھوڑی اور پیشانی میں اکیس فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس تصویر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ چہرہ عجیب جغرافیہ بن گیا ہے اور ناک یوگوسلاویہ کے نقشے کی طرح دکھائی دیتی ہے اور ہم بڑی بڑی صورتوں میں اشیا کے صرف ٹکڑے ہی دیکھتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہم زندگی کی مکمل تصویر نہیں دیکھ پاتے بلکہ ان کے کچھ ٹکڑوں کو ہی دیکھتے ہیں۔ اگر ہم کسی آسمانی قوت کے باعث زندگی کا مکمل اور جامع روپ دیکھ سکیں تو شاید فن کی تخلیق ہی ختم ہو جائے۔ روزن کوسٹ نے اپنی تصویروں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پاپ آرٹ کمرشل آرٹ کی نقل یا بازگشت نہیں بلکہ کامک (تمثیلی) تخلیق ہے۔ یہ آرٹ کا نیا بعد ہے۔ اس نے فنون لطیفہ اور کمرشل آرٹ کی حدوں کو مٹا دیا ہے اور ایک نئے طرزِ فن کو جنم دیا ہے۔

ماس کمیونی کیشن اور اشتہار کے اس دور میں پاپ آرٹ کی تحریک ناگزیر تھی۔ یہ جدید سرمایہ پرست دور کی پیداوار ہے۔ اس نے آرٹ کی دنیا کو نئے موضوعات اور مواد اور اشکال سے روشناس کرایا ہے۔ ایک نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”اس وقت سوال یہ نہیں کہ کیا پاپ آرٹ عظیم آرٹ ہے بلکہ یہ ہے کہ کیا یہ آرٹ اس دور کے نازک جذبات، شعور اور ماحول کی نمائندگی کرتا ہے یا نہیں یا یہ کہ اس فن کا مواد اور موضوع اور تکنیک فن کے نقطۂ نظر سے موزوں اور جائز ہیں یا نہیں۔ پاپ آرٹ مکمل فن نہیں، اس کی کوئی آخری قدر متعین نہیں کی جا سکتی۔ یہی کیا کم ہے کہ پاپ آرٹ نے انسانی پہلو کو پھر سے

اہمیت دینا شروع کر دیا ہے۔ لیبر من کے قول کے مطابق پاپ آرٹ میں وہی انسانی اقدار موجود ہیں جو کسی امن مورچے یا ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف مظاہرے اور بموں سے دہشت زدہ دنیا کے خلاف احتجاج اور بغاوت میں ہے۔

پاپ آرٹ کی پرورش شہری تہذیب میں ہوئی ہے۔ شہری اثرات ہی اس تحریک کا سرچشمہ ہیں اس لئے اس کی معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کئی پاپ فن کار اس تکنیک کو محض سنسنی پھیلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور وہ اس فن کی کافی مضحکہ خیز صورتیں پیش کرتے ہیں جن میں چمک دمک اور شور زیادہ ہے اور معنی کی گہرائی کم۔ ان کا فن سماجی تنقید یا طنز کے ناکام اور غیر واضح نمونے پیش کرتا ہے۔ ہیرلڈ اوزبورن ٹلینڈ نے پاپ آرٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ غیر مربوط اشیا کو ایک دوسرے سے جوڑ دینا فن کی تعمیری تخلیق کے لئے کافی نہیں۔ فن کار کو یہ اشیاء اس طرح جوڑنی چاہئیں کہ دیکھنے والے کو ان کے ایک دوسرے کے ساتھ آنے سے تحیّر اور تسکین کا احساس ہو۔ اگر ہمارے فن کی تخلیق خارجی شعور کے لئے انسانی احساس کے غیر لفظی اظہار کے لئے ہوئی ہے جیسا کہ میں مانتا ہوں، تو پاپ آرٹ حقیر آرٹ ہے کیونکہ اس پر لفظی خیالات حاوی ہیں۔ اس میں ہمدردی اور تنقید نہیں اس لئے یہ صحیح طور پر ابلاغ کی خوبی سے عاری ہے۔

پاپ آرٹ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ تہذیب کے موجودہ لمحے میں زندہ رہنے سے کیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس تہذیب کے ثبوت کا محض ایک حصہ ہے۔ اس کا سماجی اثر صرف یہی ہے کہ ہم بکاؤ شئے حقیر اور غیر شائستہ دنیا سے سمجھوتا کر لیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا اثر اشتہاری فن سے مختلف نہیں۔ بلنٹ کی نظر میں یہ ایک ایسا سمجھوتا ہے جسے آج سب سے زیادہ رد کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے فن اور خود زندگی بناوٹی مقبول عام تمثیلوں اور ریاکارانہ تجارت سے بچایا جا سکتا ہے۔

پاپ آرٹ کا شور ہر سو سنائی دے رہا ہے۔ اس کے کئی مداح بھی ہیں اور کٹر مخالف بھی۔ خطرہ یہ ہے کہ پاپ آرٹ نئی حقیقت پرستی کے پردے میں کمرشل فن کا شکار ہو کر نہ رہ جائے اور جدیدیت کے نام پر سنسنی پھیلانے کا سٹنٹ ثابت نہ ہو۔ اس لئے ایسے فن کاروں سے بچنے کی ضرورت ہے جو فن کے وفادار نہیں اور نہ ہی سنجیدہ ہیں۔ جو محض نقالی پر اپنا کاروبار چمکائے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں اس فن کی رو میں کبھی نئے سنجیدہ اور جدید تہذیب کے نمائندہ فن کی نشوونما ہو سکتی ہے جو اپنے دور کی زندگی اور فن میں ایک نیا توازن اور ربط قائم کر سکے گا۔

هدایت اللہ اختر

کشمیری فنون پر عربی اور ایرانی اثرات

طلوعِ اسلام سے قبل ہندوستان کی طرح کشمیر ہمہ رنگ معاشرے کی دولت سے محروم ضرور تھا لیکن کشمیریوں کے محنتی اور جفاکش ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہرگز نہیں۔ کشمیریوں کی جفاکشی اور جاں فشانی ہی کا نتیجہ تھا، جس نے ہندوستان اور ہندوستان کے فلک بوس پہاڑوں کے دامنوں میں اشوک اور بدھ مت کے پرچار کے لئے دیوہیکل بت تراشے، مندر کھڑے کئے اور بڑی بڑی چٹانوں پر تختے تراش کر ان پر اشلوک کندہ کر ڈالے جنہیں ریت کے طوفان اور باد و باراں کے تھپیڑے نہ مٹا سکے اور جو آج بھی کشمیریوں کے فنِ تعمیر کا پتہ دیتے ہوئے چین کی سرحدوں تک بکثرت ملتے ہیں کشمیری فن کار جب تیشہ لے کر پہاڑ پر چڑھتے تو یہ پہاڑ ہوتا اور جب اترتے تو پہاڑ دیوتاؤں کی آماجگاہ میں تبدیل ہو گیا ہوتا۔

یہی عالم پانی کے تہہ خانوں میں تھا۔ جھیل ولر کی تہوں میں سلطان زین العابدین بڈشاہ نے جب غوطہ خور بھیج کر مندروں کا کھوج لگایا تو پانی کی تہہ میں کئی ایک مندر اور کتنی ہی مورتیاں برآمد ہوئیں یہ سب کشمیریوں کے فنِ گراں بہا کے نمونے تھے۔ بعد ازاں اس آبگیر کے درمیان ایک عمارت کھڑی کردی گئی جس کا نام "زینہ لنک" تھا۔

کشمیریوں نے ظہورِ اسلام سے پیشتر سنگ تراشی، مصوری، رقص و موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ میں جو کمال حاصل کر رکھا تھا وہ زیادہ تر ہندو دھرم، سنیاس، سادھنا اور ترکِ دنیا کی جانب بہت زیادہ مائل تھا۔ لیکن اسلام کے مبلغ اور عرب کے جفاکش جب اس خطۂ حسین میں وارد ہوئے تو انھوں نے اس ملک کے محنت کشوں کو ایک حقیقت سے آشکار کردیا۔ کھیتی باڑی کے ڈھنگ سکھائے، صنعت و حرفت سے روشناس کرایا۔ فنون کے عروج اور تجارت کے اصول بتائے۔ ہندوستان، ایران، افغانستان اور عرب ممالک سے رابطے قائم کئے۔ برہمنوں سے اقتدار علم چھینا اور تعلیم ہر فرد پر لازم کردی۔ دیوتاؤں کی زبان سنسکرت ان کھنڈروں میں دفن ہو گئی جنہیں کشمیریوں نے کندہ کیا تھا۔ اس کی جگہ فارسی نے لے لی اور کشمیر کی مقامی زبان کشمیری کے لئے رسم الخط بھی فارسی ہی سے لیا گیا۔ مندروں کی جگہ مسجدوں نے لی اور بت تراشی ختم ہو گئی۔ مسجدوں کی دیواروں پر قرآن کی آیات کندہ ہونے لگیں۔ شعر و نغمہ پر بھی ایرانیت چھا گئی۔

مصوری میں شہزادوں اور پری زادوں کی تصاویر کی بجائے خوبصورت بیل بوٹے بننے لگے اور خطاطی ہونے لگی۔ تلوار کے پھلوں، توپ کے دہانوں اور خنجروں کے دستوں پر جہاں خونخوار درندے اور برہنہ راکھشس بنائے جاتے تھے، پھول پتیاں کندہ کی جانے لگیں اور عربی حروف میں اشعار صیقل ہونے لگے۔ ان پر زر و جواہر سے مرصع ہتھیار مثلاً خنجر، زرہ، کٹار، خود، تلوار جو نوادرات لئے ہوئے ہیں ان سے ایرانی سلاحِ جنگ کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ لباس میں ڈھیلا فرغل، سر پر پگڑی ٹانگوں میں شرعی پاجامہ، کاندھے پر چادر ہندو مسلمان سبھی یہی لباس اپنانے لگے کہیں کہیں کٹر ہندو لنگوٹی میں نظر آتے ہیں ورنہ کشمیر کا ٹھیٹھ لباس اوپر بیان کر دیا گیا ہے (۱) کشمیریوں

کا قومی باس ست جو قطعی طور پر قدیم ایران سے ملتا ہے۔ عربی اور ایرانی تمدن کے اپنائے جانے پر ساگ پات کی جگہ گوشت نے لے لی۔ اور گوشت کے پکوان اب تک خاص طور پر ایرانی اور عربی چلے آتے ہیں جس طرح عرب ایک ہی تھال پر بیٹھ کر کھاتے ہیں اور ایرانیوں کی قالین اور گبوں پر نشست ہوتی ہے بالکل وہی طور و طریق کشمیریوں کے ہیں غرضیکہ کشمیری معاشرے کے جس شعبے کا تجزیہ کیا جائے۔ اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ کشمیر نے زندگی کے ہر شعبے میں عربی تمدن اور ایرانیت کو اپنایا ہے اسی لیے کشمیر کو ایران صغیر بھی کہا جاتا ہے۔ افغان عہد حکومت میں کشمیری صنعت کا یہ عالم تھا کہ یہاں کی بنی ہوئی شالیں، افغانستان، ایران، ترکستان اور روس تک جاتی تھیں۔

جارج فاسٹر اپنے ۱۷۸۳ء کے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ کشمیر میں نہ صرف شمالی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے آئے ہوئے سوداگر اور تجارت پیشہ لوگ نظر آتے ہیں بلکہ تاتار، ایران اور ترکی کے سوداگر بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جو خوب پیسہ کمانے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی آب و ہوا اور دلکش مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کشمیر کی مشہور قدیم شاعرہ للہ دید شومت کی پیرو ایک درویش خاتون تھی جو وحدت الوجود کے فلسفہ کی قائل تھی۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کی کشمیر میں آمد پر اس نیک سیرت خاتون نے اسلام کی تعلیمات کو اپنایا۔ وادی میں اسلام کے آغاز کا اثر یہ تھا للہ عارفہ کا صوفیانہ کلام جسے اس نے کشمیری زبان کا جامہ پہنایا وہ بچے بچے کی زبان پر آگیا، اور اس کے دوہے گوشے گوشے میں گائے جانے لگے۔ کشمیری عوام شروع شروع میں فارسی اور عربی سے نابلد تھے۔ ان کی زبان کشمیری تھی لیکن شاہ ہمدانؒ کے ہمراہ آئے ہوئے سات سو مبلغین اور معلمین نے بڑی جلدی کشمیری زبان میں مہارت حاصل کی اور اسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر کشمیریوں کو عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ و تراکیب سے روشناس کرا دیا، آہستہ آہستہ سنسکرت جو سرکاری زبان تھی متروک ہو گئی اور پورے کشمیر میں اسلامی علوم اور اسلامی تعلیمات کا عروج شروع ہو گیا۔

یہ دور کشمیری شاعری کا دورِ اول کہلاتا ہے۔ اور اس دور کے نمائندوں میں شتی کنٹھ، للہ عارفہ اور شیخ نور الدین ولی قابلِ ذکر ہیں۔

مغل عہد کی آمد آمد تک کئی عرب اور کتنے ہی ایرانی فاضل سرزمین کشمیر میں آکر اپنے علم کا کمال اور حکمت کے موتی بکھیر چکے تھے چنانچہ مرزا حیدر نے تاریخ رشیدی کشمیر ہی میں لکھی۔

امیر فتح اللہ شیرازی خوراک کی بے اعتدالی سے بیمار ہوئے اور ۹۹۷ھ میں سری نگر میں انتقال ہوا، اور کوہ سلیمان پر دفن کر دیئے گئے۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کو امیر کی وفات سے بہت صدمہ ہوا ابوالفضل فیضی نے مرثیہ لکھا:

دگر ہنگام آں آمد کہ عالم از نظام افتد
جہان عقل را در غیم روز ماتم شام افتد

۱۰۰۵ھ سری نگر ہی میں اکبر نے جمال الدین حسین انجو کو فارسی میں لغت مرتب کرنے کو کہا۔ یہ فرہنگ اکبر کے زمانے میں شروع کی گئی اور عہد جہانگیری میں مکمل ہوئی۔ بارہ برس کی محنت سے تمام قدیم شعراء کے کلام میں سے تمام تر الفاظ یکجا کئے گئے۔ تزک جہانگیری میں درج ہے کہ "جمال الدین حسین انجو کو شہنشاہ نے عضد الدولہ کا لقب دیا اور جمال الدین حسین انجو بہار کے گورنر ہوئے۔"

اس طرح ملا محمد علی کاشمیری، کشمیر سے احمد نگر آگئے۔ پہلے نظام شاہی میں ملازم رہے۔ پھر سلطان برہان الملک کے دربار سے وابستہ رہے۔ عبدالرحیم خانخاناں کو متاثر کیا چنانچہ خانخاناں نے عربی کی مشہور کتاب "علامۃ العلما خواجہ حسین الدین" کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اس طرح ملا باقر کشمیری جہانگیر کے دربار سے وابستہ تھے۔ ملا محمد یوسف کشمیری ہمدانی ایک مشہور شاعر اور انشا پرداز تھے۔ ملا یوسف ایک نامور سپاہی تھے اور یہ

مشہور عالم محمد صادق کشمیری کے بھائی تھے جو طبقات شاہجہانی کے مصنف تھے۔ غرضیکہ ایران اور کشمیر کے باہمی روابط نہ صرف مذہبی اور روحانی بلکہ علمی اور لسانی بھی تھے کیونکہ ایران اور کشمیر کے مذہبی، روحانی اور ثقافتی ربط و ضبط کا ذریعہ فارسی زبان تھی، جو وسط ایشیا کی سب سے عظیم علمی اور تہذیبی زبان تھی۔

کشمیریوں نے نہ صرف اسے اپنایا بلکہ غنی کشمیری جیسے نامور شعرا پیدا کئے جن سے ایران کے مشہور شعرا صائب اور کلیم فارسی اشعار کا مفہوم سمجھنے کشمیر آتے تھے۔

یہی عالم موسیقی کا ہے کشمیری مغنی اپنے کمال کی وجہ سے اتنی شہرت رکھتے تھے کہ اکبر جیسے جلیل القدر بادشاہ کے دربار میں ہندی، ایرانی، تورانی اور تان سین جیسے باکمال ہنرمند مغنیوں کے ساتھ وہ بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں چونکہ ہندی موسیقار کثرت سے تھے، اس لئے کشمیری مغنی ان کی صحبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان کشمیری مغنیوں نے اپنے وطن واپس آکر جب ہندوستانی راگ راگنیاں بیان کیں تو کشمیری موسیقی ہندی اور ایرانی موسیقی کے اشتراک سے ایک جدید قالب اختیار کرتی چلی گئی

اکبر اعظم سے ڈیڑھ صدی قبل زین العابدین بڈشاہ شہنشاہ کشمیر نے ملا محمود اور ملا جمیل جو علم موسیقی میں صاحب تصانیف اور کئی راگ راگنیوں کے بانی تھے خراسان سے بلوائے اور ان کو انعامات سے سرفراز کیا ایران کی راگنیاں جو کشمیر کے سازندوں اور مطربوں نے اختیار کریں۔ ان کے نام ساگا راست، نوا، نے ریز، چارغ وغیرہ ہیں۔

محمد ایوب اولیاء

برٹش میوزیم میں ایشیائی مخطوطات کی نمائش

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے جس دورِ آزمائش میں یہ شعر لکھا تھا وہ واقعی ابتلا اور ذہنی کشمکش کا زمانہ تھا — یہ ایک غلام قوم کا حکمران طبقے کے خلاف ردِ عمل تھا — اپنی محرومیوں اور حسرتوں کو دل پذیر انداز میں بیان کرنے کا ذریعہ تھا — اب کہ بحمد اللہ ہم آزاد اور خود مختار ہیں تو اس شعر میں وہ گرفت اور توازن قدرے کم پایا جاتا ہے جو اس کے زمانۂ تحریر میں تھا — اب بھی لاکھوں، کروڑوں مسودے، مخطوطے، شاہی فرامین، قلمی نسخے، شبیہیں، دستی تصویریں اور کتابیں یورپ کے عجائب گھروں اور لائبریریوں میں موجود ہیں لیکن ہم ان کی بازیابی کے لئے وہ واویلا اور تگ و دو نہیں کرتے جو تقسیم ملک اور حصول آزادی سے قبل ہمارا نعرہ تھا — شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ؎

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہمارے دل میں لاکھوں شکایتیں اور ہزاروں تلخیاں ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس بات سے کسی منصف کو بھی انکار نہ ہوگا کہ جس طرح یورپین اقوام بالخصوص انگریزوں نے ہمارے علمی ذخائر اور قلمی و ادبی شہپاروں کی نگہداشت اور حفاظت کی ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی — اس بات کی شہادت برٹش میوزیم میں ایشیائی مخطوطوں کی نمائش واضح اور مناسب طور پر دے سکتی ہے ؎

غنی! روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن　　　که نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

لندن کے رسل سکوئر میں لندن یونیورسٹی سے گزریں تو سامنے برٹش میوزیم کی عظیم اور جہازی عمارت پڑتی ہے۔ اس کے شمالی دروازے سے داخل ہو کر آگے بڑھیں تو گنگ روم آتا ہے جس میں یہ نمائش ترتیب دی گئی ہے — اس کا آغاز سامی حروف تہجی اور رسم الخط سے ہوتا ہے۔ جس کے تحت پیلایو عبرانی سامیٹین آرمیک، پہلوی، مینڈے اک، سیریاک اور عربی وغیرہ زبانیں آتی ہیں۔ اس کیس میں پہلا مخطوطہ چھٹی صدی قبل مسیح کا عبرانی PALAEO زبان میں دیکھا جا سکتا ہے جو غالباً کسی چیز پر لکھا ہوا ہے اور ماہرین اور طالب علم کے لئے نہایت دلچسپی کا باعث ہے۔ اس کے بعد عربی زبان کا نمبر آتا ہے۔ موجودہ عربی زبان دراصل شمالی عربی ہے۔ جو NABATAEANS لوگوں کے حروف تہجی سے اختراع کی گئی تھی۔ یہ لوگ کوہ سینا کے شمال، مشرق اور جنوب میں رہائش پذیر تھے۔ قدیم ترین عربی نسخہ جو NABATAEANS رسم الخط میں پایا جاتا ہے، ۳۲۸ بعد از مسیح کا ہے۔

دراصل اہل عرب تحریر میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے۔ اور اس کرۂ ارض پر وہ واحد مثال ہیں جو زود لسان، زبان دان اور شاعری کے دلدادہ ہوتے ہوئے بھی بہت کم پڑھے لکھے تھے۔ عربی شعرا جو دوسری اقوام کو عجمی یعنی گونگا سمجھتے تھے اپنی نظمیں زبانی، زندہ الفاظ سے دوسروں تک پہنچاتے

تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عربی شعرا اپنے شعر کو زبانی یاد رکھتا تھا تاکہ وہ اُن کے کلام کو ازبر کر سکیں۔ مگر اسلام کی عالمگیر تحریک اور مذہب نے ان کو فنِ خطاطی سے روشناس کرایا۔ چونکہ اسلام میں انسانی مصوری کی ممانعت تھی اس لئے مسلم خطاطوں اور کاتبوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو حسنِ قلم پر صرف کیا۔ اور دو سو سال سے بھی کم عرصے میں وہ اس فنِ شریف میں اس قدر مشاق اور ماہر ہو گئے کہ آج تک ان کا کوئی مثیل و ہمسر نہیں۔ تحریر کی تزئین و آرائش کے لئے بہت سے انداز وضع کئے گئے جن میں مکی، مدنی کوفی اور بصری خط خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

۷۵۰ء میں جب بغداد میں عباسیوں کی خلافت قائم ہوئی تو فنِ خطاطی اسلامی فنونِ لطیفہ میں سے نمایاں ترین سمجھا جانے لگا۔ اس دور کے مشہور خوش نویس ابن مقلہ، ابن البواب اور یاقوت تھے۔ برعظیم پاک و ہند میں اعلیٰ پایہ کے خطاط پیدا ہوئے۔ افریقہ کا خط مغربی بھی اپنے جلو میں اپنی تمامتر رعنائیاں رکھتا ہے۔

عربی زبان کا قدیم ترین قلمی نسخہ جو یہاں دیکھا جا سکتا ہے وہ PAPYRUS کے پتوں پر لکھا ہوا پاسپورٹ ہے۔ بچھڑے کی جھلی پر لکھا ہوا قرآنِ کریم کی رسم الخط میں ہے۔ اس کے علاوہ خطِ نسخ اور دیگر اسالیب میں بھی لکھے ہوئے قرآن کریم کے نسخے قلب و نظر کو تازگی بخشتے ہیں۔

فارسی زبان اور خطِ نستعلیق میں لکھے ہوئے ادب پارے اپنی نظیر آپ ہیں۔ یہاں روغنی مجلد خمسۂ نظامی خطِ نستعلیق میں دیکھا جا سکتا ہے یہ نایاب نسخہ چالیس ہزار پونڈ مالیت کا بتایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دیوانِ خاقانی (نسخ میں)، دیوان سلمان ساوجی (نستعلیق میں) اور عشق وامق و عذرا نامی خطِ شکست میں لکھے ہوئے موجود ہیں۔

اردو کا قلمی نسخہ رتن سین اور پدماوتی کا عشق از ہنس بھی آپ یہاں دیکھیں گے جو اٹھارویں صدی عیسوی میں خطِ نسخ میں لکھا گیا تھا۔ پنجاب کا جغرافیہ پنجابی گورمکھی میں، ہملی بائبل ملتانی زبان اور رسم الخط میں، گجراتی میں دی ٹسٹامنٹ، مراٹھی زبان میں بیتال پچیسی بھی آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصنیف پالی پراکرت کا کلکتہ کا چھپا ہوا بنگالی زبان میں نسخہ بھی یہاں رکھا ہے جو ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا اٹھارویں صدی کا لکھا ہوا بنگالی میں مہا بھارت کا نسخہ بھی قابلِ قدر ہے۔

علاوہ ازیں ترکی، ملائی، پشتو، سندھی اور اردو کے مخطوطے عربی خطِ تحریر میں لکھے ہوئے موجود ہیں، جو اعلیٰ انسانی ذوق، محنت اور پاکیزگی کی غمازی کرتے ہیں۔

یہ تو رہی افقی رسم الخط کی بات ——— اب آیئے ذرا عمودی خطِ تحریر کا جائزہ لیں جس کے تحت چینی اور جاپانی زبانیں آتی ہیں چینی طرزِ تحریر کی ابتدا سادہ تصویروں کے ذریعے ہوئی جو زندگی کی روزمرہ کی چیزوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ زیادہ طور پر اسماء ہوتے تھے فعل کے لئے دو اشاروں یا نشانوں کو مجتمع کرنا پڑتا تھا جس سے کسی کام کا ہونا پایا جاتا تھا۔ اس بات سے اس زبان کے اشکال کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہزاروں قسم کے اشاروں تصویروں اور اُن ملی ہوئی شکلوں کو یاد کرنا پڑتا ہے ——— جاپانی تحریر بنیادی طور پر اس زبان سے مختلف ہے۔ بایں ہمہ جاپانیوں نے رسم الخط چینیوں سے مستعار لیا ہے اور بعد کو اس میں ایزاد و ترمیم کی ہے۔ چینی خط میں سب سے پرانی تحریر ایک ہڈی پر دیکھی جا سکتی ہے جو ایک ہزار سال قبل مسیح کی ہے۔ اور جاپانی زبان کی ٹائپ میں چھپی ہوئی (متحرک بلاک کے ذریعہ) سترھویں اور اٹھارویں صدی کی کتابیں بھی آپ یہاں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

قاضی عبدالقادر

تجریدی مصوری اور تفہیم کا مسئلہ

(۱)

مصوری، صورت گری، مجسمہ سازی اور سنگتراشی کی یہ کم نصیبی رہی ہے کہ فنونِ لطیفہ کی ان اصناف پر تنقید مصوروں اور مجسمہ سازوں کی بجائے فلاسفہ ماہرینِ نفسیات، ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھوں میں رہی جو اپنی تنقیدوں اور تبصروں میں اپنے منتخب میدان کے خیالات اور تصورات لے آئے مثلاً فلسفہ و منطق سے، ریاضی سے، نفسیات و تحلیل نفسی سے، ادب و شعر سے۔ اور اس طرح فنی تنقید یعنی صورت گری کی مختلف اصناف پر تنقید کو لسانیاتی، ریاضیاتی فلسفیانہ، نفسیاتی، ادبی اور شاعرانہ بنا دیا گیا۔

افلاطون سے لے کر جان ڈیوی اور کولنگ وڈ تک سوائے دو ایک کے ایسی مثالیں نہیں ملتیں جہاں خود مصور بھی نقاد ہو۔ میری مراد لیونارڈو، رینالڈز اور پال کلے سے ہے۔ یہ مصور بھی تھے اور نقادِ فن بھی۔ ان کے علاوہ ایسی قابلِ ذکر مثال نہیں ملتی جہاں ایک اچھا نقاد اعلیٰ درجہ کا مصور بھی ہو، یا ایک بلند پایہ مصور ایک اچھا نقادِ فن بھی ہو۔ ہمیں سردست دوسرے درجہ کے مصور نقادوں سے نہیں جن کی تعداد یقیناً خاصی ہوگی۔ انھوں نے نہ ہی تو فن کو کچھ دیا اور نہ تنقیدِ فن میں کچھ کیا۔ اگر کچھ دیا بھی ہے تو وہ اختلالِ ذہنی سے مختلف نہیں۔

مصوری اور تجریدی مصوری کے بارے میں جو خیالات ایک عرصے سے پھیل رہے ہیں اور فنونِ لطیفہ کے اس پہلو پر ایک مدت سے جو لعن طعن ہو رہی ہے اس کی تاریخ نصف صدی سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہی خیالات اب اس ملک میں پھیلتے نظر آ رہے ہیں اور یہاں بھی اس گفتگو کا آغاز ان نقادوں ہی سے ہوا ہے جو خود مصور نہیں اور اسی سبب سے مصوری کے مقصد، تصویر اور مجسمے کی غرض و غایت، اور "معنی و مفہوم" کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک مختلف عالمِ تخلیق میں رہ کر کہا گیا ہے جو کسی اعتبار سے مصوری و صورت گری پر منطبق نہیں ہوتا۔

واقعہ تو یہ ہے کہ مصوری پر یہ بحث، موضوعِ بحث سے عدم واقفیت کی صورت میں ہوئی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ کہے کہ یہ ساری گفتگو بے معنی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ صورت گری پر تنقید کے پیچھے یہ تصور ہے اور غالباً اس پر سب متفق ہیں کہ فن یا مصوری ایک لسان و زبان ہے اور چونکہ زبان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہے اور خود اس کی تفہیم بھی ممکن ہے۔ لہٰذا اگر کسی تصویر میں یہ دونوں عنصر نہ ہوں یا کم ہوں تو اسی اعتبار سے وہ تصویر کم اہم، بے معنی اور بے مقصد ہوگی۔ تجریدی مصوری پر جو اعتراضات ہوتے رہے ہیں اسی خیال کے تحت ہوئے ہیں کہ وہ سمجھ میں نہیں آتی۔ غرض روایتاً مصوری لسان و ابلاغ کی ایک قسم سمجھی جاتی رہی ہے لیکن یہ روایت نادرست بنیادوں پر استوار ہوئی ہے مجھے بہرحال اس تصور کو قبول کرنے میں تامل ہے کہ مصوری ایک زبان ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ اس تصور پر تنقید کی جائے مناسب یہ ہے کہ خود اس تصور کی توضیح کر دی جائے۔

(۲)

شہرت یہ کہ مصوری ایک زبان ہے بلکہ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر مصور کی اپنی زبان، اپنی ابجد اور اپنا طرزِ تحریر بھی ہوتا ہے۔ ایک مصور نیلے رنگ

کو اپنی تصویر میں زیادہ مقام دیتا ہے، دوسرا زرد کو تیسرا گلابی کو زیادہ استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح بعض مصور خاص موضوعات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ کوئی میلے ٹھیلوں کی تصویریں بناتا ہے، تو کوئی نوجوان لڑکیوں کی۔ اسی طرح مختلف فن کاروں کی تکنیک مختلف ہوتی ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ وہ مخصوص رنگ جو ایک مصور استعمال کرتا ہے، موضوعات جن کا وہ انتخاب کرتا ہے، تکنیک جو وہ برتتا ہے اس کی زبان کے الف بے ہیں جس مخصوص انداز میں مصور کاغذ یا کپڑے پر خطوط کھینچتا ہے، برش چلاتا ہے اور رنگ پھیلاتا ہے وہ اس مصور کی تحریر ہے۔ مثال کے طور پر چند تصویریں جو ایک عرصے تک پکاسو اور میرو کی سمجھی جاتی رہی تھیں۔ ان کے بارے میں ماہرین نے جب یہ فیصلہ سنایا کہ یہ فی الحقیقت پکاسو اور میرو کی نہیں ہیں تو یہ فیصلہ انہیں نکات کے پیش نظر دیا گیا تھا کہ ماہرین نے پکاسو کی "تصویری تحریر" اور ان جعلی تصویروں کے نقوش میں کوئی مماثلت نہیں پائی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تصویریں جو اب تک پکاسو کی کہلاتی تھیں، پکاسو کی نہیں ہیں کیونکہ ان میں پکاسو کی تحریر کی "شوخی" نہیں۔

اس قسم کی باتوں سے کہنے والے کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ہر فن کار مختلف صورتوں اور رنگوں یا خطوط کو نقش کرتے ہوئے ایک مخصوص وزن دیتا ہے جو اس کی تمام تخلیقات میں مشترک پایا جاتا ہے اور جب کبھی اس مصور کی تصویروں کے اصلی ہونے کے بارے میں سوال اٹھے تو صرف انہیں چیزوں کی روشنی میں یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ گویا ادبیات سے "اسٹائل بیانی" کے طریقہ کا فنی تحقیق میں اطلاق ہے جہاں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ایک تحریر فلاں شخص کی تحریر ہے یا نہیں، شخص مذکور کی تسلیم شدہ تحریروں کی طرز نگارش، جملوں کی ساخت وغیرہ اور تحریر زیر بحث کی ہیئت کا مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے "اسلوبیاتی تحقیق" اور "مصورانہ تحقیق" کی اس مماثلت میں یہی تصور کام کرتا ہے کہ مصوری ایک زبان ہے اور تصویر ایک تحریر ہے اور جس طرح ادبی تحریر کی قدر و قیمت کا انحصار اس کی "خیال آفرینی" میں ہے، بعینہ ایک تصویر کی خوبی اس کے خیال و فکر میں مضمر ہے۔

مصوری سے گذر کر کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ مصوری ہی نہیں بلکہ فنون لطیفہ کی دوسری اصناف مثلاً موسیقی، مجسمہ سازی وغیرہ بھی مختلف زبانیں ہیں اور جو خیال ایک صنف میں ادا کیا گیا ہے اس کا اظہار یا ترجمہ دوسری میں ہو سکتا ہے۔ نازی بربریت کا اظہار ایک مجسمہ میں بھی ہو سکتا ہے۔ اسی بات کو ساز و آواز کے آہنگ میں بیان کیا جا سکتا ہے، کاغذ پر رنگ روپ میں مقید کیا جا سکتا ہے اور الفاظ و اوزان کا پابند بنا کر نظم میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک تصویر یا مجسمے میں کچھ کہا گیا ہے تو اس کا اظہار نظم و شعر میں، یا نثر و تقریر میں ہونا چاہیئے اور اگر یہ ممکن نہیں اور ایک زبان کے "خیالات" دوسری میں بیان نہ ہو سکیں تو دونوں میں سے ایک زبان ناقص، کم ترقی یافتہ اور اسی اعتبار سے کم قدر و اہمیت کی حامل قرار دی جائے گی یا پھر یہ کہا جائے گا کہ ایک زبان میں بات ہی بے معنی کہی گئی ہے ورنہ دوسری زبان اور دوسرے پیرایئے میں اس کا اظہار ہو سکتا تھا۔

اہل ریاضی، ریاضی کی مختلف اصناف کے مابین اسی قسم کا تعلق بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں جو کچھ اقلیدس میں کہا جائے وہ کلاسیکی الجبرا کے قضایا میں بیان ہو سکتا ہے اور الجبرا کے مسائل کو ہندسہ کی زبان میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح افلاطون نے ان تصورات و خیالات کو ایجابی قدر دینے کی سفارش کی تھی جو ریاضیاتی خصوصیات رکھتے ہوں اور وہ خیالات اور اصناف فن جو کسی قسم ریاضیاتی تحلیل کی متحمل نہیں ہو سکیں معقولیت کے دائرہ سے خارج متصور کی جائیں گی۔ غالباً اسی سبب سے افلاطون نے موسیقی کو مصوری اور مجسمہ سازی سے اعلیٰ قرار دیا تھا کیونکہ موسیقی کی اساس ریاضیاتی ہے جبکہ مجسمہ کے خد و خال ریاضیاتی اور ہندسی تصورات میں احسن طور پر تحویل پذیر نہیں۔

دور جدید میں غیر شبیہی، یا تجریدی مصوری کو اسی وجہ سے ہدف ملامت بنایا جاتا ہے لیکن اس پر اعتراض اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ یہ ریاضیاتی نہیں، بلکہ یہ ایسی زبان ہے جس کی تعبیر نہایت موضوعی ہے اور روایتی اصولوں سے آزاد ہے۔ ماہرین نفسیات البتہ تجریدی مصوری کو ایک اعتبار سے اہمیت دیتے ہیں۔ یہ اہمیت و قدر طبی اور نفسیاتی ہے۔ ان کے سلسلے ایسی تصویریں نفسیاتی رپورٹیں ہیں جن میں ماہر نفسیات مصور کی شخصیت کے ارتقا کے خطوط

پڑھتا ہے۔

لیکن مصوری اور تجریدی مصوری کے بارے میں یہ خیالات اور نظریات کسی اعتبار سے بھی اس فن کا حق ادا نہیں کرتے۔ اس طرف اشارہ آج سے نصف صدی قبل (۱۹۱۳ء) پکاسو اپنے مخصوص انداز میں کر چکا تھا جب نقادوں نے اس کی مکعبی تصویروں کے رنگ روپ کے امتزاج پر تنقید کے بجائے ان میں فلسفہ حکمت کے نکات اور ریاضی و منطق کے تصورات اور تحلیل نفسی کے حقائق پڑھنے چاہے تھے۔ پکاسو نے بتایا کہ مکعبیت کی آسان توجیہ کرنے کے لئے لوگوں نے اسے ریاضی، موسیقی، تحلیل نفسی، کیمیا اور نہ جانے کس کس سے متعلق کرنا چاہا ہے۔ ان ساری کوششوں کو اگر حماقت نہ کہا جائے تو ادبِ محض کہہ لیجئے۔ بہرحال اس طرزِ فکر کے کوئی بہت عمدہ نتائج نہیں نکلے اور ان گوناگوں نظریات نے لوگوں کی آنکھیں چندھیا دیں، لیکن ایک مصور کے اس احتجاج کے باوجود نقاد اس کی اور اس جیسے دوسرے فن کاروں کی تخلیقات میں فلسفہ و حکمت کے مسائل، دین، ادب و اخلاق کے اصول تلاش کرتا رہا اور مصر رہا کہ مصوری تجربہ کا اظہار ہے، وہ اشارتی ہے اور اس کی حقیقت لسانیتی ہے۔

اس ساری گفتگو سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ معترضین کے لئے تصویر ایک قسم کی فلسفیانہ یا نفسیاتی تصنیف ہے اور اس کے بارے میں اسی طرح رد و قدح ہونی چاہیئے جو ایک عالمانہ تحریر پر ہو سکتی ہے اور جب جدید نقاد تجریدی مصوری پر تنقید کرتے ہیں تو اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تجریدی مصوری ایک مبہم اظہار ہے۔ اس کے منطقی محاسن کے بارے میں گفتگو نہیں ہو سکتی اور کیونکہ تجریدی تصویر کو اس قسم کی بحث کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا لہٰذا وہ کسی اعتبار سے لائق اعتنا نہیں۔

یہ کہ تجریدی مصوری معقول گفتگو کا موضوع نہیں بن سکتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ نہایت مغلق زبان ہے۔ "اس کی ابجد عجیب ہے"۔ جو کچھ اس میں کہا جاتا ہے اسے معقول پیرائے میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ "یہ غیر معقول و لایعنی ہے اور یہ سارا عمل تضیع اوقات ہے"۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ مصوری سماجی قدر و اہمیت کی حامل نہیں۔ یہ تصویریں ضائع کرنے کے ہی لائق ہیں اور وہ جو ایسی تصویریں بناتے ہیں اگر قابلِ گردن زدنی نہیں ہو تو کم از کم ان کی کوششیں قطعی ناقابلِ ستائش ضرور ہیں۔

(۳)

مصوری کے مندرجہ بالا نظریات اور مصوری پر ساری تنقید، جیسا کہ ہم نے دیکھا، اس بنیادی غلطی کا شکار ہیں کہ مصوری ایک زبان ہے۔ اس غلطی کو میں "معقولاتی مغالطہ" کہوں گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بحث جو ایک تصور کے تحت ہونی چاہیئے وہ بے محل ہو جاتی ہے۔ یہ مغالطہ میرے خیال میں تحریری زبان کو فن تحریر یا خطاطی سے خلط مبحث کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نکتہ وضاحت چاہتا ہے۔

زبان اشاروں اور علامتوں کے برتنے کا وظیفہ ہے۔ عام طور پر زبان کے لئے یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اشاری ہے اور اشاروں کا نظام ہے جہاں علامات افراد کی حرکات و سکنات، انسان و حیوان کی آواز، کاغذ یا تختہ پر بنائے ہوئے نقوش اور خطوط اپنے سے سوا کسی اور شے یا تصور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کو دیکھ کر یکلخت ہاتھ کا ماتھے تک اٹھ جانا "جذبات خیرسگالی" کا اظہار ہے۔ اسی طرح چوراہے پر سرخ، سبز اور زرد روشنیاں شہر کے حسن میں اضافہ کے لئے نہیں لگائی جاتیں، ان کی اہمیت اشارتی ہے۔

اگر قدیم مصری زبان کا مطالعہ کریں تو ہم وہاں یہی دیکھتے ہیں۔ یہ تصویری زبان کی کلاسیکی مثال ہے۔ اس زبان میں لکھنے کے لئے "کربلی چٹائی پر بیٹھی ہے"

---

۵۱ ملاحظہ ہو میری تصنیف: تعارفِ منطق جدید (باب دو، زبان اور منطق) شائع کردہ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۵ء

چنانچہ ایک تصویر پر بلی کی ایک تصویر بنا کر دکھانا پڑتا ہے کہ یہاں کس خیال یا واقعہ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے یعنی ہر تصویر اپنے سوا ہر خیال یا واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس اعتبار سے ہر تصویر اشاری ہے لیکن رفتہ رفتہ مکمل تصویر کی جگہ ایک نشان یا خفیف سی علامت خیالات کے اظہار کے لئے کافی سمجھی جانے لگی اور اسی سے ہماری ترقی یافتہ تحریری زبان کا تصور سامنے آیا جس کی مثال اس مضمون کی تحریر و زبان پیش کرتے ہیں۔

لیکن ہم جب تصویری زبان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو صرف یہ کہتے ہیں کہ کون سے نقوش اور خطوط کن حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں زبان تصویری ہے، اس زبان کے اشارات تصویری ہیں۔ ان کی حیثیت عملی اور وظائفی ہے جو ہر زبان کا خاصہ ہے لیکن تصویریں جن پر یہ زبان مشتمل ہے، ہمیں ان سے بحیثیت تصویر کے سروکار نہیں۔ ہم ان تصویروں کا بحیثیت تصویر کے مطالعہ نہیں کرتے یہاں ہم وہی فرق قائم کرتے ہیں جو صوت و آواز کے دو مختلف پہلوؤں کے مابین قائم کرتے ہیں۔ آواز کو تقریر و خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بھی سمجھا جا سکتا ہے اور آواز کا مطالعہ اس کی اپنی طور پر بھی ہو سکتا ہے۔ موسیقی میں ہم آواز کو اسی انداز سے مطالعہ کا موضوع بناتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم تحریری زبان میں "تحریر" اور "زبان" کو ایک دوسرے سے جدا کر کے تحریر بحیثیت ایک صنفِ فن اور زبان، خیالات کی ترسیل کے ذریعہ کی حیثیت سے امتیاز قائم کر لیں گے، اور یہ مطالعہ کے دو مختلف اور ایک دوسرے سے قطعی آزاد موضوع قرار دیئے جائیں گے۔

تحریر کو جب ہم موضوع گفتگو بناتے ہیں یا جب ہم خطاطی کے نمونوں کے بارے میں حکم لگاتے ہیں تو ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں ہوتی کہ خطاطی کے ان نمونوں میں کیا کہا گیا ہے بلکہ یہ کیسے لگ رہے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تحریر کیا کہہ رہی ہے بلکہ وہ کیسی نظر آتی ہے۔ بعینہ جب ہم کلاسیکی موسیقی یا آواز بحیثیت موسیقی کو موضوع مطالعہ بناتے ہیں تو یہ جاننا نہیں چاہتے کہ اس میں کیا کہا گیا ہے بلکہ یہ کان کو کیسی لگ رہی ہے۔ سماعت پر بار تو نہیں ہے

موسیقی کا سارا دار و مدار صوت، آواز کے آہنگ اور سماعت پر ہے۔ مصوری کی کل کائنات خطوط، رنگ، روغن و حجم نیز ان کی ترتیب و امتزاج ہے۔ اس میں خیالات و تصورات کا کوئی گزر نہیں اور اسی وجہ سے ان کی افہام و تفہیم کی بات ہے۔ سوال کرنا مصوری کی حقیقت سے عدم واقفیت کا اظہار ہے۔

(۴)

مسئلہ اب یہ ہے کہ مصوری اور تصویر کی حقیقت کیا ہے؟ اس بیان سے کیا مراد لی جائے کہ تصویر کے معنی و مفہوم کے بارے میں سوال ہی غیر اہم، بے معنی ہے اور یہی بحث کا دشوار گزار پہلو ہے۔

مصوری کی ایک ایسی تعریف دینا جو تحلیلی اور لفظی نہ ہو بلکہ معنویاتی بھی ہو اور جس پر سب متفق ہوں مشکل کام ہے لیکن اپنے وسیع ترین معنوں میں مصوری سے مراد تجربے کے خالص نظری (Visual) عناصر یعنی رنگ، خطوط اور بناوٹ (Texture) کو ان کی یک سطحی اور دو جہتی (طول و عرض) حالت میں برتنا ہے۔ انھیں نظری عناصر کے اجتماع کو نظری مادیت (Visual) کہتے ہیں۔ اگر اس میں طول و عرض ہے تو وہ تصویر ہے اور اگر عمق یا گہرائی کا عنصر بھی شامل ہو گیا تو پھر گفتگو تصویر اور مصوری سے نکل کر مجسمہ اور سہ جہتی صورتوں میں داخل ہو جائے گی۔ یہیں فی الوقت بحث صرف مصوری اور تصویر سے ہے۔ مصوری کی تعریف کے بعد اب تصویر کے لئے یہ کہا جائے گا کہ وہ رنگ، خطوط اور بناوٹ کا تفاعل (Function) ہے۔ انھیں تین عناصر پر تصویر مشتمل ہوتی ہے اور انھیں کے تفاعل کا نام تصویر ہے۔ ایک تصویر میں سے رنگ، خطوط وغیرہ کو نکال دیجئے تو سارا کارخانہ ختم ہو جائے گا۔

اب یہ دریافت کرنا کہ ان عناصر کی ترکیب کیوں کر ہوتی ہے، تصویر کے اصول ترتیب کے بارے میں سوال کرنا ہے۔ یہ تضاد، تکرار اور مشابہت یا مماثلت ہیں۔ عصر جدید کی تصویروں میں اصول تضاد نمایاں ہے جبکہ کلاسیکی مصوری میں مشابہت کا اصول کارفرما ہے اور قرون وسطیٰ کی تصویروں میں تکرار کا اصول غالب نظر آتا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ مصوری کو اس طرح تین واضح ادوار اور اصولوں کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ انسان کے اور دوسرے کارناموں کی طرح اس میں بھی مستثنیات ملتے ہیں۔

یہ بحث قطعی مختلف ہوئی کہ تصویر میں تضاد ہو یا تکرار۔ ہمارے سامنے مسئلہ صرف تصویر کی ہیئت ترکیبی کا ہے۔ اور ہم نے یہ دیکھا ہے کہ نظری عناصر کا اجتماع نظری صورت کا نام ہے۔ اب یہ کہنا کہ یہ نظری صورت کسی شکل سے مشابہت رکھتی ہے یا نہیں، یہ نظری صورت گلاب کے پھول جیسی ہے یا مکان اور درخت جیسی معلوم ہوتی ہے۔ دراصل ایک نظری صورت میں اپنے سابقہ تجربے کی جھلک دیکھنے کی کوشش ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری تصویر دیکھنے والے پر آتی ہے۔

ایک تصویر جو ممکن ہے ایک سے زیادہ نظری صورتوں پر مشتمل ہو اگر اس میں کوئی جانی پہچانی شکل و صورت نظر آئے تو بھی اس سے تصویر کی قدر و قیمت میں نہ اضافہ ہوتا ہے نہ کمی۔ یہ اتفاق ہے کہ ایک نظری صورت جانی پہچانی بھی ہو لیکن اس کے لئے یہ کسی طور بھی ضروری نہیں کہ اسے کسی سابقہ تجربے سے منسوب بھی کیا جائے۔

مصوری کے تاثیریتی اور بعد تاثریت مدرسوں میں غالباً اسی سبب سے "مشابہتوں کی تصویر کشی" کے خلاف جنگ نظر آتی ہے[1]۔ پچھلی صدی کے اواخر میں کیمرے کی ایجاد کے بعد مصوروں نے یہی کہا تھا کہ جہاں تک تجربے کی ہو بہو عکاسی مطلوب ہے یہ کام کیمرہ بھی کر سکتا ہے لیکن مصور کو سروکار نظری تجربے کی اس ابتدائی اور اساسی صورت سے ہے جہاں نظری عناصر اپنی حقیقی صورت میں نظر آتے ہیں یعنی مصور کا موضوع وہ رنگ اور خطوط اور مان کا امتزاج اور ترتیب ہے جنہیں ابھی ہم نے اپنی نفسیات میں نہیں رنگا ہے اور جو ہماری موضوعیت سے پاک ہیں۔ فلسفہ میں یہی چیز ہسرل کی مظہریت کی شکل میں ظاہر ہوئی اور جدید مصوری اسی تصور کی روشنی میں دیکھی جانی چاہیئے۔

اس کل بحث سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تصویر اپنی حقیقت میں نہ اشاری ہے نہ وہ خیال اور تصور کی علامت ہی ہے۔ اسی سبب سے اس کے بارے میں یہ سوال کرنا مناسب نہیں کہ "اس تصویر کا کیا مطلب ہے؟" "اس تصویر میں کیا خیال پیش کیا گیا ہے"۔ اور تصویر زبان یا اشارہ نہیں لہذا اس کی حیثیت نہ عملی ہے نا وظائفی۔ تصویر کا <u>اساسی</u> طور پر کوئی وظیفہ نہیں۔ یوں تصویر کو مختلف مقاصد کے لئے استعمال <u>کیا جا سکتا ہے لیکن تصویر کا تصویر ہونے کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں کہ وہ کسی مقصد کے لئے استعمال بھی کی جائے۔</u>

لہذا مصوری چاہے وہ تجریدی ہو یا حقیقی (اور اس بحث کے بعد تو یہ فرق بھی لغو معلوم ہوتا ہے) اس پر اس اعتبار سے تنقید کرنا کہ اس سے زندگی کے کون کون سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں، ایک بے معنی بات کرتا ہے۔ اور اسی طرح ایک "تجریدی تصویر" میں کسی جانی پہچانی شکل (انسان، انسانی روپ کتاب) کو تلاش کرنا اور اسے نہ دیکھ کر اعتراض کرنا کہ اس میں کوئی جانی پہچانی شکل نظر نہیں آتی، دراصل تصویر میں اس چیز کو دیکھنے کی بچکانہ خواہش ہے جو نہ تصویر میں ہے اور نہ مصور نے وہاں بنانی چاہی تھی[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہوں میرے مضامین
(a) Dawn Karachi 24 Nov. 1960: What is abstract Art?
(b) Khyber Mail (Peshawar) 22 Feb. 1965: Pioneers of Modern Art.

[2] اسی سبب سے بیشتر جدید مصور اپنی تصویروں کو کسی قسم کے عنوان نہیں دیتے اور اگر تصویر کو عنوان دیا تو اس کا مقصد دیکھنے والے کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ تجربے کے کس پہلو کی نظری تحلیل (Visual Analysis) اس تصویر کا سبب بنی۔

کتاب نما کی مطبوعات

آنگن : خدیجہ مستور کا شاہکار ناول (چوتھا ایڈیشن) جسے اس ربع صدی کا بہترین اردو ناول قرار دیا جا چکا ہے ۔/۸

دشتِ وفا : احمد ندیم قاسمی کا تازہ مجموعہ کلام (دوسرا ایڈیشن زیرِ طبع ہے) ۔/۸

مینا بازار : کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ ۲/۵۰

برگِ حنا : احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے مجموعہ کا سستا ایڈیشن ۲/۵۰

جگنو اور ستارے : جیلانی بانو کے ناولٹ ۔/۳

پنجاب میں اُردو : حافظ محمود شیرانی کا تحقیقی شاہکار ۔/۹

منٹو کے خطوط : ندیم کے نام منٹو کے خطوط کا نیا ایڈیشن ۲/۵۰

ریزہ ریزہ : ظہور نظر کا مجموعۂ کلام ۔/۵

دردِ آشوب : احمد فراز کا مجموعۂ کلام ۔/۵

راگ رنگ : موسیقی پر عنایت الٰہی ملک کے مضامین ۔/۲

بچوں کی کتابیں

حامد پر کیا گذری : عزیز اثری کا دُوسرا مقبول ناول، آفسٹ چھپائی باتصویر ۔/۳

تین اناڑی : عصمت چغتائی کا نہایت دِلچسپ ناول ۔/۲

جیتی جاگتی کہانیاں : عصمت، ہاجرہ، خدیجہ، اور جیلانی بانو کی کہانیاں، آفسٹ، باتصویر ۔/۳

زیرِ طبع

- پیاسے کا صحرا : ساقی فاروقی کا پہلا مجموعۂ کلام
- پتھر کی زبان : فہمیدہ ریاض کا پہلا مجموعۂ کلام
- کرنا فلی : مشہور بنگالی ناول - ترجمہ احمد سعدی
- وہ لوگ : ہاجرہ مسرور کے ڈرامے
- چوری چھپے : ہاجرہ مسرور کے افسانے

ایجنسی کی کتاب

شعلۂ گل : احمد ندیم قاسمی کا مجموعۂ کلام - قیمت ——— ۶/۵۰

کتاب نما - ۵۲ بی - سیٹلائٹ ٹاؤن - راولپنڈی

شاخ : ۴۰ - انارکلی - لاہور

فراق گورکھپوری

○

اوروں سے کیا کہ پاؤ گے، کیا بیان کر پاؤ گے
وہ چہرہ دیکھو گے تو یارو، دیکھتے ہی رہ جاؤ گے

ان کو دیکھ کے آنے والو، باخبری کی قدر کو قسم
کیسے ہیں وہ اور کہاں ہیں، اتنا بھی نہ بتاؤ گے؟

راہ کے کاروبار میں یارو، ہشیاری سی خطرہ ہے
عقل و ہوش سے کام نہ لینا، اک دن دھوکا کھاؤ گے

میرا قرب غنیمت جانو، ورنہ کچھ ہی دنوں کے بعد
دور دور تک ڈھونڈو گے لیکن تم مجھ کو نہ پاؤ گے

وہ نغمے چھوڑے جاتا ہوں بعد مرے اے ہم نفسو
دیر دیر تک سر دھن دھن کر اوروں کو بھی سناؤ گے

میرے جیتے جی تم سن لو، ساز غزل کے یہ نغمے
اور بھی شاعر آئیں گے لیکن کہاں فراق کو پاؤ گے

فراق گورکھپوری

○

دارالسلطنتوں کو بنایا دولت مند انسانوں نے — فنوں کا اک شہر بسایا میرے دل کے ترانوں نے
عشق کے تکیے میں آئے ہو با ادب اہلِ عزت و جاہ — اس مٹی کو سلام کیا ہے بڑے بڑے ایوانوں نے
آج وہی دل گلیوں گلیوں مارا مارا پھرتا ہے — وہ دل جس کا طواف کیا ہے کعبوں نے بت خانوں نے
لاعلمی، ناواقفیت، ناتجربہ کاری، معصومی — سوچو تو، کیا کیا نہ دیا داناؤں کو نادانوں نے
وہم و یقیں، ایمان و تشکک، اقرار و انکار و سکوت — کیا کیا مجھ کو سکھایا تیری ان آنکھوں کے بہانوں نے
شعر و شاعری بڑی پرانی چیزیں ہیں لیکن مجھ کو — اپنی طرف بلایا تھا اس فن کے نئے عنوانوں نے
کرشن و محمدؐ و عیسیٰؑ نے کس ظلمت میں آنکھیں کھولیں — کیسے کیسے چراغ جلائے دنیا کے غم خانوں نے
جن کو حجابِ اکبر کہیے جن تک ہاتھ پہنچ نہ سکے — وہ پردے بھی چاک کیے، کیا غضب کیا انسانوں نے
اوروں کی آنکھوں کو ملی ہے کب وہ دولتِ نظارہ — شاہدِ ہستی کو دیکھا! تو دیکھا ہم حیرانوں نے
کچھ غمِ دوراں، کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ انساں، کچھ غمِ عشق — ایک مہابھارت لکھ ڈالی ان دو چار افسانوں نے
نا گھر تیرا، نا گھر میرا، چڑیا رین بسیرا ہے — یادِ رفتگاں کی تصویریں کھینچی ہیں کاشانوں نے

دھرتی کے اے المیو! تم اس فراق کی قدر کرو
نغمۂ خلد سنایا تم کو آج اسی کے ترانوں نے

فیض احمد فیضؔ

○

کیے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے
شب و روزِ آشنائی مہ و سال تک نہ پہنچے

وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حسن کرتے
تری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

ترا لطف وجہِ تسکیں، نہ قرار شرحِ غم سے
کہ ہیں دل میں وہ گلے بھی جو ملال تک نہ پہنچے

کوئی یار جاں سے گزرا، کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیمِ یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

چلو فیضؔ دل جلائیں کریں پھر سے عرضِ جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

فارغ بخاری

○

کفر کا رنگ جھلکتا ہے نہ اسلام کا رنگ
کچھ عجب ہے مِرے افکار کے اصنام کا رنگ

چند افراد یہاں رنگوں کے سوداگر ہیں
کتنے چہرے ہیں کہ جن پر ہے فقط نام کا رنگ

منجمد غم کی فصیلوں میں گھرے ہیں ہم لوگ
دل کے آئینے میں ہے حسرتِ ناکام کا رنگ

وہ بھی زندوں میں گنے جاتے ہیں جن کے دل میں
کسی چلمن کی ہے خوشبو نہ کسی بام کا رنگ

گردشِ جام نے رنگین بنا رکھا ہے
ورنہ بے رنگ سا ہے گردشِ ایام کا رنگ

حسن سلمائے حقیقت کا کوئی رنگ نہیں
جو مئے ناب کا ہے رنگ، وہی جام کا رنگ

کتنے افسانے حوادث سے جنم لیتے ہیں
ہے مِرے نام میں فارغ میری ہمنام کا رنگ

قتیل شفائی

○

تہہ میں جو رہ گئے وہ صدف بھی نکالیے
طغیانیوں کا ہاتھ سمندر میں ڈالیے

اپنی حدود ہی میں رہیے کہ رہ جائے آبرو
اوپر جو دیکھنا ہے تو پگڑی سنبھالیے

خوشبو تو مدتوں کی زمیں دوز ہو چکی
اب صرف پتیوں کو ہوا میں اچھالیے

آہیں جو بچ رہی ہیں الٰہی انہی کی خیر
نغموں کی موت پر بہت آنسو بہا لیے

صدیوں کا فرق پڑتا ہے لمحوں کے پھیر میں
جو غم ہے آج کا اُسے کل پر نہ ٹالیے

کہہ دو صلیبِ شب سے کہ اپنی منائے خیر
ہم نے تو پھر چراغ سروں کے جلا لیے

آیا ہی تھا ابھی مرے لب پہ وفا کا نام
کچھ دوستوں نے ہاتھ میں پتھر اُٹھا لیے

دنیا کی نفرتیں مجھے قلاش کر گئیں
اک پیار کی نظر مرے کاسے میں ڈالیے

ساحل کے انتظار میں چکرا گیا ہوں میں
مجھ کو مری وفا کے بھنور سے نکالیے

رسوائیوں کا آپ کو آیا ہے اب خیال
ہم نے تو اپنے دوست بھی دشمن بنا لیے

محسوس ہو رہا ہے کچھ ایسا مجھے قتیل
نیندوں نے جیسے آج کی شب پر لگا لیے

قتیل شفائی

○

یہ مانا پیار اب بھی جانِ گل کا آشنا نہ ہے یارو
مگر یہ زہر پینے پر مجھے اصرار ہے یارو

میں اُتروں بھی تو میدانِ وفا میں کس طرح اُتروں
مقابل دوستوں کا لشکرِ جرّار ہے یارو

میسّر جس کو صحرا ہو وہ کیوں دریا تلک جائے
بگولا بھی تو اک اُڑتا ہوا منجدھار ہے یارو

نہیں ہے کوئی سدِّ راہ اطمینان سے بڑھ کر
نہ ہو ساحل اگر کوئی تو بیڑا پار ہے یارو

یہ منظر بھی کوئی دیکھے شبستانِ تحیّر کا
مقدّر سو رہا ہے آدمی بیدار ہے یارو

بھروسہ کر ہی لو اپنے مخاطب کی ذہانت پر
خموشی بھی تو اک پیرایۂ اظہار ہے یارو

کہاں تک حسنِ یوسف اپنی مجبوری پہ روئے گا
یہاں تو ہر قدم پہ مصر کا بازار ہے یارو

گئی رُت میں بھی جو اکثر ہمیں پہنائی جاتی تھی
اب اِس زنجیر میں شامل نئی جھنکار ہے یارو

بہکنے میں قتیلؔ اپنی الگ اک شان رکھتا ہے
وگرنہ میکدے میں ہر کوئی مے خوار ہے یارو

ادا جعفری

○

سچ کو زہر سے کہتے ہیں   زہر پی لیا ہم نے
راہ میں کہاں چھوڑا   دل سا رہنما ہم نے
تنگ و تیرہ گلیوں میں   شہر کھو دیا ہم نے
ظرف اپنا اپنا ہے   منہ سے کچھ کہا ہم نے!
خوابِ دل کا سرمایہ   اور لٹا دیا ہم نے
ہٹ گئے ہیں رستے سے   کچھ کہا سنا ہم نے؟
یاد آنے والوں کا   نام بھی لیا ہم نے؟
دیکھنے کو دیکھا تھا   کوئی خواب سا ہم نے
برگِ گل سے کیوں پوچھا   دل کا راستہ ہم نے

کر لیا ہے کس دل سے
اپنا سامنا ہم نے

افضل پرویز

○

عجز بیں اُس کی سبھا میں کیا کسی کو چارہ تھا
داں تو ہر شوریدہ کے سر پہ چمکتا آرہ تھا

ہائے وہ دن جب کسی فریاد پہ قدغن نہ تھی
درد کی ہر لہر زخمہ اور میں اکتارہ تھا

اُس نے دل میں جھانکنے کی مجھ کو مہلت ہی نہ دی
شوخ کے طرزِ تکلم ہی میں کیا چٹخارہ تھا

شاہ کے دربار میں ٹوڈی[1] کے سُر محبوس تھے
آہوئے دل اُس گھڑی صحراؤں میں آوارہ تھا

حُسن تیرا برگِ گُل تھا یا پرِ طاؤس تھا
دل مرا دینِ مبینِ عشق کا سیپارہ تھا

وصل اک لمحہ تھا لیکن نقش ہو کر رہ گیا
ورنہ کہنے کو غزالِ دشت کا طرارہ تھا

کتنے چاؤ سے کیا تھا ہم نے آغازِ سفر
زادِ رہ معصوم آشاؤں کا اک پشتارہ تھا

گاؤں کو پرویز نے تیاگا تو پھر لوٹا نہیں
ایک جھونکا تھا کوئی جوگی تھا یا بنجارہ تھا

[1] ایک راگنی جس کے متعلق روایت ہے کہ اس کے اثر سے آہوانِ صحرا کھچے آتے ہیں۔

مظفر علی سیّد

○

آگ سی ایک، دل میں لگی چاہیے
زندگی چاہیے، روشنی چاہیے

قہقہوں میں ہمارے فقط زہر ہے
مسکراہٹ ہمیں آپ کی چاہیے

اِک طلب ہو تو اللہ سے مانگیں دعا
کچھ بھی ملتا نہیں، اور سبھی چاہیے

بچ گئے تم سے جب اس کے دیوار و در
غیر کو اور کیسی خوشی چاہیے

دل جلا شن کے عشاق کی گفتگو
عشق بھی آج کل سرسری چاہیے

جس کو دیکھوں اُسے میں ہی چاہا کروں
آپ بھی تو کسی کو کبھی چاہیے

اور کچھ دم سے یاروں کو مطلب نہیں
بس رگ و پے میں اک سنسنی چاہیے

تم تو سیّد فقیری میں خوش ہو گئے
وہ بھی ہیں جن کو آسودگی چاہیے

مظفّر علی سیّد

○

تماشو اینٹ پتھر کی پناہیں
مساجد، مدرسے اور خانقاہیں
ہمارے سر پہ سایہ ہے فلک کا
غنیمت ہیں یہ مٹیالی سی راہیں
سنبھل کر بیٹھیے گا میکدے میں
یہاں پیہم اُچھلتی ہیں کلاہیں
حکومت کیا چلے مٹّی پہ اُس کی
کہ جس کی آسماں پر جلوہ گاہیں
کجا دوزخ، کہ جنّت میں بھی ہم نے
دبی آہیں سُنیں، زخمی کراہیں
نہیں دَولت کبھی ملنے کی ہم کو
ملے کیسے کہ جب تک ہم نہ چاہیں
وہاں کیجے تو کیسے پیار کیجے
جہاں پل میں بدلتی ہوں نگاہیں
نہ اُن کے ہاتھ آؤں گا میں سیّد
بُلایا ہی کریں گی اب وہ باہیں

صہبا اختر

○

بہ رعالم برابر لکھ رہا ہوں
میں پیاسا ہوں، سمندر لکھ رہا ہوں

نہ جانے کیا بلا ہے حرفِ زندہ
غمِ جاں سے گزر کر لکھ رہا ہوں

نظر پروازِ آدم پہ جمی ہے
ستاروں کا مقدّر لکھ رہا ہوں

سلامت ہے یہ کیوں تجھ سے بچھڑ کر
میں اپنے دل کو پتھر لکھ رہا ہوں

مئے لب سے مجھے خوش کرنے والو
تمھارے نام کوثر لکھ رہا ہوں

صہبا اختر

○

اُن کو مرے علوئے سخن سے ہے کیوں حسد
ناچس کی تیلیوں کے برابر ہیں جن کے قد

سینے میں ناچتی ہے زمیں، دل میں آسماں
چھوتا ہے دستِ فکر مہ و مہر کے جسد

مجھ کو یہ فخر ہے کہ میں فرزندِ خاک ہوں
خورشید و ماہتاب نہیں میرے اب و جد

آغاز بھی حیات ہے انجام بھی حیات
اک روشنی ازل ہے تو اک روشنی ابد

صہبا نثار اُس پہ سخن کے ہزار رنگ
جس نے مری غزل کو دیئے ہیں یہ خال و خد

سجاد باقر رضوی

○

راہوں کے اُونچ نیچ ذرا دیکھ بھال کے
ہاں رہروِ مراد، قدم رکھ سنبھال کے

فتنوں کو دیکھ، اپنے قدم روک، بیٹھ جا
راتیں یہ آفتوں کی ہیں، یہ دن وبال کے

لمحوں کی لَے پہ گزری ہیں راتیں نشاط کی
کس دھن میں دن کٹیں گے یہ رنج و ملال کے

میں سرگراں تھا ہجر کی راتوں کے قرض سے
مایوس ہو کے لوٹ گئے دن وصال کے

کچھ یہ نہ تھا کہ میں نے نہ سمجھی بساطِ دہر
میں خود ہی کھیل ہار گیا دیکھ بھال کے

سامانِ دل کو بے سرو سامانیاں ملیں!
کچھ اور بھی جواب تھے میرے سوال کے

تخلیق ہے مری، تری تخلیق سے الگ
میں بھی بناتا رہتا ہوں پیکر خیال کے

پیاسی زمینِ دل ہے، پڑا قحطِ فصلِ شوق
ہاں اے ہوا، کدھر گئے دن برشگال کے

باقرؔ یہ دانت بیچ زباں بند کیوں ہوئی
قائل تو آپ بھی تھے بہت قیل و قال کے

سجاد باقر رضوی

○

ظرفِ عالی ہوں کہ بھر کر بھی کبھی چھلکا نہیں
ہوں وہ دریا جو کناروں پر کبھی بہتا نہیں

ہوں وہ پیمانہ کہ محفل جس کو ہاتھوں ہاتھ لے
میں وہ نشہ ہوں جو سر چڑھ کر کبھی اترا نہیں

کشتِ ہستی! تو مجھے پہچان، تیری آس ہوں
میں وہ بادل ہوں جو اب تک ٹوٹ کر برسا نہیں

خواب ہوں لیکن اگر تعبیر خود اپنی کروں
میں نہیں یا پھر مری دنیا کا یہ نقشہ نہیں

دوں کسے آواز! اپنے آپ کو کیسے جگاؤں
تو مرے دل میں تو ہے لیکن مری سنتا نہیں

اس فقیری میں بھی للچاتی ہے دُنیا کی جھلک
میں کہوں کیسے کہ اُس کے پاس سے گذرا نہیں

تھا ہواؤں میں مگر نیچی تھی کچھ ایسی اُڑان
میں یہ سمجھا دل پہ اُترے گا، مگر اُترا نہیں

فاصلے قربت بنے، اب قربتیں ہیں فاصلہ
وہ جو پہلو میں ہے میرے دھیان میں آتا نہیں

دیکھتے ہو تم جسے ہر آن میرے ساتھ ساتھ
وہ مری آشفتگی ہے، وہ مرا سایہ نہیں

عزّتِ سادات ہے محفوظ باقرؔ میرے پاس
میں وہ عاشق ہوں جو اب تک شہر میں رسوا نہیں

صادق نسیم

○

ہر لفظ میں مہتابِ معانی کی ضیا ہوں
نادیدہ نگارانِ تصوّر کی ادا ہوں

احساس کے غنچوں کی چٹک ہے مری آواز
میں سینۂ آفاق میں دھڑکن کی صدا ہوں

ادراک کے شعلوں کا چمن ہے مرا آہنگ
میں برگِ خزاں ہو کے بھی گلزار نما ہوں

ہر تلخ حکایت پہ ہے شیریں مرا لہجہ
میں زہر کے ساغر میں بھی رس گھول رہا ہوں

محدود ہے کیوں حدِ طلب تک مری آواز
میں موجِ صبا ہو کے بھی زنجیر بپا ہوں

جب دشتِ الم سے کوئی جھونکا کبھی آیا
میں لالۂ خود رُو کی طرح اور کھلا ہوں

اب قصرِ تمنّا کے دریچے ہیں مرے زخم
میں خوں میں نہایا ہوں تو شہکار بنا ہوں

اک نغمۂ رنگیں ہوں لبِ سازِ مژہ پر
صادق جو ہی غنچہ ہوں تصویرِ صدا ہوں

صادق نسیم

○

بیدلؔ کا تخیل ہوں نہ غالبؔ کی نوا ہوں
اُس قافلۂ رفتہ کا نقشِ کفِ پا ہوں

رقصاں ہے چراغانِ تمنا مرے ہر سُو
وہ روشنیاں ہیں کہ میں سائے سے جُدا ہوں

ہر عکسِ مقابل سے نمایاں ہے مرا نقش
تنہا میں ہوں یا آئینہ خانے میں کھڑا ہوں

ظلمات اماں بھی ہوں اجالوں کا امیں بھی
میں صبح کے تارے کی طرح ڈوب رہا ہوں

افلاک رسی سے بھی تلافی نہیں ہوتی
کس عزم کی اَن دیکھی چٹانوں سے گرا ہوں

ہر چند کہ نس نس میں غمِ برقِ تپاں ہے
مثلِ کرم بھی برستا ہوں کہ گھنگھور گھٹا ہوں

ایک ایک کرن میں ترے سو رنگ نظر آئے
جب بھیگے پہر چاند کے ہمراہ چلا ہوں

خود اپنے تصور سے لرز اُٹھتا ہوں صادقؔ
کس کاکلِ پُرخم کی جنوں خیز ہوا ہوں

جاوید شاہین

○

اب یہاں لوگوں کے دکھ سکھ کا پتا کیا آئے
بند ہوں گھر تو مکینوں کی صدا کیا آئے

ڈوبتے دن کے جلو میں نہ سکوں ہے نہ فراغ
شفقِ شام سے چہروں پہ ضیا کیا آئے

سرد سینوں میں پنپتے ہی نہیں درد کے بیج
ان خرابوں پہ برسنے کو گھٹا کیا آئے

دور ہو کیسے ترے جسم، تری جاں کی گھٹن
تنگ نے بے روزن و در گھر میں ہوا کیا آئے

خشک پتے ہیں کہ جھڑتے ہی نہیں پیڑوں سے
کیسے تبدیل ہو رُت، رنگ نیا کیا آئے

کھو چکے لطفِ سحر خیزی، گراں خواب مکیں
صبحدم، بند دریچوں میں صبا کیا آئے

گرم ہنگامہ کرے کون رگوں میں شاہیں
خشک ندیوں میں کوئی موجِ بلا کیا آئے

محمد علوی

○

زمیں لوگوں سے ڈر گئی ہے
سمندروں میں اُتر گئی ہے

خموشیوں میں صدا گجر کی
خیال کے پر کتر گئی ہے

کھڑے ہیں سب برگ سر جھکائے
ہوا درختوں کو چر گئی ہے

ہمیں تو نیند آئے گی نہ لیکن
یہ رات بھی تو ٹھہر گئی ہے

کہاں بھٹکتے پھرو گے علوی
سڑک سے پوچھو کدھر گئی ہے

○

خرابے میں تنہائی کے کیوں پھروں
ملے جسم کا شہر تو جا رہوں

ابھی ساتھ چلتا ہوں ٹھہرو ذرا
جدائی کی پوشاک تو جھاڑ لوں

سنوں بند کمروں کی سرگوشیاں
کواڑوں کی درزوں سے جھانکا کروں

نئی نظم تو لے اُڑے چھوکرے
میں بوڑھی غزل سے ہی جی خوش کروں

پتا نام چاہو تو لکھ لو میاں
میرا نام علوی ہے گجراتی ہوں

محسن احسان

○

کتنی کڑی سزا ملی ہے دل کی بھول پر
اب قہقہے لگاتا ہوں اپنے اصول پر

غم کی مہیب آندھیاں چلنے کے باوجود
یادوں کا خون جم گیا لمحوں کی دھول پر

اب کے برس بہار نے ہر وار سہہ لیا
دستِ خزاں کا کوئی نشاں تھا نہ پھول پر

پاؤ گے اور کچھ نہ بجز زخمِ زندگی
انگور کو چڑھا کے ذرا دیکھو ببول پر[ے]

آئی ہوائے شوق تو سب نقش مٹ گئے
تحریر کوئی بھی نہ ملی دل کی دھول پر

محسنؔ کبھی نہ آئیں گی اڑ اڑ کے تتلیاں
گلدان میں سجے ہوئے کاغذ کے پھول پر

ے گرتے انگور چڑھایا ہر گھا زخیا

محسن احسان

○

سمجھ میں آتا نہیں، انتظار کیسا ہے
وہ پاس بھی ہے، پہ دل بے قرار کیسا ہے
امیرِ قافلۂ شہر! کچھ بتا تو سہی
جبینِ رہرواں پر غبار کیسا ہے

نہ برق ہی کہیں تڑپی، نہ آگ ہی بھڑکی
مگر دھواں سا سرِ شاخسار کیسا ہے
نہ کارواں کوئی بھٹکا، نہ کوئی دل دھڑکا
مگر یہ شورِ سرِ رہگزار کیسا ہے

ہر ایک بات میں پنہاں ہے طنز کی تلوار
مجھے خبر ہے مرا غمگسار کیسا ہے
پرو دیئے مری پلکوں پہ جس نے پیار کے پھول
خدا ہی جانے وہ جانِ بہار کیسا ہے

ہوائے وحشتِ محبت اسناد محسن کی
وہ بے مراد، غریب الدیار کیسا ہے

سیف زلفی

○

جو لوگ شور کرتے نہیں، ڈھول کی طرح
ذہنوں میں گونجتے ہیں، بڑے بول کی طرح

کھل کر بھی منتظر، کہ ملے زندگی کی بھیک
ہر گل ہے شاخسار پہ، کشکول کی طرح

اتنا گھنا ہے ذہن کہ پل بھر سکوں نہیں
شور اپنی سوچ کا ہے کسی غول کی طرح

جھانکا جو دل کے بیچ تو عریاں تھیں خواہشیں
اُوپر سے اوڑھ لی تھی اَنا، خول کی طرح

یہ جان لے کہ سستا نہیں ہے ہر ایک شخص
میں بھی بہت گراں ہوں، ترے مول کی طرح

ہیں ذہن کھوکھلے کہ ذرا نغمگی نہیں
پڑتے ہی تھاپ بجنے لگیں، ڈھول کی طرح

اُس ان سُنی سی شکل کی تفسیر کیا کروں
دل میں اُتر گئی جو نئے بول کی طرح

زلفی وہاں وہ چاہ کا دریا بھی خشک ہے
میں بھی یہاں ہوں سوکھے ہوئے ڈول کی طرح

سیف زلفی

کب تک یہ التفات، یہ پتھراؤ دوستو
پھر تم نہ گن سکو گے میرے گھاؤ دوستو

سینہ سپر ہوں میں بھی سرِ مقتلِ حیات
اب تم بھی خندقوں سے نکل آؤ دوستو

میں موجِ تند و تیز ہوں، ہٹ جاؤ راہ سے
کاغذ کی کھے رہے ہو کہاں ناؤ دوستو

پایا ہے تم نے اپنا خریدار بھی کوئی
پوچھا ہے تم نے اپنا کبھی بھاؤ دوستو

پہلے تم اپنے اپنے گریباں میں جھانک لو
پھر داغ ماہتاب کے گنواؤ دوستو

اپنی ستائشوں کے کنویں میں مگن رہو
خود اپنی عظمتوں کے بھجن گاؤ دوستو

تم چپ رہو تو اس میں تمہارا بھرم بھی ہے
یوں سب کے سامنے تو نہ ہکلاؤ دوستو

خنجر بدست آج تو بگڑے ہوئے ہو تم
اپنے کیے پہ آج تو شرماؤ دوستو

اچھی نہیں ہے ذہن پہ کائی جمی ہوئی
ہے مرگِ آب، جھیل کا ٹھہراؤ دوستو

کہتے ہیں جس کو شعلۂ احساسِ آگہی
اس کو لہو کی آنچ سے بھڑکاؤ دوستو

وہ سوچ جس سے گوہرِ انسانیت ملے
اس سوچ کے بھنور میں اتر جاؤ دوستو

وہ عطر، جس کا نام خلوصِ حیات ہے
اُس عطر سے مزاج کو مہکاؤ دوستو

وہ سوچ جس سے ذہن کے گوشے دمک اٹھیں
اُس سوچ کی کرن سے لپٹ جاؤ دوستو

زلفی کے دل میں گردِ کدورت ذرا نہیں
تم بھی اسی اصول کو اپناؤ دوستو

تخت سنگھ

○

ہر آنکھ تری، جھیل ہے نتھرے ہوئے جل کی
ہر جھیل میں خوشبو ہے اُجالے کے کنول کی

ہر اور دہکتی ہیں تجھے گھورتی آنکھیں
کیوں خیر مناؤں نہ ترے رُوپ سجَل کی

چاندی کی ڈلی بن کے مری رُوح میں جھلکی
مُسکان تری نین کٹوروں سے جو چھلکی

ہوتا ہے تری چاپ کا دھوکا جو کہیں سے
پڑتی ہے بھنک کان میں ہلکی سے بھی ہلکی

دھوپ "آج" کی ہر چند کڑی ہے، پر ابھی تک
سپنوں کے گھنے پیڑ تلے چھاؤں ہے کل کی

رہ جائیں نہ آشاؤں کے یہ پھول جُھلس کر
حالات کے جھونکوں میں تپی ریت ہے تھل کی

لگتا ہے، ہری ہونے کو ہے ڈال سمے کی
کونپل سی تو پھُوٹی ہے نئی بھور کے پل کی

کشور ناہید

○

ضبط اتنا بھی نہ کر، احساس مرجھا جائے گا
سرخ گالوں کا چمکتا رنگ زرد جائے گا

ایک ہی ہے سوچ کا انداز، دن یا رات ہو
لاکھ کیجے ترکِ صحبت، ربط بڑھتا جائے گا

ان گنت لوگوں کی چاہت نے اُسے دھندلا دیا
وہ کہاں تک اپنی صورت کو بدلتا جائے گا

روح بھی تشنہ رہے گی ریگِ ساحل کی طرح
جسم بھی شوقِ تعلق میں اُجڑتا جائے گا

ڈھیر ہو جائے گا سورج ایک دن جل جل کے آپ
چاند پتوں کی طرح آخر کو مرجھا جائے گا

شامِ غم جس سے ملوں پھروں وہ یاد آئے گا پھر
ہاں مگر کچھ دن میں وہ چہرا بھی دھندلا جائے گا

زعم ہے اس سے بچھڑ کے بھول جائیں گے اسے
کب مگر اپنی طبیعت ہی کو بدلا جائے گا

میں تری خوئے تلوّن کے کھلے صحرا میں ہوں
مجھ سے ہی کب تیرے گھر کا رستہ ڈھونڈا جائے گا

رنگ دکھلائے گا کچھ آخر شکستوں کا شمار
ہونٹ سی لو گی تو آنکھوں میں اُبھرتا جائے گا

تشنۂ گریہ ہوں مدت سے، تماشہ ہوں ترا
تو کہاں تک اپنے سائے سے الجھتا جائے گا

اندمالِ غم بھی ہے ناہید طرحِ تازہ غم
تشنگی جتنی بڑھے، شعلہ بھڑکتا جائے گا

اسلم انصاری

○

درسِ آدابِ جنوں یاد دلانے والے
آ گئے پھر مری زنجیر ہلانے والے

کس طرح کھوئے گئے عکسِ رواں کی صورت
شہرِ ہجراں میں ترا کھوج لگانے والے

خمِ محراب پہ صدیوں کی سیہ گرد بھی دیکھ
طاقِ ویراں میں لہو اپنا جلانے والے

غور سے دیکھ، کوئی ہے پسِ تصویرِ خزاں
ورنہ کس سمت گئے رنگ جگانے والے

فصلِ بے برگ کچھ ایسی بھی تو بے رنگ نہیں
داستاں عہدِ بہاراں کی سنانے والے!

زہر اب زہر ہے، کرتا نہیں کارِ تریاک
مر گئے زہر کو تریاک بنانے والے

دفِ گُل ٹوٹ گئی دستِ صبا میں لیکن
رقص کرتے ہی رہے وجد میں آنے والے

بجھ گئے شوخ دریچوں میں سلگتے مہتاب
سو گئے رات کی تقدیر جگانے والے

منتظر سب ہیں، مگر سب کو یہی دھڑکا ہے
اس خرابے کو پلٹتے نہیں جانے والے

اسلم انصاری

لرز لرز کے دلِ ناتواں ٹھہر ہی نہ جائے
فراقِ ساز، کہیں روحِ نغمہ مر ہی نہ جائے

اُتار لے کسی شیشے میں ساعتِ نغمہ
صدائے قافلۂ گل کہیں بکھر ہی نہ جائے

سنا بھی دے کسی گل کو فسونِ تنہائی
رہِ خیال سے یہ کارواں گزر ہی نہ جائے

کسی کو مہلتِ ہستی بھی دے غمِ جاناں
یہ کیا کہ آئے کوئی تو پلٹ کے گھر ہی نہ جائے

ہے ایک قلزمِ خوں قریۂ جنوں سے ادھر
یہاں جو آئے کوئی اس کی پھر خبر ہی نہ جائے

نگاہِ یار۔ غمِ جاں گسل کا کیا ہو گا
ترے کرم سے نصیبِ وفا سنور ہی نہ جائے

وہ خوش مزاج ہے، اس کو الم سے کیا نسبت
سنا نہ عشق کا غم، عشق سے وہ ڈر ہی نہ جائے

بجا کہ جاں سے گزرنا بہت کٹھن ہے اگر
ترے نثار، کوئی ایسا کام کر ہی نہ جائے

بہا دے آج کچھ آنسو، کہ پھر غنیمت ہیں
چڑھا ہے آج جو دریا، وہ کل اُتر ہی نہ جائے

سلیم شاہد

کھلتی ہے گفتگو سے گرہ پیچ و تاب کی
پر کس سے کھل کے بات کریں اضطراب کی

کافی نہیں ہے چشمِ تماشا کو رنگِ گُل
لائیں کہاں سے زخم میں خوشبو گلاب کی

اپنی برہنگی کو بچا تیز دھوپ سے
کرنوں میں بُو ہے جلتے ہوئے آفتاب کی

کچھ مَیں شجر سے ٹوٹ کے بے خانماں ہوا
ہاں کچھ ہوا نے بھی مری مٹی خراب کی

اک عمر ہو گئی ہے کہ میں جاں کنی میں ہوں
ایسی ٹھہر گئی ہے یہ ساعت عذاب کی

آہٹ نہ کر کہ میں تجھے جی بھر کے دیکھ لوں
ایسا نہ ہو کہ گر پڑے دیوار خواب کی

احساسِ تیرگی ہے تو سورج اچھال دے
ورنہ دعا نہ مانگ یہاں انقلاب کی

محکوم بستیوں سے سرکنے لگی ہے دھوپ
وہ عہد ہوں کہ جس نے شفق بے نقاب کی

بجلی چلی گئی تو وہ آنکھوں میں رہ گیا
اب چھُو کے پڑھ رہا ہوں عبارت کتاب کی

شاہد کہاں سے ہو کے گزرتی ہے آبِ جُو
رنگت تمام سرخ ہے کیوں سطحِ آب کی

بشیر احمد بشیر

○

اک دن میں پلک تک کوئی خونِ جگر آیا — برسوں میں کہیں چشمِ رواں کو ہنر آیا
اتنا ہی بس اب ربط ہے، وحشت ہوئی جب بھی — دیکھ آیا در و بام کو، اک آہ بھر آیا
ہو کون یہ اس دشت میں، کس کی ہو یہ آواز — آفت زدہ ہوگا کوئی، آیا ٹھہر آیا

ق

محسوس ہوئی چاپ سی آتی ہوئی نزدیک — دیوار پہ سایہ سا لرزتا نظر آیا
دیکھا جو پلٹ کر تو ہے اور نہ دریچہ — ہنستا ہوں میں اب، رات مگر کتنا ڈر آیا

ہر ثابت و سیار کی گردش رہی موقوف — پھر ماہِ مبیں فرشِ زمیں پر اتر آیا

ق

بخشا گیا پھر اذنِ سفر ہر سفری کو — پھر قافلۂ صبحِ ازل موج پہ آیا
یکتا ہوئے، کامل ہوئے افسانہ گری میں — اچھا ہوا یارو، تمھیں یہ بھی ہنر آیا

میں ساعتِ رفتہ، مری امید نہ رکھیو — گزرا ہوا لمحہ بھی کبھی لوٹ کر آیا

پہلے تو بشیر اک یونہی سادہ سی لگی بات
پرکھا تو سخن گنجِ جواہر نظر آیا

جون ایلیا

○

حال یہ ہے کہ خواہشِ پرسشِ حال بھی نہیں
اپنا خیال بھی نہیں، اُس کا خیال بھی نہیں

اے شجرِ حیاتِ شوق، ایسی خزاں رسیدگی
چادرِ برگ و گل تو کیا، جسم پہ چھال بھی نہیں

تو مرا حوصلہ تو دیکھ، داد تو دے کہ اب مجھے
شوقِ کمال بھی نہیں فکرِ زوال بھی نہیں

مجھ میں وہ شخص مر چکا جس کا کوئی ثبوت تھا
سود ہے کیا، زیاں ہے کیا، اس کا سوال بھی نہیں

خیمہ گہِ نگاہ کو لوٹ لیا گیا ہے کیا؟
آج افق کے دوش پہ گرد کی شال بھی نہیں

اُف یہ فضائے احتیاط، تاکہیں اُڑ نہ جائیں ہم
بادِ جنوب بھی نہیں، بادِ شمال بھی نہیں

مست ہیں اپنے حال میں دل زدگان و دلبراں
صلح و سلام تو کجا، جنگ و جدال بھی نہیں

وجہِ معاشِ بیدلاں یاس ہے اب، مگر کہاں
تیرے ورود کا گماں فرضِ محال بھی نہیں

پہلے ہمارے ذہن میں حسن کی اک مثال تھی
اب تو ہمارے ذہن میں کوئی مثال بھی نہیں

میرے زمان و ذات کا ہے یہ معاملہ کہ اب
صبحِ فراق بھی نہیں، شامِ وصال بھی نہیں

غارتِ روز و شب تو دیکھ، وقت کا یہ غضب تو دیکھ
کل تو نڈھال بھی تھا میں، آج نڈھال بھی نہیں

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

انور شعور

○

کیا چاہیے نہ تھا یہ کبھی پوچھنا تمھیں
کیسے ہو تم شعور یہ کیا ہو گیا تمھیں

ماتھا جلا ہوا ہے کڑی دھوپ سے، اور آنکھ
کہتی ہے رات رات کا جاگا ہوا تمھیں

کیا اضطراب تھا کہ سکوں چھین لے گیا
کیا انقلاب تھا جو نہ راس آسکا تمھیں

کس سمت سے چلی تھی کس آنگن سے آئی تھی
بادِ سموم، جس نے پریشاں کیا تمھیں

کیوں گرد گرد ہے یہ قبا جس کے باب میں
تھا ناگوار لمسِ لطیفِ صبا تمھیں

عرصے سے کیوں غزل کوئی شائع نہیں ہوئی
کیوں نشر گاہ سے نہ کسی نے سنا تمھیں

وہ جمگھٹا وہ بھیڑ وہ جلسے کہاں گئے
چھوڑا تمھارے چاہنے والوں نے کیا تمھیں

رہتے ہو کیوں اکیلے اکیلے اُداس اُداس
کیا دوستوں سے آنے لگی ہے حیا تمھیں

میں نے تو کوئی دکھ تمھیں ہرگز دیا نہیں
پھر دو جہاں کا کون سا غم کھا گیا تمھیں

میں سامنے ہوں جان ذرا آنکھ تو اٹھاؤ
مدت ہوئی ہے دیکھے ہوئے آئینہ تمھیں

اقبال ساجد

○

غار سے سنگ ہٹایا تو وہ خالی نکلا
کسی قیدی کا نہ کردار مثالی نکلا

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

سب کی شکلوں میں تری شکل نظر آئی مجھے
قرعۂ فال مرے نام پہ گالی نکلا

راس آئے مجھے مرجھائے ہوئے زرد گلاب
غم کا پر تو مرے چہرے کی بحالی نکلا

کٹ گیا جسم مگر سائے تو محفوظ رہے
میرا شیرازہ بکھر کر بھی مثالی نکلا

رات جب گذری تو پھر صبح حنا رنگ ہوئی
آسماں جاگی ہوئی آنکھ کی لالی نکلا

رات مجھ سے بھی تو ہر گھر کے در و بام سجے
چاند کی طرح مرا عکسِ خیالی نکلا

آہ پھنکار کی مانند دلوں سے نکلی
کوئی بھی گھر نہ یہاں سانپ سے خالی نکلا

تخت خالی ہی رہا دل کا ہمیشہ ساجد
اس ریاست کا تو کوئی بھی نہ والی نکلا

صمد انصاری

○

محرابِ جنوں میں سرِ منبر نہیں پہنچے
جو لوگ غمِ ذات سے باہر نہیں پہنچے

گزرے ہیں کسی راہ سے مقتل کے مسافر
پہنچے ہیں سرِ دار تو مڑ کر نہیں پہنچے

گرتا ہے جہاں تازگیِ فکر کا جھرنا
اُس چشمۂ حیواں پہ سکندر نہیں پہنچے

وہ تیر بھی سینے میں کھٹکتے ہیں ہدف کے
وہ تیر جو ترکش سے کماں پر نہیں پہنچے

الفاظ کو دیتے ہیں جو الہام کی صورت
بازارِ سخن میں وہ پیمبر نہیں پہنچے

مہکے ہیں وہی رات گلابوں سے زیادہ
وہ داغ جو زخموں کے برابر نہیں پہنچے

جو دل میں اُتر جاتے ہیں بے لفظ و معانی
فن تک وہ صمدؔ حسن کے تیور نہیں پہنچے

صدیق افغانی

○

بوالہوس ہم بھی نہ تھا، وہ بُت بھی ہرجائی نہ تھا
پھر بھی ہم بہروپیوں کو خوفِ رسوائی نہ تھا

آندھیوں نے سب مٹا ڈالے نقوشِ رہگزر
ریت کے سینے پہ داغِ آبلہ پائی نہ تھا

رات کے کالے کنوئیں میں چھپ گیا سایہ مرا
اس سے پہلے تو کبھی یہ رنگِ تنہائی نہ تھا

درد کا گرداب، موجِ اشک، سیلِ آرزو
دل میں اک ناشور تھا زخمِ شناسائی نہ تھا

وہم کا پیکر تھا آویزاں درو دیوار پر،
کھڑکیوں میں چاند، محوِ جلوہ آرائی نہ تھا

سبز پیڑوں کے تنے کٹ کٹ کے کیوں گرنے لگے
اے ہوا! میں قتل و غارت کا تمنائی نہ تھا

کیا تر و تازہ تھا آبِ صبح سے نخلِ شفق
بجھتے سورج میں تو یہ اندازِ رعنائی نہ تھا

ایک اک کردار تھا اپنی اداکاری میں گم
اِس تماشاگاہ میں کوئی تماشائی نہ تھا

مرگیا صدیق کوہِ غم سے ٹکر مار کر
سر میں سودا تھا، مگر ذوقِ جبیں سائی نہ تھا

صدیق افغانی

○

شعبدہ تھا یا حقیقت، ذہن تاریکی میں تھا
جل رہا تھا آگ میں جنگل، دھواں پانی میں تھا

سبز ٹہنی پر جما تھا قطرۂ خونِ گلاب
لوگ یہ سمجھے کہ سونے کا اثر مٹی میں تھا

جنبشِ موجِ ہوا سے چھڑ گیا سازِ شمیم
ورنہ ہر گل مضطرب زندانِ خاموشی میں تھا

کھُل گئیں جب انگلیاں کتنی پشیمانی ہوئی
بند اک پھیلا ہوا صحرا مری مٹھی میں تھا

بزم میں آ کر بجھا، میری طبیعت کا چراغ
میں کہ صدیوں سے فروزاں کُنجِ تنہائی میں تھا

چھُو لیا جب میں نے وہ پیکر تو میلا ہو گیا
اب کھُلا یہ راز۔ چاہت کا مزا دوری میں تھا

میں نے جب صدیق دوڑائی زمانوں پر نظر
اک جہاں سمٹا ہوا لمحے کی پہنائی میں تھا

ریاض مجید

○

چھوڑ میرا ساتھ، خود کو ختم کرنے دے مجھے
زندگی اے زندگی! مت روک مرنے دے مجھے

منزلوں کی راہ تکتے تکتے آنکھیں بجھ گئیں
چلتے چلتے تھک گیا ہوں، اب ٹھہرنے دے مجھے

روزِ پیدائش سے زنجیرِ سفر میں قید ہوں
اے دلِ آوارہ! اب آرام کرنے دے مجھے

ہو گیا ہے ختم کھارے پانیوں کا سلسلہ
دیکھ، دھرتی آگئی ہے، اب اُترنے دے مجھے

مجھ کو اَن دیکھی زمینیں دیکھنے کا شوق ہے
میں ہواؤں کی امانت ہوں، بکھرنے دے مجھے

سب مرے بوسیدہ خدّ و خال سے بیزار ہیں
اے بدن! اب اور کوئی سوانگ بھرنے دے مجھے

روح کا کانٹا ہے، ناآسودہ خواہش کی خلش
جو مرا دل چاہتا ہے، کر گزرنے دے مجھے

میرے مردہ جسم سے کچھ اور پتھر باندھ دے
موج اُبھارے بھی اگر، تو مت اُبھرنے دے مجھے

اے گلی کوچوں کے شور و غل! مرے پیچھے نہ آ
اپنے اندر کی صدا پر کان دھرنے دے مجھے

سہہ چکا ہوں ہر سمے کا قہر اپنی جان پر
اے ریاضؔ! اب اپنے بال و پر کترنے دے مجھے

ریاض مجید

○

رات دن محبوس اپنے ظاہری پیکر میں ہوں
شعلۂ مضطر ہوں میں لیکن ابھی پتھر میں ہوں
اپنی سوچوں سے نکلنا بھی مجھے دشوار ہے
دیکھ میں کس بے کسی کے گنبدِ بے در میں ہوں
دیکھتے ہیں سب مگر کوئی مجھے پڑھتا نہیں
گزرے وقتوں کی عبارت ہوں، عجائب گھر میں ہوں
جرم کرتا ہے کوئی اور شرم آتی ہے مجھے
یہ سزا کیسی ہے؟ میں کس عرصۂ محشر میں ہوں؟
میرا دکھ یہ ہے میں اپنے سابقوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں
تجھ کو اتنا کچھ بنانے میں مرا بھی ہاتھ ہے
میری جانب دیکھ میں بھی تیرے پس منظر میں ہوں
کون میرا پوجنے والا ہے جو آگے بڑھے
میں اکیلا دیوتا جلتے ہوئے مندر میں ہوں
مجھ سے بھی اُڑتے ہوئے لمحے نہ پکڑے جا سکے
میں بھی دنیا کی طرح حالات کے چکر میں ہوں

گوہر ہوشیارپوری

○

شاعری بات نہیں گرمِ سخن ہونے کی
شرط ہی اور ہے شائستۂ فن ہونے کی

ہیں کہ ہر دم مجھے بالیدگیٔ روح کی فکر
روح کو فکر ہے وارستۂ تن ہونے کی

پرتوِ رنگ سے گلگوں ہوا معمورۂ چشم
دھوم ہے کوئے تماشا کے چمن ہونے کی

رم بہ رم سلسلۂ موجِ غزالانِ خیال
دشتِ غربت کو بشارت ہو وطن ہونے کی

حق پرستی کو یہاں کون ہے آمادۂ دار
کس کو توفیق ہے بے گور و کفن ہونے کی

یا بچے گا نہ سحر تک کوئی درماندۂ شب
یا سحر ہی نہیں "خاکم بدہن" ہونے کی

درد کی سالگرہ خیر سے گزرے گوہرؔ
آ گئی رات وہی چاند گہن ہونے کی

فضیل جعفری

○

روز و شب چلتے ہیں لیکن نہیں پاتے خود کو
ہائے یہ دَور کہ اب اپنے ہی سائے ہوئے لوگ

کُو بہ کُو پھرتے ہیں بے نام بگولوں کی طرح
دل میں سو طرح کے ارمان بسائے ہوئے لوگ

راستہ بھول گئے جسم کے صحراؤں میں
آرزوؤں کے سمندر میں نہائے ہوئے لوگ

○

شہرِ لب و رخسار میں مرنے نہیں دیتیں
کچھ مصلحتیں حد سے گذرنے نہیں دیتیں

ایسا کوئی جادو تری یادوں نے کیا ہے
تہ خانوں سے ماضی کے اُبھرنے نہیں دیتیں

آوارہ حسیناؤں کے مانند ہوائیں
منزل پہ مسافر کو ٹھہرنے نہیں دیتیں

زاہد فارانی

○

ہے میرے سر سے کوئی بوجھ اتارنے والا
پکارتا ہے یہ ہر دم پکارنے والا

پھرا ہے یوں وہ رُخِ آئینہ نما مجھ سے
کوئی نہیں مری صورت سنوارنے والا

بنا ہوں سینۂ دریا کا بوجھ مدت سے
کوئی رہا ہی نہیں پار اُتارنے والا

بدلتی جاتی ہے حالت زمیں کے چہرے کی
کہ آسماں ہے نیا روپ دھارنے والا

اتر کے کارگہِ فن میں فتح یاب ہوا
بساطِ دہر پہ ہر روز ہارنے والا

میں اپنے عہد کا عنقاے شعر ہوں زاہد
مرا قلم ہے نئے نقش اُبھارنے والا

○

ستارے چپ ہیں کہ نغمہ سرا سمندر ہے
شبِ خموش کے دل کی صدا سمندر ہے

سکوتِ لب کو صداؤں کا پیش رو سمجھو
کہ رود پار کے آگے کھلا سمندر ہے

وہ دیکھتا ہے مرے اضطراب کو ہنس کر
میں تیز رو ہوں، وہ ٹھہرا ہوا سمندر ہے

مہ و نجوم دکھاتے ہیں آئینہ اس کو
فلک کے سامنے چہرہ نما سمندر ہے

تھکے چلے ہیں مسافت کا نقش اہلِ طلب
ہوا سروں میں ہے اور زیرِ پا سمندر ہے

نظر میں صورتِ ساحل ابھی نہیں آئی
مرے سفر کا ہر اک مرحلہ سمندر ہے

کیفی جامپوری

○

بلبلو! وقتِ نوا تو دیکھو
اور گلشن کی فضا تو دیکھو
کس کو آوارہ سری تھی منظور
دشت کے صبح و مسا تو دیکھو
ایک دامن بھی سلامت نہ رہا
شوخیِ دستِ صبا تو دیکھو
میرے اشکوں میں وہ سرخی نہ سہی
اپنے ہاتھوں کی حنا تو دیکھو
ہنستے ہو چاک گریبانوں پر
تم ذرا اپنی قبا تو دیکھو
لطفِ نغمہ پہ مٹے جاتے ہو
سینۂ نغمہ سرا تو دیکھو

○

سامنے دشتِ وفا ہو جیسے
راہرو آبلہ پا ہو جیسے
ترے لہجے کا یہ دھیما پن بھی
عالمِ رنگ و نوا ہو جیسے
چاندنی رات کے سناٹے میں
کوئی دل چیخ رہا ہو جیسے
میں نے محسوس کیا ہے اکثر
تو ابھی اُٹھ کے گیا ہو جیسے
اہلِ دل کا یہ سکوتِ پیہم
ماتمِ مرگِ وفا ہو جیسے
ہم ہیں بدنامِ تمنا، ہم سے
شہر کا شہر خفا ہو جیسے

ظفر ابنِ متین

○

سوچتا ہوں کہ میں آج رازِ نہاں کھول دُوں
بند کمرے میں گھٹتا ہے دم، کھڑکیاں کھول دُوں

کیا کروں، میرے لب ہیں شکایت سے ناآشنا
ورنہ اک دن بھرم تیرا اے مہرباں، کھول دُوں

پڑھ لیا دل کا مضمون چہرے کے عنوان سے
تو نہ مانے تو میں آج سب سُرخیاں کھول دُوں

میری چُپ ہی بھری بزم کا اب تو موضوع ہے
کیا بنے اہلِ محفل پہ، گر میں زباں کھول دُوں

چُپ رہوں میں تو اک نقطۂ بے حقیقت سے کم
اور بولوں تو ہر رازِ کون و مکاں، کھول دوں

○

ویراں روش روش ہے، چمن جا کے کیا کریں
اُڑتی ہے سر پہ خاک، ہوا کھا کے کیا کریں

جنگل سہی، سکوں تو ہے پیڑوں کی چھاؤں میں
گھر تپ رہا ہے دھوپ سے، گھر جا کے کیا کریں

رہتے ہیں اور لوگ بھی کچے مکان میں
بادل گرج رہے ہیں تو گھبرا کے کیا کریں

پہنچے گی کیا نحیف صدا بامِ عرش تک
صحرائے بے کنار میں چلّا کے کیا کریں

ساری فضا ہے کرب کی چیخوں سے ہمکنار
ایسی اُداس رُت میں غزل گا کے کیا کریں

اختر انصاری اکبر آبادی

○

یوں وہ اک مہ جمال ساتھ رہا
جیسے کوئی خیال ساتھ رہا

کوئی ماضی نہ کوئی مستقبل
ہر زمانے میں حال ساتھ رہا

اب کہاں وہ رفیقِ تنہائی
دل تھا جب تک، ملال ساتھ رہا

تم کہاں اور تمھاری بزم کہاں
ہاں تمھارا خیال ساتھ رہا

چھٹ گئے سب رفیق دُنیا کے
ایک میں خستہ حال ساتھ رہا

ناصر صدیقی

○

نہ اجنبی کی طرح اور نہ آشنا کی طرح
وہ میرے پاس سے گذرا مگر ہوا کی طرح

سمٹ نہ جائے کہیں آہٹوں میں لرزشِ دل
مٹا رہا ہے کوئی مجھکو نقشِ پا کی طرح

ہوا سے دُور رہی تیری بات کی خوشبو
کوئی بھی جھونکا نہ آیا تری صدا کی طرح

تمام عمر اُسی چُپ کی جستجو میں رہا
مرے وجود میں اُتری تھی جو صدا کی طرح

یہ واقعہ ہے کہ انساں کے بھیس میں ناصر
ہر ایک شخص دکھائی دیا خدا کی طرح

ارشد ملتانی

○

صبحِ عشرت سے حدِ شامِ فغاں تک دیکھا
دلِ گم گشتہ کو کیا کیسے کہاں تک دیکھا

فصلِ گل تو فقط آغاز ہے بربادی کا
ہم نے آشوبِ بہاراں کو خزاں تک دیکھا

دل کے جل بجھنے کا عالم بھی عجب عالم تھا
کوئی شعلہ نظر آیا نہ دھواں تک دیکھا

تابِ نظارا کہاں، حوصلۂ دید کسے ؟
آئینے ٹوٹ گئے تم نے جہاں تک دیکھا

دلِ مضطر ہی سے قائم ہے محبت کا فسوں
سلسلۂ شوق کا بے تابیٔ جاں تک دیکھا

مسعود جاوید

○

پھر جینے کے لیے مرتا ہوں
میں بھی سورج کی طرح ڈھلتا ہوں

چاند سے مجھ کو یہی شکوہ ہے
میں اسے چوم نہیں سکتا ہوں

وقت پاگل نہ بنا دے مجھ کو
میں بھی احساسِ زیاں رکھتا ہوں

عشق نے جس کو چمن زار کیا
جانے اس آگ سے کیوں ڈرتا ہوں

یہی معیارِ وفا ہے مسعودؔ!
آگ بجھتی ہے تو میں جلتا ہوں

روحی کنجاہی

○

ہر شخص ترے شہر میں کیوں شعلہ بپا ہے
کیا اس کے تعاقب میں کوئی سیلِ بلا ہے

تسکین کی خواہش سے ہوا کوئی نہ آزاد
کشکول لیے ہاتھ میں ہر شخص چلا ہے

آنکھیں کہیں پاؤں کہیں اور ہاتھ کہیں ہیں
کیا جانیے کیا چیز بشر ڈھونڈ رہا ہے!

موضوع اُبھر آئے مرے ذہن میں کیا کیا
جلتا ہوا کاغذ جو کہیں دیکھ لیا ہے

اُس کو بھی زمانے نے بہت سخت سزا دی
یہ جان کے روحیؔ مرا دل چیخ اُٹھا ہے

○

مل سے دشمن نے مرا ہاتھ بٹایا کیسا
شہرِ خوباں کا سمندر میں بسایا کیسا

میں کہ ہر بات پہ رو دیتا تھا بچوں کی طرح
آج چپ چاپ ہر اک صدمہ اٹھایا کیسا

اب کوئی حادثہ شاید کبھی چونکا نہ سکے
مجھ کو بے حس تری یادوں نے بنایا کیسا

لفظ اُبھریں بھی تو مفہوم سے خالی ہی رہیں
ذہن پر پھیل گیا وہم کا سایا کیسا

آج روحیؔ مجھے خود سے بھی نہیں کوئی غرض
اپنے رستے سے ہر اک سنگ ہٹایا کیسا

شمیم حنفی

○

کچھ تری بے مہریاں ہیں اور کچھ میری خطا ہے
میں بھی اک پیاسا سمندر، تو بھی اک خالی گھٹا ہے

ہر طرف منظر بچھے ہیں خشک پتھریلی زمیں پر
ہر طرف اُلجھی ہوئی تنہائیوں کا سلسلہ ہے

لوگ تجھ سے دُور رہنے کی قسم کیوں لے رہے ہیں
سوچتا ہوں اب یہی کہہ دوں کہ تو میرا خدا ہے

خواب کی زنجیر یوں کب تک مجھے رُسوا کرے گی
ایک مرجھایا ہوا پتّہ بھی دامن کھینچتا ہے

تیری آنکھوں میں نہ جانے کیا نظر آیا تھا مجھ کو
کیسے بتلاؤں کہ پچھلی شام سے کیا ہو گیا ہے

○

لوگوں نے افسانہ بنایا، ایک ذرا سی بات کا
میرے کاندھوں پر سایہ تھا، شاید اس کے ہات کا

تیرا قصّہ، میرا قصّہ، سب کا قصّہ ایک تھا
اس نگری میں رنگ ایک تھا ہم سب کے حالات کا

ہرا بھرا سا باغ تھا جس میں سُورج مُکھی کے پھول تھے
رُت بدلی تو منظر دیکھا، پت جھڑ کے صدمات کا

گیان دھیان کے موتی چمکے، کِن آنکھوں کے تھال میں
سُورج کوسوں دُور تھا لیکن، جادو ٹوٹا رات کا

درد کی اس گھاٹی سے آگے، ایک انوکھا موڑ ہے
دل میں آگ سی جلتی ہے جب، موسم ہو برسات کا

خالد احمد

○

کس قدر کرب سے اک کرب کا اظہار ہوا
عجزِ اظہار مری راہ کی دیوار ہوا

صبح کی چاہ میں پتھرا گئیں میری آنکھیں
ایک آزار مجھے دیدۂ بیدار ہوا

فکرِ فنکار کی ضربوں کے نشاں ہیں اس پر
ایک پتھر فقط اس بات پہ شہکار ہوا

مجھ کو لے ڈوبا مرے کھوکھلے پن کا احساس
میری ناکامی کا باعث مرا معیار ہوا

کل حقیقت سے فسانوں کی طرح بھول نہ جائے
گم فسانوں میں اگر آج کا فنکار ہوا

○

ڈھونڈتی ہیں کب سے جیون کے سپنوں کی تعبیر
میری خالی آنکھیں میرے خوابوں کے نخچیر

بُت جب ٹوٹا، خود میرے اندر کا بُت چلّایا
مجھ پر گرز اٹھانے والے میری کیسی تقصیر

پیار کے قیدی کب کرتے ہیں، اپنی رہائی قبول
کیسی حسرت سے تھامے ہیں ٹوٹی ہوئی زنجیر

رنگوں میں جب تک نہ ملا تھا رنگ حقیقت کا
خاکے خاکے ہی کہلائے، ہو نہ سکے تصویر

ہنستے ہنستے میں نے کہہ دی اپنی کہانی آج
تنہائی میں کب تک تنہا کوئی بہائے تیر

خالد شیرازی

○

تری طلب سے کہیں بے خبر نہ ہو جاؤں
میں پانیوں میں اُتر کر گُہر نہ ہو جاؤں

مری اُکھڑتی ہوئی سانس دے اگر فرصت
تو اے چراغو! قریبِ سحر نہ ہو جاؤں؟

کسی شجر کی طرح میں بھی صبح کہرے سے
لپٹ تو جاؤں، مگر بے بصر نہ ہو جاؤں

مجھے یہ ڈر ہے کہ اس دھوپ کی قلمرو میں
گنواؤں سایا تو گردِ سفر نہ ہو جاؤں

وہ خواب ہوں جسے دھڑکا لگا رہا خالد
اُچٹ کے آنکھ سے بے بام و در نہ ہو جاؤں

○

اگرچہ مجھ کو نہیں اعتبارِ موسمِ گل
میں کر رہا ہوں مگر انتظارِ موسمِ گل

خزاں نے چھیڑ دی رُوداد جلد پت جھڑ کی
گوارا کر نہ سکی اقتدارِ موسمِ گل

نہ جانے کتنی ہولوں کی خاک چھان چکا
میں ایک برگِ غریب الدیارِ موسمِ گل

مجھے نہ لے کے چلو خاک اُڑ رہی ہے جہاں
میں کیسے دیکھ سکوں گا دیارِ موسمِ گل

اگرچہ دونوں مکیں ایک ہی دیار کے تھے
میں بے کلاہ تھا، وہ تاجدارِ موسمِ گل

عبداللہ جاوید

○

دنیا کی رسم و راہ سے بیگانگی ہے یہ
سچ پوچھیے، وفا نہیں، دیوانگی ہے یہ

وہ بھی بدل رہے ہیں جنھیں پُوجتا ہے دل
بدلے نہیں جو آپ، بڑی سادگی ہے یہ

بڑھتے چلو کہ منزلِ جاناں ہے ایک وہم
یارو، سفر سے کام رکھو، زندگی ہے یہ

جو سنگِ در کسی کی جبیں کا ہو منتظر
اسی سنگِ در پہ سر نہ جھکے، خواجگی ہے یہ

دستِ دعا اٹھیں بھی تو لب پر دعا نہ ہو
جس پر خدا بھی ناز کرے، بندگی ہے یہ

جاوید زندگی کے حقائق سے انحراف
جھوٹے تصورات سے وابستگی ہے یہ

○

شدت کا درد اور مزا دے گیا ہمیں
مل کر ترا بچھڑنا بھی کیا دے گیا ہمیں

اک رسم ہے کہ ہم بھی تجھے بے وفا کہیں
سچ پوچھیے تو وقت دغا دے گیا ہمیں

اب اس غزال چشم کی وحشت کو کیا کہیں
سوغات میں جو دشتِ بلا دے گیا ہمیں

ہم چل پڑے ہیں موجۂ نکہت کے ساتھ ساتھ
جھونکا ہوا کا تیرا پتہ دے گیا ہمیں

مدت ہوئی بچھڑ کے، مگر یہ نہیں کھُلا
وہ درد دے گیا کہ دوا دے گیا ہمیں

جاوید اس کی یاد کے افسانے بن گئے
وہ اک طلسمِ ہوش رُبا دے گیا ہمیں

احمد ندیم قاسمی

○

سب نے انسان کو معبود بنا رکھا ہے
اور سب کہتے ہیں — انسان میں کیا رکھا ہے

یوں بظاہر تو دیا میں نے بجھا رکھا ہے
درد نے دل میں الاؤ سا لگا رکھا ہے

منصفو! کچھ تو کہو، کیوں سرِ بازارِ حیات
مجھ کو احساس نے سُولی پہ چڑھا رکھا ہے

جس کے ہر لفظ سے ہو حشرِ صداقت پیدا
میں نے وہ گیت قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے

ہاں — میں خاموشِ محبت کا بھرم رکھ نہ سکا
ہاں خدا کو تو ترا نام بتا رکھا ہے

لاکھ فرزانگیاں میرے جنوں کے صدقے
میں نے لُٹ کر بھی غمِ عشق بچا رکھا ہے

اور تو کوئی چمکتی ہوئی شے پاس نہ تھی
تیرے وعدے کا دیا راہ میں لا رکھا ہے

میری امید کی پتھرا گئیں آنکھیں، لیکن
میں نے اس لاش کو سینے سے لگا رکھا ہے

گھومتی پھرتی ہیں لیلائیں، بگولوں کی طرح
قیس نے دشت میں اک شہر بسا رکھا ہے

حسنِ تخلیق کی دھرتی میں جڑیں کیسا پھیلیں
تم نے انسان کو گملے میں سجا رکھا ہے

الطاف فاطمہ

گواہی

بیس تاریخ کے بعد ہی سے چاند کے دن اور تاریخوں کے چرچے چل نکلے تھے۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ ہم اپنے خالی وقفوں میں اسٹاف روم کے سیمنٹ کے فرش والے سنسان طویل افسردہ برآمدے کے گملوں سے خالی دروں کے ستونوں کے ساتھ کاسنی پلاسٹک سے بنی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے دنیا جہان کی باتیں کرتے کرتے گھوم پھر کر چاند کی بات پر آ ہی جاتے اور خیال آرائیاں شروع ہو جاتیں۔ چاند انتیس کا ہوگا، چاند تیس کا ہوگا۔ عید جمعرات کی ہے، عید جمعے کو ہونا چاہیئے۔ چاند گیارہ کو دکھائی دے گا، چاند بارہ کو.....

چاند! چاند! اُفوہ یہ چاند صاحب بھی کتنے "امپورٹنٹ" ہو جاتے ہیں..... اور خلا، والی پبلک اپنے حسابوں سمجھ رہی ہے کہ اس نے اب جا کر چاند پر چھاپہ مارا ہے اور یہاں یہ ہے کہ یار لوگ تیرہ سو سال پہلے ہی اس پر قبضہ جما چکے ہیں..... میں نے کرسی کو ذرا اور دھوپ کی تلاش میں اِدھر سے اُدھر کھسکا کر ٹانگیں پھیلالیں۔ مگر شاید میرے چہرے پر اس ہنسی کے آثار تھے جو میں نے اپنے دل میں محسوس کی تھی یوں کہ اب ارجمند نے اپنے مخصوص جارحانہ اور کھلے دل والے انداز میں ہنسی کا سبب دریافت کیا تھا اور جب آپ کو کسی کا جارحانہ انداز دلچسپ معلوم ہوتا ہے تو اس کی بات کا جواب دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔

"اچھا تو کیا میں ہنس رہی تھی؟"

"تو اور نہیں تو کیا؟"

اور یہ بھی تو ہنسنے کو یہ تھوڑی بات ہے کہ میں بیمار ہوں اور سخت دکھیا ہو رہی ہوں۔ اور پھر بھی اتنی صبح صبح سردی میں بستر علالت سے اُٹھ کر یہاں آنا اور پھر واپس جا کر اس کو بیانا پڑتا ہے۔"

یہ کتنی اچھی بات ہے کہ اسٹاف روم کے اس طویل افسردہ برآمدے کے گملوں سے خالی دروں کے درمیان بیٹھ کر ہم اصل بات قبول دینے کے بجائے کوئی بات بھی بنا سکتے ہیں، اس لئے کہ پینتالیس منٹ کے اس مختصر سے خالی وقفے میں ہم کو بہت باتیں کرنا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک کی ہوئی بات اور اس کا جواب بہت جلد غیر ضروری اور فرسودہ ہو جایا کرتا ہے..... ورنہ اگر انسان جرح کرنے اور دل کی اصلی اور خالص سوچوں کو آبولانے بیٹھ جائے تو کتنی مشکل آپڑے۔ اس لئے کہ انسان کی سوچ کا بیشتر حصہ احمقانہ ہوا کرتا ہے۔

چنانچہ یوں عید کے دن قریب سے قریب تر آتے گئے اور اسی حساب سے چوڑیوں، جوڑوں، جوتوں اور پروگراموں کے تذکروں میں بھی شدت آ چکی تھی۔ سو ہم کو یہ بھی باور کرنا پڑا کہ عید ایک نہ ایک دن آ دھمکے تو کچھ بعید نہیں مگر کس دن؟ اس سے مجھے اس مرتبہ یوں دلچسپی نہ تھی کہ اگرچہ بوجہ علالت انسان تلے اوپر اتفاقیہ رخصتیں تو نہیں لے سکتا تاہم وہ اپنے آپ کو روزے سے مستثنیٰ ٹھہرانے کا مجاز ضرور ہوتا ہے اور انتیس تیس کے پھیر میں بھی نہیں پڑتا۔

چھٹی کا نوٹس میں نے بار بار پڑھا۔ پتہ نہیں کیوں، اعتبار نہیں آرہا تھا چنانچہ اسی بے اعتباری کے عالم میں، ارجمند اور میں رینگتے سسکیاتے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ عید تو یہاں سے وہاں تک پھیلی پڑی ہے۔

"کیوں نہ ہم لوگ آج بیڈن سے نکلیں" فوراً ہی صلاح بن گئی اور بیڈن کے اندر یہ عالم تھا کہ جو کچھ اور جہاں کہیں تھا سر بازار آگیا تھا۔ سر پر چھائے ہوئے شامیانوں اور ان کے رنگ برنگے بانسوں والے دروں میں سے گذرتے ہوئے برات والے گھر کا سا سماں لگ رہا تھا۔

ہر چیز کی کتنی افراط ہے اور کتنی کثرت۔ اجناس اور اشیا کا ایک سیلاب ہے جو حواس گم کئے دیتا ہے۔ اتنے کہ آٹے اور گھی کی گم گشتگی اور ہر چیز کے چڑھے ہوئے نرخوں تک کا احساس رخصت ہو چکا ہے

"ارے بھئی میں یہاں ٹھیر کر یہ سجی ہوئی مٹھائیاں ضرور دیکھوں گی" ارجمند نے تقریباً مچل کر کہا تھا "مجھے یہ نظارہ بہت اچھا لگتا ہے"

"ضرور دیکھو اور اگر مقدور ہو تو کیمرہ اٹھا کر تصویر بھی کھینچو"

"مگر مجھے تو یوں لگتا ہے ———"

"کیا؟"

کیا یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی ہر ادھوری بات کو پورا اور مکمل کرے۔ بہرحال میں نے اپنی بات مکمل نہیں کی، بھلا یہ بھی کوئی کہنے والی بات تھی کہ یہیں تو سارے بازار کی بیچ و بیچ سے آگے نکل بیٹھنے والی دوکانوں کو دیکھ کر بنات النعش گردوں والی پارٹی کا خیال آتا ہے کہ وہ شام ڈھلے سوا لنگا کے ساتھ سر راہ آ بیٹھتی ہے لیکن کسی نظارے کا یہ کچھ کم احسان ہے کہ وہ آپ کو بہت سی باتوں کے وجود سے لاتعلق کردے اور آپ کو یہ بھی نہ یاد رہے کہ زندگی میں کچھ خلا بھی ہیں اور ہم نے کچھ کھویا ہے اس لئے کہ زندگی کا بھاؤ بہت چڑھ گیا ہے چنانچہ یہ ہوا کہ ہم خاموشی سے آگے بڑھے اور سویوں کے کافوری اور گلابی ڈھیر پر جھلکتے ہوئے چاندی کے ورق نے مجھے آنکھ ماری۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے"

"کیا کہا!"

آؤ سویاں خریدیں"

"یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا جہاز عید کے تند تھپیڑوں میں گھر گیا ہو۔ پھر ارجمند نے عید کے جوڑے اور پروگرام کے متعلق پوچھ ہی ڈالا۔

"چنانچہ اب ہم بھی کپڑوں اور جوتوں کی باتیں کرتے ہیں"

"ارے میں گڑبڑا گئی عید کے دن! پروگرام! یار کیا سوال ہے تمہارا بھی کہ بھئی عید کے دن ....."

گر ہاں واقعی ..... ارجمند کے سوال کی معنویت اور حقیقت پر غور کرنے کے بعد اپنی ذات کس قدر حقیر شرمناک اور بے ضرورت محسوس ہوئی جواب کے سارے الفاظ حلق میں اٹکے پڑے تھے اور مجھے اپنی ذات نہایت واہیات نظر آئی۔

مگر جس کو اپنی ذات جس درجے واہیات نظر آتی ہے اسی درجہ وہ اکڑتا اور اپنی خودی کو بلند کرتا ہے

چنانچہ میں نے بھی اپنی ذات کے گرد والی فصیل کو اونچا اور مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

ارے بھئی عید کے پروگراموں کا کیا ہے۔ ایک پروگرام یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آدمی لحاف میں دبک کر مزے سے کتاب پڑھتا رہے اور یہ دیکھو میں نے آج یہ کتاب ڈھا کر بڑے چھپٹی ہے۔ اور بھئی روز روز کپڑے بدل بدل کر آتے رہو تو عید کے دن تو کپڑوں کی چھٹی ہونا چاہئے

سخت عورت کا کام ہے کپڑے بدلنا!"

"اچھا! لیکن مجھے معلوم تھا کہ ایسی باتیں کرتے وقت ہر انسان کے منہ پر سخت پھٹکار برسنے لگتی ہے۔ چنانچہ اس روز اپنے کمرے میں گھستے ہی آئینے کی پیشی میں جانا پڑا تھا۔ ہائے اس وقت تک وہ پھٹکار تحلیل ہو چکی تھی اور یوں ایک بار پھر میں نے شیر ہو کر سوچا تھا: "اور جو اس وقت میں ایک عدد پُرمغز اور مختصر سی تقریر جھاڑ دیتی تو ہنا! یہ سب تو فروعات ہیں، عیاشی ہے، کہ تم جس کو ثقافت اور روایتوں کا نام دیتے ہو وہ تو نری سٹے بازی ہے مال کی بکری اور نکاس کے ڈھنگ ہیں اور زندگی کے بھاؤ چڑھ جانے کے اصلی سبب ....." تو بھی کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

لیکن جب اپنی شال اور سوئیٹر واپس رکھنے کے لئے الماری کھولی تو ہاتھ نے خود بخود سیدھے ہاتھ والی دراز کھینچ لی۔ فوم پلاسٹک کے مربع ڈبے پر رکھی سرمئی فائل بلا ارادہ ہاتھ میں آ گئی۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ اس میں اپنا ارادہ بھی شامل ہو۔ الماری کے قریب والی چوکی پر بیٹھ کر احتیاط سے سرمئی فائل کو کھولا لسٹوں اور ڈاکٹری رپورٹوں کے نیچے، یکسر سے تھا سیاہی اور سفیدی مائل بھورے پن میں ابھرتے ہوئے لیبلوں سے بچ کے اس طرف۔ ایک بیمار مغموم اور ماؤف دل تھا معمولی سا انسانی دل — اس وجود کا حصہ جسے دنیا کے سارے چراغ جلا کر بھی ڈھونڈ لینا میرے بس میں تھا۔

پھر مجھے ہمیشہ کی طرح ناوقت باتیں یاد آئیں۔

اور مجھے لڑکی یاد آئی جو برف باری میں لالٹین اٹھا کر اس راستے پر جا کھڑی ہوئی تھی جس راستے اس کی ماں کو کام پر سے واپس آنا تھا۔ رات اندھیری تھی اور برف و باد کا طوفان تند۔ لڑکی کو ڈر تھا کہ ماں راستہ نہ بھٹک جائے

پھر یوں ہوا کہ وہ لالٹین اونچی کئے اندھیرے راستوں کو تکتی رہی۔ برف کے گالے چپکے چپکے اس کے وجود پر برستے رہے حتٰی کہ وہ ان کی مکمل حفاظت میں آ گئی۔ اور وہ لالٹین برف کے ڈھیر پر بے سود ٹمٹماتی رہی۔ یوں کہ ماں نے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔

میں نے احتیاط سے فائل بند کی اور وہ بیمار اور مغموم دل فائل کے گتوں کے درمیان چھپ گیا۔ جس نے انجانے میں ہر سال عید کا جوڑا تیار کیا تھا۔ میں نے فائل دراز میں واپس رکھ دی۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

"ہیں کیا کہا؟" کسی نے مجھ سے سوال کیا۔

میں ایک لفظ بھی نہیں۔ بولی ہوں میں نے اپنے آپ اپنی گواہی دی۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

کوئی بار بار میرے اندر گنگنائے جا رہا تھا۔

اس شام چاند دیکھنے کی ذرا بھی خواہش نہ ہوئی اس لئے کہ میری طبیعت بدستور خراب تھی اور اس وقت بھی پروگرام کے مطابق میں اس بستر علالت پر دراز تھی جو صبح سے خالی پڑا تھا۔

شیر خرمہ تیار تھا۔ اور سویوں کے مزعفر کا پروگرام ناشتے کے بعد تھا۔ گرم گرم چائے دان میز پر آ چکا تھا چنانچہ بستر چھوڑنا اب ضروری قرار پایا۔ پھر یوں ہوا کہ منا شپ شپ کرتے چڑھے۔ آنکھوں پر عینک غائب تھی۔

"آج عید نہیں ہے!"

"ارے جاؤ۔ عینک لگا کر اخبار پڑھو پھر اطلاع دو۔"

"او نہوں! اخبار کی کیا بات ہے۔ رات اعلان ہوا ہے۔"

"مگر رات تو چاند کا اعلان بھی ہوا تھا۔"

"مگر یہ اعلان آدھی رات کو ہوا تھا۔"

"محترم صاحب، تم جب کوئی خبر لاؤ گے ایسی ہی لاؤ گے۔ خلائی جہاز کو ہو گیا۔ وزارت بدل گئی۔ سفارت ہو گئی۔ کہیں حکومت کا تختہ اُلٹ گیا۔ حد یہ کہ شاستری مر گیا۔ آج لے کے صبح صبح عید صاف کر فاوی۔"

"پھر کیا خیال ہے؟"

"تم بتاؤ روزہ و کھول رہے ہو؟"

"اب جو سب لوگ فیصلہ کریں۔" اس کی آنکھوں کی گہری آسمانی رنگت ایسے میں اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔

"اچھا پھر جاؤ تم فیصلے کا انتظار کرو۔"

"میری نظر کھڑکی کے شیشوں سے باہر نکلتی چلی گئی۔ جنرل صاحب کے طویل سیاہ دروازوں اور سیاہ ستونوں والے گیٹ سے کچھ پرے جگنیوں والوں کے بچوں کے دو گروہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"آج عید نہیں ہے!" ایک گروہ نے لے سے کہا اور نفی میں گردنیں ہلائیں۔

"آج عید ہے!" دوسرے گروہ نے اسی انداز میں دعویٰ کیا اور ان کی ہلتی ہوئی گردنوں کا رُخ اثباتی تھا۔

"آج عید ہے ...... آج عید ہے" اثباتی گردنیں اچھل اچھل کر کہہ رہی تھیں۔

میں نے شیر خورمے کا پیالہ دوبارہ اپنے سامنے کھسکا لیا۔

نیچے نہانے کے پانی ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے۔ کندھوں پر تولیے ڈالے مرد آپس میں بحث رہے تھے۔

"جی تو کیا آپ کا خیال ہے کہ شہر شہر کا اپنا چاند نکلوایا جائے۔"

"ارے میاں۔ گواہ ــــ گواہ ــــ گواہی کی شرائط ہیں جن کا گواہوں میں ہونا ضروری ہے۔"

"تو پھر عید ہو چکی ...... کون ہے گواہی کے قابل آپ کہ میں؟" اب سب خاموش ہیں!

پھر یہ ہوا کہ گھرانا دو فریقوں میں بٹ گیا۔

میں نے بیماروں والے مخصوص ڈھیلے پن اور بے دلی سے صفائی شروع کر دی تھی اس لیے کہ بلو کا موڈ آف ہو چکا تھا اور اس نے پھر سے لحاف میں گھس کر بستر کو اور بھی اجاڑ دیا تھا

"ارے بھئی تم کیوں غصہ ہو رہی ہو؟ مسلمان ایسے ہی عید مناتے ہیں۔"

"مجھے تو یہ خیال آ رہا ہے کہ بچارے بیٹو کی پہلی تو عید ہے اور اس میں جھگڑا پڑ گیا۔"

"ارے بھئی بیٹو کی فکر نہ کرو۔ اس کی عید کے امکانات روشن ہو گئے ہیں اس لیے کہ اس کے ابا جان نے غسل خانے کا دروازہ بند کر لیا ہے۔"

چنانچہ روزہ ترک کرنے کے باوجود نمازی بٹ چکے تھے۔ جنرل صاحب کے گیٹ سے اس طرف متعدد لوگ اس حال میں کم سے تھے کہ اوپر سے قمیص بدل چکے ہیں اور ٹانگوں میں پاجامہ میلا ہے۔ کسی کا دھڑ رمضان منا رہا ہے تو ٹانگیں عید۔ ایک صاحب کے سر پر فقط ٹوپی نئی تھی، باقی جسم پر میلے کپڑے ـــــ

اور بحث جاری تھی۔ پھر میں نے کونے جیب کو دیکھا جو کرا ہوا اپنی بیساکھی کے سہارے اپنی بیکار ٹانگ کو گھسیٹے خاموشی سے نماز پڑھنے چلا جا رہا تھا۔ اس کے چیچک مارے چہرے پر تنہائی کا شدید احساس تھا۔ اس لئے کہ وہ ماحول جس کے ساتھ وہ چھپاتا ہوا نماز کو جاتے ہوئے اپنی ساری محرومیوں کو بھول جاتا تھا مگر یہیں میں نماجمعت میں مشغول تھا۔

میں کھڑکی کے قریب سے ہٹ آئی تھی۔ "بچو اب اٹھ کر کپڑے بدل ڈالو۔ آئندہ سے ہم کرسمس منائیں گے۔"

"کیوں؟"

"کیا کریں پھر؟"

"اگر حبیب کے چیچک مارے چہرے پر تنہائی کا وہ بھیانک احساس نہ نظر آتا تو ہو سکتا تھا کہ لحاف میں دبک کر کتاب پڑھنے والا پروگرام ملتوی ہو جاتا۔

اور اب ملنے والی پارٹیاں آ رہی تھیں جو بعض جگہوں سے منہ کی کھا کر آ رہی تھیں، اس لئے کہ بعض گھرانوں میں عید نہیں آئی تھی، اور جب پارٹی آوازوں پر آوازیں دینا شروع کر دے تو انسان کو جس حال میں بھی ہو اسی حال میں حاضری دینا پڑتی ہے۔

اب عید منانے اور عید کا بائیکاٹ کرنے والی دونوں پارٹیاں آمنے سامنے تھیں اور بحث جم رہی تھی۔ میں نے کہنے والوں کے لئے سویاں اور دوسرے لوازمات لاتے ہوئے اُلجھے ہوئے فقرے سُنے۔

چاند...... گواہی...... رویت ہلال...... گواہی...... گواہ کے لئے ضروری ہے......

گواہی! گواہی! میں گواہی دیتی ہوں کہ ہم میں سے کوئی گواہی کے قابل نہیں کہ گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ صادق، صالح اور مرد مومن ہو۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ اب میں کرسمس مناؤں گی میں نے دوبارہ لحاف میں لیٹ کر سوچا تھا۔ اس لئے کہ جھگڑا تو کچھ۔ اور یہ کہ کرسمس میں گواہی کی حاجت نہیں۔

"اور جو جس قوم کی تقلید کرتا ہے وہ اسی قوم کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔"

میں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا اور لحاف کے اندر منہ کر کے سوچا گر یہاں تو کوئی نہیں بجز آئندہ سے ثانیہ کے جو اپنی تصنیف کے ایک گوشے پر چپ چاپ کھڑا ہے چنانچہ میں نے اس کی تصنیف کو پرے کھسکا دیا اور نہایت ضدی پن سے سوچا تھا۔

ٹھیک ہے جو جس قوم کی تقلید کرتا ہے وہ اسی کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔ چنانچہ میں کرسمس منانے والوں کے ساتھ اٹھائی جاؤں گی۔

لیکن شاید یہ میرا مقدر نہیں کہ میں ان کے ساتھ اٹھائی جاؤں اور منصوبے میں ہونے والی اس امکانی تبدیلی کی تفصیل یوں ہے کہ......

جوں ہی یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے سفید برآمدے میں قدم رکھا معلوم ہوا کہ ہمشیرہ عزیزہ کے علاوہ گھر کے باقی لوگ بھی آؤٹ ہیں۔ اور یہ اطلاع مجھے نینی نے دی تھی جو عموماً اکیلے گھر میں وہ جانے کیوں عموماً دل گرفتہ نظر آتی ہیں، مگر آج خلاف معمول ان کے چہرے پر انارے چھوٹ رہے تھے۔

"او...... ہلو...... بیگم اِز آؤٹ۔" پھر وہ رُکیں۔ "ہیپی عید۔"

دونوں عیدوں کو گزرے بھی ایک دن ہو چکا تھا۔

"او مسز میک! میں شکریہ خاک ادا کرتی۔ جبکہ یہ طے تھا اور ان کو نہیں معلوم تھا کہ ——"

"—— کہ میں ان ہی کے ساتھ اُٹھائی جانے والی ہوں۔"

پھر اچانک ہی نینی اپنی عادت کے مطابق اکسائٹڈ ہو گئیں۔

"پتہ ہے کون آیا ہے؟"

"کون؟" میں نے بے دلی سے پوچھا۔

وہ اور بھی ایکسائٹڈ ہوگئیں اور میز پر رکھے کچھ کیلوں، الائچی کی تھیلی اور ایسی ہی چند چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ دیکھو! اب بتاؤ کون آیا ہے؟"

"کوئی بنگال سے آیا ہے؟"

"نہیں۔ نہیں" یوں ان کا سر خوشی سے اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا۔

اور اب میں سمجھ گئی تھی کہ آنے والا کہاں سے آیا ہے۔ ایک لمحہ کو میرے اندر ایکسائٹمنٹ نے جھرجھری سی لی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد پہلی مرتبہ کسی شخص کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ وہ اُدھر سے آیا ہے مگر وہاں سے کون آسکتا ہے۔ میں سوچنے لگی۔

"تمہیں معلوم ہے کیا ہوا۔ میں یہاں اس کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی، کہ مجھے محسوس ہوا کوئی جھکا ہوا مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے نظر اُٹھائی ......" اور وہ ایک دم ضرورت سے زیادہ ایکسائٹڈ ہوگئیں اور لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگیں "میں چونک پڑی میں نے اُٹھ کر اُسے گلے سے چمٹا لیا۔

"اوہ مائی ڈارلنگ، مائی برائے فرینڈ ——" پھر وہ کہتی رہیں "میرا ہم رقص ..... اوہ ہی ڈانسیز سو ویل ....." وہ سفید چکنے برآمدے کے فرش پر یہاں سے وہاں تک رقص کے انداز میں لہراتی چلی گئیں .... یہاں تک کہ ان کو دروں میں جڑے ہوئے جالیوں اور روغن کے منتظر کوری لکڑی کے فریم کا سہارا لینا پڑا۔

پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"یرنو! جب لڑائی ہو رہی تھی تو میں اس لڑکے کے لئے کتنا پریشان ہوتی تھی۔ مجھے خیال آتا تھا کہ وہ اب کاہے کو کبھی آئے گا ...۔ اوہ یہ لڑکا ہے کہ از اے تھرو بریڈ جنٹلمین ....." وہ پھر رکیں۔

"ارے میں تو بھول ہی گئی۔ تمہارے لئے چائے لاؤں؟" انھوں نے رُک کر پوچھا

"نہیں شکریہ! بینی مجھے پاندان لا دو، میں پان کھاؤں گی۔ میرا گلا بہت دکھ رہا ہے۔"

"پاندان لاکر رکھنے کے ساتھ ہی انھوں نے سلسلۂ کلام جوڑ لیا۔

"میں نے ان کو بتایا کہ جب بھی بچے والز کے رکارڈ لگاتے ہیں تو میں ہمیشہ یاد کرتی ہوں کہ دو سال پہلے کرسمس ایو پر اسی برآمدے میں ہم نے تم نے رقص کیا تھا .... اُف توبہ، یہ لڑکا کتنا اچھا والز کرتا ہے۔ میں نے کتنا چاہا تھا کہ وہ ایسٹر پر یہیں موجود ہو لیکن اس کا ویزا ختم ہو چکا تھا ......"

میں نے دیکھا ان کا بوڑھا اور پرشکن چہرہ خوشی سے تمتایا ہوا تھا اور آنکھوں میں کچھ پالینے والی بچی چمک ....

میں نے کرسی سے ٹیک لگالی ..... دن دھندلا اور مطلع ابرآلود تھا .... اور میرے سامنے برآمدے کے سفید فرش پر کھڑی وہ بوڑھی عورت تھی جو اندر سے بہت تنہا تھی اور جس پر ہر دوسرے تیسرے مہینے افسردگی کے دورے پڑتے رہتے تھے اور واقعی یہ احساس کتنا شکست خوردہ اور پسپا کن ہو سکتا ہے کہ بچے اب بڑے ہوتے جا رہے ہیں۔ اب مجھ سے کپڑے بھی نہیں بدلواتے۔ اپنی ذات کی بے مصرفی اتنی ہی تھکا دینے والی ہوتی ہے کہ پھر انسان بچوں کے کمرے میں نیچی سی کرسی پر اسکارف باندھ کر اور بائبل ہاتھ میں لے کر بیٹھ جائے۔

اور یہ کتنی اچھی بات ہے کہ تمہارا بوڑھا دل مسرور ہے چنانچہ میں تم کو یہ یاد دلانے کی کوشش نہیں کروں گی کہ تم جس شخص کی آمد پر اتنی خوش

ہو اس کا تم سے اسی قدر واسطہ ہے کہ تم اس گھر میں بچوں کی دیکھ بھال پر مقرر ہو جہاں وہ مہمان آیا ہے ..... وہ عمر میں تمہارے اس بیٹے سے بھی بہت چھوٹا ہے جس سے تم نے اس بنا پر قطع تعلق کر لیا کہ اس نے کیتھولک فرقے میں شادی کر لی تھی اور اب لاپتہ ہے۔

پھر بھی وہ شخص محض تم کو خوشی دینے کی خاطر تمہارے ساتھ رقص بھی کر لیتا ہے اور بڑے لگاؤ اور توجہ سے تمہارے ساتھ پیش آتا ہے، اس لئے کہ تمہارے روپ میں اس کو وہ نینیاں اور گورنسیں بھی نظر آجاتی ہیں جنھوں نے اس کو پالا، پروان چڑھایا، اور تربیت دی اور یہ کہ تم ان سب باتوں کے علاوہ اس حقیقت سے بھی واقف ہو کہ وہ آپ بھی اندر سے تمہاری طرح تنہا ہے جیسے ویرانے میں کھڑا ہوا ایک تنہا درخت۔

میں چپ چاپ بغور اس تمتماتے چہرے کو دیکھتی رہی جس کے ساتھ میں اٹھائی جانے والی تھی۔

نہیں معلوم کہ میحا دحضر کی ملاقات کا کیا انداز رہتا ہوگا البتہ یہ مجھے خوب معلوم تھا کہ ہمدمِ دیرینہ سے لوگ باگ کس انداز سے ملتے ہوں گے اور جبکہ ایک دو نہیں متعدد ہمدمانِ دیرینہ جمع ہوں۔ چنانچہ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ صاحبانِ خانہ گھر آنے پر جب آنے والے کے کوائف سے آگاہ ہوں گے تو کس انداز کی غلغل مچے گی۔ لہٰذا میں نے یہی مناسب جانا کہ کمرے میں جا کر لحاف میں دبک جاؤں۔ عزیزی ہمشیرہ سے گپ لگانے کا امکان ختم ہو چکا تھا کہ ان کو مہمان کو ایٹ ہوم کرانا اور کھانا کھلانا ہوگا۔ اور مجھے تو نینی نے اپنے اپارٹمنٹ میں بچوں کے ساتھ ہی کھلا دیا تھا کہ گھر والوں کی آمد دو بجے سے پہلے ممکن نہ تھی۔ اور مہمان اپنی رپٹ لکھوانے تھانے جا چکا تھا۔

ایسے دھندلے دھندلے دنوں میں سوچا تو رات کا دھوکا کھا کر بھولا بھٹکا کوئی خواب بھی آ نکلتا ہے لیکن ابھی خواب کے بکھرے بکھرے اور مختلف سین نٹ بھی نہ ہو پائے تھے کہ محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے یوں آوازیں دینا شروع کر دیں جیسے بھونچال آگیا یا پھر کسی کو جھجانے کے جھولے پینگ کی یاد پھر سے آگئی ہو۔

ناچار ہڑبڑا کر لحاف پھینک کر باہر نکلنا پڑا۔ میں چائے کی ٹرالی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تو نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ سب کے سب چائے کا دور چلا رہے تھے اور عزیزی ہمشیرہ اپنے مخصوص نان سیریس انداز میں سگرٹ کے کش لگا لگا کر کہہ رہی تھیں "ارے کچھ سنا یہ کیا کہہ رہے ہیں ان کی باتیں تو سنیئے"

میں نے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اس مہمان کی طرف دیکھا جو ان سرحدوں کو عبور کر کے آیا جن کو کچھ دن پہلے ہم دشمن کے علاقے اور سرحدوں سے یاد کیا کرتے تھے۔

میرے سامنے جانے پہچانے عینک کے اجلے اور نفیس شیشوں کے اس طرف جھانکتی ہوئی آنکھوں میں بڑی خاموشی اور عجیب سی بے حسی تھی کہ دیکھنے والے کا دم سا گھٹنے لگے، اور ان آنکھوں کو اپنے محیط میں لئے ایک چہرہ تھا جسے پہلی نظر میں دیکھنے والا متانت کہہ تو سکتا ہے مگر اپنے اس فیصلے پر مطمئن نہیں ہوتا چنانچہ اسی افراتفری کے عالم میں دوبارہ پر نگاہ دوڑائی۔

"ارے! میری نظر ٹھٹک گئی ..... تو تم بھی انھیں انسانوں میں سے ہو جن پر سے وقت یوں گذرتا ہے جیسے ..... خیر کوئی بات نہیں وقت نے اکثر ایسے ستم فرمائے ہیں۔

"اچھا تو کیا کہہ رہے تھے آپ؟" میں نے صاحب سلامت کے بغیر ہی سوال کیا۔

"کچھ نہیں!" آنے والے کا چہرہ ہر قسم کے جذبے اور تاثر سے عاری تھا

میں اس مختصر سے جواب سے یوں مطمئن ہو گئی تھی کہ یہ تو عزیزی ہمشیرہ کا قاعدہ ہے کہ یوں ہی زور شور سے آوازیں دیں گی اور بعد میں پتہ چلے گا کہ بات تو کچھ تھی ہی نہیں۔ چنانچہ میں نے چائے کی پیالی سنبھالی اور ادھر ادھر دیکھا۔ دن کے اس پچھلے پہر سماں اور بھی دھندلا گیا تھا۔ آسمان بہت بھورا اور بھرا بھرا سا تھا کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ بادل اور دھند بارش بھی لائے ہیں یا نہیں۔ پھر موزیک کے سفید برآمدے کے دروں میں بغیر جالی اور بغیر پینٹ والے فریم نے آسمان اور بے یقینی کے احساس کو اور بھی چمکا دیا تھا تو خیر اس طرف پھیلی ہوئی لان کی سبزی اور فضا میں دھڑ دھڑاتے ہوئے ہوائی جہاز کی آواز کسی حد تک زندگی کا احساس دلا رہی تھی۔

"کچھ نہیں کیوں! ابھی جو آپ بتا رہے تھے، بتائیے نا انہیں، چائے اور ڈالیں آپ کی پیالی میں؟"

"کیا بات؟" میں نے پھر سوال کیا اور بے وقوفوں کی طرح سب کی طرف دیکھا۔

"بھئی وہ سفید پوشوں والی بات بتاتے کیوں نہیں؟"

"ہاں وہ میں یہی بتا رہا تھا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ایک سفید پوش کھڑا ہے۔"

"کیا!" میں نے اپنی کرسی اس درجہ آگے کی کہ ٹرالی گھوم کر آگے جا پہنچی۔ "آپ سے کس نے کہا..... جھوٹ..... ہوں..... جھوٹ!"

آواز پر وہی بے حسی طاری تھی: "ہم کیا جانیں، ہم کوئی محاذ پر گئے تھے ہم سے تو انہوں نے کہا جو آپ سے لڑنے آئے تھے۔"

"فوجیوں نے؟"

"جی فوجیوں سے میرا مطلب سپاہی نہیں، افسروں نے کہا تھا۔"

"اللہ جانتا ہے!"

آنے والا عجیب بے بسی سے مسکرایا۔

"تو اس کا مطلب ہے ہم جن باتوں کو افواہیں، الیوژن اور من گھڑت کہہ کر ٹالتے رہے ہیں....."

"وہ تو یہ تک کہتے ہیں جب بھی لاہور پر بم پھینکنے کی کوشش کی کسی سفید پوش نے اپنی چادر میں سمیٹ لیا۔"

"اب یہ آپ نے دل سے گھڑ لیا۔"

تب میری بے اعتباری پر اس شخص نے اس انداز سے دیکھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو — جیسے کہہ رہا ہو — مجھے کیا غرض پڑی ہے جو باتیں دل سے گھڑ گھڑ کر سناؤں اور وہ بھی تمہارے اپنے شہر کے متعلق۔

"اچھا ایک بات بتائیے۔ بالکل سچ سچ — یہ باتیں مسلمان فوجیوں کی زبانی سنی ہوں گی؟"

"اس بات کی میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اس موضوع پر کسی مسلمان فوجی سے قطعی گفتگو نہیں ہوئی۔"

"تو پھر!..... تو پھر......"

میرے کانوں میں وہ آواز گونجی جو اکتوبر ۱۹۶۵ء کی صبح بہت سویرے سویرے چائے کی میز کے قریب سنی تھی۔

"جھنڈہ میں کیا ہوا..... کیا بتاؤں! اگر کچھ کہوں گا تو یقیناً تم لوگ کہو گے — پھر گپ ٹھونکی!"

"ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اکثر اوقات گپیں ٹھونکی ہیں لیکن اگر اس وقت میں کچھ بتاؤں تو وہ گپ ہرگز نہیں ہوگی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بھی گپ کی مد میں ڈال دی جائے گی..... مگر میں بیان ضرور کروں گا اس لئے کہ اگر میں نے اب نہ بیان کیا تو شاید......" پھر وہ آواز بھاری ہو گئی تھی اور مسلسل میرے کانوں کے پردوں کے اس طرف آ تھرتی چلی جا رہی تھی — یہاں تک کہ میں نے سنا:

"تب اس شخص نے کہ جس کا چہرہ چادر کی اوٹ میں چھپا تھا اس جیپ کے ڈرائیور سے کہا، تم مجھ سے سوال کر کے میری راہ کھوٹی نہ کرو حسنؑ اور حسینؑ آگے جا چکے ہیں اور اب میرے نام کا نعرہ لگنے والا ہے — اس نے یہ کہا اور آگے بڑھ گیا۔"

تب میں نے نظر اٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا جو میجر عمر تھا اور صبح صبح منہ اندھیرے چائے پینے کے لئے ہمارے پاس کچھ دیر کو رک گیا تھا آنسو اس کی آنکھوں سے سرک سرک کر اس کی وردی پر گر رہے تھے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے میز کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا: "پھر میں نے جب اس ڈرائیور سے اس واقعے کا وقت پوچھا تو مجھ پر سناٹے کا عالم طاری ہو گیا۔ یہی وہ وقت اور محاذ تھا جہاں ہم نے پہلے دن یا علیؑ کا نعرہ لگایا تھا۔"

"ہو سکتا ہے اس ڈرائیور کو الیوژن ہوا ہو۔"

"الیوژن..... ا" وہ ہنسا تھا۔" اچھا پھر یہ کرو کہ تم میرے ڈرائیور کو ایک پیالی چائے بھجوا دو..... اور اب ہم چلے۔"

اور اب اس دھندلائی ہوئی سہ پہر میں چائے کی اس ٹرالی کے قریب بیٹھا وہ شخص، جو ابھی ابھی ان سرحدوں کو عبور کر کے آیا تھا جن کو ان دنوں ہم دشمن کی سرحدیں کہا کرتے تھے، کہہ رہا تھا" وہ کہتے ہیں کہ ایک تو جب وہ نعرے لگاتے تھے تو ہمارے جوان بدحواس ہو جاتے تھے۔ جیسے پیروں تلے کی زمین سرک جاتی تھی۔"

وہ شخص آج ان سب باتوں کی گواہیاں دے رہا تھا کہ جن کو ہم نے الیوژن، افواہ اور گپ کی مد میں ڈال دیا۔ اور یہ کہ وہ ان صالحین میں سے ہرگز نہ تھا جن کی گواہیوں پر عیدیں منائی جا سکتی ہیں لیکن خیر اس سب سے مجھے کیا، میرا تو پروگرام بدل چکا ہے۔"

اور جو جس قوم کی تقلید کرے گا، وہ....."

شیرو سنو اب وہ پوچھ رہا ہے" اور یہ فوجی اسکاؤٹس کون ہیں....." اور اب وہ ایک اسکاؤٹ گرل کی جوانمردی کا قصہ سنا رہا ہے..... اور اب ہم پر صداقت آشکار ہو رہی ہے۔ اس شخص کا ان محاذوں سے کیا واسطہ۔ یہ قصے تو ان ہی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں جو ہمارے محاذوں تک آئے ہوں گے۔

"بات یہ ہے کہ ہمارے فوجی جب نعرے لگاتے تھے....."

"تمہارے فوجی" "نہ جانے کس نے ٹوک دیا ہے۔

بات کرنے والا سٹپٹا گیا ہے..... اور دوسرے لمحے سر اُٹھا کر اس نے کہا ہے..... اس نے کہا ہے....." وہ ٹھیک ہے..... تمہاری فوج۔"

اتفاقاً میری نظر شفاف شیشوں کے اس طرف ٹکرائی ہے..... ان میں ہر ایک حق اور ہر ایک بات سے دستبردار ہو جانے والی کیفیت کتنی شدید ہے.....

اور ایک خفیف سی دھندلاہٹ بھی۔ اور اس مرتبہ ان کی طرف دیکھ کر وہ دم گھٹنے والا احساس نہیں ہوا بلکہ مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں نے الماری کھولی ہے اور بے خیالی میں سیدھے ہاتھ کی دراز سے ایک فائل نکالی ہے اور فائل میں سے ایکسرے نکالا ہے۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں کی طرح دھندلا دھندلا ایکسرے اور ان میں ایک مٹھی بھر دل ہے اور اس دل میں ہر طرف برف کے ڈھیر ہی ڈھیر ہیں اور ہر ڈھیر پر ایک ننھا سا دیپ جھلملا رہا ہے..... مجھے ایک بار پھر لوسی یاد آ رہی ہے.....

لوسی جو اپنی ماں کی راہ میں روشنی کرتے نکلی تھی اور لوسی کی ماں نے پرانا راستہ بدل لیا تھا۔ اس لئے کہ اس کو ایک قریبی اور سہل راستے کا بھی علم تھا..... اور پھر یوں ہوا کہ تمام رات برف کے نرم نرم گالے اس کے وجود پر چپکے چپکے برستے رہے حتیٰ کہ برف کے ڈھیر پر اس کی چھوٹی سی لالٹین ٹمٹماتی رہ گئی.....

اور لوسی کی یہ کہانی بچپن سے لے کر آج تک میرے لئے پریشانی کی رہی ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ بھی یہ کہانی سن کر اپنے چھوٹے سے نرم نرم تکیے میں منہ چھپا لیا تھا۔ اور جب اس کا ایک کونا بھیگ جاتا تھا تو میں چپکے سے اپنی آنکھیں سرکا کر کسی دوسری طرف رکھتی رہی تھی۔ چنانچہ اب بھی میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں دوسری طرف کر لی تھیں اور یہ سمت تھی سامنے بیٹھے ہوئے انسان کا وہ سر جس پر وقت سے بہت پہلے برف سی گرتی جا رہی تھی۔ اس لئے کہ جب کچھ لوگ راستہ بدل لیتے ہیں تو ——

تو خیر یہ تو لوگوں کے اپنے مسئلے ہیں۔

پر میرا تو انفرادی مسئلہ کسی قوم کے ساتھ اُٹھائے جانے یا نہ جانے کا ہے۔ اب میں کیا کروں کہ اب اگر میں ان کے ساتھ اٹھائی جاؤں تو پھر میری پشت پناہی کے لئے سفید پوشوں کی ضمانت کون دے گا۔

اور عید کے منانے یا نہ منانے کا یہ ہے کہ چاند کی گواہی کے لئے تو ضروری ہے کہ گواہ کچھ ضروری شرطوں پر پورا اترتا ہو چنانچہ طے یہ پایا کہ چاند کی گواہی دینے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مومنین اور صالحین میں سے ہو لیکن بعض گواہیوں کی فضیلت اور صداقت کی دلیل ہی یہ ہے کہ گواہی دینے والے مومنین اور صالحین میں سے نہ ہوں۔ چنانچہ افواہوں، گپوں اور الیوژن کی گواہی کے بعد میرے لئے یہ فیصلہ مشکل ہے کہ کس قوم کے ساتھ اٹھائی جاؤں۔

مسعود مفتی

نئے پیمانے

ایک افسر تبدیل ہوگیا ــــ دوسرا آگیا۔

ملاقاتی کمرے میں علاقے کے معتبرین بیٹھے تھے اور باری باری دفتر میں ملاقات کے لئے جا رہے تھے۔ جہاں سے چپراسی نے قریشی صاحب کے نام کی تختی اتار دی تھی اور اب نئی تختی لگا رہا تھا۔

لوگ دھیمی آوازمیں باتیں کر رہے تھے۔ موضوع نئے افسر کی ذات تھی۔ کس قسم کا ہے۔ پہلے کہاں کہاں رہا ہے۔ وہاں وقت کیسے گذارا ہے۔ وغیرہ وغیرہ کسی کا چچا ماموں، کسی کا لڑکا، کسی کی لڑکی کا سسرال۔ کسی کی برادری کا کوئی دور دراز کا رشتہ دار اور کسی کا ملنے والا ضرور کسی ایسے علاقے میں رہتا ہوتا جہاں اس افسر نے پہلے ملازمت کی تھی۔ تبادلے کی خبر کے ساتھ ہی خطوط چل پڑے تھے۔ اب اُس کے ماضی کی واضح تصویر ملاقاتیوں کے سینوں میں موجود تھی اور وہ دبی آواز میں اپنی اطلاعات کا تبادلہ کر رہے تھے۔

اتنے میں دو آدمی ملاقاتی کمرے کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ صاحب کا چپراسی لپک کر بنچ سے اٹھا۔ جھک کر فرشی سلام کیا۔ مصافحہ کرکے اپنا ہاتھ سینے پہ رکھا اور آگے بھاگ کر ملاقاتی کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

جب وہ اندر داخل ہوئے تو سب ملاقاتی کھڑے ہوگئے۔ دو ایک نے اپنی کرسیاں ان کے لئے چھوڑ دیں۔ باقی سمٹ سمٹ کر بیٹھنے لگے۔

اُنھوں نے سرسری انداز میں دو چار لوگوں کا حال پوچھا۔ چند ایک انکسار سے آگے بڑھے تو اُن کے ساتھ برتری سے ہاتھ ملایا اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔

"جناب کی اطلاع اندر دوں؟" چپراسی خوشامد سے دانت نکال رہا تھا

اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ــــ سوچا ــــ پھر ایک بولا: "کتنی دیر ملاقاتی لے رہا ہے؟"

"بس جی پانچ منٹ۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔ جب سب فارغ ہو جائیں گے تو ہم اطمینان سے ملیں گے۔"

"بہتر حضور۔"

ان میں سے ایک بھاری بھرکم تھا۔ کوئی پچاس برس کا۔ سر پہ سنہری کلاہ اور سفید کلف دار پگڑی۔ ساری مونچھیں۔ توند کے اوپر اچکن پھنسی ہوئی جیبی گھڑی کی زنجیر اچکن کے بٹن اور جیب کے درمیان لٹکتی ہوئی۔ ہاتھ میں مرصع چھڑی۔

دوسرا آدمی لمبا اور دبلا تھا۔ عمر سے پہلے ڈھلا ہوا قیمتی سوٹ میں ملبوس۔ سر کے کھچڑی بال سلیقے سے سجے ہوئے۔ ہونٹوں میں سگریٹ اور چہرے پر بے نیازی آنکھیں سنہری فریم والے کالے شیشوں سے ڈھکی ہوئی۔

ملاقاتی باری باری اندر جا رہے تھے۔ جب آخری آدمی گیا تو صرف یہ دونوں کمرے میں رہ گئے۔

اچکن والے نے سوٹ والے کی طرف دیکھا اور بولا "کیا خیال ہے جی آپ کا؟"

دوسرا خاموشی سے سگریٹ کا کش لگاتا رہا۔

"کچھ سنا آپ نے صاحب کے متعلق؟" اُس نے پھر پوچھا۔

سوٹ والے نے کش ختم کر کے راکھ جھاڑی۔ اطمینان سے دھوئیں کے دو تین چھلے منہ سے اُگلے اور طنزیہ بولا "سنتے ہیں سخت افسر ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"یہی کہ پچھلی جگہ دو تین کلرکوں کو رشوت لینے کی وجہ سے نوکری سے برطرف کر دیا تھا۔" اُس نے دوسرے کی نظروں میں نظریں ڈال کر استہزا آمیز انداز میں کہا ــــ دو تین لمحے ایسے ہی دیکھتا رہا۔ پھر خود ہی ہنسنے لگا۔

اچکن والے نے سنجیدگی سے سر ہلایا "ہاں چھوٹے دل کا آدمی ہے۔ کسی کو پیسے بناتے نہیں دیکھ سکتا ــــ بالکل تنگ نظر ہے۔"

دونوں کی آنکھوں میں حقارت لہرائی۔

"آپ شیخ انتظام الدین کو جانتے ہی ہیں؟"

"کون وہ جو اسمبلی میں ہیں"

"ہاں ہاں وہی ــــ اب آپ ہی سوچیں کتنے بڑے زمیندار ہیں۔ لاکھوں کی جائداد۔ علاقے میں دور دور تک نام مگر سنا ہے کہ اُنھوں نے ایک دو کام کرنے کے لئے صاحب سے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔"

"نہ صرف یہ جی" سوٹ والا بولا "بلکہ میں نے سنا ہے کہ سرکاری قرضہ جات کی وصولی کے لئے اُسے جیل میں ڈالنے کی دھمکی دی۔"

"بالکل ٹھیک سنا آپ نے" اچکن والا سر ہلا کر بولا "توبہ توبہ ....."

چند منٹ خاموشی رہی اور پھر اچکن والا بولا "دراصل جی قصہ یہ ہے کہ صرف خاندانی آدمی ہی خاندانی کی قدر کر سکتا ہے۔ مجھے تو یہ صاحب کوئی خاندانی نہیں لگتا ــــ اب بھلا اس میں بات ہی کیا تھی۔ اگر شیخ انتظام الدین کی عزت کے لئے چند کنجڑوں اور چماروں کو دبا دیتا، وہ ان کے خلاف فیصلہ کر دیتا۔"

"بالکل بالکل" دوسرے نے فوراً سر ہلایا اور سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ پھر نتھنوں سے دھوئیں کی لہر چھوڑتے ہوئے بولا "پھر جی ایسوں کا حشر بھی تو دیکھ لیں تا، تار کے ذریعے تبادلہ ہوا۔"

دونوں خاموشی سے سوچنے لگے۔

اتنے میں چپڑاسی آیا "آئیے جناب"

اچکن والا اُٹھ کر دفتر کی طرف بڑھا۔

صاحب نوجوان سا خوش خلق آدمی تھا۔ اُس نے اُٹھ کر اخلاق سے ہاتھ ملایا، حال احوال پوچھے گئے۔ نئی جگہ کی باتیں ہوئیں ــــ پچھلی جگہ کا ذکر ہوا۔ ملاقاتی نے اپنے خاندان کے دو چار ایسے لوگوں کا بار بار ذکر کیا جو صاحب کے خاندان کے دو چار بڑے لوگوں کو جانتے تھے۔ باتوں باتوں میں دیگر تعارف بھی کرا تا گیا۔ "میرے دادا سارے پنجاب میں پہلے خان بہادر تھے ــــ ۱۸۵۷ء کے غدر کے فوراً بعد انھیں سرکار کی طرف سے خدمات کے عوض خلعت بھی ملی تھی۔"

صاحب نے مروت سے مسکرا کر سر ہلایا۔

"اور یہی میرے والدین پر بھی سرکار بڑی مہربان تھی ۱۹۱۱ء میں دہلی میں جو دربار ہوا تھا، اس میں اُن کو خاص طور پر قطار کے سرے والی کرسی ملی تھی ..... اور پھر شاہ ایڈورڈ انگلستان کے تخت پر بیٹھا تو وہ تاجپوشی میں شرکت کے لئے ولایت بھیجے گئے تھے۔"

صاحب نے متاثر ہونے کے انداز میں ابرو اوپر اٹھائے۔

ملاقاتی نے بتایا "بہت خدمات ہیں جناب ہماری۔ میرے والد پر انگریز خاص طور پر مہربان تھے سب افسر شکار کھیلنے ہماری زمینوں پر آتے تھے۔"

صاحب سر ہلاتا رہا اور ملاقاتی اپنا تعارف کراتا رہا۔ بڑا ایک دفعہ صاحب نے اپنی گھڑی کی طرف بھی نگاہ کی مگر وہ نظر انداز کر گیا اور اپنے بزرگوں اور انگریزوں کے تعلقات کے قصے سناتا رہا۔

کیا زمانے تھے جناب وہ بھی ـــــ انگریز کا راج ـــــ اب بھی یاد آتے ہیں تو دل کھل جاتا ہے۔"

صاحب کھڑا ہو گیا، اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "اچھا ملک صاحب، پھر کسی وقت تفصیل سے بات کریں گے۔"

ملاقاتی بھی اٹھ کھڑا ہوا اور قریب ہو کر قدرے دھیمی آواز میں بولا "ہم لوگ سرکار کے پرانے خدمت گار ہیں۔ کل دو بھینسیں بنگلے پر بھجوا دوں گا جب سوکھ جائیں گی تو اُن کی جگہ دوسری آ جائیں گی۔"

"نہیں نہیں ملک صاحب" صاحب نے ہنس کر کہا "آپ یہ تکلیف نہ کریں۔"

"تکلیف کیسی جناب! میں نے تو درجن بھر گائے بھینسیں رکھی ہی افسروں کے لئے ہیں۔ میرا کون سا اپنا کام رک رہا ہے ـــــ وہی بھجوا دوں گا جو شیخ صاحب کو دی تھیں۔ اُنھوں نے بھی تین سال استعمال کی ہیں۔ مجھے کیا فرق پڑے گا۔"

"نہیں نہیں۔ آپ بالکل تردد نہ کریں" صاحب نے ذرا بے چینی سے کہا۔

"اچھا تو" وہ اور قریب ہو گیا "آج کل نئی فصل آئی ہے۔ دانے اور گھی بھجوا دوں گا۔"

صاحب نے بے صبری سے انکار میں سر ہلایا۔

"میرا کیا جاتا ہے جناب۔ گھر کے دانے ہیں۔ گھر کا گھی ہے۔ جہاں ہمارا اتنا بڑا کنبہ کھاتا ہے، ایک آپ کے کھانے سے کون سا فرق پڑے گا۔"

صاحب انکار کرتا گیا مگر ملاقاتی نے اصرار جاری رکھا تو اس نے ذرا سختی سے کہا "ملک صاحب یہ میرا اصول نہیں ہے۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں۔"

ملاقاتی نے مایوسی سے اُسے دیکھا۔ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

"تمہاری گندم تیار ہے" وہ چپڑاسی سے سرگوشی میں بولا "اگلے جانا۔"

چپڑاسی نے جھک کر سلام کیا۔

سوٹ والا اندر چلا تو اس نے اچکن والے سے کہا "آپ ذرا انتظار کریں۔ میں فارغ ہوتا ہوں تو اکٹھے چلیں گے۔"

وہ اندر گیا تو صاحب بڑی خوش خلقی سے ملا۔ دو چار باتیں ہوئیں۔ پھر صاحب نے خود ہی پوچھ لیا "آپ کی مل کیسی چل رہی ہے؟"

"کون سی؟"

"وہ جو یہاں ہے۔"

"اچھا اس کا کہہ رہے ہیں۔ میں نے سمجھا آپ نئی مل کا ذکر کر رہے ہیں" پھر سگریٹ کا کش لگا کر بولا "یہاں والی بھی اچھی ہے مگر میں اُسے بیچ رہا ہوں

کوئی سٹرانگ پارٹی مل جائے تو بارگین کروں۔"

"کیوں بیچ رہے ہیں آپ؟"

"دراصل جی یہ میری سب سے پہلی مل تھی۔ اس کے منافع سے اب میں سات فیکٹریاں اور لگا چکا ہوں۔ کچھ اس کی مشینری بھی پرانی ہو چکی ہے
میں نے کہا (آنکھ مار کر) نک اِٹ!"

اپنی عقل کی داد لینے کے لئے اس نے فخریہ قہقہہ لگایا اور نکٹائی کی گرہ درست کی۔

صاحب بھی تقاضے سے مسکرایا "آپ کو تو شروع میں انکم ٹیکس بھی تو معاف ہوتا ہے نا۔"

"جی جی۔ لیکن وہ وقت اب ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے اسے بیچ کر اب نئی لگاؤں گا تاکہ اس پر ٹیکس ہالیڈے مل جائے۔۔۔۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ کاروباری چیزیں تو آپ ہی بہتر سمجھتے ہیں۔"

"جی نہیں کاروبار تو ہر ایک کو کرنا چاہیئے۔ اسلام نے بھی تجارت پر زور دیا ہے۔۔۔۔ آپ کو بھی کاروبار کرنا چاہیئے۔"

افسر خفیف سی ہنسی ہنسا۔

"نہیں نہیں۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اگر آپ کی ڈیزائر ہو تو میری نئی فیکٹری میں شیئرز خرید لیجئے۔"

اب کے صاحب نے قہقہہ لگایا "تو بہ کریں جی۔ ہمارے پاس اتنا پیسہ کہاں۔ تنخواہ میں بمشکل سفید پوشی سے گزارہ ہوتا ہے۔"

"نو۔ نو۔ نو۔ آپ فکر نہ کریں۔ ڈونٹ یو وری، ڈونٹ مائنڈ۔ ہمارے پاس ایک فنڈ ہے جس میں سے اپنے مہربانوں کو قرضے دے سکتے ہیں۔"

"نہیں قرضہ ادا کرنے کو پیسے کہاں سے لائیں گے۔"

"دیٹ اگین از ناٹ ڈی فی کلٹ یو کین پے اٹ بیک آؤٹ آف دی انکم آف شیئرز۔"

افسر نے نفی میں سر ہلایا "کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجے۔ آپ کاروبار کریں۔ ہم تو نوکریوں کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی سے گزارہ کریں گے۔"

ملاقاتی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ جیب سے سونے کا سگریٹ کیس نکالا اور کھول کر صاحب کو سگریٹ پیش کیا۔

"معاف کیجئے میں تو پیتا نہیں۔"

اس نے خود ایک سگریٹ نکالا۔ ڈبہ بند کر کے سرے کو اس پر مارا اور ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا "بہرحال۔۔۔۔ یو کال تھنک اباؤٹ اٹ۔"

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

"یہاں کام تو کافی ہوگا آپ کے لئے" ملاقاتی نے کہا۔

"جی ہاں کام تو کرنا ہی پڑتا ہے، ملازمت جو ہوئی۔"

"اگر کبھی بور ہو جائیں تو ریلیکس کرنے کے لئے لاہور مری وغیرہ کا چکر لگا لیا کریں۔"

صاحب مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"نو آنسٹلی لاہور، مری، کراچی اور راولپنڈی میں میں نے بنگلے بنوائے ہیں۔ دے آر ایٹ دی ڈسپوزل آف فرینڈز۔ آپ وہاں جائیں
جتنے دن دل کرے۔ رہیں۔ مائی سرونٹس ول لُک آفٹر یو۔"

افسر نے مسکراتے ہوئے کہا "کون جائے جی اتنی دور۔ یہاں سے ہی فرصت ملنا مشکل ہے۔"

"تو کوئی بات نہیں۔ وہی کین اریخ اے گے پارٹی ہیر"

افسر کھڑا ہو گیا "اچھا جی۔ پھر ملیں گے"

ملاقاتی بھی کھڑا ہو گیا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "ہاں کبھی فرصت میں آؤں گا۔ بہرحال وِش اذاین اوپن آفر ٹو یو"

"خدا حافظ" صاحب نے کہا

ملاقاتی چلا۔ دروازے پر رک کر مڑا "میرے پاس کچھ اچھی انگلش وسکی آئی تھی۔ میں ایک کریٹ چپڑاسی کے پاس چھوڑ جاؤں گا"

افسر مسکرا دیا "نہیں بھائی میں تو ڈرنک نہیں کرتا"

"اچھا تو پھر گڈ بائی"

باہر نکلے تو اچکن والا ملاقاتی بھی تیار کھڑا تھا۔ دونوں کار کی طرف بڑھے۔ ڈرائیور نے گاڑی چلائی تو اچکن والے نے پوچھا "کیسی رہی ملاقات؟"

"بوگس آدمی ہے" دوسرا بولا

پھر دونوں اپنی اپنی ملاقات کا حال ایک دوسرے کو سنانے لگے۔

کار چل رہی تھی اور وہ باتیں ختم کر کے خاموش ہو چکے تھے۔ اچکن والا سوچ سے نکل کر بولا "خدا بھی ایسے لوگوں کو افسر بنا دیتا ہے جنہیں افسری کرنا ہی نہیں آتی"

سوٹ والے نے اثبات میں سر ہلایا "اب آپ شیخ صاحب ہی کو لیں۔ کیا ریل پیل تھی ۔۔۔ کیا رونق تھی ۔۔۔ گندم آ رہی ہے گھی کے ٹین اتر رہے ہیں۔ دربار لگا ہے۔ دعوتیں اڑ رہی ہیں خاندانی لوگوں کو سر پر بٹھا رہے ہیں۔ جس کام کے لئے کہا ویسے ہی ہوا کر دیا ....."

"وہ تو جی یاروں کا یار تھا" اچکن والا بات کاٹ کر بولا "کیا بات تھی۔ افسری تو وہ کر گیا ہے"

پھر دونوں اپنی پچھلی یادوں میں کھو گئے۔

کار چل رہی تھی۔

دفعتاً اچکن والا "مگر نہیں جلدی پیچھا چھوٹ جائے گا اس سے"

"ہاں جی" سوٹ والے نے زور سے سر ہلایا "اسے کچھ کرنا ہی پڑے گا"

"کار چلتی گئی ۔۔۔ انجن غرا رہا تھا ۔۔۔"

ام عمارہ

آگہی کے ویرانے

"آپا، آپا! میری ماں کو رکھ لیجئے" بادشاہ نے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھماتے ہوئے سرگوشی کی۔

"کیوں بھلا تمہاری ماں کو کیوں رکھوں؟ وہ تو خود چلی گئی۔ اب ——" آسیہ نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کی زبان رک گئی۔ بادشاہ کا پھول جیسا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور اس کے ہر وقت مسکراتے ہوئے ہونٹ ایک سوال میں تبدیل ہو گئے۔

"کیوں بادشاہ خیریت تو ہے؟"

"آپا۔ آپا میری ماں کہتی ہے کہ اگر آپ اسے نہیں رکھیں گی تو وہ مجھے بنگلے کے گھر لے آئے گی اور نیلم کی ماں مجھے مارے گی —— اور —— اور آپا وہ مجھے عید میں کپڑا بھی نہیں بنا دے گی۔ پھر میں عید میں نیا پینٹ اور شرٹ کہاں سے —— کہاں سے ——" بادشاہ کی بڑی بڑی آنکھوں سے موتی جیسے آنسو ٹپکنے لگے۔

"چپ چپ بادشاہ میں تیری ماں کو رکھ لوں گی۔ بس —— "ننھے سے بادشاہ کے آنسو دیکھ کے وہ چائے کا گھونٹ بھرنا بھول گئی بادشاہ جس کے ننھے منے ہاتھ پکے ہوئے تھے جیسے ایک مٹی بھر بھات اور ایک پینٹ اور قمیص کے لیے صبح سے شام تک ایک پاؤں پر کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ بادشاہ تھا۔ یہ ماں باپ نام رکھتے وقت کیوں نہیں سوچتے۔ مایوسی کی تصویر بادشاہ پر ایک نظر اس نے ڈالی۔

"بادشاہ! اے او بادشاہ، کہاں مر گیا ——" رفعت کی تیکھی آواز کان چھید گئی۔

"جاؤ بادشاہ ورنہ آپا خفا ہو جائے گی" اس نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"اونہہ، اسی پیار نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے ——" رفعت نے چولہے کے پاس سے ہانک لگائی۔

"ذکر نہ ہوا پس ہانک لیا گیا ہے۔ کمبخت کی خاطر ہم ہو رہی ہیں ——" اس نے جھنجھلا کے چائے کی کیتلی اتنے زور سے پٹخی کہ چھناکے کے ساتھ آسیہ کا کلیجہ دہل گیا۔

"کیا ٹوٹا رفعت؟" آسیہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" رفعت نے چائے دانی کی ٹوٹن آنگن میں پھینکتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا "چائے دانی ٹوٹ گئی"

"چائے دانی ٹوٹ گئی اور تم کہتی ہو کہ کچھ نہیں ٹوٹا"

"ٹوٹنے کی چیز تھی، ٹوٹ گئی۔ میں کیا کروں ——" رفعت نے بکھری ہوئی چائے کی پتی جھاڑو سے سمیٹ کے نالی میں گراتے ہوئے ایسے کہا جیسے تیرہ روپے کی چائے دانی کا ٹوٹنا کوئی بہت ہی معمولی سی بات تھی اور ایسی ایسی چائے دانیاں جب چاہے آ سکتی ہیں۔ اس کے اس رویے سے

آسیہ کو سخت تکلیف ہوئی۔

"تیرہ روپے کی تھی یہ کیتلی اور تم کہتی ہو کہ۔۔۔" آسیہ نے افسردگی سے چائے کی پیالی اُٹھا کے ٹھنڈی چائے ایک سانس میں حلق میں انڈیل لی۔

"کون سا فرق پڑ جائے گا جو کیتلی ٹوٹ گئی تو ٹوٹ گئی۔ تیرہ روپے ہی کی تو تھی۔ آپ آسیہ آپا ایک ایک پیسے کے پیچھے ایسے مرتی ہیں جیسے پیسہ ہی آپ کا سب کچھ ہے۔ اور پھر۔۔۔"

"تم نہیں بولو گی تو اور کون بولے گا رفو۔ جب نمک کی ایک کنکری سے لے کے تمہاری شلوار کے ریشم تک کے بارے میں سوچنا پڑے تو تیرہ روپے بھی تیرہ سو کے برابر ہوتے ہیں۔" آسیہ نے آہستہ سے کہا۔

ابھی پرسوں ہی رفو نے اس سے فرمائش کی تھی اب کے عید پر وہ اس کے لئے سیاہ ریشمی شلوار اور جاپانی چکن کی قمیص بنوا دے، دوپٹہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پچھلی عید کا شفان کا دوپٹہ اب تک ویسے ہی نیا پڑا ہے۔ اس نے بڑی فراخ دلی سے کہا تھا جیسے دوپٹہ نہ بنوا کے وہ اس پر بہت بڑا احسان کر رہی ہے۔

"اوہ آپ کو میری ریشمی شلوار کھل رہی ہے۔ چلئے میں نہیں بنواتی شلوار قمیص۔ بھلے کو آپ اس بادشاہ کے سنگ میں گئے ڈوبے۔ بھلا آپ کا کیا واسطہ۔" رفو تنتنائی۔

"کیا بکتی ہو رفو۔ یہاں بادشاہ کا کیا ذکر۔ تمہارا اس سے کوئی مقابلہ بھی ہے؟"

"وہ تو صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ ابھی ابھی بادشاہ آپ سے میری شکایت کر رہا تھا اور آپ مزے سے سن رہی تھیں۔۔۔"

"اور اسی جھنجھلاہٹ میں تم نے کیتلی پٹخ ڈالی۔ خدا کسی کو عقل کا اندھا نہ بنائے۔"

"میں آپ نے میری شکایت سن سن کے اس بے ہودے کا دماغ آسمان پر کر دیا ہے۔۔۔" رفو کو بادشاہ کے ہنستے مسکراتے چہرے سے نفرت تھی۔

"یہ کیا کہ ہر وقت ٹھی ٹھی کئے جا رہے ہیں۔" اس نے ایک دن اعتراض کیا تھا۔

"اتنی ظالم مت بنو رفو۔ تمہیں کسی کی ہنسی پر کوئی اختیار نہیں۔ خدا کا شکر کرو کہ وہ اتنا ہنس مکھ ہے ورنہ روتی بسورتی شکل دیکھ کے تو میرا دم اُلٹنے لگتا ہے۔"

"مگر آپا۔۔۔"

"بس چپ رہو۔ یہ بادشاہ نام کا نہیں دل کا بھی بادشاہ ہے۔ کیوں بادشاہ؟" اس نے مسکرا کے بادشاہ کی طرف دیکھا تھا۔

اور جب سے لے کے آج تک رفو کی دشمنی پکی ہو گئی تھی۔ موقع بے موقع اس کے کان اینٹھ دیتا، وہ چانٹے لگا دیتا اور بات بے بات ڈانٹنا تو بہت ہی معمولی سی بات تھی۔

"مگر یہ واقعہ ہے آسیہ آپا کہ بادشاہ کو آپ نے بہت سر چڑھا رکھا ہے اور اب یہ بادشاہ ہر وقت۔۔۔"

"تمہارا دماغ سچ مچ خراب ہو گیا ہے رفو۔۔۔" آسیہ نے تعجب سے رفو کو دیکھا۔

رفو جو اس کے رشتہ کی بہن تھی لیکن اپنی بہنوں سے زیادہ پیاری۔ تنہائی کے اس کڑے وقت میں جب ایک ایک کر کے سارے رشتہ دار منہ موڑ گئے اور آسیہ تن تنہا وسیع دنیا میں ایک ایک کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی تو اچانک آنگن کا دروازہ کھلا اور چھوٹے چچا ہمیشہ کی طرح آنگن کے چبوترے پر براجمان تھے۔

"اب انھیں کون سی مصیبت یہاں کھینچ لائی؟"

آسیہ ان کی صورت دیکھ کر لرز گئی۔ خاندان کے سب سے گئے گزرے انسان جنھیں دیکھ کے ابا کے پتنگے لگتے تھے اور اماں کی جان کی ڈھنڈیا پڑ جاتی

تھی چھوٹے چچا کون تھے، کیا تھے؟ اس کے بارے میں اسے کوئی پتہ نہیں تھا۔ ان کا شمار گھر کے قریبی لوگوں میں ہوتا تھا اور بس۔ وہ یہ البتہ ضرور جانتی تھی کہ چھوٹے چچا اُن کے اپنے چچا نہیں ہیں ——— اور یہ انکشاف بھی اس پر اس دن ہوا تھا جب اس نے چھوٹے چچا کی گود میں بیٹھ کے مارے سوالوں کے ان کا ناک میں دم کر دیا تھا کہ:

"آپ اگر ابا کے بھائی ہیں تو ان کی طرح لمبے کیوں نہیں؟ آپ کی آنکھیں سیاہ ہونے کی بجائے بھوری کیوں ہیں۔ آپ مرچ کی طرح سوکھے کیوں ہیں؟ جبکہ ابا اتنے لحیم شحیم ہیں؟ آپ کے سر کے بال لمبے لمبے اور سنہرے کیوں ہیں؟ آپ کی ناک ابا کی طرح اونچی اور چوڑی کیوں نہیں؟"

تو چھوٹے چچا نے چڑ کے کہا تھا "میرے ماں باپ الگ اور تمہارے باوا کے الگ۔ بھائی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ میرے اپنے بھائی تھوڑے ہی ہیں۔"

"ہائیں ——— یعنی کہ ———"

"ہاں ہاں۔ بالکل۔ تمہارے ابا میرے ماموں کے بیٹے ہیں اور ———"

"یعنی میرے دادا آپ کے ویسے ماموں تھے جیسے اماں کے ماموں ہیں جنید نانا؟"

"ہاں ہاں ———"

اللہ توبہ ——— اسے دادا کے تصور ہی سے گھن آنے لگی۔ اتنی بڑی زبردست شخصیت کا اتنا باوقار بیٹا ——— "جنید نانا تو ایک دم کوڑے جیسے ہیں۔ جی اب بھلا ابا کے ابا ویسے تھے تو پھر آپ ابا کے اپنے بھائی ہو ہی نہیں سکتے ہیں۔ کیوں بھئی ———؟" اس نے اپنے جانتے عقلمندی کی بات کی۔

"ارے نہیں بیٹی ——— تمہارے دادا تو تمہارے ابا سے زیادہ ہاتھ پیر والے تھے۔ تم کیا جانو میرے ماموں کو۔ ان کے آگے بڑے بھتیا تو بس کچھ بھی نہیں ہیں۔"

"کمال کرتے ہیں چچا، ابھی خود ہی کہہ رہے تھے کہ آپ کے ماموں جنید نانا جیسے تھے اور اب ———"

"اُف! وہ تو میں نے تمہیں اپنا رشتہ سمجھایا تھا"

"یعنی کہ ———"

"یعنی کہ کچھ نہیں۔ چلو بھاگ جاؤ میرے پاس سے ———"

"اماں اماں۔ یہ چھوٹے چچا کہتے ہیں کہ وہ ابا کے اپنے بھائی نہیں ہیں اور میرے دادا جنید نانا کی طرح کوڑے جیسے تھے جو اُن کے ماموں تھے ——— پھر خود ہی پلٹتے ہیں کہ وہ "

"چپ کرو ——— اسے تم کو کیا لینا ان سب باتوں سے۔"

"ایں مگر یہ چھوٹے چچا بھلا ہمارے اپنے نہیں ہیں؟"

"اپنے ہی تو ہیں۔ تمہارے باپ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں۔"

"اوہ! اب بھی میں چھوٹے چچا کی اماں ابا کی ایسی پھوپھی تھیں جیسے میری زبیدہ پھوپھی ہیں ایں؟"

"نہیں، فریدہ تمہاری پھوپھی ویسی نہیں ہیں۔ تمہاری کوئی پھوپھی ہیں ہی نہیں۔ تمہارے باپ اپنے باپ ماں کے اکلوتے ہیں" اماں نے زبیدہ پھوپھی کے نام پر تیوری چڑھائی۔

"چہ چھوٹے چچا بھی اپنے نہیں زبیدہ پھوپھی بھی اپنی نہیں ——— چھوٹے چچا کے اپنے نہ ہونے کا تو اسے ایک ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔ کبھی دو پیسے کی بیری بھی نہیں دلائی۔ اُلٹے اس کے دو چار پیسے بیڑی پینے کے بہانے مار لیتے تھے ——— لیکن فریدہ پھوپھی کے اپنے نہ ہونے کا اسے رہ رہ کے

افسوس ہو رہا تھا۔

اتنی پیاری سی تھیں، اتنی نازک سی زبیدہ پھوپھی کہ بس اور اسے کتنا پیار کرتی تھیں — جب دہا سے آتی تھیں تو کہیں میٹھی کے لڈو ہیں تو کہیں روغنی پیٹھے ہیں — خوشبودار جوڑے جیب میں بھر بھر دیتیں اور جیبیں بھر بھر کے نکی، شکر پارے اور پتہ نہیں کیا کیا الا بلا لاتی تھیں ہر وقت اسے گودی میں ڈھوئے پھرتیں۔ اماں سے لہک لہک کے باتیں کرتیں — مگر اماں کی بھویں جب تک زبیدہ پھوپھی رہتیں دو دھاری تلوار بنی رہتیں۔ لیکن زبیدہ پھوپھی کے رویے میں کوئی فرق نہ آتا — کہیں اماں کی ساڑی زبردستی دھوئی جا رہی ہے تو کبھی اس کے لئے فراکیں سل رہی ہیں اور رات کو مزے سے ابا کی چارپائی پر بیٹھی ایک پاؤں کلیجے سے لگائے بیل کی طرح جھک رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اسے قصہ بھی سنا رہی ہیں، ابا کا پیر دب رہا ہے۔ ملازموں کو انعام و اکرام بھی مل رہے ہیں — اور جب وہ جانے لگتیں تو نوکر چاکر ابا اور وہ خود سب کے سب رنجیدہ ہو جاتے۔ بس ایک اماں اور دوسرے چھوٹے چچا (اگر وہ ہوتے تب) کے چہروں پر اطمینان کی لہریں دوڑ جاتیں — جیسے بڑی بلا ٹل گئی ہو۔

ایک دفعہ جب زبیدہ پھوپھی ایسے ہی گئیں تو چھوٹے چچا نے اماں سے پوچھا "ٹل گئی بلا؟"

"ہاں مگر چھوٹے، یہ بلا تو تم نے سر چڑھا رکھی ہے۔ میاں گھوڑی تو تمہاری ہے لیکن نہ تم اسے لگام دے سکے اور نہ ہی سیدھے رستے پر چلنا سکھایا۔ کیسے سوار ہو میاں؟" اماں ہنسیں

"آپ ہنستی ہیں بھابھی یہ کمبخت بڑی منہ زور ہے اور سچ پوچھئے تو وہ نام کو میری گھوڑی ہے ورنہ سوار تو وہی پرانا ہے — صرف نام بدل گیا ہے۔"

"میاں تم سخت بزدل ہو —"

ایسی بات نہیں بھابھی۔ دراصل ان سب باتوں کے باوجود میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ اور اب سچ پوچھئے تو وہ میرے دل پر چڑھتی بھی نہیں۔ بھلا آپ ہی بتلائیے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ خدا کے بعد اگر کسی کو عزت کے لائق سمجھتا ہوں تو وہ —"

"مگر چھوٹے میاں یہ بھی تو سوچو یہ ہیرا جلا پایا؟"

"یہ ناانصافی ہے بھابی۔ ذاتی بنا کے رکھا ہے بھابی انھوں نے آپ کو کیئے نہیں —؟ بس یہ ذرا سا شوق ہے اور یہ تو آپ سے پہلے کا ہے۔ اسی لئے انھوں نے مجھے — خیر چھوڑیئے —"

"دیکھو میاں، میں عورت ہوں اور مجھ سے یہ سب کچھ دیکھی کر — اور تم کیسے مرد ہو کہ کچھ محسوس نہیں کرتے۔ کمال ہے —"

"بات یہ ہے بھابی کہ میں نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ اور وہ میری ملکیت تھی ہی کب جو میں محسوس کروں۔ میں تو بس محل پر ٹاٹ کا پردہ ہوں — اونہہ —"

اور آسیہ منہ کھولے چھوٹے چچا اور اماں کی مکالمہ بازی سنتی رہی — اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اور تو اور اماں جو ہر لمحے چھوٹے چچا سے چڑی رہتی تھیں اس طرح گھل مل کے باتیں کر رہی تھیں کہ اسے سخت تعجب ہو رہا تھا۔ ورنہ اماں تو بس اٹھتے بیٹھتے سخت سخت باتیں کہنے کی عادی تھیں۔ جہاں چھوٹے چچا آئے اور اماں نے ہتھیار سنبھال لئے۔ ویسے چھوٹے چچا تھے بھی سخت اٹھائی گیرے۔ انھوں نے کئے بیٹیوں کی طرح گودوں کھلایا تھا — اور پھر ایک دن مزے سے اس کے ہاتھوں کے کڑے لے کے پردیس سدھار گئے اور اس کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں کیا کہ اماں اس کے ہاتھوں میں کڑے نہیں دیکھیں گی تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ اماں نے مارے غصے کے دھواں دھوں پیٹ کے رکھ دیا اور ابا نے قسم کھالی کہ زیور نام کی کوئی چیز اسے نہیں بنا دیں گے۔

اب یہ بھی ہونے والی بات تھی کہ ابا نے قسم کچھ ایسے وقت کھائی تھی کہ سرتا سر پوری ہو گئی اور دو دن کے اندر ابا کا جنازہ بیچ آنگن میں دھرا تھا۔

"اور وہ دن اور آج کا دن اس کی قسمت میں سونے کے کڑے آبڑی چیز تھے تار کا چھلا بھی نہیں تھا۔ اور اماں ابا کی سچی رفیق تھیں۔ ابا کے بعد ان کو یہ دنیا اتنی ناپسند ہوئی کہ سال لگتے لگتے انھوں نے اپنا راستہ لیا اور جب آسیہ کو ہوش آیا تو اپنے چاروں جیسے آنگن میں تنہا تھی اور اوپر آسمان اور نیچے زمین، دو مار دگر برہنہ بٹے ہوئے در جیسے اونچے ستون اور اژدہے کی طرح منہ کھولے ہوئے کمرے جن کے بڑے بڑے دروازے اسے نگلنے کے لئے ہی کھلے تھے ــــ اس نے اجنبی نظروں سے چاروں طرف دیکھا، گھر کا ایک ایک تنکا اس کا دیکھا بھالا تھا۔ لیکن ہر چیز نے جیسے اس کے لئے اپنی پہچان کھو دی تھی ــــ اس نے حیران و پریشان ہو کے ادھر ادھر دیکھا" تو ایسے بھی ہوتا ہے اللہ میاں کہ انسان اتنا بے سہارا ہو جائے کہ اسے سہارے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہو اب ــــ اب میں کیا کروں ۔ اتنا بڑا مکان اور ایک اکیلی ذات۔ تنہائی میں اس کا دم الٹنے لگا۔ اس نے گھبرا کے آنگن کے دروازے کی طرف دیکھا تھا جیسے اس کی دیکھ بھال کے لئے ابھی ابھی اسی دروازے سے کوئی داخل ہوگا اور اس نے نظر اٹھائی تو چھوٹے چچا چھوٹی رفو کا ہاتھ پکڑے سامنے کھڑے تھے جنھیں دیکھ کر وہ ایک دم لرز گئی۔ اس کی نگاہیں کلائیوں کی طرف گئیں۔ سونے کے کڑے تو خیر کانچ کی دو چوڑیاں بھی اس کی بھری بھری کلائیوں میں نہیں تھیں ــــ پتہ نہیں اب کیا نحوست پھیلائیں گے۔ اسے اپنے کڑوں اور ابا کی موت میں نہ جانے کیا مماثلت نظر آئی۔ چھوٹے چچا کی نحوست کے بارے میں اس کا عقیدہ اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ وہ ان کی صورت دیکھتے ہی کانپ گئی۔ جی چاہا کہہ دے "اب کس لئے آئے ہیں چچا، گھر تو آپ کی نحوست کی بدولت گھر دا بن گیا۔ اور میں بے یار و مددگار اس بھری پُری دنیا میں صرف ــــ لیکن اس کی فطری نیکی سامنے آ گئی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کسی سے سخت لہجہ میں گفتگو بھی کبھی کی تھی۔

"کیسے آئے چچا؟ کدھر کد ھر سے؟" اپنی تمام نفرت کے باوجود اس کے لہجہ میں سختی نہیں آ سکی۔

"میں نے سوچا آسیہ منی ــــ بھیا بھابی کے بعد میری بیٹی اکیلی گھبرائے گی ــــ سو اس رفعت کو لے آیا تمہاری دوسرا تو رہے گی اور اسے بھی دنیا میں رہنے کا سلیقہ آ جائے گا۔ ورنہ یہ تو ــــ چھوٹے چچا نے پکڑا ہاتھ پکڑ کے رفعت کو اس کی طرف دھکیل دیا جو سہمی اس سے آ لگی"

"یہ کس کی لڑکی پکڑ لائے چچا؟ سونے چاندی کے کاروبار سے لڑکیاں چرانے کا بیشہ یقیناً ــــ وہ پھٹ پڑی۔

"کیا بکتی ہو؟ یہ میری بیٹی ہے جس سے جی چاہے پوچھ لو" چھوٹے چچا اس کی بات کا برا ماننے کی بجائے کھلکھلا کے ہنس پڑے۔

"یہ آپ کی بیٹی ہے!" آسیہ نے بے اختیاری سے بڑے چچا کو دیکھا۔ اور پھر موٹی موٹی آنکھوں والی گول مول رفو کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس سوکھے مارے انسان اور اس گول مٹول لڑکی میں اسے کوئی مناسبت نظر نہ آئی۔

"کیوں چچا اب پھر کوئی نیا گل کھلانے کا ارادہ ہے" اس نے لرز کے چچا کو دیکھا ــــ آج کل ویسے ہی اغوا کی داستانیں سننے میں آتی رہتی ہیں آئے دن ریڈیو سے اعلان ہوتا رہتا ہے۔ اخبارات کے کالم کے کالم اس قسم کی خبروں سے سیاہ ہوتے ہیں۔ اور چچا جس قماش کے آدمی ہیں ان سے تو کسی قسم کا کام بعید نہیں ــــ آسیہ پریشان ہو گئی

دماغ تو نہیں خراب ہوا ہے تمہارا؟ چلو ہمارے گاؤں جس سے جی چاہے پچھوا دوں ــــ یہ میری بیٹی ہے ــــ بڑا افسوس تو یہ ہے کہ تم نے کبھی گاؤں کا منہ ہی نہیں دیکھا۔ بھابی تو صرف بیاہ کے آئی تھیں اور پھر جب سے آج تک بس کبھی کبھی بھیا جاتے رہتے تھے ــــ

"ہوگا چچا، اب آپ ہی دیکھئے۔ آپ نے خود ہی کبھی نہیں بتایا کہ آپ کی شادی ــــ پھر ــــ پھر آپ کی یہ بیٹی ــــ چچا آپ سے تو ذرا ہی لگتی ہے ــــ" آسیہ نے سادگی سے کہا۔

"پاگل ہوئی ہے لڑکی۔ گاؤں میں سے جس سے جی چاہے پوچھ لینا یہ میری لڑکی ہے۔ لو بیٹی ذرا غور سے دیکھو ــــ اس کا چہرہ۔ اس کی پیشانی ہونٹوں کا خم پتلی سی ناک کے ساتھ پھیلے ہوئے نتھنے اور آنکھوں کا بھورا رنگ ــــ" چچا نے اپنی بھوری بھوری آنکھیں جھکائیں ــــ

اگر اور کوئی وقت ہوتا تو آسیہ ہنس پڑتی ۔ لیکن اس وقت وہ سچ مچ متفکر تھی چھوٹے چچا کو اس نے بے اعتباری سے دیکھا ـــــ ان کی شخصیت کے بارے میں وہ بچپن سے سنتی آئی تھی کہ اگر سچ کو چھوٹے کا سایہ بھی پڑ جائے تو وہ آسانی سے جھوٹ میں بدل جائے۔ اور آج وہ اتنا بڑا جھوٹ سچ میں تبدیل کرنے پر مصر تھے ـــــ وہ پریشان سی سوچ رہی تھی۔ اور چھوٹے چچا رفو کا ہاتھ پکڑے بڑے غور سے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور فریدہ پھوپھی جو اماں کا سن کر آئی تھیں برآمدے میں آگئیں "اچھا آپ کب آئے؛ اور اس بار صاحبزادی بھی ساتھ ہیں ـــ اب آپ کے سسر کے پاس کھانے کو کچھ نہیں رہا کیا؟"

فریدہ پھوپھی کی بات سن کے آسیہ کی جان میں جان آئی۔ تو یہ سچ مچ چھوٹے چچا کی بیٹی ہے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ فریدہ پھوپھی اس کی کیسی پھوپھی ہیں، اس کے بارے میں مرتے دم تک اماں نے کچھ نہیں بتایا۔ لیکن پھر بھی وہ اسے اپنی پھوپھی لگتی تھیں۔ چھوٹے چچا جو اس کا خون تھے ـــــ فریدہ پھوپھی جن کی رشتہ داری بس یونہی تھی لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ چھوٹے چچا جہاں سارے زمانے کے لپاٹیے مشہور تھے ـــ وہاں فریدہ پھوپھی کی گھر باہر سوائے اماں کے سب ہی عزت کرتے تھے۔ اور اماں کی محبت کے قائل تھے ان کا وقار تو ایسا تھا کہ چھوٹے چچا جیسے منہ پھٹ آدمی بھی ان کا لحاظ کرنے پر مجبور تھے ـــ ان کو دیکھتے ہی چھوٹے چچا کی نگاہیں جھک جاتیں۔ چہرے پر عجیب سی مسکینیت چھا جاتی تھی۔ یہ اس نے بچپن سے دیکھا تھا اور اس وقت بھی فریدہ پھوپھی کی آواز سن کے ان پر نسیان چھا گیا۔ انھوں نے نظریں اٹھا کے ایک بار فریدہ پھوپھی کو دیکھا اور خاموشی سے اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگے۔

"اے چھوٹے میاں جواب کیوں نہیں دیتے:" فریدہ پھوپھی نے بڑی محبت سے رفعت کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ لیکن بڑے زور سے کانپ گئیں اور ان کا ہاتھ ایک جھٹکے سے الگ ہو گیا جیسے بجلی کا شاک لگ گیا ہو۔

"جواب کیا دیں اس کی خالہ اور نانا تو آنے ہی نہیں دیتے تھے لیکن میں نے سوچا، آسیہ اکیلی رہے گی۔ اور پھر میں نے سوچا اس کے ساتھ رہ کے یہ بھی آدمی ہو جائے گی۔ ورنہ وہاں رہ کے تو کچھ دنوں بعد اس میں اور کسی جانور میں فرق کرنا بھی مشکل ہی ہوتا۔ اب اسی وقت دیکھ لو سلام نہ پیام بس آنکھیں پھاڑے ایک ایک کو دیکھ رہی ہے۔ جیسے ـــــ" چھوٹے چچا نے جھلا کے بیٹی کی طرف دیکھا اور انھیں آسیہ کا بچپن یاد آگیا۔ جب وہ اتنی سی تھی تو ہر آنے والے کو بڑے ادب سے سلام کرتی، پان پیش کرتی اور مزے مزے کی باتیں کرتی اور اب یہ ـــــ چھوٹے چچا نے رفو کی طرف دیکھا جو بڑے اطمینان سے انگوٹھا چوس رہی تھی۔

"تو دیکھو! ابھی خاصی دس گیارہ سال کی لڑکی انگوٹھا چوس رہی ہے دسی منہ پر اسے میں تمہارے باپ کے آستانے پر چھوڑ آیا۔" چھوٹے چچا نے جھلا کے فریدہ پھوپھی کی طرف ہاتھ چلایا۔

اور فریدہ پھوپھی کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے غش کھا کے گرنے والی ہوں۔ وہ کپکپا کے زمین پر بیٹھ گئیں۔ آسیہ حیرانی سے کبھی چھوٹے چچا کو دیکھتی اور کبھی فریدہ پھوپھی کو۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انجانے لوگوں میں گھر گئی ہے اور چھوٹے چچا سے دوسرے دنوں کے مقابلے میں زیادہ ہی پراسرار معلوم ہو رہے تھے۔

"فریدہ پھوپھی کے ابا تمہارے سسر ہیں چچا؟" اس نے تعجب سے چھوٹے چچا کو دیکھا

"میرے کیوں ہوتے۔ وہ تو تمہارے ـــــ"

اچانک چھوٹے چچا کی نظریں فریدہ پھوپھی پر پڑ گئیں اور وہ ایسے رک گئے جیسے یکایک کسی نے ان کی زبان میں تالا ڈال دیا۔

"کیا ہمارے؟" آسیہ نے تعجب سے انھیں دیکھا۔

"کچھ نہیں بیٹا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری چچی فریدہ پھوپھی کے گاؤں کی بیٹی تھی۔ اور اس ناطے گاؤں کا ہر بڑا بزرگ میرا سسر تھا۔ یہ گاؤں کے رشتے ناطے ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹی۔ جیسے میرا سسر تمہاری فریدہ پھوپھی کو بیٹا کہتا ہے ـــ اور ـــ بس یوں سمجھ لو گاؤں میں لوگوں کے ایسے ہی اَن ٹوٹ رشتے ناطے ہوا کرتے ہیں۔ ویسے کوئی رشتہ نہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ نام نہاد رشتے خون کے رشتوں سے بھی زیادہ اہم ہوتے ہیں، بیٹی کے لیے۔" اور چھوٹے چچا بے پناہ کوشش کے باوجود آسیہ کو کافی اطمینان نہیں سمجھا سکے۔ آخر ہکلا کے چپ ہو رہے۔

فریدہ پھوپھی آہستہ آہستہ زمین پر سے اٹھیں اور ساڑی جھاڑتی ہوئی کمر کی سے دوسرے آنگن میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد چھوٹے چچا قریب آئے "بیٹا آسیہ بیٹی اب یہ رفو تمہاری بہن ہے۔ للہ اسے سمجھ کے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا" چھوٹے چچا رقو کو آسیہ کے پاس چھوڑ کے دروازے کی طرف بڑھے۔

"آپ جا کہاں رہے ہیں چھوٹے چچا؟ اتنی سی رقو کے ساتھ اتنے بڑے ڈھنڈار گھر میں اکیلے کیسے رہوں گی؟" آسیہ کو پہلی مرتبہ اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔

"وہ تمہاری فریدہ پھوپھی تو ہیں ہی۔ اس لئے ـــ" چھوٹے چچا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سامنے سے فریدہ پھوپھی ہاتھ میں اپنا سوٹ کیس لئے برقع ڈالے چلی آ رہی تھیں۔

"کہاں چلیں پھوپھی اتنی جلدی؟" آسیہ نے تعجب سے پھوپھی کی طرف دیکھا۔ ابھی صبح تو وہ اسے دلاسا دے رہی تھیں کہ ـــ وہ اسے چھوڑ کے گاؤں نہیں جائیں گی اور اس وقت ـــ

"ہاں ـــ بیٹی تمہارے یہ چچا اور بہن آ گئے ہیں اسی لئے میں نے سوچا ـــ"

"لیکن پھوپھی، چچا تو ـــ اور یہ اتنی سی ہے ـــ" اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اکیلے ہو جانے کے تصور ہی سے اس کی روح نکلی جا رہی تھی ـــ پھوپھی کا سہارا بہت تھا۔ وہ اسے بچپن سے مانتی تھیں۔ لیکن آج اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ سہارے کتنے کمزور ہوتے ہیں ـــ

"میں رہ جاتی میری گڑیا۔ لیکن میرے پیچھے گاؤں میں گھر برباد ہو جائے گا۔ اور پھر تمہاری حویلی کا بھی بُرا حال ہوگا۔ یوں بھی اس کی دو طرف سے دیواریں گر گئی ہیں ـــ"

"اونہہ! حویلی کی فکر بیکار ہے۔ جہاں سب گیا وہیں وہ بھی جائے گی۔ البتہ آپ کا اپنا گھر ہے تو پھر شوق سے جائیے ـــ آخر ہم ہیں کون آپ کے" آسیہ نے کچھ مایوسی اور کچھ غصے سے کہا۔

"میں پھر آؤں گی گڑیا رانی۔ لیکن ابھی تو مجھے جانے ہی دو۔ مجھے اس گھر کے کونے کونے سے جیسے آواز آتی ہوئی سنائی دیتی ہے ـــ اور ـــ"

"رکشہ آ گیا بی بی جی" بیگم کی ماں نے بات کاٹ دی اور فریدہ پھوپھی دو ہفتے پہلے جس خاموشی سے گھر پر آئی تھیں، ویسے ہی آنگن کے دروازے سے باہر چلی گئیں۔ سڑک پر رکشے کی گھنٹی گونجی اور پھر ایک بے کراں سناٹا چھا گیا۔ وہ ویران آنکھوں سے پاٹوں پاٹ کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے پانی کے نلکے پر حسب دستور بالٹیوں پر بالٹیاں بج رہی تھیں۔ گھڑے ٹوٹ رہے تھے، ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔ مزدور اپنے سروں پر سبزیوں کی ٹوکریاں اٹھائے ہاٹ کی طرف جا رہے تھے۔ باہر کی دنیا میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن یہ اتنا سناٹا کیوں ـــ اس نے اپنی آنکھیں دوپٹے کے آنچل سے پونچھ لیں۔ کالج کی بس اس کے پھاٹک پر سے گزر گئی اور سامنے آمخلیق میاں کے لوہے کے پھاٹک پر رک گئی۔ اس نے دیکھا ہمیں میاں کی چھوٹی لڑکی برقع لپیٹے بس میں بیٹھ گئی ـــ

آج ایک مہینے سے وہ کالج نہیں جا رہی تھی۔ زندگی کا نیا سفر جاری رکھنے کے لئے اسے اسکول میں ملازمت کر لینی پڑی تھی ورنہ زندگی، جو خدا کی امانت تھی بجائے، رواں دواں گزرنے کے گھٹ گھٹ کے مفلوج ہو جاتی ـــ اسے کتنا شوق تھا ایم۔ اے پاس کر کے کالج میں پڑھانے کا، لیکن اب وہ وہ کبھی کالج تک

نہیں پڑھ سکے گی، اور — اور اپنی محرومی کے احساس پر اس کے آنسو بہہ نکلے۔

"ارے... ارے آسیہ بیٹی — چھوٹے چچا اپنا سوٹ کیس برآمدے میں رکھتے ہوئے ٹھٹک گئے۔

"کچھ نہیں چچا، مگر یہ آپ جا کہاں رہے ہیں۔

چھوٹے چچا کے ہاتھ میں میلا چکٹ بستر دیکھ کر جو رسیوں سے بندھا ہوا تھا، اس نے تعجب سے انہیں دیکھا — "بھلا میں اکیلے کیسے رہوں گی —" اس کے لہجے میں سارے زمانے کا دکھ تھا۔

"میں کہیں جا تھوڑے ہی رہا ہوں — باہر سامان پڑا تھا اسے قرینے سے رکھ دوں —" چھوٹے چچا بستر کو چوکی پر رکھ کے بیٹھ گئے۔

اب ہمیں چھوڑ کے آپ کہیں نہیں جائیں گے نا — اس نے پرامید نظروں سے چھوٹے چچا کو دیکھا۔ زینت پھوپھی کے رویے سے اسے بڑی سخت مایوسی ہوئی تھی۔ خواہ مخواہ اپنی محبت کا ڈھونگ رچاتی تھیں مجھ پہ —"

"اونہہ میں کیوں جانے لگا اپنی رانی بیٹی کو چھوڑ کے — ارے میں تو کبھی بھی یہاں سے نہ جاتا۔ بس یوں سمجھو آسیہ بیٹی، سر پر شیطان کا سایہ پڑ گیا تھا۔ اگر وہ گھبیا کمبخت میرے پیچھے نہ پڑتی تو بھلا میں بھیا کے قدموں کو چھوڑ کر کہاں جاتا۔ وہ تو —" چھوٹے چچا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے — "قسمت میں آخری دیدار نہیں لکھا تھا ورنہ وہ کمبخت دھوکے باز —" اور آسیہ پر چھوٹے چچا کی پہلودار شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہو گیا۔

تو بھلا یہ کیسے آدمی ہیں کہ دوسرے کی بہو بیٹیوں کو — اور پھر وہ گھبیا کمبخت کتنی پارسا بنتی تھی۔ اور پرسے باپ کے عمر کے چھوٹے چچا — اونہہ کتنی معصوم بنتی تھی اور کرتوت ایسے۔ کیسے کیسے اس کا شوہر ڈھونڈتا پھرتا تھا — اور یہ چچا — گاؤں سے کتنے آدمی ڈھونڈنے آئے تھے اسے — وہ اس پراسرار طریقے سے غائب ہوئی تھی کہ سب ہی حیرت زدہ تھے — لیکن کسی نے چچا کا ذکر بھی نہیں کیا۔ گھر میں کسی نے ان کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس کے کڑھے لے کر بھاگے تھے۔ مگر کسی کے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ وہ ایک کڑھا پہننے والی بھی اپنے ساتھ لئے جا رہے ہیں۔

"کس گنوارن کی نذر کر دیا چچا۔ پورے چار تو تھے میرے کڑھے" اس نے چچا کی طرف دیکھا جو سر جھکائے چوکی کے کونے پر بیٹھے تھے۔ اور سارے جہان کی مسکینیت ان کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

"کیسے سیدھے سادے بیٹھے ہیں بے چارے جیسے کچھ جانتے ہی نہیں ہے کے میرا کڑھا —" اسے چچا کے وجود سے پھر سے نفرت ہونے لگی۔

"تم اپنے کڑوں کے لئے تو بہت روئی ہو گی آسیہ — میں بے تو جاتا تمہارا کڑا پر اس کے واکوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ گھبیا کمبخت —"

"کیوں نہیں چچا وہ کڑھے تو سچ مچ گھبیا کے ہاتھوں کی زینت ہی بن سکتے تھے۔ ورنہ میرے ہاتھوں میں خود —" اس کی آواز رندھ گئی۔

"اُف وہ! ارے آسیہ منی میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا میں کہہ رہا تھا کہ اگر وہ کمبخت میرے پیچھے نہ پڑی ہوتی تو میں کبھی تمہاری چیز کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھتا۔ آخر اسے لے جانے کے لئے پیسوں کی ضرورت بھی تو تھی — میں نے تو اسے گاؤں میں ہی گھر رکھ دیا تھا بھلا اس کا منہ تھا کہ —"

چھوٹے چچا بغیر سوچے سمجھے اپنی صفائی میں نہ کہنے والی باتیں بھی کہتے چلے جا رہے تھے۔

"لیکن چچا، رفو کے ہوتے آپ کو ایسی ویسی حرکت نہیں کرنی چاہئے تھی — مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ آپ کی شادی ہو گئی ہے اور یہاں آپ کی اتنی بڑی لڑکی بھی ہے۔

"شادی کس منحوس نے کی ہے بیٹی —

"ہائیں کیا کہہ رہے ہیں آپ! بغیر شادی کے ہی یہ آپ کی بیٹی ہے" منی نے کراہیت سے ناک سکوڑی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ شادی نہیں ہوتی۔ بس یوں سمجھو۔ دنیا کے کہنے سننے سے شادی بھی ہو گئی بیٹی بھی ہو گئی۔ اور — لیکن میں اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتا — شادی تو مٹی میٹی دو دلوں کے ملاپ کا دوسرا نام ہے لیکن میرا دل کبھی رفو کی ماں سے ملا ہی نہیں اور ملتا بھی کیسے — یہ جو تمہاری فریدہ پھوپھی ہے نا، یہ ایک ہی نٹ کھٹ ہے اب اس وقت دیکھئے اس کے لچھن — اس سے کوئی دل بھی لگا سکتا ہے بھلا وہ تو تمہارے —"

"کیسی باتیں کرتے ہیں۔ فریدہ پھوپھی کا آپ کی شادی — یا۔ رفو سے کیا تعلق —"

"اب وہ بات یہ ہے آسیہ، میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا ہے نا کہ رفو کی ماں فریدہ کے گاؤں کی تھی۔ دراصل یہ فریدہ بڑی وہ ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو اس کے دو روپ ہیں — میری زندگی تباہ کر دینے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے —"

"کیا کہہ رہے ہیں چچا؟ آپ پہلے آدمی ہیں جو پھوپھی کے بارے میں ایسی باتیں کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے تو اپنی ساری عمر برباد کر دی — ایک دن کہہ رہی تھیں کہ ان کا شوہر ان سے الگ ہو گیا اور، کلوتی بیٹی کو بھی لے گیا — سچ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے —"

"اچھا!"

"ہاں اور کیا۔ سچ سچ مجھے ان کے میاں پر غصہ آتا ہے۔ موا مونڈی کاٹا — پھوپھی تو اتنی اچھی ہیں بے چاری، آج تک اس کے گھر میں بیٹھی ہیں۔ دکھڑے کئے۔ سلامیاں کیں، لیکن کبھی اپنے باپ کے یہاں تک نہیں گئیں۔ میں نے ان کے میاں کو برا بھلا کہا تو کہنے لگیں کہ ان کا شوہر فرشتہ تھا وہی اس کے قابل نہیں تھیں۔ —"

"سچ وہ ایسا کہتی ہے!" چھوٹے چچا اچھل کے چوکی پرے آنگن میں آگئے

"اور کیا — آپ کو تعجب کیوں ہو رہا ہے؟ جس سے جی چاہے پوچھ لیجئے —"

"اچھا! تعجب ہے فریدہ اور اتنی رواداری! مجھے سچ مچ بڑی حیرت ہو رہی ہے تم سے یہ باتیں سن کر۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ فریدہ ایک نمبر کی فرادٹے ہے سمجھیں منی! اس سے بچ کے رہنا اور اگر یقین نہیں آتا تو گاؤں جو وہاں ہر شخص میری اس بات کی تائید کرے گا۔ میں نے یونہی تو —"

"مگر کمال کرتے ہیں چچا۔ آپ کو پھوپھی کے بارے میں ایسے الفاظ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ وہ تو اتنی اچھی ہیں کہ میں تو خیر محلے کا بچہ بچہ ان کا نام احترام سے لیتا ہے اور آپ —" آسیہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"دیکھو آسیہ منی! تمہاری فریدہ پھوپھی کو جتنا میں سمجھتا ہوں اتنا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا — تم ابھی چھوٹی ہو اور لوگوں کو پہچاننے کے لئے ایک عمر چاہئے —"
چھوٹے چچا نے چڑ کر کہا اور سامان درست کرنے لگے۔

"چھوٹے چچا ہم اس چھٹی میں گاؤں کیوں نہ چلیں؟ — اسکول میں جب موسم خزاں کی چھٹی ہوئی تو اس کا دل اپنا گاؤں دیکھنے کے لئے مچل اٹھا آج تک وہ وہاں نہیں گئی تھی۔ اماں کو گاؤں کے نام سے نفرت تھی اور ابا کبھی اسے اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ اب کے جب چھٹی ہوئی تو وہ خود مختار تھی۔ نہ ابا تھے اور نہ ہی اماں کی جلتی ہوئی آنکھیں انھیں گھورنے کے لئے زندہ ہیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے گاؤں جانے کی۔ اس ویرانے میں اب کیا رکھا ہے۔ جب اچھے دنوں میں نہیں تو اب جانے کا فائدہ؟ خواہ مخواہ —" چھوٹے چچا نے بات کاٹ دی۔

"نہیں چچا، بس ایک بار چلی جاؤں۔ آخر میں بھی تو دیکھوں کہ ابا کا گاؤں کیسا ہے جہاں وہ کے ابا کی روح جوان ہو جایا کرتی تھی اور —"

"پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پہنچا کے چلا آؤں گا۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس اجڑی نگری سے۔ پھر ان رفو اکیلی رہے گی —" چھوٹے چچا اس کے اصرار سے

عاجز ہو کے بولے :

"زوبی چلے گی ہمارے ساتھ۔ میں بس دو دن وہاں رہوں گا۔ پھر ہم ساتھ ہی واپس آجائیں گے۔"

"بہت اچھا ـــ"

اسے گاؤں میں آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ حویلی جس کا ذکر وہ بچپن سے سنتی آئی تھی اور جس کا ہیولیٰ اس کے ذہن میں اونچے پرانے محل سے کم نہیں تھا، کچھ بھی نہیں، مٹی کا بہت بڑا مکان تھا جس کی کچی دیواریں دو طرف سے ڈھے گئی تھیں اور دن دہاڑے لونڈے آنگن میں لگے ہوئے امرود، شریفے اور شفتالو کے لئے چلے پڑتے تھے۔ تنگ آکے زبیدہ پھوپھی نے تاڑ کے بڑے بڑے بلکوں سے ٹوٹی ہوئی دیواریں گھروا دی تھیں۔ دوپہر کی خاموشی میں سنسناتی ہوئی ہوا جب پتوں کی دیواروں سے ٹکراتی تو یہ پتے جھن جھن کے بج اٹھتے اور سناٹے میں ایسے ایسا محسوس ہوتا جیسے بھوتوں کی بارات آرہی ہے اور یہ پتے تالیاں بجا بجا کے اس کا استقبال کر رہے ہیں۔

دو دن میں اسے کچھ نہیں تو سو مرتبہ اپنا شہر اور گھر یاد آیا ـــ زبیدہ پھوپھی ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی تھیں۔ گاؤں کی دور و نزدیک کی رشتہ دار عورتیں اس سے ملنے آئیں لیکن زبیدہ پھوپھی نے اسے پہلے ہی ڈرا دیا تھا کہ ان سے گھل مل کے باتیں کرنا گویا اپنا اسکینڈل بنانا ہے۔ چنانچہ اس کی ہوں ہاں سے عاجز ہو کے عورتوں کی بھیڑ خود بخود چھٹ گئی اور گاؤں والیوں نے متفقہ طور پر اسے بد دماغ کا خطاب دے دیا۔

ویسے بھی اسے اپنی یہ پھوپھی اور چچیاں ذرا بھی اچھی نہیں لگی تھیں۔ پہلے ہی دن اسے ابو اور چھوٹے چچا کو دیکھ کے انھوں نے اتنی کھسر پھسر کی اور اتنا ہنسیں کہ ان کی بدتمیزی اور گنوار پنے کو سکتے اس کے دل پر جم کے رہ گیا تھا۔ اور وہ اکتائی اکتائی سی دو دن گزرنے کا انتظار کر رہی تھی ـــ "اللہ، یہ ابا کی سسرال کا گہوارہ ہے جس کی تعریف کرتے ابا کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ پتہ نہیں ان کو کیا مزا آتا تھا اس اجڑی دنیا میں ـــ اس نے چٹیل میدان کھیتوں کی طرف دیکھا جہاں بارش نہ ہونے کی وجہ سے خاک اڑ رہی تھی۔ اور گاؤں کے کاشتکاروں کی نگاہیں بادل کی تلاش میں آسمان تک تک کے رہ گئی تھیں۔

"کب چلیے گا چچا؟" اس نے اکتا کے چھوٹے چچا سے پوچھا "میرا تو اس اجڑی دنیا میں ایک لمحے کو بھی جی نہیں لگا۔ اور یہ حویلی ـــ یہ تو مجھے بھوتوں کا مسکن نظر آتی ہے ـــ" اس نے اونچے شہتیروں والے کھپریلی کمروں کی طرف دیکھا جن میں جا بجا ایسی مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا صفائی وغیرہ کرا دے لیکن ایک ہی کمرہ جھاڑتے جھاڑتے اس نے اتنی خاک پھانکی کہ اس کے گلے میں خراش پڑ گئی۔

خواہ مخواہ کی باتیں کرتی تھیں پھوپھی۔ حویلی کی دیکھ بھال پتہ نہیں کیا کرتی ہیں۔ یہ موٹی موٹی شہتیریں دیمک کی نذر ہو رہی تھیں اور باہر کے بیٹھکے میں جو کچی بچھی ہوئی قالین پر تو جیسے دیمکوں نے ایک جال بن کے رکھ دیا تھا۔

"پھوپھی آپ نے اس قالین کو دھوپ ہی دکھا دی ہوتی ـــ" آسیہ کو بار بار افسوس ہو رہا تھا۔ "اتنی قیمتی قالین اب کہاں سے آئے گی۔ خواہ مخواہ ابا نے یہاں چھوڑ رکھی تھی۔ کون یہاں رہنے آرہا ہے۔"

"یہ تمہاری اماں کی جہیز کی قالین ہے بیٹی اور جس دن وہ بیاہ کے آئی تھیں تب سے یہ آج تک یہ ایسی ہی بچھی ہے ـــ انھوں نے مجھے قسم دے دی تھی کہ ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں، سو میں ان کی قسم سے مجبور تھی" زبیدہ پھوپھی نے چور دل کی طرح اسے دیکھا۔

"اف وہ تو اتنی نفرت کرتی تھیں اماں ان سے ـــ" اس نے ایک نظر زبیدہ پھوپھی کے معصوم چہرے پر ڈالی۔ سفید آنچل میں گھرا ہوا چہرہ فرشتوں کی طرح معصوم تھا ـــ کیا ایسی صورت سے نفرت بھی کی جا سکتی ہے! اس نے تعجب سے چھوٹے چچا کو دیکھا جو اس دو دن سے، اندر نہ جانے کتنی باتیں زبیدہ پھوپھی کے خلاف کر چکے تھے اور اب واپس جانے کے لئے سامان ٹھیک کر رہے تھے ـــ اور وقوجلدی جلدی کچے پکے امرود، اور شریفے بڑی سی ڈلیا میں بھر رہی تھی اس نے ایک نظر دونوں باپ بیٹی پر ڈالی۔ اور خاموشی سے چھوٹے آنگن میں چلی گئی جہاں زبیدہ پھوپھی رہتی تھی اور اس وقت بہت زور شور

ست پڑوس میں رہنے والی سکینہ بوا سے بحث کر رہی تھیں ــــ سکینہ بوا اسے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ ورنہ وہ نہ جانے کس بات پر پھوپھی کی اوقات پر تھوک رہی تھیں۔ اور پھوپھی کا چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا ــــ

"ہم لوگ آج جا رہے ہیں پھوپھی ــــ سواری کے لئے کہلا دیجئے گا ــــ"

ہوں، اچھا۔ گر آج رک جاتیں تو بہتر تھا ــــ میں نے تمہارے ــــ فریدہ پھوپھی کچھ کہتے کہتے رک گئیں اور سکینہ بوا کی طرف دیکھنے لگیں ــ جو منہ ٹیڑھا کئے چولہے میں آگ کریدے جا رہی تھیں۔

آسیہ نے ایک نظر سکینہ بوا کو دیکھا اور خاموشی سے چولہے میں ناچتے ہوئے شعلے کو تکتی رہی۔

" ابا بلا رہے ہیں ــــ باجی ــــ۔ رفو نے پیچھے سے اس کا آنچل کھینچا ــــ

"اچھا ــــ" وہ کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہے چھوٹے چچا؟"

چلنا نہیں ہے کیا ــــ" چھوٹے چچا نے چڑ کر کہا اور پھر سامان باندھنے بیٹھنے لگے ــــ

"چھوٹے چچا، آج ہم لوگ نہیں جا رہے ہیں۔ کل چلیں گے۔ آج فریدہ پھوپھی نے ہمیں روک لیا ہے۔ شاید کوئی نیاز وغیرہ ہے۔ کہنے لگیں مت جاؤ ــــ" وہ کچھ ایسی محبت سے بولیں کہ میں ناں نہیں کہہ سکی ــــ" آسیہ نے آہستہ سے کہا اور چھوٹے چچا بپھر گئے۔

کمال کرتی ہو۔ کل اسکول کھل جائے گا۔ نوکری کا معاملہ ہے کچھ جو ہو گیا تو روٹی کے لالے پڑ جائیں گے۔ پھر فریدہ پھوپھی تمہارے کیا کام آئے گی ــــ"

"اور ــــ"

"کیا اور؟ میری طبیعت خود یہاں الجھتی ہے۔ سیدھی طرح چلی چلو ــــ میں دیکھ رہا ہوں اس فریدہ کی محبت تمہیں کسی کام کا نہیں رکھے گی ــــ"

چھوٹے چچا کو فریدہ پھوپھی سے اللہ واسطے کا بیر تھا

"نہیں کھلے گا سامان میں نے گاڑی کے لئے نتھو کو کہہ دیا ہے ــــ بس کوئی دم میں سواری آ جائے گی۔" چچا اڑیل ٹٹو کی طرح اپنے فیصلہ پر اڑ گئے۔

خوب تھی وہ سواری بھی ــــ وہ سوچتے سوچتے زیر لب مسکرا پڑی۔ بیل گاڑی پہ جھونپڑا ڈال دیا، اور ایک پلنگ ڈال کے گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے ہیں۔ اور بیل کے گلے کی گھنٹی جیسے جرس کارواں تھی کہ بجتی چلی جا رہی تھی اور اس نے اپنے آپ کو کسی شہزادی سے کم کیا محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ سونگی گاڑی ایک تخت رواں تھی اور راستے بھر چھوٹے چچا کس محبت سے طرح طرح کے قصے سناتے رہے تھے۔ ورنہ گاؤں سے اسٹیشن تک کا وہ میں کا سنسان راستہ طے کرنا قیامت سے کم کب تھا۔ اور آج۔

آج انہی چھوٹے چچا کی بیٹی پر پابندی لگا رہی تھی۔ باپ بیٹی دونوں ہی سخت "ٹیکل" قسم کے تھے۔ جب کہ اس کی ایک کلیگ نرگس کہتی تھی۔ ان دونوں نے مل کے زندگی اجیرن کر دی تھی۔ چھوٹے چچا تو پھر بھی من موجی آدمی تھے۔ غائب ہوتے تو ہفتوں کی خبر لیتے لیکن رفو چچا کا وہ عطیہ تھی جس کے کرم کی بارش سے وہ ہمیشہ مستفیض ہوتی رہتی تھی ــــ تیسرے دن ایک نہ ایک آفت بھی رہتی تھی ــــ اور ابھی جس فراخ دلی سے اس نے چائے دانی توڑی تھی۔ اس سے اس کے دل و دماغ دونوں کھٹے ہو کے رہ گئے تھے ــــ جی چاہ رہا تھا کہ اپنا سر جلتے ہوئے چولہے میں گھسیڑ دے یا پھر رفو کا اور نہیں تو دونوں ہی کا ــــ لیکن وہ کچھ نہیں کر سکی۔ وہ تو وہ سخت بات بھی رفو کو نہیں کہہ سکی۔ ایسا نہ ہو کہ رفو محسوس کرے کہ آسیہ باجی کا بہنا اور اس کی حیثیت، ان بابرے جہان کی سی ہے یا اس غریب رشتہ دار کی سی جس کا کوئی دوسرا آسرا نہیں۔ کبھی کبھی ،ت چھوٹے چچا پر بے پناہ غصہ آنے لگتا۔ اچھے تھے کہیں سے بے چارے کے میرے سر پر ایک عذاب ڈال دیا اور صاحبزادی کا یہ عالم ہے جیسے یہاں رہ کر مجھ پر احسان کر رہی ہیں جب دیکھو تنتنا رہی ہیں ــــ مرلے بادشاہ کی بیٹی چاندی پر چپت لگا رہی ہیں۔ کبھی اس کے کان کو جوتی کی طرح گھما رہی ہیں ۔ اور نہیں تو اس کے

اسکول جانے پر اعتراض کیا جا رہا ہے۔ آخر کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے جو اس غریب لڑکی پر اتنی نوازش ہے — آخر اس نے آپ کا کیا بگاڑا ہے لیکن — آسیہ نے کبھی رفو سے اُلجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کیونکہ اس کے مزاج کی اُفتاد سے وہ بہت خائف رہنے لگی تھی۔ جہاں کچھ سمجھانے کی کوشش کی اور یہ تنتنا کے کھڑی ہو جاتی۔

"اب کے ابا کے ساتھ نانا میاں کے یہاں ہی جاؤں گی۔ واہ ہم بھی کسی کے باندی غلام ہیں کیا جب جی چاہے گا چلے جائیں گے۔ ابا آئیں تو میں صاف کہہ دوں گی۔ آپ نے تو مجھے ان کی تنہائی کا ساتھی سمجھ کے یہاں چھوڑا تھا۔"

"یا اللہ یہ کس گناہ کی سزا ہے" آسیہ نے ٹھنڈی سانس بھر کے رفعت کی طرف دیکھا جو کراہ کراہ کر دھڑ دھڑاتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل رہی تھی —

کیا پاکیزہ صورت ہے۔ لگتا ہی نہیں یہ چھوٹے چچا کا پروڈکشن ہے۔ یہ تو بس میری بہن لگتی ہے — آسیہ نے غور سے رفو کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ بھرا ہوا چہرہ اور بھرے ہوئے موٹے موٹے ہونٹ۔ اوپر سے کھڑی اور نیچے سے کچھ چوڑی ناک۔ بہت ہی دیکھا بھالا چہرہ اور بہت ہی مانوس۔ کس کے ایسی ہے یہ — آسیہ نے سوچتے سوچتے نظریں اُٹھائیں۔ سامنے چھوٹے چچا اپنا میلا چکٹ بستر کاندھے پر لادے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ بڑا اچھا ہوا، آ گئے۔ بس آج کہہ دوں گی انھیں۔ لے جائیے اپنی لاڈلی کو — مجھ سے صاحبزادی کی نازبرداری نہیں ہو سکتی۔ میرے ناتواں وجود میں شہزادی صاحبہ کے نازنخرے برداشت کرنے کی سکت اب نہیں رہی۔ مارے غصے کے اس کا خون کھول گیا۔

آنگن میں رفو چھوٹے چچا سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی — اونہہ اسی کا نام ہے مکاری۔ خواہ مخواہ مظلومیت طاری کرنے کی کوشش۔ اس وقت آسیہ کو اپنا وجود سب سے زیادہ قابلِ رحم محسوس ہوا۔ کیا مصیبت گلے پڑی ہے میرے مالک۔ وہ دل ہی دل میں دہائی دیتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف جانے کو مڑی —

یہ رفو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ باپ ایسے ہیں کہ میرے تیرے دروازے گھوم گھوم کے وقت کاٹتے پھرتے ہیں۔ دو وقت کی روٹی اپنے قوتِ بازو سے حاصل کرنے کی توفیق نہیں ہوئی — اور بیٹی صاحبہ کے طنطنے کا یہ عالم — معاذ اللہ! انھوں نے رفو کی طرف دیکھا جو اب تک چھوٹے چچا سے لپٹی روئے چلی جا رہی تھی۔

اس نے ایک نظر اپنے ماضی اور حال پر ڈالی۔ بچپن میں کبھی ضد کی ہو تو کی ہو۔ بڑی ہونے کے بعد اس نے کبھی مزاج کی گرمی شاید ہی کبھی دکھائی۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ ابا کی موت ہونے کے بعد اس نے کسی سے اونچی آواز سے بات بھی کی ہو۔ وہ تو ایسی بُردبار ہو گئی تھی کہ اس کی جوانی بھی اس بُردباری اور سنجیدگی کی نذر ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اماں جب ابا کے بعد بے قرار ہو کے روتی تھیں تو سینکڑوں نشتر اسے اپنے دل میں ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے لیکن وہ عالی ہمتی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے آنسو پی کر اماں سے لپٹ جاتی۔ "دیکھیے اماں! ابا مر گئے ہیں۔ میں تو ابھی ابھی زندہ ہوں۔ کیا ہوا جو ابا نہیں ہیں اور میرا کوئی بھائی نہیں ہے — میں بیک وقت آپ کا سہاگ اور بیٹا دونوں بن جاؤں گی۔ بیٹا بن کے کما کے کھلاؤں گی، اور بیٹی بن کے خدمت کروں گی۔ اماں، میری اماں — " وہ اپنے لب و لہجے سے تمام غم جھٹک دیتی۔ لیکن چہرے کو کیا کرتی جس پر یتیمی اور دکھ کی چھاپ اتنی گہری تھی۔ اماں سے آنسو اس کی باتیں سُن کے تھمنے کی بجائے اُبل اُبل کے بہنے لگتے تھے۔ اور وہ جو بڑے عزم کے ساتھ مردانہ وار دکھوں کا مقابلہ کرنے پر تلی ہوتی، اسی دکھ کے دھارے میں بہہ جاتی۔ اور پھر جب اماں نے ابا کی رفاقت میں عمر کا ساتھ چھوڑ دیا تو دنیا اندھیر ہو گئی — اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کے اس نے اپنے راستے کا تعین کیا اور پھر نا موشی سے اس راستے پر چل نکلی جو اس کے گھر سے ہوتا ہوا ضلع ہائی اسکول کی سفید عمارت کو جاتا تھا —

زندگی خود بخود ایک ڈھرے پر آ گئی — اور رفتہ رفتہ وہ اپنے شب و روز کی عادی ہوتی چلی گئی — اور اب جبکہ وہ ایک ذمہ دار انسان تھی

اور اپنی استطاعت بھر آرام بھی بہتر تھا، تب بھی اسے غصہ ایک دم نہیں آتا تھا ـــــ اس کا غصہ تو جیسے اس کے جذبات کی آگ کی طرح ہمیشہ کے لئے برف کے تودے تلے دب چکا تھا۔ وہ ہر ایک کی بات سن لیتی تھی مگر کبھی کسی کو اُلٹ کے جواب نہیں دیتی تھی اور نہ ہی کسی پہ خفا ہوتی تھی۔

یہ کس چیز پر پھولتی ہیں بیگم صاحب۔ آخر انھیں کس بات پر اتنا ناز ہے۔ آسیہ نے سوچتے سوچتے کتاب اُٹھا لی۔

ٹھیک ہے کل میں انھیں رخصت ہی کردوں گی۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری اس نے کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے سوچا میں نے تو کبھی ناز نخرے نہیں کئے لیکن میرا کون بیٹھا ہے ناز برداری کے لئے۔ جبکہ رقو کے پانچ ماموں کے ماں اور ننھیال کا بھرا پُرا کنبہ موجود ہے۔ اور یہاں بس اللہ کا نام ہے۔ اماں تو اکلوتی تھیں۔ قدرت کی بھی کیا ستم ظریفی ہے۔ اب جبکہ رقو کو کسی کی ضرورت نہیں تو اس کے سب موجود ہیں اور یہاں اپنا نام کا کوئی رشتہ دار نہیں ـــــ چلو اچھا ہے رقو بی بھی چلی ہی جائیں۔ آخر انھیں کیا ضرورت ہے میرے ساتھ لاوارثیت کی زندگی بسر کرنے کی ـــــ ان کا تو سب سے بڑا ستون خدا رکھے چھوٹے چچا کی موجود ہے ـــــ وہ بڑے اطمینان سے پلنگ پر لیٹ گئی اور کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے ـــــ لا حاصل باتوں میں اُلجھ کے کیوں اپنے ذہن کا کونا کرے۔ اس نے دل جمعی سے کتاب کھول لی اور مزے سے پڑھنے لگی۔

کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ وہ کھو سی گئی۔ کب اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ کس وقت چھوٹے چچا اس کے کمرے میں آ کے بیٹھے اسے پتہ نہیں چلا۔ الفاظ آپس میں گڈمڈ ہونے لگے تھے کہ ـــــ ایک دم برقی روشنی چمک اُٹھی اور ساتھ ہی چھوٹے چچا کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی "اسی لئے آنکھوں پر یہ موٹا چشمہ چڑھ گیا ہے۔ ایسی بھی کیا لاپرواہی۔ اندھی ہو جاؤ گی تو کون پوچھے گا تمہیں ـــــ" زندگی میں پہلی بار چچا کی آواز میں دبدبہ تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو چچا کا انداز بڑا ہی مسکین ہوتا تھا اور اسے چچا کے نیاز مندانہ لہجے سے اُلجھن ہونے لگتی تھی۔

"آپ کب آئے چچا؟" چچا کی باتوں نے اس پر خوشگوار اثر ڈالا اور ان کے اپنے پن نے اس کی شگفتگی واپس لادی۔

"ارے واہ ری لڑکی میں کب آیا؟ گھر میں آتے تم نے نہیں دیکھا تھا؟ تمہارے سامنے ہی تو آیا ہوں۔ وہ جب تم اسارے میں کھڑی تھیں ـــــ"

"میرا مطلب یہ نہیں، میں نے یہ پوچھا تھا چچا کہ آپ میرے کمرے میں کس وقت آئے"

"یہی کوئی آدھے گھنٹے سے بیٹھا ہوں۔"

"پھر مجھے پکار لیتے مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا ـــــ کوئی ضروری کام ہے کیا؟"

"ہاں میں نے سوچا تم سے دو باتیں کر ہی لوں ـــــ" چچا کے لہجے میں بڑی بہادری تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"ہوا کچھ نہیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں نے اپنی بیٹی اس لئے چھوڑی تھی تمہارے پاس کہ آدمی بن جائے گی، اور تم تنہا بھی نہیں رہو گی مگر تم نے اسے انسان بنانے کی بجائے چولہے کی باندی بنا دیا۔ کیوں؟"

"یہ سراسر الزام ہے چچا۔ میں نے رقو کو اپنی بہن سے کم نہیں سمجھا۔"

"بس اب رہنے دو یہ باتیں۔ بہن کی طرح رکھتی تھیں۔ رسے آج تک اس کے لئے کالا حرف بھینس برابر ہے اور تم خود ٹھاٹھ سے امتحان پر امتحان پاس کئے جا رہی ہو۔"

"یہ تو اپنا اپنا شوق ہے۔ رقو کو پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور میں نے ہمیشہ ایم اے پاس کرنے کا خواب دیکھا۔ پھر ـــــ"

"کیوں نہ ہو۔ کیوں نہ ہو، ماشاء اللہ پڑھے لکھے باپ کی بیٹی ہو کیوں نہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب دیکھتیں ـــــ"

"دیکھئے چچا۔ آپ تو طعنے دینے بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی محنت اور اپنے زور بازو سے کیا ہے ـــــ ملازمت کی، خود پڑھا اپنے ساتھ آپ کی صاحبزادی کے دوزخ بھرنے کا سامان کیا۔ ان کے فیشن کی چیزیں پوری کیں اور ـــــ"

"کس نے کہہ دیا تھا تمہیں اسے اپنے ساتھ لئے لئے پھرنے کو۔ نہ تم اسے باہر لے کر گھومتیں اور نہ اسے یہ لت لگتی۔"

"حد ہو گئی چچا۔ جیسے میں تو باہر نہیں جاتی۔ پھر مجھ پر کیوں نہیں فیشن کا بخار چڑھا۔ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔"

"خیر میں نے بہت ڈھیل دی تھی۔ باور چی نہیں۔ تم نے اس سے کام کرا کرا کے دیوالیہ کر دیا ہے اس کا ——— سے کوئی بھی نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی برابری میں آئے وہ تو کوئی اور لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کے لئے دنیا تیاگ دیتے ہیں اور پھر بھی ———"

"بہت ہوا چھوٹے چچا۔ بند کیجئے اپنی بکواس۔ میں جوگن نہیں ہوں کہ دنیا تیاگ دیتی۔"

"نہیں جی، وہ تو میں تھا جس نے تم لوگوں کی بہتری کے لئے اپنا آپ برباد کر لیا ———"

"بڑی نوازش آپ کی۔ اب مزید احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ لے جا سکتے ہیں اپنی صاحبزادی کو۔ ——— آمنہ نے تلخی سے کہا۔

"کیوں مجھے کیا پڑی ہے جو دوسروں کا پاپ ڈھوتا پھروں ——— تم ہی بھگتو ———" چھوٹے چچا نے حقارت سے کہا۔

"خوب اب یہ اپنی لڑکی کسی اور کے سر تھوپنے پھرتے ہیں۔ آسیہ کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ اس نے تعجب سے چھوٹے چچا کی طرف دیکھا جو اپنی جیتی جاگتی جوان بیٹی کو دوسرے کا پاپ کہہ رہے تھے۔ اور تو پہلے دن جو میں نے سمجھا تھا صحیح تھا۔ چچا ضرور کہیں سے اغوا کر لائے ہیں اور اب ——— اب کیا ہو گا۔ وہ آنے والے خطرے کی آہٹ محسوس کر رہی تھی ———

آپ بھی تماشہ ہیں چچا جب آپ رفو کو یہاں لاتے تھے تو اپنی صورت ملا ملا کے اسے اپنی بیٹی ثابت کر رہے تھے اور جب میں نے آپ کی بیٹی سمجھ کے اسے اپنا لیا تو آپ مجھے نیا دھوکا دے رہے ہیں ———

"دھوکے کی کیا بات ہے ———"

"آپ اسے اغوا کر کے نہیں لائے تھے؟"

"پاگل ہو گئی ہو! میں بردہ فروش ہوں کیا!" چھوٹے چچا غصے سے چیخ اٹھے۔

"پھر؟"

"پھر کیا۔ یہ ہے تو میری بیٹی پر اپنی نہیں ———" چھوٹے چچا سنبھل سنبھل کے سوچتے ہوئے بول رہے تھے۔

"آپ کی اپنی بیٹی نہیں! کیا ———" حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔

"نہیں۔ میں نے تو شادی ہی صرف اس کے لئے کی تھی۔"

"کیا مطلب؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں چچا ——— اس نے الجھ کے پوچھا۔ چچا کی باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔

"میں جیتی ——— مجھے ——— دنیا کو جہیز میں دولت ملتی ہے اور مجھے یہ لڑکی ملی تھی ———" چچا نے مظلومیت سے کہا۔

"اچھا آپ کی شادی بیوہ سے ہوئی تھی ———"

"نہیں تو ———"

"میں سمجھ گئی آپ کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا۔ ہے نا؟"

"ارے کوئی میرے ساتھ کیا دھوکا کرتا۔ میں نے تو جان بوجھ کے مکھی نگلی تھی۔ صرف ایک ایسے شخص کی خاطر جسے میں خدا کے بعد خدا سمجھتا تھا ———"

"ایں آپ کو اس نے اس گڑھے میں پھینکا تھا؟" اس کے لئے آج ہر بات نئی تھی۔ سے پتہ تھا کہ چھوٹے چچا ابا ہی کو خدا کے بعد خدا کہتے تھے۔

"بات یہ ہے بیٹی کہ کبھی کبھی خدا بھی لغزش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور تمہارے ابا تو انسان تھے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ———" چچا کی باتیں سن سن کے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

بات یہ ہے بیٹی کہ ۔۔۔ اور ۔۔۔ بس یوں سمجھ کر بیچ انھوں نے ڈالا اور بدلہ میں نے پایا ''

ایں ۔۔ یہ چھوٹے چچا کیا بک رہے ہیں۔ اس کے حواس گم ہوتے جا رہے تھے ۔۔۔ سراسر میرے فرشتہ صفت ابا پر اتہام۔ کمال ہے۔ اچھا بدلہ دیا انھوں نے ان کی نیکی اور بہتر سلوک کا۔ بہت ہوئی رشتہ داری ۔ میں باز آئی ان کی سرپرستی سے۔ واہ کمال ہے جس تھالی میں کھائیے اسی میں چھید کیجئے۔ یہ اچھے آدمی ہیں کہ جس درخت کے سائے میں پروان چڑھے آج اسی کی بیخ کنی کرنے پر تیار ہیں ۔۔۔

اسے چھوٹے چچا کے وجود سے نفرت ہوگئی جو سر جھکائے بڑی مسکینیت سے بیٹھے تھے۔ جیسے انھوں نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

بہت ہوا چچا آج تو آپ نے صفائی میں میرے باپ پر اتہام لگا دیا ہے۔ کل کہیں میرا ہی گناہ ثابت کرنے کی ضرورت نہ پڑ جائے آپ کو۔ وہ غصہ سے دل ہی دل میں کھول رہی تھی۔

''اتہام؟ اتہام کی کیا بات ہوئی اس میں ۔۔۔'' چھوٹے چچا نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

''بس بس۔ اب آپ مجھ اپنی والی صاحبزادی کے یہاں سے بستر گول کیجئے۔ میں آپ لوگوں کی ہمدردی کے بغیر بھی عزت سے زندہ رہوں گی '' وہ ایک دم سے آگ ہو کر چھوٹے چچا پر لپکی

''کون حرامزادہ تمہارے ساتھ ہمدردی کرنے آیا ہے ۔۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جس کا باپ اس کی گردن سنبھالو تم اپنے باپ کی تخلیق کو ۔۔۔ جان چھوٹے ہماری ۔۔۔ ''

چھوٹے چچا کے لہجے میں سارے جہان کی پھٹکار تھی۔

''مجھ نے بننے اتہام کے لئے آپ کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔ یہ میرا کرانس کہ آپ نے ذکر کر لیا اور کوئی فرق نہیں پڑا آپ ۔۔۔ آپ ۔'' وہ کانپ کے اپنے بستر پر بیٹھ گئی ۔۔۔

''سچ کڑوا ہوتا ہے صاحبزادی لیکن یہ حقیقت ہے کہ تو میری اتنی ہی رشتہ دار ہے جتنی تم۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہارے ماں باپ دونوں مر گئے۔ اور اس کی ماں ابھی زندہ ہے۔''

آسیہ کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چھوٹے چچا اتنی بڑی بات کہہ گئے تو اب تک وہ ہوش میں کیسے ہے۔ اس نے چھوٹے چچا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا جن کے

چہرے پر مسکینیت چھا رہی تھی ۔۔۔ اور ایکدم سے چھوٹے چچا اور اماں کی مکالمہ بازی اس کے ذہن میں گھوم گئی۔ اماں کی آنکھوں کی نفرت چھوٹے چچا کی مسکینیت ۔۔ اور ایک قدآور انسان سامنے آ گیا۔ سانولا رنگ۔ بلند پیشانی اور روشن آنکھوں والا پُرتمکنت چہرہ ۔۔۔ زبیدہ پھوپھی ۔۔۔ دبلی پتلی دودھ کی طرح سفید ہلکی ہلکی جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ۔ پیشانی پر زخم کا گہرا

سکینہ بوا کا گستاخانہ انداز۔ اور ۔۔۔ اور گاؤں میں تو سنا تھا کہ رائی کا پہاڑ بن جاتا ہے لیکن اتنی بڑی بات اس تک کیسے نہیں پہنچی۔ جبکہ جبکہ ۔۔۔ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی ۔۔۔ اس کا کلیجہ پھٹ جا رہا تھا۔

''آسیہ ۔۔۔'' چھوٹے چچا نے اسے آہستہ سے پکارا

''جی ۔۔۔'' اس نے آہستہ سے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں سے زندگی کی روشنی معدوم ہوتی جا رہی تھی ۔۔۔

''مجھے معاف کر دو بیٹی ۔۔۔'' چھوٹے چچا نے اپنے پرانے انداز سے گنگنایا شروع کیا۔

''آپ نے میرا کیا بگاڑا ہے چچا۔ آپ کس چیز کی معافی مانگ رہے ہیں ۔۔۔'' اس نے کرب سے چھوٹے چچا کو دیکھا۔

''میں ۔۔۔ میں بیٹی ۔۔۔ میں تو کو کر لئے جا رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ زندگی نظروں میں آپ ذلیل ہو جائے ۔۔۔ میں نے بیٹی بنائے۔ اور وہ میری بیٹی ہے ۔۔۔''

چھوٹے چچا جلدی جلدی بول رہے تھے ۔۔۔

اس نے بے حس نظروں سے چھوٹے چچا کو دیکھا جو رقو کے لئے سب کچھ تھے اور اس کے کوئی بھی نہیں ۔۔۔ زبیدہ پھوپھی کی ممتا کہاں مر گئی ۔۔۔ سنتے تھے کہ ممتا سات پردوں کے پیچھے بھی سامنے آ جاتی ہے۔ لیکن یہ کیسی ماں تھیں ۔۔۔

اس کا معطل ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا ماضی کی ایک ایک بات ذہن کے پردے پر چل رہی تھی ۔۔۔ چھوٹے چچا ۔۔۔ جو سارے زمانے کے لپاڑیئے مشہور تھے آج اتنا بڑا ایثار اس کے سامنے پیش کر گئے تھے کہ اس کی تپش سے وہ ایک دم راکھ کا ڈھیر ہوئی جا رہی تھی۔

''یا اللہ۔ یا اللہ ۔۔۔'' وہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی اسے اپنا دم اپنے سینے میں گھٹتا محسوس ہوا۔ پسینے کے قطرے پیشانی سے ڈھلک ڈھلک کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا ریگستان بسا ہوا تھا۔

نکہت حسن

نوشتۂ دیوار

دیوار کے اوپر اور دیوار کے پیچھے ایک دنیا آباد تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی دیوار پر مرزا صاحب ہر سال سفیدی کراتے تھے لیکن دو ایک دن بعد ہی دیوار کا سفید رنگ محلے والوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگتا تھا اور وہ جلد اپنی پرانی شکل و صورت میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ دھندلے اور گہرے نقش اُبھرتے، کوئلے اور پنسل سے تصویریں بنتیں۔ گالیاں اور شعر ساتھ ساتھ لکھے جاتے۔ کبھی کا دھڑ اور انسان کا سر دیکھ کر مستری چراغ دین پھر مغموم ہو جاتا اور پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ یہ نام اور یہ تصویر اس کے لئے جان کا عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ لوگ اس کے نام چراغ دین کو بھول کر اسے کوڑوں کا سردار ہی کہنے لگے تھے۔ ماسٹر یوسف کی بیوہ پھر دھڑتے سے محلے میں نکلتی اور برقعے کے اندر ہی اندر اپنے بے ڈھنگے اور بھدّے جسم کو عجیب ہوشربا انداز میں ہلاتی ہوئی اپنے گھر میں چلی جاتی۔ ہاتھی کے جسم پر عورت کا منہ، اور نیچے لکھی ہوئی عبارت ——

'تیری بیوی —— میری بیوی —— سب کی بھاوج —— رنڈی'

دلوں کی قربت، اور دوری کا اندازہ اس محلے میں اسی طرح لگایا جاتا تھا۔ دیوار کے قریب سے جو بھی گذرتا تھا وہ لمحے بھر کو ٹھہرتا ضرور تھا۔ صاحب ذوق ہوتا تو پڑھتا بھی اور اپنی طرف سے کچھ اصلاح اور کچھ اضافہ بھی کر دیتا۔ کچھ نہیں تو جاتے جاتے حروف کے نقطے ہی درست کر دیتا یا ب، ت، کی کمانوں کو پوری لمبان دے کر گزر جاتا۔ پر جہاں ذوقِ سلیم کا فقدان تھا وہ بھی پڑھتے تو ضرور تھے۔ بعد میں گردن جھٹک کر استغفراللہ، استغفراللہ کہہ کر نکل جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس دیوار پر پورے محلے کی اموات اور پیدائش کا ریکارڈ مع نام اور تاریخ کے درج تھا۔ اگر کوئی ڈاکو بھی مر جاتا تھا تو اس کا نام دیوار پر لکھا جاتا تھا:۔

نام :۔ نیک دل زماں

تاریخ پیدائش :۔ ۱۹۱۱ء —— تاریخ وفات :۔ ۱۹۶۱ء

پہلا ڈاکہ :۔ ۱۹۳۰ء —— دوسرا جیل سے نکلنے اور بارہ سال سزا کاٹنے کے بعد۔

سیرت :۔ امیروں کو لوٹ کر غریبوں کو بانٹنا

سلسلۂ نسب :۔ سلطانہ ڈاکو سے ملتا تھا۔

صورت :۔ کبھی بھیگی بلی اور کبھی خوفناک شیر سے مل جاتی تھی۔

خدا مغفرت کرے خوب مرد تھا ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں —— یہ حقیقت میں ہم سے جدا ہوتے نہیں

بچہ ماں کے پیٹ سے بعد میں نکلتا تھا۔ دیوار پر اس کا نام اور سن پیدائش پہلے رقم ہو جاتا تھا۔ پیدائش کے بعد یا تو ماں باپ کو نام تبدیل کرنا پڑتا تھا یا پھر جنس تبدیل کروانے کی فکر سوار ہو جاتی تھی۔ ہاں جو سہل پسند ماں باپ تھے وہ ان جھمیلوں میں سرے سے پڑتے ہی نہیں تھے اس طرح اس محلے میں بہت سی محمودہ، نثار اور شوکت نام کی لڑکیاں اور انجم، سعیدہ اور نازو نام کے لڑکے دیوار کے سائے سائے پل بڑھے تھے جو اپنے ساتھی لڑکے لڑکیوں کے چڑانے پر آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر اور اپنی قمیضوں کے دامن اٹھا اٹھا کر یقین دلانے میں لگے رہتے تھے۔ لیکن دیوار کا لکھا قسمت کی لکیر تھا اس طرح اس دیوار نے بہتیرے مردوں کو عورت اور عورتوں کو مرد بنا کر رکھ دیا تھا۔

مرزا صاحب کا اکیلا دم تھا۔ سوچتے تھے محلے والوں سے بگاڑ کر کے کیا کرنا ہے۔ باہر ہی کی تو دیوار تھی۔ اندر تو مرزا صاحب نے گھر میں کسی عبادت گاہ کی سی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ اللہ، محمد لکھے ہوئے کلینڈر لٹکے ہوئے تھے۔ طاقوں اور کارنسوں پر واقع بلیات والے نقش فریم کئے ہوئے دھرے تھے۔ بیٹھک میں جہاں وہ صبح و شام بیٹھتے تھے وہاں کارنس پر رحل میں سرخ کار چوبی کا جزدان چڑھا ہوا قرآن شریف رکھا ہوا تھا دیوار پر سامنے کی طرف مخمل کی ہری جا نماز کو کیلوں سے جوڑ کر لٹکایا تھا کھونٹیوں اور سوراخوں میں جگہ جگہ اڑسی ہوئی تھیں۔ ایک کھونٹی پر کھجور کی گٹھلی کی ہزار دانوں والی تسبیح ٹنگی ہوئی تھی اور اس کے برابر ہی مرزا صاحب کی مری کی کڑھائی کی دوپلی ٹوپی جس کا چھاپہ اور کڑھائی اب صرف یادگار زمانہ تھی اور صرف بیٹھک کی آرائش کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ نماز کے لئے مرزا صاحب رامپوری ٹوپی استعمال کرتے تھے، جو رامپور سے نہ آنے پر بھی ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں آسانی سے مل جاتی تھی۔ مرزا صاحب نے اپنی زندگی کی تمام جمع پونجی صرف کر کے یہ مکان بنوایا تھا۔ بڑے بڑے کمروں اور روشن کھڑکیوں والا مکان مرزا صاحب کی کل ملکیت تھا۔ ماشاءاللہ کنبے والے آدمی تھے۔ بیوی نوجوانی میں مر چکی تھی۔ پر بہوئیں، بیٹیاں بیٹے اور پوتے، نواسے سب تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ ان میں سے کوئی بھی مرزا صاحب کے ساتھ اب نہیں رہتا تھا ایک تو نوکری چاکری کا معاملہ دوسرے محلے کا تنگ اور گھٹا ہوا ماحول، بہوؤں، بیٹیوں کو تو آتے ہی خفقان ہونے لگتا تھا۔ پھر نہ کوئی پاس نہ پڑوس۔ دیوار سے لگے ہوئے گھوسیوں کے دو تین کچے مکان تھے یا پھر قصائیوں، نائیوں اور گدیوں کی آبادی۔ مرزا صاحب نے اپنے اور قصبے کی آبادی کے درمیان پکی پختہ دیوار تو کھڑی کروائی تھی۔ پھر بھی اچھی بری خوشبوئیں، دودھ نکالنے اور گائے بھینس کے ڈکرانے کی آوازیں اور بے تکا بے تکا شور سب کچھ صاف سنائی دیتا تھا۔ پھر کسی کھاتے پیتے زمیندار کے ہاں بھینس کا چارہ کاٹنے والی مشین چلتی اور مرزا صاحب کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے گھر کی عورت پٹنے لگتی۔

جما کی بیوی رشیدہ روز پٹتی تھی۔ وہ روز گنڈاسا ایک طرف پھینک کر اور اکڑ کر بیٹھ جاتی تھی اور بڑبڑانے لگتی تھی: "مشین لگوا دیجی۔ مجھ سے نہیں کٹتا ہے چارہ۔" وہ بڑی ادا سے اپنے بھاری بھاری ہاتھ دبا دبا کر پھونکیں مارتی۔

اور جما گنڈاسا اٹھا کر اس کے سر پر سوار ہو جاتا: "اب کاٹتی ہے کُتی یا اڑاؤں تیری گردن!" وہ شیر کی طرح چنگھاڑتا اور رشیدہ جب بھی نہیں اٹھتی تو وہ اپنے سیدھے ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلیاں دکھا کر کہتا "پتہ ہے یہ اسی مشین میں آکر کٹی ہیں جس کی دہائی تو روز رات کو دیتی ہے!" اور رشیدہ کی بتیسی سی بجنے لگتی۔ وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ بیٹھتی اور گنڈاسا لے کر ذرا سی دیر میں ڈھیر کا ڈھیر چارہ کاٹ کر رکھ دیتی۔ پھر دوسرے دن شام تک وہ پھر بھول جاتی اور پھر گنڈاسا ایک طرف ڈال کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتی۔ جما پھر اس کو دھمکاتا اور اپنا کٹا ہوا ہاتھ دکھاتا۔ رشیدہ پھر گھگیاتی اور پھر چارے کا ڈھیر لگ جاتا۔

رات کو جب وہ دونوں لیٹتے تو جما اس کی تھوڑی ہلا کر کہتا: "شکر کر رشیدہ، جو مرزا صاحب کی دیوار کھڑی ہوئی ہے اور سر چھپانے کو انھوں نے زمین دے رکھی ہے کسی اور محلے میں رہتی تو تیرا روز تماشا بنتا۔ بچے بڑے سب تالیاں پیٹتے۔"

رشیدہ پلنگ پر لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر دیوار کو چھو کر دیکھتی۔ ٹھنڈی یخ دیوار کے لمس سے اس کو جھرجھری سی آتی اور رجا کو موقع ملتا۔ مرزا صاحب کسی مزدوری سے صحن میں سے گزرتے تو ان کو دیوار کے پیچھے سے سانپ کی سی پھنکار سنائی دیتی اور وہ ٹارچ لے کر ادھر اُدھر جھانکتے۔ جھانکے کچے مکان میں مردہ مردہ سی روشنی دیکھ کر وہ پُرمعنی کھنکارا بھرتے اور پھر اندر آ کر دعائے گنج العرش کا ورد کرتے کرتے سو جاتے۔

مرزا صاحب کے مکان کی دیوار محلے میں ہونے والی تمام اچھی بُری باتوں کا کھلا ہوا اشتہار تھی۔ تمام اچھی بُری باتیں یہیں سے شروع ہوتی تھیں اور یہیں ابھر کر پھیلتی تھیں۔ کتنے ہی چھوٹے بڑے عشق اس دیوار کے سایے سایے پروان چڑھے۔ کچھ پھلے پھولے اور کچھ بن کھلے مرجھا گئے۔ نصرو اور سکینہ کے عشق نے پورے محلے کے مردوں کو فکر کا ایک نیا رخ دیا تھا ورنہ اب سے پہلے وہ اس کو جوانی کا جوش سمجھ کر چٹکیوں میں اُڑا دیا کرتے تھے۔ سکینہ دیوار کی اوٹ میں ہو کر کھڑی ہو جاتی تھی اور نصرو گلی سڑک پر سے کنکریاں پھینکتا رہتا تھا۔ کنکری جب لڑھکتی ہوئی سکینہ کے پیر کے قریب آ کر گرتی تو وہ سمجھ جاتی: "تھوڑی سی بے کلی ہے اور دل میں رہ رہ کر میٹھا میٹھا سا درد اٹھ رہا ہے۔ پھر ملنے کی خواہش ابھی نہیں ہے۔" پھر دوسرے دن ایک کے بعد ایک دو تین کنکریاں پے در پے آکر پڑتیں اور سکینہ سمجھ لیتی: "دیدار کی خواہش ہے۔ صرف شکل دیکھ کر قرار حاصل کرنا مقصود ہے۔" پھر اس سے اگلے دن کنکریوں کی بوچھار سی ہونے لگتی۔ سکینہ کے پیر کا انگوٹھا بھی زخمی ہو جاتا۔ وہ پھونک مار مار کر زخم خشک کرتی اور بے چین ہو جاتی: "ملنے کی خواہش ——" وہ آنسو بھری آنکھوں کو دیوار پر ٹکا دیتی۔ دیوار پر بنی ہوئی بہت سی تصویریں اور نقش بولنے سے لگتے اور اس کو کچھ ڈھارس سی بندھتی۔ وہ زمین سے کچی مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا کر پھینکتی جو راستے میں ہی بکھر جاتا اور نصر اللہ سمجھ جاتا: "معاملہ ٹھیک ہے، سکینہ راضی ہو چکی ہے۔" پھر رات کے اندھیرے میں دیوار کے پیچھے دو سایے سے کھنچتے۔ سرگوشیوں اور سسکیوں کی آواز ابھر کر مرزا صاحب کے صحن میں پھیلنے لگتی۔ وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے کھنکارتے اور نصرو اور سکینہ دیوار چھو کر اقرارِ محبت کرتے ہوئے جدا ہو جاتے۔

مرزا صاحب کی دیوار کے سائے سائے نصر اللہ اور سکینہ کا عشق پروان چڑھ رہا تھا۔ پکی پختہ دیوار ایسی بڑی آڑ تھی کہ سکینہ کا وجود اس میں پورا کا پورا چھپ جاتا تھا اور وہ بے جھجک اشارے کنائے کرتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن دیوار سے لگے ہوئے سکینہ کے گھر میں زور سے ڈھولک بجی اور سکینہ ہیرا چاٹنے کے لئے بلبلائی بلبلائی پھرنے لگی۔ وہاں اُپلوں کے ڈھیر میں نہ ہیرا تھا اور نہ پتھر۔ وہاں تو بس ایک دھیمی دھیمی آنچ تھی جس کی تپش کو سینے سے لگائے لگائے سکینہ ڈولی میں سوار ہو گئی —— دولہا گھوڑی پر سوار ہونے کے لئے آگے بڑھا تو اس کی نظر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے شخص پر پڑی۔ اُجڑے بال، گریباں چاک، آنکھوں میں اداسیاں اور خالی ہاتھ۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چھپائی ہوئی اکنی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ صبح کو دیوار پر ایک اور نقش اُبھرا:

"نوجوان عاشق کی حسرت ناک موت"

نام :- نصر اللہ خاں

پیدائش :- ________

وفات :- ________

سلسلۂ نسب :- مجنوں، فرہاد اور پنجاب کے عاشقوں سے ملتا تھا۔

سیرت :- خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہنا۔ اور خاموشی سے مر جانا۔

ع حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ہمیشہ کی طرح سب نے مزے لے لے کر نئی لکھی ہوئی عبارت کو پڑھا۔ بیکار گھر میں بیٹھے اور جوڑ توڑ کرنے والے بوڑھوں نے بھی، کام کاج پر جانے

والے مردوں نے بھی اور اوباش قسم کے چھوکروں نے بھی۔ پر کسی کے خون نے جوش نہیں مارا۔ وہ سب اس کو ہنسی دل لگی سمجھ کر پڑھتے، وہ چارپائیوں کا اضافہ اپنی طرف سے کرتے، اور پھر قہقہے لگاتے ہوئے یا توبہ توبہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ مرزا صاحب صبح سے اپنے دروازے پر کھڑے ہوئے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان کو نصراللہ کی جواں مرگی کا افسوس بھی تھا اور سکینہ کی معصوم محبت کے پامال ہونے کا غم بھی۔ انھوں نے بارہا سکینہ کو دیکھا تھا۔ گٹھے ہوئے جسم کی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ ڈری ڈری آنکھیں، کپکپاتی ہوئی چھوٹی سی ناک اور تھرتھراتے ہوئے گداز ہونٹ۔ اس کے جسم کا رواں رواں کانپتا تھا، عجیب لوری مٹی سے اللہ میاں نے اس گٹھے ہوئے جسم کی لڑکی کو بنایا تھا۔ وہ روز صبح سویرے کچے دودھ کا جھاگ بھرا کٹورا مرزا صاحب کے لئے لے کر آتی تھی اور ایسے اوندھے سیدھے قدم اٹھا کر چلتی تھی کہ دودھ اس کے اپنے گھر کے دروازے سے جو چھلکتا تو مرزا صاحب کے کمرے کی میز پر رکھنے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک کٹورا ابلتا ہی رہتا تھا۔ میز پر جو بوندیں گرتیں ان کو سکینہ اپنے سر کی اوڑھنی اتار کر جلدی جلدی صاف کرنے لگتی۔ اتنی دیر میں مرزا صاحب سلام پھیر کر اس کی طرف مڑتے تو وہ لڑھکتی ہوئی واپس جاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ دروازے پر اس کے ٹھوکر لگتی تو مرزا صاحب چیختے "ہوش میں، ہوش میں،" پر سکینہ روز بروز بے ہوش ہوتی گئی۔ پھر ایک دن جب وہ دودھ کا کٹورا میز پر رکھنے لگی تو کٹورے کے ساتھ ساتھ خود بھی اوندھی گر پڑی۔ مرزا صاحب نے اس کا بازو پکڑ کر اس کو سیدھا کھڑا کیا تو وہ تھرتھر کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مرزا صاحب کو غصہ بھی آیا اور رحم بھی۔ انھوں نے اس کو نرمی سے گھرکا "تیرا یہاں کون تجھے کھا رہا ہے؟ ہوش میں رہ" پر وہ اپنے گول مٹول جسم کو لٹو کی سی چکر پھریاں دیتی ہوئی دروازے سے باہر نکال لے گئی گھر جا کر اس نے اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا "تو خود دودھ دے آیا کر یا ابا آپ ہی دے آئے گا۔"

"پر تو کیوں نہیں جائے گی؟" اس کی ماں نے کریدا۔

"بس نہیں۔" وہ پھولی جی کی طرح پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"بات تو بتا؟" ماں کرید سی لگ گئی۔

تب سکینہ نے اپنے پھولے پھولے گالوں کو پچکا کر زور سے آواز نکالی "ہوش میں۔ ہوش میں"

اور پھر دونوں ماں بیٹی ہنستے ہنستے پلنگ پر گر پڑیں۔ دوسرے دن سے نورا خود کھیت پر جاتے ہوئے مرزا صاحب کو دودھ کا کٹورا دیتا جاتا تھا۔ پھر بھی مرزا صاحب کسی نہ کسی بہانے سے سکینہ کو بلواتے ہی رہتے تھے۔ کبھی چلم بھرواتے اور کبھی تازہ مکھن منگواتے۔ اور سکینہ ویسے ہی ہمیشہ کی طرح لڑھکنیاں کھاتی ہوئی آتی اور سٹرپٹر کام کر کے تیر کی طرح نکل جاتی ــــــ وہ اب کچھ دن سے تو نرے ہوش تھا اور نہ فرصت۔ پہلے بے دھیانی میں نصراللہ سے دل لگا بیٹھی اور کچی ڈلی پھینک کر اقرار بھی کر لیا، پھر معلوم ہوا کہ وہ دوسرے گھر میں مانگی ہوئی ہے تو پلنگ پر اڑانٹی کھٹوانٹی لے کر لیٹ گئی، بالکل روٹھی رانی کی طرح جو نہ منہ سے بولے اور نہ سر سے کھیلے۔ ماں نے ٹٹولا تو بس خاموش خاموش گونگوں کی طرح تکنے لگی۔ ماں نے جلتا ہوا پلا پکڑایا کہ مرزا صاحب کی چلم میں ڈال آ وہ کئی مرتبہ آ کر کہہ گئے ہیں، تب بھی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ وہ تو برات والے دن بھی بس لاش کی طرح اٹھی ہوئی ڈولی میں جا بیٹھی تھی۔

مرزا صاحب نے حقے کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اس کے اٹھتے ہوئے قدموں کو گنا تھا۔ اس نے دو قدم کا فاصلہ بارہ پندرہ قدموں میں طے کیا تھا۔ وہ، جو قلانچیں بھرتی تھی، مرے بیل کی طرح چل رہی تھی اور جب ہی سے مرزا صاحب بے چین تھے۔ صبح کو دیوار پر لوگوں نے اس کا اور اس کی محبت کا تماشہ بنایا ہوا تھا۔

"بڑے افسوس کا مقام ہے۔ انسانی ہمدردی سرے سے مفقود ہے۔" مرزا صاحب نے دل میں سوچا۔ انھوں نے دیوار کے قریب کھڑے ہوئے مجمع پر نظر ڈالی اور پھر خود بھی چلتے ہوئے مجمع کے قریب آئے اور ایک نوجوان کی کلائی پکڑتے ہوئے بولے، "میاں کچھ خوف خدا بھی ہے! بڑے شرم کی بات

ہے! اور یہ تو ہے شیرا! اوروں کو تو چل جانے دے۔ پر تو عقل اور طاقت دونوں رکھتا ہے۔ پھر کتنی ہی مرتبہ محلے کی لڑکیوں کو غیروں کے چنگل سے چھڑا چکا ہے۔ سکینہ کی مدد کرنے کے بجائے ادھر کھڑا اس کا مذاق اُڑا رہا ہے!"

"پر مرزا جی سکینہ کی تو شادی ہو گئی ہے، میں اس کو کیسے چھڑا سکتا ہوں!" شیرا بے وقوفوں کی طرح منہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

شادی ہو گئی ہے! ایسی شادی نہیں ہوتی! پتہ بھی ہے ایسی شادی عذاب بن کر پورے قصبے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے! ماں باپ نے زبردستی بچی کے گلے پر چھری پھیری ہے۔ خدا کے ہاں تم سب کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ تمہیں بھی اور ان سب کو بھی جو آج ایک معصوم کی ہنسی اُڑا رہے ہیں۔"

مرزا صاحب یہ کہہ کر اندر جانے لگے تو شیرا نے لپک کر ان کا راستہ روک لیا۔ "جی مرزا صاحب چلے کہاں؟ کچھ ترکیب تو بتاؤ۔"

میں کیا ترکیب بتاؤں۔ تمہارا معاملہ ہے۔ خود سوچو۔ نہ سمجھ میں آئے تو پنچایت بٹھاؤ۔ پر اتنا میں ضرور کہتا ہوں کہ سکینہ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اس معصوم پر ظلم ہوا ہے اور مظلوم کی آہ عذاب بن کر لگتی ہے۔ تمہاری گائیوں کا دودھ سوکھ جائے گا! تمہاری فصلیں جل جائیں گی! تمہارے مویشی مر جائیں گے! اور تم سب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر و گے!" مرزا صاحب نے قرب قیامت کی نشانیاں بتا کر ہنستے کھلکھلاتے مجمع میں سنسنی پھیلا دی۔

"پر مرزا صاحب ایک جان تو گئی۔ کڑیل جوان اپنی جان سے گیا ہے! اور سکینہ کیا بھینٹ مانگتی ہے؟" ایک دوسرے نوجوان نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا جو شاید نصراللہ کا رشتہ دار یا شاید بھائی تھا۔

"تم کس کو کہہ رہے ہو؟" مرزا صاحب نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"نصراللہ کو۔"

"بھاڑ میں ڈالو نصراللہ کو، وہ بھی کوئی مرد تھا! اُٹھا کر بھیا سی لڑکی کو قصائی کے حوالے کیا۔۔۔۔ اچھا ہوا مر گیا محلے سے ایک نامرد کم ہوا۔ تم سب بھی مر جاؤ تو اچھا ہے۔" یہ کہہ کر مرزا صاحب نے کوئی آیت مع ترجمہ پڑھی جس کا مفہوم تھا "ظالم کی نجات نہیں۔" پھر انھوں نے جاتے جاتے دیوار کی طرف دیکھا شیرا کوئلے کا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑے ہوئے نصراللہ کے نام کے سامنے گالیاں لکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور مجمع اللہ اکبر کہتا ہوا چھٹ گیا۔

دوسرے دن صبح کو سکینہ کا باپ مرزا صاحب کو دودھ کا کٹورا دینے آیا تو وہ وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ انگلیوں سے تسبیح کے دانوں کو گھماتے ہوئے انھوں نے منہ سے "ہوں۔ ہوں" کی اور ہاتھ سے نورا کو ٹھہرنے کا اشارہ کر کے دعا مانگنے کے بعد بولے "نورا، سکینہ کی بغیر مرضی شادی کر کے تو نے اچھا نہیں کیا!"

نورا کھڑے کھڑے ایسا چونکا جیسے کسی زہریلے جانور نے ڈنک مار دیا ہو۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا "بغیر مرضی! بغیر مرضی کیسے؟ میری مرضی تھی۔ سکینہ کی ماں کی مرضی تھی۔ پھر لڑکے کے ماں باپ کی مرضی تھی۔ سال بھر تک چوکھٹ پر ناک رگڑوائی تھی۔ بڈھے بڑھیا کو تب کہیں جا کر حامی بھری تھی! بغیر مرضی کیسے ہو گئی؟"

نورا نے اپنا چوڑا چکلا سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"تیری ہی تو مرضی تھی۔ پر لڑکی۔۔۔۔" یہ کہتے کہتے مرزا صاحب ذرا رکے تو نورا مذاق اُڑانے کے سے انداز میں بولا "کیسی باتیں کرو ہو مرزا صاب؟ بچوں کی بھی مرضی ہووے ہے۔ جہاں ماں باپ نے کر دیا ٹھیک ہے۔"

"یہی تو ٹھیک نہیں۔" مرزا صاحب نے کہا

"کیوں، ٹھیک کیوں نہیں؟ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔"

"غلط ہوتا آیا ہے۔" مرزا صاحب نے تسبیح گھماتے ہوئے کہا۔

"پھر ہم کیا کریں، اور دائی قوانی قانون کی طرح اس پر بھی کوئی قانون لاگو ہو گیا ہوگا!" نورا نے لاپروائی سے کہا۔

"نیا قانون کیسا! یہ خدائی قانون ہے اور ہمیشہ سے ہے!" یہ کہہ کر مرزا صاحب نے کارنس پر رکھی ہوئی کتاب اُٹھا کر شادی بیاہ اور نکاح کے شرعی قوانین کی تفصیلات پڑھ کر نورا کو سنائیں جن کو وہ بغیر سمجھے ہوئے سر ہلا ہلا کر سنتا رہا۔

پھر نورا گردن ہلا کر بولا "پر اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ کہو تو بڑھی بھینس خیرات کر دوں؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بوڑھی بھینس سے کیا ہوتا ہے! لڑکی کی خیر خیریت معلوم کر! اگر خوش ہے تو پھر خوش ہے، لیکن اگر اس کی آنکھ میں ایک بھی آنسو اور سینے میں ایک بھی آہ ہے تو پھر سمجھ لے تیرا دین بھی گیا اور دنیا بھی!" یہ کہہ کر مرزا صاحب نے کتاب بند کر کے کارنس پر رکھ دی اور پیٹھ موڑ کر باقی وظیفہ پڑھنے لگے۔ نورا جانے کے لئے مڑا تو انھوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ سپاٹ اور سیدھا سادا چہرہ جس کو نہ دین کی پروا تھی اور نہ دنیا کی۔ فکر تھی تو بوڑھی بھینس کی، جو نہ دودھ کی تھی اور نہ پیسے کی، کھڑی کھڑی کھاتی تھی یا ڈکراتی تھی۔ اس نے گھر جا کر کھونٹے سے بھینس کو الگ کیا اور اس کو گھسیٹتا ہوا بوچڑ خانے کی طرف جانے لگا۔ مرزا صاحب نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا اور سرد آہ بھر کر رہ گئے۔

"جاہل، گنوار، جانور اور انسان کو ایک ہی طرح ہانکتے ہیں۔ سکینہ اور بڈھی بھینس میں کیا فرق ہوا؟ قصائی قصائی سب برابر، چاہے ہاتھ میں چھری ہو، یا منہ پر سہرا، ایک ہی بات ہے۔" مرزا صاحب دیر تک کھڑے ہوئے سڑک پر گھسٹتی ہوئی بھینس اور نورا کو دیکھتے رہے۔ پھر یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے: "میری گردن پر کوئی عذاب نہیں۔ لکھنے والوں کو بھی سمجھا دیا اور باپ کو بھی خدائی قانون بتا دیا۔ اب یہ جانیں اور ان کا دین ایمان۔ الٰہی تو ان کو عقل دے!" یہ کہہ کر مرزا صاحب اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگے۔

•

مرزا صاحب پڑھے لکھے آدمی تھے۔ لوگوں کو صحیح بات بتانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پھر کچھ خوفِ خدا بھی تھا لیکن اپنی بات منوانے کے لئے کسی کے پیچھے ڈنڈا لے کر وہ کبھی نہیں دوڑے۔ ان کو معلوم تھا کہ قصبے کی آبادی ہزاروں سال پہلے کے عرب وحشی قبائل سے کسی طرح بھی بہتر نہیں ہے۔ یہ جس کے پیچھے پڑ جائیں اس کی عزت تو رہی ایک طرف، جان بچانا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ اور پھر دیوار ــــــ! وہ تو ایسا رستا ہوا ناسور تھا جو کسی بھی وقت کسی کے بھی جسم میں پھوٹ سکتا تھا۔ اس میں کسی بڑے چھوٹے، امیر غریب کی تمیز نہیں تھی بس کسی کی کوئی نازیبا حرکت کوئی دیکھ لے یا کوئی اُنچی بُری بات ہاتھ لگ جائے، پھر دیکھیے دوسرے دن دیوار پر اس کی تفصیل، شجرہ نسب اور تصویروں کے ساتھ قصبے میں ایک سے ایک بڑا فن کار اور صاحبِ ذوق موجود تھا۔ شیرا اپنی موزوں بے تکان اور چٹیلی گالیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ چھوٹے میاں جو قطعی چھوٹا نہیں تھا۔ اس کو سارے عشقیہ اور دل میں گدگدی اور حرارت پیدا کرنے والے شعر یاد تھے جن کو وہ املا کی تھوڑی سی غلطیوں کے ساتھ دیوار پر موقع و محل کے لحاظ سے نوٹ کر دیا کرتا تھا۔ بعد میں جب بھی اسکول ماسٹر، نوشیرواں کو فرصت ہوتی اور وہ اُدھر سے گذرتا تجھے اور املا کی غلطیاں درست کرتا ہوا نکل جاتا تھا۔ تصویر کشی کا فن چھدّا کو اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ اس کا باپ مجذوب سا بزرگ آدمی تھا جو منہ میں پانی بھر کر زمین پر پچکاریاں مار مار کر نقش بنایا کرتا تھا۔ چھدّا منہ سے تو نہیں ہاں ہاتھ سے بالکل جیتی جاگتی تصویریں بنا دیا کرتا تھا۔ مستری چراغ دین کا کارٹون اور ماسٹر یوسف کی بیوہ کی تصویر اس کی مصوری کے نمونے تھے، جو دیوار کے انمٹ نقوش تھے۔ پھر ایک مرتبہ جس کا نام یا جس کی تصویر دیوار پر آ جائے وہ مٹائے نہیں مٹتی تھی۔ ابھی تھوڑے دن کی بات ہے۔ رجب علی بزرگ سا آدمی تھا۔ شرع تورہ کا پابند، پرچون کی دوکان تھی نیچی نظریں کئے وہ دکانداری کرتا تھا۔ عورتیں مرد سب اس کی دوکان سے سودا سلف خریدتے تھے۔ ایک دن کسی نے دیکھ لیا کہ وہ جب ماسٹر یوسف کی بیوہ کو دال کا لفافہ پکڑا رہا تھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور حساب میں بھی گڑبڑ کر بیٹھا تھا۔ پھر کیا تھا۔ دوسرے دن ایک لمبی چوڑی باتصویر کہانی دیوار پر رقم

تھی۔۔۔نقل پیر۔۔۔اب رجب علی پاپا کھا رہا ہے۔ مسجد میں جا کر قرآن شریف اُٹھانے کو تیار ہے۔ اپنی گنجڑی پلوٹھی کو واسطہ دلا رہا ہے کہ اس کے کان میں اگر بھنک پڑ گئی تو بوڑھے رجب علی کا مردہ ہی اٹھوا دے گی۔ وہ جا کر ایک ایک کے آگے گڑگڑایا: "میرا جوان بیٹا ہے وہ سُنے گا تو اس کا خون جوش کھائے گا۔ کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھا تو میں بڈھا ٹھڈا آدمی کہاں پولیس چوکی کرتا پھروں گا۔ پھر تمہیں تو سب کو معلوم ہے کہ میرا حساب کر دو ہے۔ پیسے جوڑنے میں اکثر گڑبڑا کر بیٹھتا ہوں بیسیوں مرتبہ تم میں سے ہی کئی ایک آ کر میرے پیسے واپس کر کے گئے ہو۔ ماسٹر کی بہو کے پاس دو آنے زیادتی چلے گئے تو ایسا کونسا غضب ہو گیا کہ تم نے نہ میری عمر کا خیال کیا اور نہ رتبے کا۔ میری شرافت اور ایمان داری سب پر پانی پھیر دیا۔"

پر اب کیا ہو سکتا تھا۔ دیوار پر لکھا جا چکا تھا جو مقدر کے لکھے کی طرح اب قبر تک ساتھ جائے گا۔ مرنے کے بعد دلوں سے پہلے ہی مٹ جائے۔ دیوار کا تو ہر نقش انمٹ تھا۔ اکثر لوگوں کا دل چاہتا تھا کہ کلھاڑی پھاوڑے اُٹھائیں اور اس دیوار کو ڈھا دیں۔ دیوار تھی یا خدائی فوجدار۔۔۔ نہ آزادی کا جینا تھا اور نہ چین کا مرنا۔ پھر دیوار کی اوٹ میں ہوتے ہوتے کچے پکے عشق اور گھوسیوں کے مکان آڑے تھے۔ جمّا اور نورا دونوں محلے کے شیر تھے جو پکی پختہ دیوار کے سائے میں پل بڑھ کر اور بھی مضبوط ہو گئے تھے۔ کیونکہ ان کو مرزا صاحب جیسے بزرگ کی پشت پناہی حاصل تھی۔ جمّا کو دیوار سے دوہرا فائدہ تھا۔ اول تو وہ بے دھڑک رشیدہ کو بے روک ٹوک مار لگا سکتا تھا۔ رشیدہ کے لئے جمّا کی مار اتنی ہی ضروری تھی جتنا جمّا کے لئے رشیدہ کا بھاری بھرکم جسم۔ اس کو مار پیٹ کر وہ بے تکان اونچی اونچی سانسیں لے سکتا تھا۔ اس کی سانس میں اتنا جوش تھا کہ اگر ہوتی کوئی کچی مٹی کی دیوار تو دو دن میں ہی شاید ڈھیر ہو جاتی۔ پھر بھی سانس لیتے وقت اس کو اپنے گھر کی بقیہ تین دیواروں اور سب سے زیادہ کھپریل کی چھت سے خطرہ ہی رہتا تھا جو جمّا کی پھنکاروں سے کسی وقت بھی اُڑ سکتی تھی۔ اس لئے وہ جلد اپنے کو قابو میں کر لیتا تھا۔ اور سنبھل سنبھال کر سو جاتا تھا۔ لیکن اس کی پھنکاروں سے مرزا صاحب کی نیند ایسی ٹوٹتی کہ صبح تک پلک ہی جھپکنے میں نہیں آتی تھی۔ اُدھر دوسری طرف نورا نے مویشیوں کا پورا ریوڑ اکٹھا کر لیا تھا جن کے گوبر اور چارے کی بدبو سونگھتے سونگھتے مرزا صاحب کو مستقل نزلہ رہنے لگا تھا۔ وہ اکثر سوچتے تھے کہ مکان کے پیچھے شاگرد پیشہ خالی پڑا ہے۔ جمّا اور نورا آرام سے اس میں رہ سکتے ہیں۔ مکان کے سامنے کی غلاظت بھی دور ہو جائے گی اور ان کو بھی سکون مل جائے گا۔ بیٹھے بٹھائے ان کو اچھے مرض لگ گئے۔ انھیں نہ تو نزلے کی شکایت تھی اور نہ کم خوابی کی۔ ان کی صحت اور ان کا کسرتی جسم تو ان کے ہم عمروں کے لئے مثال تھا۔ پچاس سے اوپر کے پیٹے میں تھے لیکن نہ بال سفید ہوئے تھے، نہ دانت جھڑے تھے اور نہ بینائی میں فرق آیا تھا۔ وہ تو ایسے ٹھکے ٹھکائے اور بچے جلائے تھے جیسے ابھی لوہار کی بھٹی سے نکل کر آئے ہوں۔ اب جو ان کی نیندیں غائب ہونا اور مستقل چھینکیں آنا شروع ہوئیں تو ان کو فکر ہوئی۔ انھوں نے ذکر بھی کر ڈالا اور نورا کو بلوایا۔ جمّا تو یہ سُن کر ایسا خوش ہوا جیسے جنت مل گئی ہو، پر نورا کا چہرہ لٹک گیا۔ یہ دیکھ کر مرزا صاحب نے پوچھا "کیوں؟ تجھے اُدھر اُٹھ آنے پر کیا اعتراض ہے؟"

"اعتراض تو کوئی نہیں، بس چودم اور ایک کمرے کی بات ہے۔"

"چودم کون ایسے بڑے ہیں! تیرے چونٹوں پاؤں کے لئے ایک کمرہ بہت ہے۔ مویشیوں کے لئے جیسے اُدھر چھپر ڈالا ہے اِدھر بھی ڈال لیجو۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔"

"پھر؟" مرزا صاحب چنگھاڑے۔

"ابھی وہ لونڈیا بھی تو بھیتی کر آئی ہے۔ تم جانو، جوان لونڈیا ہے جیٹی کر بیٹھی تو کیا ہوا۔ دل تو اس کا بھی ہے۔ ہم میاں بیوی کو دیکھے گی تو۔۔۔" نورا اپنی جھونک میں بول رہا تھا کہ جمّا نے اس کو آنکھ ماری اور وہ ہکلا کر خاموش ہو گیا۔

"کون لونڈیا؟" مرزا صاحب نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"سکینہ، جی اور کون! اس کا مرد خود پٹ کر گیا ہے کہ رکھو اس تھوبے کو۔ نہ منہ سے بولے اور نہ کوئی اور بات بتائے۔ بس منحوسوں کی طرح روئے

جا وے ہے، اس کا دل کرے تو آجائے نہیں تو ہماری طرف سے آزادی: میں تو اس کو دوبارہ جانے کے لئے راضی کر رہا تھا۔ پر تیسرے ہی دن اس کے آدمی کی چٹھی آگئی: "طلاق، طلاق، طلاق۔ بیچ پنچوں کے درمیان تین طلاق، اب تم بتاؤ؟" نورا ہمیشہ جب رکتا تھا مفصل بات چیت کرتا تھا۔

مرزا صاحب نے اس کو بیچ میں ٹوک کر کہا: "اچھا مجھے یہ سب کچھ تو نہیں سننا۔ تم دونوں سوچ لو اور سامنے کا حصہ خالی کر دو تو میں صفائی کے لئے آدمیوں کو بلواؤں۔ مکان کے پیچھے تم بھلے ہی کچا مکان کھڑا کر سکتے ہو۔"

جمّا اور نورا شاگرد پیشے میں اٹھ آئے لیکن مرزا صاحب کی کم خوابی اور نزلے کی شکایت بدستور رہی پہلے تو گھڑی دو گھڑی آنکھ بھی لگ جاتی تھی، اب تو راتیں جاگ جاگ کر اور توبہ استغفار کرتے ہی گزرنے لگیں۔ ایسے اوندھے سیدھے خیالات آتے کہ کبھی نوجوانی میں نہیں آئے ہوں گے۔ اور دم لیتے ہی الٹے خوف سے کانپنے سے لگتے، یہ حالت ان کی اکیلے پن کی وجہ سے نہیں تھی۔ اکیلے مرزا صاحب کوئی آج سے تھوڑی رہ رہے تھے۔ بیوی کو مرے ہوئے بھی پندرہ سال سے کچھ اوپر ہی ہو چکے تھے اور سب سے چھوٹی بچی کی شادی کو بھی پانچواں برس لگ رہا تھا، انھیں تنہائی سے نہ کبھی وحشت ہوئی تھی اور نہ گھبراہٹ۔ ان کو اپنی تنہائیاں بڑی عزیز تھیں۔ ان تنہائیوں نے ان کو خدا اور مذہب سے قریب کیا تھا۔ پر پچھلے دن سے جو کتابیں ان کے مطالعے میں تھیں، ان سے اب وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دنیا کو چھوڑے بغیر عقبیٰ کو سنوارنا بچوں والی بھول ہے اور جب سے ہی ان کو یہ تنہائیاں کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی تھیں۔ پھر مکان کی دیوار پر اور مکان کے پچھواڑے ایک دنیا آباد تھی۔ ایسی رنگا رنگ دنیا کہ مرزا صاحب لاکھ آنکھیں چرائیں اور دامن بچائیں، وہ کانٹوں والی بیل کی طرح لپٹی ہی جاتی تھی۔ مرزا صاحب صبح سویرے چہل قدمی کے لئے نکلتے تو نہ دیکھنے کے باوجود بھی دیوار پر بنے ہوئے نقش ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے۔ دیوار پر ہر روز کسی تازہ عشق کی داستان، طربیہ اور عشقیہ اشعار ننگی اور عریاں گالیاں اور بھونڈے بیہودہ لطیفے رقم ہوتے تھے، جو مرزا صاحب جیسے صوفی منش کے دل میں بھی گدگدی پیدا کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ ان کے سینے میں میٹھی میٹھی سی اٹھتی اور وہ صبح کی ٹھنڈی ہوا سے بچاؤ کے لئے اپنی شیروانی کے اوپر کے بٹن بھی بند کر لیتے۔ چھڑی کی نوک سے دیوار پر بنے ہوئے کسی نقش کے ہجّے درست کرتے اور کبھی مسکراتے ہوئے اور کبھی جھنجلاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ دیوار پر بنی ہوئی تصویریں، دیوار پہ لکھے ہوئے اشعار اور دیوار کے پیچھے ہوتے ہوئے چھوٹے چھوٹے عشق اور پھر آئے دن خودکشی اور گھر سے بھاگنے کی وارداتیں سُن سُن کر مرزا صاحب کو اپنے ایمان پر شبہ سا ہونے لگا تھا۔ پھر دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنے کے وہ قائل بھی نہیں تھے —— وہ مدت سے دنیا اور اس کے جھگڑوں سے الگ تھلگ صوفیوں کی سی زندگی گزار رہے تھے اب کچھ دن سے محسوس کرنے لگے تھے کہ رہبانیت جھوٹا سہارا ہے اور تب ہی تصوف پر سے ان کا ایمان ایکا ایکی ہٹ گیا اور انھوں نے اپنے گرد و پیش میں دلچسپی لینے کا ارادہ کر لیا، پر گرد و پیش میں کیا رکھا تھا گھوسیوں، قصائیوں اور کسانوں کی آبادی —— اور اس کے درمیان میں کھڑی ہوئی ایک اینٹ کی دیوار جو سراسر غلاظت کی پوٹ تھی۔ اکثر مرزا صاحب کا دل چاہتا تھا کہ راج مزدوروں کو بلوا کر اس کا قصہ ہی ختم کروا دیں، پھر سوچتے تھے رات بھر کی کوفت منٹ بھر میں دور ہو جاتی ہے۔ جب وہ دیوار کے سامنے کھڑے ہو کر کوئی پھڑکتا ہوا شعر یا چٹکلا پڑھ لیتے۔ سارا دن بڑا ہلکا پھلکا گزرتا جمّا کی بیوی کا تھل تھل کرتا ہوا جسم، نورا کی زرد زرد رنگت والی بیٹی سکینہ، اس کی اُپلے تھاپتی ہوئی بھوسلے بالوں والی بیوی اور سب سے بڑھ کر جمّا کی اکلوتی گیابھن بھینس —— ان کے سامنے ڈھیروں جیتے جیتے رنگ سے بکھرے رہتے۔ اور بار بار قصد کرنے کے باوجود ان کی نمازیں قضا ہو جاتیں۔ فرضوں کی جگہ سنت اور وتر میں دعائے قنوت پڑھنے کے بجائے خالی لاحول پڑھ کر پلنگ پر لیٹ جاتے —— پر رات کا کیا کریں جو قیامت بن کر آتی —— جمّا رشیدہ کو پیٹ کوٹ کر سانپ کی طرح پھنکارنے لگتا اور سکینہ اور اُس کی ماں ہاتھ چلا چلا کر چلانا شروع کر دیتیں۔ جب سے یہ لوگ کوٹھڑی میں اٹھ کر آئے تھے۔ ان کے درمیان ماں بیٹی والا رشتہ ختم ہو کر سوکنوں والا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ادھر مرزا صاحب اور اُن کے ساتھ ساتھ نورا کا رات کا سکون ہی جاتا رہا۔ نورا کی راتیں بیٹی کے پلنگ کو تک تک کر گزر رہی تھیں، جو نہ سوتی نہ پلک جھپکاتی، بس خالی خالی آنکھوں سے چھت کو ٹٹولتی رہتی —— صبح کو نورا اور اس کی بیوی سکینہ کے خراٹوں سے جاگتے اور اس کی بیوی یہ چیخ

شروع کر دیتی "میری سوت، اپنا خصم چھوڑ کر میرے اوپر پھر انگا کر بیٹھی ہے"

اور مرزا صاحب اس کی آواز کو صبح صادق کا پیغام سمجھ کر آسمان کو دیکھتے ۔۔۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر باہر نکل جاتے، یہ دیکھنے کے لئے کہ دلوں کا بھید جاننے والی دیوار پر کہیں ان کا نام تو نہیں ۔۔۔!

دیوار کا بھوت محلے میں سب پر سوار تھا۔ پر آج کل جو سب سے زیادہ پریشان تھا وہ تھا نورا جس کی بیوی اور بیٹی کی آوازیں مرزا صاحب کے پکے مکان میں گونجتی ہوئی کچی سڑک پر صاف سنی جاتی تھیں۔ وہ کئی مرتبہ مرزا صاحب سے کہہ چکا تھا "میں تو کہہ کہہ کر ہار گیا۔ مرزا صاحب، اب ذرا تم ان کو سمجھا کر دیکھ لو۔ تمہاری وجہ سے ڈھکن پڑا ہوا ہے ورنہ ان کی کمینی حرکتوں کی وجہ سے میرا نام کبھی کا دیوار پر آ گیا ہوتا"

مرزا صاحب عورتوں کے منہ لگنے کے قائل نہیں تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ بولتے وقت قوتِ گویائی کے علاوہ باقی تمام قوتیں کسی روحانی طاقت کے ذریعے ان سے چھین لی جاتی ہیں۔ ہاں، نورا ان سے دعا کے لئے کہتا تو وہ ضرور ان کے حق میں دعا کرتے۔

"اے رب العزت اس مخلوق کی زبان اور اپنی رحمت کے درمیان کوئی ایسا رابطہ قائم کر جو موٹر کے بریک کی طرح جا کر زبان کے نیچے لگ جائے۔ تیرے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ یا مامور کر دے کسی فرشتے کو یا ابابیلوں کو جو بولتی عورتوں کے سر پر ڈھیلے برسائیں اور ان کو تنبیہ ہو اور خوفِ خدا اور انسانی ہمدردی دونوں جذبے ایک ساتھ بیدار ہوں"

پر سکینہ اور اس کی ماں کے سلسلے میں دعا کا کوئی کلمہ بھی ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ بلکہ اکثر رات کو تو عجیب و غریب خیالات ان کو آتے۔ اور ان کا دل چاہتا یہ دونوں عورتیں یوں ہی بولتی رہیں اور وہ یوں ہی لیٹے لیٹے ان آوازوں کو اپنے اندر جذب کرتے رہیں۔ انتہائی کرخت اور بے تکی آوازیں مرزا صاحب کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر عجیب و غریب اثر کر رہی تھیں۔ حالانکہ مستقل جاگتے رہنے کی وجہ سے ان کی صحت پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ ان کا گٹھا ہوا کسرتی جسم روز بروز گھلتا جا رہا تھا۔ پورے جسم میں ہلکا ہلکا درد سا رہنے لگا تھا۔ عجیب بے کلی اور بے چینی سی رہتی۔ ادھر وہ نورا کو دیکھتے، ناکام راتوں، دردوں کے جھگڑوں نے اس کو لیموں کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور تب ان کو لگتا کہ نورا کا دکھ ان کے دکھ سے مختلف نہیں۔ وہ دونوں چند روز میں عمر کے کئی سال پھلانگ کر اس سرحد پر پہنچ گئے تھے جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا اور جہاں اجالا ہے نہ اندھیرا، نہ آوازیں ہیں اور نہ چیخیں، بس آنکھوں میں کھٹکنے والی دیوار کی سفیدی کے سوا کچھ نہیں ۔۔۔ تب ایک دن انھوں نے سفید جھاگ سے بھرے دودھ کے کٹورے کے ساتھ نورا کے پھیکے زرد چہرے کو دیکھا اور بولے "ارے! یہ تجھے کیا ہوا ہے؟"

"بس جی، دونوں ماں بیٹی مجھے کھا کر دم لیں گی"

"تو کوئی بھلا مانس دیکھ کر سکینہ کا نکاح کر دے" مرزا صاحب نے مشورہ دیا۔

"بھلا مانس!" نورا نے اپنی میلی آنکھوں کو خلا میں گھمایا اور پھر بولا "اجی اب اسے کون جھیلے گا؟ پہلے ہی ایک مرتبہ ہو گیا تو بہت ہے۔ نصر اللہ کی موت اور دیوار کی کہانی سے آگے ہی اس کی بڑی شہرت ہو چکی ہے۔ میں تو اپنی گھر والی کو سمجھاتا ہوں کہ نیک بخت تو صبر کر۔ یہ تو زندگی بھر کی مصیبت ہے۔ کل کلاں کو کسی کے کان میں بھنک پڑ گئی تو دیوار پر نام آ جائے گا۔ بندہ بھی کیا کرے؟ جوان جی ہے قابو میں آتے ہی آتے آئے گا۔ سکینہ سے کہتا ہوں بیٹا تو چھپر میں اٹھ جا، تو وہ ایک اڑیل ٹٹو ۔۔۔"

"تو سکینہ سے پوچھ کر وہ نکاح ثانی کے لئے تیار ہے؟"

"نکاح ثانی!" نورا نے بغیر سمجھے ہوئے لفظوں کو زبان سے ادا کیا۔

"ہاں، ہاں دوسرا نکاح ــــ میرا مطلب ہے دوسری شادی"۔

"پوچھ کر کیا کرنا ہے جی! یہ تو وہی بات ہوئی سوت نہ کپاس کولہو سے لٹھم لٹھا۔ مجھے معلوم ہے اس کو اب کوئی نہیں تھمے گا۔ غریب کی بیٹی ایک مرتبہ اٹھ جائے تو بہت ہے"

"تو پوچھ تو سہی لڑکے کا بھی انتظام ہو جائے گا"۔

نورا کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی میلی آنکھوں کو آستین سے صاف کیا اور گھگھیاتے ہوئے بولا: "مرزا صاب جی، اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکا ہو تو پھر بتاؤ! سکینہ راضی ہو یا نہ ہو، پر میں اور اُس کی ماں مار باندھ کر نکاح پڑھوا ہی دیں گے"۔

"لاحول ولا ــــ پھر وہی جہالت۔ ایک مرتبہ زبردستی کا نتیجہ دیکھ چکا ہے، پر ابھی عقل نہیں آئی"۔

مرزا صاحب نے ایک مرتبہ پھر اپنا فرض ادا کرتے ہوئے نورا کو سیدھی راہ بجھانے کی کوشش کی۔ نورا کی موٹی عقل میں بات آنی تو مشکل تھی، پر وہ بھی روز کی ہائے ہائے سے ماجرا آ چکا تھا۔ پھر دیدار کے بھوت سے بھی اس کی جان جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اگر بھول چوک سے بھی نام آ گیا تو پھر زندگی بھر کے لئے چھٹی ہو جائے گی۔ اس نے سکینہ کو ہموار کرنا شروع کیا۔ سکینہ نصر اللہ کے نام پر جان دینے کی قسم کھا چکی تھی۔ اب کچھ دن سے سوچتی تھی کہ اس ڈائن ماں کے چنگل سے کسی نہ کسی طرح نکل ہی جائے تو اچھا ہے۔ پھر مرزا صاحب ذمہ داری لے رہے تھے۔ اس لئے تیار ہو گئی۔ نورا نے مرزا صاحب کو آ کر بتایا تو انہوں نے کہا "تو اطمینان رکھ جمعہ کو عصر مغرب کے درمیان نکاح ہو جائے گا"۔

"لڑکا؟" دماغ میں کیڑے کی طرح کلبلاتا ہوا اٹکتا لفظ نورا کی زبان سے ڈھلک سا پڑا اور وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر مرزا صاحب کو دیکھنے لگا۔

"میں سکینہ کو اپنے نکاح میں لے رہا ہوں" مرزا صاحب نے گہرے اطمینان سے کہا۔

"تم! مرزا صاب جی تم؟" نورا کی منہ اور آنکھیں پوری کی پوری پھٹ گئیں۔ پھر ذرا سنبھل کر اس نے ہوشیار گاہکوں کی طرح مرزا صاحب کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں میں ٹھہراؤ آ گیا اور پھٹا ہوا منہ بند ہو گیا۔ بس گردن آہستہ آہستہ ہل رہی تھی کہ وہ ایک دم سے اچھلا اور دیوار سے ذرا سا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مرزا صاحب نے اس کی گھبراہٹ دیکھ کر پوچھا "کیوں؛ تجھے کچھ اعتراض ہے؟"

"اعتراض!" نورا بے وقوفوں کی طرح پھر منہ کھول کر کھڑا ہو گیا، پھر ہڑبڑا کر بولا "دیوار ــــــ!"

"دیوار کیا؟" مرزا صاحب نے ناگوار ناگواری سے پیر پٹختے ہوئے کہا۔

تب پھر نورا بولا "دیوار پہ نام آ جائے گا! اور تم جانو دیوار پہ نام آنا ــــــ!" یہ کہتے کہتے نورا ذرا ذرا کا تو مرزا صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر نورا کے قریب آ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور دیر تک اس کو اطمینان دلاتے رہے۔

دوسرے روز شام کو نورا اپنے مویشیوں کو ہانکتا ہوا اپنے کوارٹر میں داخل ہو رہا تھا تو اس نے دیکھا، مرزا صاحب کے مکان کے سامنے والی دیوار ڈھائی جا چکی تھی اور مرزا صاحب بیچ میدان میں کھڑے ہوئے ملبہ اٹھوا کر میدان ہموار کرا رہے تھے۔

حسین شاہد

اِعتراف

دہائی خدا کی منصور بن جانا بھی آسان رہا، مرقیس بننا بھی مشکل نہ ٹھہرا تو ایک کام اور وہ ہے سکول ٹیچر بننا۔ اگر کوئی منصور بن جائے تو لوگ اسے سولی پر لٹکا دیں گے اور سولی سے بہتر دکھوں کا علاج اور کرنا ہو گا۔ اگر کسی کے مقدر میں قیس بننا لکھا ہے تو اس کے لئے بڑی سے بڑی آفت طفلانِ بے پروا کی سنگ زنی ہی ہو سکتی ہے لیکن قیس کو ایک تو پتھر کھانے کی چاٹ خود بھی ہوتی ہے دوسرے اگر وہ پتھر کھانے سے بچ جانا چاہتا ہو تو راہِ فرار ہمیشہ کھلی پائے گا۔ لیکن سکول ٹیچر تو اپنے پاؤں چل کر لڑکوں کے پاس جانے اور پتھر کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

آج میں وہ سب باتیں صفحۂ قرطاس پر لانے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں جنہیں میں اب تک رازِ بنا کر سینے میں چھپائے چلا آتا تھا لیکن انہیں ہضم کرنا میرے لئے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

مجھے محکمۂ مال میں آئے ہوئے دس بارہ برس ہونے کو ہیں۔ آج جب میں بطور تحصیلدار دورے پر نکلتا ہوں تو پورے کا پورا علاقہ میری راہ میں آنکھیں بچھاتا ہے۔ میرے سامنے ایک روشن مستقبل ہے۔ جوں جوں میں اپنی ذات کے سنگ ہائے گراں اپنی راہ سے ہٹاتا جاؤں گا ترقی کے دروازے کھلتے جائیں گے اور جس دن میں نے ہمت کر کے اپنی ذات فنا کر دی معلوم نہیں میں کونسے منصب پر سرفراز ہو جاؤں لیکن ترقی کا کوئی بھی زینہ چڑھتے ہوئے مجھے ابتدائی زینہ شدت سے یاد آتا ہے جب میں سکول ماسٹر تھا اور اس زینہ پر کھڑا ہوتے ہی مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آ جاتا ہے۔

میں اپنی زندگی کے دونوں زمانے کبھی نہ بھلا سکا، شاید آئندہ بھی کبھی نہ بھلا سکوں۔ ایک زمانہ پڑھنے کا اور دوسرا پڑھانے کا۔ پہلے دور میں مَیں نے سنگ زنی کی لذت جی بھر کر حاصل کی اور دوسرے دَور میں لذتِ سنگ سے شناسائی ہوئی یا یوں سمجھیں کہ طالب علم ہوتے ہوئے ایک پروانگا یا اور ماسٹر بن کر اسے کاٹا۔

یہ میری آپ بیتی کے دو ورق ہیں جو آج بھی مجھے یاد آتے ہیں تو میرے دل سے دھواں سا اُٹھتا ہے!!

میں سکول کے تصور سے جتنا بھاگتا ہوں سکول اتنا ہی تلخ حقیقت بن کر بار بار میرے سامنے آ جاتا ہے۔ میں دورے پر ہوتا ہوں تو یہاں والے عام طور پر میری رہائش کا انتظام سکول کی عمارت میں ہی کرتے ہیں مجھے یوں لگتا ہے جیسے انہیں کسی زمانے میں میرا شغل تدریس معلوم ہو گیا ہے اور وہ ازراہِ شرارت مجھے سکول میں ٹھہراتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتہ کا ذکر ہے میں ایک قصبے میں دورے پر تھا اور حسبِ معمول سکول کی عمارت میں برسرِ عدالت تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز پڑی۔ کوئی آدمی چوکیدار سے پوچھ رہا تھا: "صاب بہادر کا نام کیا ہے؟"

"چوہدری برکت علی چیمہ" یہ چوکیدار کا جواب تھا جو ہونا ہی چاہئے تھا لیکن سکول کی عمارت میں بیٹھ کر میرا اپنا دکھ میرے اندر سے نکل کر میرے سامنے آ بیٹھتا ہے اس لئے میں نے یہی سمجھا کہ اس نے مجھے میری سکول میں پڑی ہوئی چڑ سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے

کوئی اور بہانہ بنا کر چوکیدار کو پیٹ ڈالا ملا

میں آپ کو اپنی چڑ کے بارے میں ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔ میں نے وعدہ جو کیا ہے کہ آج کوئی بات چھپا کر نہیں رکھوں گا! ....

آج مجھے خیال آ رہا تھا کہ میں تو اتنے بلند منصب پر فائز ہوں کہ جسے بھی چاہے بہانہ بنا کر پیٹ ڈالوں لیکن مولوی نعمت اللہ اگر زندہ ہے تو بیچارا ابھی تک وہی دینیات کا بے بس مدرس ہوگا جب ایسی واردات اس پر گزرتی ہوگی تو وہ کیا کرتا ہوگا۔ میں تو اپنے عہدے کی برکت سے اپنی دلی بیماریوں کا کچھ نہ کچھ علاج کر ہی لیتا ہوں لیکن مولوی کے دکھ تو اس کے اندر گھٹ گھٹ کر اب تک آتش فشاں کا لاوا بن چکے ہوں گے۔ میرے خیال میں اگر اسے آج سیشن جج لگا دیا جائے تو اس کی عدالت سے کوئی نوجوان موت سے کم سزا نہ پائے چاہے ایک زمانہ نوجوان کی بے گناہی کا ثبوت دیتا رہے بس ـــــ اب مولوی نعمت اللہ کا ذکر آ ہی گیا ہے تو پہلے اس کی کہانی سن لیجئے۔ میری چڑ کی داستان مولوی کے حالات سے اس طرح منسلک ہے کہ اگر دونوں کو الگ الگ بیان کیا جائے تو دونوں باتیں بے لذت ہو کر رہ جائیں۔

میرے والد صاحب جب مجھے پہلے دن سکول چھوڑنے گئے تو داخلے کے لوازمات پورے ہو جانے کے بعد انھوں نے میری موجودگی میں مدرس سے کہا تھا "آج کے بعد ماس آپ کا اور ہڈیاں ہماری۔ آپ ہدایت دینے کے لئے اس کی کھال بھی ادھیڑ دیں تو ہم آپ سے باز پرس نہیں کریں گے"۔

میں گاؤں کے سکول میں پرائمری تک زیر تعلیم رہا اور ماسٹر صاحب میرے والد صاحب کی اجازت کے مطابق میری کھال ادھیڑتے رہے۔ میرے لئے کائنات میں پہلی قابل ذکر ہستی خدا کی تھی اور دوسری ماسٹر کی۔ اگر کبھی سر پر غرور ماسٹر صاحب کے سامنے بلند ہونے کی سوچتا بھی تو والد صاحب کا فرمان یاد آ جاتا اور میں اندر ہی اندر دانت پیس کر رہ جاتا۔ لیکن پرائمری پاس کر کے جب میں شہر کے ہائی سکول میں پہنچا تو ماحول کو مختلف پایا۔ ایک تو والد صاحب اب اتنے قریب نہیں تھے۔ دوسرے میں نے دیکھا کہ گاؤں کے مقابلے میں یہاں کے لونڈے اپنے اساتذہ کا واجبی سا احترام ہی کرتے تھے۔ وہ بھی صرف ان کے سامنے۔ پیٹھ پیچھے تو ظالموں نے ہر ایک معلم کی کوئی نہ کوئی چڑ بنا رکھی تھی ......

ایک اُستاد کی چڑ ماسٹر پاپی تھی تو دوسرے کی چھتا! ایک کو ماسٹر گھسن کہتے ہیں تو دوسرے کو ماسٹر دِچھو!!

یہ صورت حال نہ جانے کیوں میرے لئے یک گونہ مسرت کا باعث ہوئی!

میرے لئے انتہائی لذت کا ہنگام وہی ہوتا تھا جب میں کسی ماسٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے چپکے سے اسے چڑ کا پتھر مار دیتا تھا۔ ایک تو میں ڈیل ڈول کا مضبوط تھا، دوسرے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس لئے میرے ساتھ امتیازی سلوک ناگزیر تھا جس کا میں نے جی بھر کے فائدہ اٹھایا۔ اگر کبھی کوئی ماسٹر سزا بھی دیتا تو میں کھلے بندوں اسے اس کی چڑ سے پکارنے لگتا۔ بات بڑھ جاتی تو کبھی کبھی اساتذہ سے معافی بھی مانگ لیتا لیکن پنڈ وہیں کا وہیں رہتا۔ موقع ملنے پر میں کسی استاد کو اس کی چڑ کا پتھر مارنے سے باز نہ رہتا۔

مولوی نعمت اللہ دینیات کے مدرس تھے۔ اتفاق کی بات کہ کئی سال گزر گئے لیکن ان کی کوئی چڑ نہ بنی۔ میں تو ایسا کرنے کی ہمت اس لئے بھی نہیں کرتا تھا کہ یہ واحد استاد تھے جو میرے والد صاحب کے ذاتی طور پر شناسا تھے اور جانتے تھے کہ میرا علاج اپنے ہاتھوں سزا دینا نہیں والد صاحب سے شکایت کر دینا کافی ہے لیکن دوسرے لڑکے معلوم نہیں کیوں مروت میں رہے۔ ہم پانچویں درجے سے دسویں میں پہنچ گئے لیکن مولوی صاحب نے ہمارے ہاتھوں چڑ کا کوئی پتھر نہ کھایا لیکن معلوم ہوتا ہے یہ ساری کسر ایک ہی دفعہ پوری ہونا لکھی تھی۔ بالآخر مولانا اپنی ہی ایک حرکت کی بنا پر چڑ کی دلدل میں پھنس گئے

ایک دیہاتی لڑکے کو مولانا سے کچھ زیادہ ہی عقیدت تھی۔ وہ انھیں ہمیشہ متنوع قسم کی سوغاتیں دیا کرتا۔ مولوی صاحب بھی بالعموم ضرورت کے وقت اسی سے فرمائش کیا کرتے۔ ایک دفعہ انھوں نے محمد دین کو ــــ یہ اس برخوردار کا نام تھا ــــ تھوم لانے کے لئے کہا۔ دوسرے روز جماعت میں آنے تو

چھوٹتے ہی اس سے سوال کیا "بوٹے! تھوم لایا ہے؟"

"خدا کی قسم بالکل یاد نہیں آسکا" یہ بوٹے کا جواب تھا۔

دوسرے روز پھر یہی مکالمہ دہرایا گیا اور بوٹے کو بہت معذرت کرنا پڑی۔ سوئے اتفاق کہ بوٹا تیسرے روز بھی تھوم لانا بھول گیا۔ اس روز مولانا اس پر بہت برسے، یوں ساری جماعت کو حفظ ہو گیا کہ مولوی صاحب نے بوٹے سے تھوم لانے کی فرمائش کر رکھی ہے۔ اس دن مولوی صاحب کے جانے کے بعد لڑکے بوٹے سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔

چوتھے دن مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ مولوی صاحب کا پیریڈ شروع ہوا تو میں نے ان کی آمد سے پہلے تختہ سیاہ پر لکھ دیا:

"بوٹا! تھوم لایا ہے؟"

"خبیث! تھوم لایا ہے؟"

"نالائق! تھوم لایا ہے؟"

مولوی صاحب جماعت میں آئے تو یہ تحریر دیکھ کر بہت سٹپٹائے پہلے تو انھوں نے لکھنے والے کو خناس، رجیم، خبیث اور ملعون جیسے خطابات سے نوازا اور پھر دیر تک کوشاں رہے کہ لکھنے والے کا پتہ چل جائے لیکن لڑکے مجھ سے بدکتے تھے اس لئے کسی نے نہ بتایا۔

اس سے اگلے دن میں نے مولوی صاحب کے خطابات کا قرضہ چکانے کی ایک اور تدبیر سوچی۔ دینیات کا پیریڈ شروع ہوا تو میں نے مولوی صاحب کے آنے سے پیشتر ان کی میز پر تھوم کا گٹھا لا کر رکھ دیا۔ مولوی صاحب گٹھا دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے۔ وہ غصے کے عالم میں پارے کی طرح تڑپ رہے تھے اور شیر کی مانند گرج رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جماعت میں ہٹلر گھس آیا ہے جس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ مجرم کی نشان دہی بہر صورت ہونی چاہئے لیکن لڑکے جانتے تھے کہ مجرم کا نام لیتے ہی مولوی صاحب اس کی ہڈیاں توڑ دیں گے اور میرا نام لینے والے کی اپنی بھی خیریت نہیں، اس لئے وہ چپ سادھے بیٹھے رہے۔

مولوی صاحب بے بس ہو گئے تو انھوں نے گٹھا رکھنے والے کو بڑی بے شرم گالی داغ دی!

اگر کوئی اور مدرس ہوتا تو میں کبھی کا میدان میں آ گیا ہوتا کیونکہ ماسٹروں کے کھال ادھیڑنے کے باوجود میرے دل میں ان کا خوف کبھی نہیں بیٹھا تھا۔ میں نے زندگی میں خوف کھایا ہے تو صرف ایک انسان سے اور وہ ہیں قبلہ والد صاحب اس وقت بھی میرے سامنے مولوی نعمت اللہ نہیں تھے، والد صاحب تھے، اس لئے میں توہین برداشت کر گیا حالانکہ لڑکوں کی آنکھیں مجھ سے سوال کر رہی تھیں کہ آج اتنے بے غیرت کیوں بن گئے استاد؟

اس کے بعد میں نے مولوی صاحب کے خلاف گوریلا جنگ چھیڑ دی اور آخر کار وہ آگ جو میں نے ہلکی ہلکی لگائی تھی پھیل کر سارے سکول پر محیط ہو گئی۔ یہ منظر اب روزمرہ کا معمول بن گیا کہ پانچ سات لونڈوں نے مولوی صاحب کو تنہا پا کر تھوم تھوم کا شور اٹھا رکھا ہے۔ مولوی صاحب جنگلی بلے کی طرح زخم کھا کر لڑکوں پر جھپٹتے اور لڑکے یہ جا وہ جا۔ شریر لڑکے تھوم کی رٹ اس وقت لگاتے جب وہ تعداد میں زیادہ ہوتے تاکہ کسی ایک کی نشان دہی نہ ہو سکے۔ مولوی صاحب پاگلوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگتے، انھیں گالیاں اور بددعائیں دیتے اور انجام کار روہانسے ہو کر سٹاف روم میں چلے جاتے۔ ان کے بس میں نہ تھا کہ ورنہ وہ تمام لڑکوں کو ایک جگہ ڈھیر کرتے اور تیل ڈال کر دیا سلائی دکھا دیتے۔

دوسرے مدرسین مولوی صاحب کو سمجھایا کرتے کہ وہ چڑنا چھوڑ دیں تو لڑکے خود ہی بات کو بھول جائیں گے۔ کبھی کبھار مولوی صاحب ضبط کا مظاہرہ بھی کرتے اور بات کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کیا کرتے لیکن بات کو ہنسی میں ٹالنے کا صحیح وقت نکل چکا تھا۔ اب تو پتھر کھانا ان کا مقدر بن چکا تھا۔

مولوی صاحب منصور بن جاتے تو کبھی کے پھانسی پا گئے ہوتے۔ قیس بن جاتے تو جس دن پتھر کھانے سے طبیعت سیر ہو جاتی سکول جانا چھوڑ دیتے لیکن وہ تو ہٹ کے پکے تھے روزانہ سویرے اٹھ کر نماز پڑھتے، پیٹ کا دوزخ بھرتے اور پھر اُجلے کپڑے پہن کر سکول پہنچ جاتے — پتھر کھانے کے لیے زخموں پر نمک پاشی کرانے کے لئے! جتنا جتنا مولوی صاحب چڑتے گئے لڑکے اُتنا ہی مشتعل ہوتے گئے۔ تھوم کا لفظ مولانا کے لیے دوزخ کا عذاب بن گیا۔ خدا معلوم وہ سکول کے باہر بھی زندگی میں کسی کنجڑے سے تھوم خریدنے کے قابل بھی رہے یا نہ رہے۔

مولوی صاحب کے سینے پر تھوم کی تریاں بندوق کی گولیوں کی طرح برستی رہیں کہ اسی اثنا میں ہم میٹرک پاس کر گئے۔ جو بات زیادہ لوگوں کی زبان پر جاری ہو جائے بالعموم اس کا مصنف تاریکی میں چلا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی چڑ باقی تمام اساتذہ کی نسبت زیادہ موضوعِ سخن رہی بایں ہمہ کم سے کم مولوی صاحب اس کے مصنف کے نام سے ناواقف ہی رہے...... میں سکول سے فارغ ہو کر کالج میں داخل ہو گیا اور آہستہ آہستہ سکول کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔

بی۔اے پاس کیا تو میرے اندر والا انسان صحیح سالم اور جوانی کے جوش سے بھرپور تھا۔ وہ میرے لئے ایک عرصے تک مصیبت بنا رہا اگر وہ زندہ رہتا تو یقیناً مجھے گمراہ کر دیتا کیونکہ وہ تو شبانہ روز انسانیت کی خدمت کے جذباتی نعرے لگاتا رہتا تھا۔ وہ تو میرے روکے رُکتا ہی نہیں تھا، اسے اپنا مفاد ترک کر کے دوسروں کے کام آنے کا خبط تھا۔ اس نے میری کھال اتنی نرم کر دی تھی کہ معمولی سی بے انصافی کی میخ بھی میرے جسم سے پار ہو جایا کرتی تھی۔ اب تو میں نے اپنی ہمت سے اپنے سینے میں پتھر اور اپنے جسم کے لئے لوہا چن لیا ہے لیکن اس وقت میں موم کا پتلا ہی تھا ایک دن بیٹھے بٹھائے میری موم پگھل گئی اور میں نے سوچا کہ اس قوم کی سب سے بڑی ضرورت اور خدمت یہی ہے کہ اسے تعلیم دی جائے۔ میں نے اپنے اس فیصلے کے نشیب فراز پر غور کئے بغیر اگلے برس بی۔ٹی میں داخلہ لے لیا۔ یہ کورس پاس کرتے ہی میں اپنے پرانے سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ وہ میری صلاحیتوں سے واقف ہی تھے انھوں نے بلا چون و چرا مجھے ملازم رکھ لیا۔ مجھے سینئر انگلش ٹیچر کا منصب ملا اور ہائی کلاس کے ایک فریق کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس طرح میں قوم کی خدمت میں ہمہ تن محو ہو گیا۔

چند دن گزرے تو مجھے معلوم ہوا کہ پانچ چھ برس پیشتر میں مولوی صاحب کی جو چڑ بنا گیا تھا وہ تو بعد میں آنے والے طلبا کے ذریعے کھیپ در کھیپ منتقل ہوتی آ رہی ہے اور ابھی تک اسی جوش و خروش سے اس کا ورد جاری ہے۔ وہ پہلا دن تھا جب مجھے معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کا افسوس ہوا لیکن میں سنبھل گیا اور خدا کا شکر کیا کہ بروقت پتہ چل گیا ہے۔ آئندہ میں ایسی کوئی غیر معمولی حرکت نہیں کروں گا جو میری چڑ بن سکے۔ ویسے اس کے بعد مولوی صاحب مجھے دکھائی دیتے تو میرا جی چاہتا کہ یا تو مولوی صاحب انتقال کر جائیں یا سکول چھوڑ جائیں —— اس کی وجہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکی —— میں مولوی صاحب کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا تھا میں انھیں ہضم نہیں کر پاتا تھا۔ کبھی کبھی میرے کانوں میں تھوم کی آواز پڑتی تو میں گھبرا جاتا اور میرا جی چاہتا لڑکوں کو آگ لگا دوں۔ معتبرانہ زوردار قسم کے لڑکے مجھے گولی کی طرح لگتے اور میں ہر وقت اس شعوری احتیاط کا شکار رہتا کہ کسی حرکت سے میری کوئی چڑ نہ پڑ جائے۔ مجھے یہ سوچنے کی توفیق نہ ہوئی کہ ماسٹر اور چڑ تو آپس میں جسم اور لباس کی طرح جڑے ہوتے ہیں۔ جب تک کوئی چڑ نہ پڑے ماسٹر کی ذات نامکمل رہتی ہے ماسٹر کو چڑ سے بھاگنا نہیں چاہیے ہاں یہ دعا ضرور کرتے رہنا چاہیے کہ چڑ پڑے تو گوارا قسم کی پڑے۔

ایک دن میں نے جماعت سے پچھلے دن کا پڑھایا ہوا سبق سننا چاہا تو اتفاق سے کوئی لڑکا بھی نہ سُنا سکا۔ مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے کہا "آج تو میں چھوڑے دیتا ہوں لیکن کل بھی جب سبق یاد نہ ہوا اس کا قیمہ کر دوں گا۔"

میں نے یہ بات نہایت غصے کے عالم میں کہی تھی۔ اس کے باوجود ایک لڑکا بے اختیار ہنسی سے پھٹ پڑا۔ بس یونہی لگا جیسے کسی نے کان کے لقافے

میں جوابھر کر اوپر سے زور کا مکا چلا دیا ہو!

میں نے خونی نظروں سے لڑکے کو دیکھا اور پوچھا "اس میں ہنسنے کی کون سی بات تھی؟"

وہ لڑکا تو سہم کر چپ ہو گیا لیکن مجھے باقی تمام جماعت کی آنکھوں میں شرارت ناچتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھ سے یہ آنکھیں برداشت نہیں ہو رہی تھیں لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا کہ بات کیا ہے۔

کچھ دن اور گزر گئے تو مجھے وہ خبر سنا ہی پڑی جسے میں پہلے دن سے ٹالنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میری چڑ پڑ چکی تھی۔ لڑکوں کو میری کوئی غیر معمولی حرکت تو ہاتھ نہ آسکی لیکن وہ اپنے اُستاد کو زیادہ عرصے تک نامکمل کیسے دیکھ سکتے تھے۔ جب انھیں اور کچھ نہ ملا تو اُنھوں نے میرے نام کو اُلٹ پلٹ کر میری تکمیل کر دی میرے نام کا قافیہ تنگ تھا۔ اُنھوں نے چلتی سی گرہ لگائی اور شعر تیار ہو گیا۔

برکت علی چیمہ —— بکری دا قیمہ!!

تب میں نے جانا کہ اُس روز میرے ایک شاگرد کا ہنسی والا غبارہ کیونکر پھٹ پڑا تھا۔

اپنی چڑ کا سُن کر میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب مجھے ٹیچر بننے کی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ اب میں نے سوچا کہ چڑ تو پڑنا تھی سو پڑ گئی میرا ردِ عمل صحت مند ہونا ضروری ہے۔ اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ میں لڑکوں کو پتہ ہی نہ چلنے دوں کہ مجھے اپنی چڑ کا علم ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب سکول میں چلتے پھرتے میرے کانوں میں قیمے کی گولی لگتی تو میں اپنی کھال کے اندر تڑپ کر رہ جاتا لیکن باہر سے مستحکم رہتا۔ جہاں لڑکوں کا ہجوم ہوتا وہاں سے کترا کر نکل جاتا۔ ایک کام اور بھی کیا۔ میں نے معتبر اور ذمہ دار لڑکوں کو بیٹا ترک کر دیا!

آہستہ آہستہ لفظ قیمہ میرے حواس پر سوار ہونا شروع ہو گیا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اپنے نام کے ساتھ چیمہ لکھنا چھوڑ دوں لیکن پھر خیال آتا کہ اس طرح تو میں لوگوں کی توجہ زیادہ شدت سے اپنی طرف کھینچ لوں گا۔ مولوی صاحب کی چڑ بناتے وقت تو مجھ میں ڈھیروں حسِ لطیف تھی لیکن میری چڑ پڑی تو نہ جانے یہ حس کہاں چل دی۔ بہت دفعہ اپنے آپ کو سمجھایا کہ کون ماسٹر ہے جس کی چڑ نہیں پڑتی۔ آخر اس بات کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لیکن جونہی میں اپنے گاؤں جاتا اور میرے کمّی مجھے جھک جھک کر سلام کہتے تو مجھے لڑکوں پر پھر طیش آجاتا!

میں اس وقت سیدھا اپنی عدالت برخاست کر کے آرہا ہوں۔ آج میری عدالت میں ایک آدمی پیش ہوا۔ فائل پر اس کا نام لکھا تھا۔ علی بخش المعروف چوچا ـــ جن باتوں کا میں آج انکشاف کر رہا ہوں، ممکن ہے کل اس پر پچھتاؤں لیکن اس وقت میری موم پگھلی ہوئی ہے ـــ میں آدمی کے نام پر حیران ہوا اور اس سے پوچھا کہ چوچے کا کیا مطلب ہوا۔ اس نے جواب دیا۔

"مائی باپ! بچپن میں لوگوں نے چوچا میری چڑ بنا رکھی تھی۔ مائی باپ! جوں جوں میں بڑا ہوا چڑ بھی میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی، تب مائی باپ، میں نے سوچا کہ ایک عمر کا ساتھ ہے، اسے نبھانا ہی چاہیئے۔۔۔۔۔"

مجھے یوں لگا جیسے اس آدمی نے میرے منہ پر طمانچہ دے مارا ہے۔ میرے لئے عدالت کی کارروائی جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے عدالت برخاست کی اور خود عدالت سے ریٹائر کر گیا۔ تھوم! قیمہ! اور چوچا! آج میرے عام استعمال کے لفظ نہیں رہے۔ سکول ماسٹر، تحصیلدار اور ایک عام آدمی کی علامت بن گئے ہیں۔ تھوم کے آئینے میں مجھے اپنا مجرم چہرہ نظر آرہا ہے۔ قیمہ جرم کی سزا بن گیا ہے اور چوچا ایک نارمل انسان ہے میں نے اپنی پریشانی دور کرنے کے لاکھ جتن کئے ہیں لیکن بات نہیں بنی اور اب میں نے قلم سنبھالا ہے، اپنے ہی کیس کا فیصلہ لکھنے کے لئے!

مولوی نعمت اللہ میری آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹ رہا۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ زندہ ہے تو یقیناً پاگل خانے میں ہو گا۔ میرا اپنا علم نفسیات

جہاں سے آیا وہیں چلا گیا اور میری حسِ لطیف ایک کتابی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ بظاہر تو میں پہاڑ کی سی استقامت لئے، بالکل چوکیدار کو پیٹنے کی مضحکہ خیز حرکت اب بھی کر بیٹھتا ہوں۔ سکول میں پڑھاتے ہوئے میں کبھی کبھی ایک عجیب احتیاط برتا کرتا تھا۔ اس قسم کی آخری احتیاط جو میں نے سکول میں برتی یہ تھی کہ ایک دن میں جماعت میں جا رہا تھا۔ ابھی میں برآمدے میں ہی تھا کہ میرے کانوں میں قوالی کی سی آواز پڑی۔ لڑکے میری چڑ کا گانا بنائے ہوئے تھے۔ آدھے کہتے تھے:

"برکت علی قیمہ!"

دوسرے آدھے جواب دیتے تھے:

"بکری دا قیمہ!" اور ڈیسکوں کا طبلہ بجاتے تھے۔

میں یہاں تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں تک لڑکوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے میں جماعت میں پہنچوں تو فقرہ اگلے لڑکوں کے منہ میں ہو اس لئے میں اُلٹے پاؤں لوٹ گیا اور پھر سکول کے صحن میں اپنی جماعت کے سامنے اس انداز میں کھڑا ہو گیا کہ میری پشت لڑکوں کی طرف تھی اور دھیان دوسری طرف۔ لڑکوں نے مجھے دیکھ لیا اور خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد میں آہستہ آہستہ جماعت میں آ گیا جیسے مجھے کچھ پتہ ہی نہ چلا ہو۔

اُس دن میں دل ہی دل میں کڑھتا رہا مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اپنی چڑ کو لذت نہ دینے کے لئے کتنے جگرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس دل میں یہی جذبہ سما رہا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے لڑکوں کو سزا دوں جیسے مجھے پیٹنے چوکیدار کو دی تھی۔ میں نے نہایت بے دلی سے جماعت کو پڑھایا اور دل میں غبار لئے اسٹاف روم میں چلا گیا۔

میرے بعد مولوی نعمت اللہ کی گھنٹی تھی۔ میں باہر آیا تو وہ اندر گئے تھے۔ تھوم اور قیمے کا دروازے میں ملاپ ہوا۔ تھوم جب چک تھا وہ قیمہ بن رہا تھا، دونوں مل کر لڑکوں کی لذت کا سامان بنے ہوئے تھے!

میرا یہ پیریڈ خالی تھا۔ میں اس کے دوران سٹاف روم میں کباب ہو کر بیچ بنا رہا۔ اخبارات کے مطالعہ کی بہت کوشش کی لیکن اخبار آنکھوں کے سامنے لاتا تو یہی لگتا جیسے ہر صفحہ پر قیمہ! قیمہ! قیمہ! لکھا ہوا ہو۔

پیریڈ ختم ہوا تو مولوی صاحب میرے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھے۔ اس دن وہ بڑے جذباتی ہو چلے تھے۔ آکے بیٹھے ہی تھے کہ میرے کان میں تیل ڈال دیا۔ کہنے لگے "برکت! اگرچہ تم اس وقت میرے برابر بیٹھے ہو لیکن تم کتنے ہی اونچے چلے جاؤ میرے بہرحال شاگرد ہی رہو گے . . ."

میں جھٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور جواب دیا: "محترم! میں آپ کے برابر محض انتظامی ضرورت اور مجبوری کے تحت بیٹھ رہا ہوں لیکن اگر آپ کو گراں گزرے تو میں سٹاف روم میں بھی آپ کی خدمت میں کھڑا ہی رہوں۔"

میرے اس جواب پر اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں کہنے لگے "تم تو میری اس قدر عزت کرو اور تمہاری جماعت میری اس قدر توہین کرے کیا یہ افسوس کا مقام نہیں؟ ..... کیا میرا تم پر کوئی حق نہیں؟"

مولوی صاحب کا لہجہ میرا سینہ چیر گیا۔ میں نے کھڑے کھڑے ان سے پوچھا "آخر یہ قصہ کیا ہے؟"

مولوی صاحب کہنے لگے "جو کچھ ہوا وہ تم خود جا کر پوچھ لو۔ مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ تمہاری جماعت نے آج میری ریش میں خاک ڈال دی ہے۔" اس کے بعد میرے کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ بہت سی امکانی باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ نہ آئی تو مولوی صاحب کی چڑ والی بات نہ آئی۔ اگر مجھے اس کا خیال آ جاتا تو ممکن ہے میرا ردِعمل کچھ اور ہوتا لیکن مجھے تو اس وقت اپنی چڑ زیادہ یاد آ رہی تھی۔ مولوی صاحب کی

گیا آتی۔ میں سٹاف روم سے نکلا اور اپنی جماعت کی طرف چل دیا۔

ایسے معلوم دیتا تھا جیسے اُس روز میں، میں نہیں تھا کوئی اور تھا۔ بس میں آگ کا گولا بن چکا تھا جسے اگر پانی میں بھی پھینکا جاتا تو پانی میں آگ لگ جاتی۔ میں انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور شوکتے ہوئے ناگ کی طرح جماعت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر تمام جماعت سناٹے میں آگئی۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی شیر کی طرح گرج کر پوچھا: "آج مولوی نعمت کو کس نے تنگ کیا ہے؟"

میری کڑک سن کر جیتی جاگتی جماعت قبرستان کا نمونہ بن گئی۔ بڑی خوفناک چپ کا سایہ لڑکوں پر منڈلانے لگا۔ کتنی دیر تک مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے اور زیادہ زور سے کڑک کر کہا: "اگر بتا دو تو بہتر ورنہ ایک طرف سے شروع کروں گا اور دوسرے سرے تک تمام جماعت کی کھال اتار دوں گا۔"

قبرستان میں ایک تنکے کو بھی جنبش نہ ہوئی۔

میں نے اپنی دھمکی کو سچ کر دکھانے کے لئے اگلے بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک لڑکے کو تڑاخ سے چھڑی دے ماری۔ لڑکے میں سے ایک آواز تو "ہائے" کی نکلی اور دوسری آواز یہ تھی "جی اتنگ تو ساری جماعت ...... جی ساری جماعت نے کیا تھا.... لیکن .... لیکن پہل ...... جی پہل مقبول نے کی تھی ...... جی! ....."

کسی اکتائے ہوئے افسر کی طرح میں نے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ مقبول نے پہل کیا کی تھی حالانکہ مقبول میرا بڑا چہیتا شاگرد تھا۔ میں نے اسے آج تک سزا نہیں دی تھی۔ میرے خیال میں اگر اُس لڑکے نے جھوٹ بھی بولا تھا تو محض اس لئے کہ مقبول کو کون سی مار پڑے گی۔ مقبول لائق لڑکا ہونے کی وجہ سے تمام اُستادوں کو پسند تھا اور ٹیچر انچارج ہونے کے باعث مجھے اس سے بہت پیار تھا۔ لیکن آج وہ میری عدالت میں ہی مجرم تھا اور کوئی نہ تھا جو اُسے مجھ سے چھڑا سکے!

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں خونی نظروں سے کر مقبول کے پاس پہنچا تھا تو اس کا رنگ پھولی سرسوں کی طرح ہو چکا تھا۔ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے اس ہاتھ کو ڈس لیا تو دوسرا آگے کر دیا، پھر پہلا، پھر دوسرا ...... وہ باری باری ہاتھ بڑھاتا رہا اور میں پتے کی آگ بجھاتا رہا۔ مقبول کی چیخیں نکلتی رہیں اور اس کے ہاتھ مشین کی طرح آگے پیچھے آتے جاتے رہے۔ میری اور مقبول کی ریس کتنی دیر جاری رہی اور بالآخر ہار میری ہی ہوئی، میں خود ہی ہانپ کر کرسی میں جا گرا۔

کرسی میں بیٹھ کر میں کتنی دیر ہانپتا رہا اور جب سانس نارمل ہوئی تو مجھے اصل بات پوچھنے کا خیال آیا۔ میں نے جماعت سے سوال کیا: "پہل کس طرح ہوئی تھی؟"

مردے آرام سے قبروں میں لیٹے رہے! کوئی جواب نہ آیا۔

میں نے اگلی لائن کے ایک لڑکے کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس سے پوچھا "تم بتاؤ کیا بات ہوئی تھی؟"

"جی ... جی مولوی صاحب جماعت میں ..... جماعت میں آئے ..... تو مقبول نے ...... جی مقبول کی طرف سے ...... جی قیوم کا گھٹا ... مولوی صاحب کو ..... جی قیوم مولوی صاحب کی .... "

لڑکا اپنی طرف سے میری بات کا جواب دے رہا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے اس نے سٹین گن بھری ہے اور اب اُٹھ کر مجھ پر باڑھ مار رہا ہے ابھی بات اس کے منہ میں تھی کہ میں نے گولی سے زخمی ہو جانے والے کی طرح چیخ کر کہا: "بکواس بند کرو ..... ودے! چپ ہو جاؤ!" اس روز میرے یہ آخری لفظ

تھے جو میں نے ہوش میں دیئے۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بے جان مجسمہ ہوں اور کرسی میں فٹ ہو گیا ہوں ہلنے جلنے کی پوری کوشش کی لیکن مجھے بھی کبھی بل پڑے ہیں؟ میں چاہتا تھا کہ لڑکوں سے روپوش ہو جاؤں لیکن چھپنے کے لئے میرے پاس ایک ہی پردہ تھا۔ میری کھال کا پردہ! لیکن میری کھال اس وقت بڑی نرم تھی!! لڑکوں کی آنکھیں میری کھال کو چیر کر میرے اندر پہنچ رہی تھیں۔ کتنی دیر تک میرے اعضا میرا ساتھ دینے سے منکر رہے اور آخر کار جس عضو نے سب سے پہلے میری طرف ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا وہ میرے پاؤں تھے۔ میں نے پاؤں کو جنبش دی اور باقی جسم کو پاؤں کے بل پر لیں باہر لے گیا جیسے میرا اوپر کا جسم لکڑی کا ہو اور نیچے پاؤں کے پہیئے لگے ہوں؟

پہیئے اس مرتبہ تک چلتے رہے جب تک میں بورڈنگ ہاؤس میں اپنے کمرے میں نہیں پہنچ گیا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے آج تک بے ہوش نہیں ہوا سوائے اُس رات کے جو مقبول کو مارنے کے بعد آئی۔ میرا روم میٹ ماسٹر عبدالغنی پتہ نہیں کب آیا، میں نے رات کس طرح گزاری، کمرے میں پہنچنے کے بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو یہ اگلے دن کی صبح کا ہنگام تھا۔ ماسٹر عبدالغنی منہ لٹکائے میری چارپائی پر بیٹھا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو عبدالغنی کھل گیا لیکن فوراً ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ ہمیشہ متضاد حرکات ایک ہی سانس میں کرنے کا عادی تھا۔ تھوڑی سی دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں نے دھیمے سے مسکرانا شروع کیا اور ہاتھ پاؤں کو جنبش دی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ بوجھل ہیں۔ میں دونوں ہاتھوں کو آنکھوں کے سامنے لایا تو میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں پر چمڑے کے دستانے چڑھا کر انہیں زور سے باندھا گیا ہے۔ کبھی میں ہاتھوں کو دیکھوں اور کبھی عبدالغنی کو۔ آخر میں نے آہستہ سے پوچھا "یہ کیا؟"

عبدالغنی کا گلا رندھ گیا اور وہ بولا "ظالم! میں نے تمام رات اُلو کی طرح تمہارے سرہانے جاگ کر گزار دی ہے۔ تم تمام رات ایک ہی دہائی دیتے رہے، میرے ہاتھوں کو ٹکڑے کر دو ... میں مر گیا ہے! میرے ہاتھوں کو ٹکڑے کر دو ورنہ میں مرا!!"

میں آہستہ آہستہ چارپائی سے اُٹھا۔ دستانے اُتار کے استعفیٰ لکھا اور عبدالغنی کے ہاتھ سکول بھجوا دیا۔ (پنجابی سے)

سعیدہ احسان

دائرے

"آپ کو وقت نکالنا ہی ہوگا۔ دیکھئے ابھی سب لوگ ڈائننگ ہال میں ہیں۔ آپ کی غیر موجودگی کا کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا پلیز پلیز" وہ اچانک چونکی۔ ہال میں ابھی تقریریں ہو رہی تھیں اور تالیوں کی آواز سے ہال گونج اٹھتا تھا۔ زمان صاحب غالباً ملن صاحب کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے یہ شخص ہر دوسرے شخص کا شکریہ ادا کر رہا تھا جب وہ کھانے کی میز سے اٹھی تو آئی جی توقیر احمد صاحب نے جو اس کورس کے اسپانسر تھے تقریر ختم کی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔

کیا خودی کی تکمیل یوں ہی ہوتی ہے۔ کیا انا اسی طرح پروان چڑھتی ہے! کیا زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں کے داغ ان خود ساختہ تعریفوں سے مٹ جاتے ہیں! کیا......!

"آپ پھر کچھ سوچنے لگیں۔"

"جی؟" اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو دیکھا۔ شوق، التجا اور امید کے اصرار کی نگاہوں، اس کی آواز میں لرز رہے تھے۔ اسے اپنے ذہن میں ایک جھنجھنی سی محسوس ہوئی۔

پھر ماضی اور حال کے فاصلے سمٹ گئے۔ کسی دور کی آواز اس کے کانوں میں گونجی "جب تم میرے پاس ہوتی ہو اتنی قریب ہوتی ہو کہ میں تمہیں چھو سکوں۔ اس وقت تمہارے تبسم کے دلاسے روح کے خلا بھر جاتے ہیں۔ تمہاری قربت مجھے ایسی آسودگی عطا کر دیتی ہے جو ہر خواہش، ہر آرزو، ہر تمنا کی تکمیل ہو۔ پھر بھی میں تمہیں چھوتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں تم ہوا میں تحلیل نہ ہو جاؤ، بکھر نہ جاؤ۔ تمہاری آنکھوں کی گہری اُداسی مجھے خوفزدہ کر دیتی ہے چھپے ہوئے اندیشے سر اٹھاتے ہیں اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں کبھی سمجھ بھی سکوں گا... کیا....

یکایک ایک سوال گونجا "آپ کہاں ہیں؟ کیا سوچ رہی ہیں آپ؟ دیکھئے لوگ شاید ادھر آ رہے ہیں۔" وہ چونک کر سیدھی بیٹھ گئی۔ ہال تالیوں کے شور اور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ غالباً آخری تقریر ختم ہو گئی تھی۔ یہ سب کامن روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کا ساتھی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ "چلئے باہر کار میں بیٹھتے ہیں" اور کمال نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ تازہ ہوا کے ایک جھونکے نے اسے پوری طرح بیدار کر دیا۔ اس کے ذہن نے ایک جھرجھری سی لی اور اب وہ پوری طرح اس موقع، اس لمحے سے آگاہ ہو گئی۔ آخر یہ چھوکرا جس سے اس کی ملاقات کی میعاد محض ایک شام تھی، جو عمر میں بھی یقیناً اس سے چھوٹا تھا، جوان، حسین اور دولتمند بھی، پڑھا لکھا بھی تھا آخر چاہتا کیا تھا؟ محبت؟ ناممکن! خوش وقتی؟ مگر وقت گزارنے کے اس سے بہتر ذریعے بھی اسے ضرور معلوم ہوں گے۔ ... پھر یہ کیا ہے؟

کار میں بیٹھ کر کمال نے اپنا سگریٹ کیس کھول کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا "سگریٹ لیجئے۔"

"شکریہ میں سگریٹ نہیں پیتی"

"آپ وقت سے پہنچیے۔ میری خاطر پلیز"

اس نے ایک سگریٹ اٹھالی اور سگریٹ جلاتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی لرزش پر اسے تعجب ہوا۔ آخر یہ گھبراہٹ کیوں! "مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا تھا، کہنا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو۔ اور اگر آپ کے پاس وقت ہو تو۔ اسی لئے باوجود اس کے کہ کل شام آپ نے بتادیا تھا کہ آپ مصروف ہوں گی پھر بھی میں ملنے یہاں آنے کی جرأت کی۔ اس امید میں کہ شاید میں ——— آپ کو کچھ دیر کے لئے اپنے ساتھ ڈرائیو پر جانے کے لئے ——— آمادہ کرسکوں......."

"دیکھئے میں مجبور ہوں اسی لئے میں نے کل بھی آپ کو بتادیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی میری غیر موجودگی محسوس کی جارہی ہوگی"

"لیکن کل تو آپ کالادنا چلی جائیں گی"

اسے ہنسی آگئی "مگر پرسوں واپس بھی تو آجاؤں گی"

"اچھا تو پھر وعدہ کیجئے کہ واپس آنے پر ملیں گی۔ ورنہ میں یہیں ستیہ گرہ کردوں گا"

"اچھا پھر آپ سلیچر کو ٹیلی فون کرلیں"

"جی نہیں، سلیچر کو میں خود جا حاضر ہوجاؤں گا۔ اور اب صرف دس منٹ کے لئے ڈرائیو پر چلیے۔ دیکھئے نا آپ نے تو آنے کے بعد کافی بھی نہیں پی تھی۔ بالکل قریب ایک ریستوراں ہے۔ دس منٹ میں واپس آجائیں گے"

"اچھا چلئے" اس نے بہت بے دلی سے کہا۔ اس لڑکے کا اتنا اصرار اسے اچھا نہ لگا مگر اس کے اس بے پناہ شوق اور بے تکان اصرار کو وہ رد نہ کرسکی اور کسی انجانے ذہنی انتشار اور بے چینی نے اسے جھنجوڑ کر اس نیم بے حسی کے عالم سے بیدار کردیا۔ اس گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے اس نے نظریں نیچی کرلیں۔ اب اس کی نگاہیں کافی کی پیالی میں گہرے بھورے مشروب میں ڈوب گئی تھیں۔ پھر جیسے اس کا دم الجھنے لگا۔ حال دھندلا ہوتا گیا اور یکایک ماضی کی ایک شام ابھری۔ ایک آواز اس کے کانوں میں بس رہی تھی۔ کافی کی پیالی میں ایک اور چہرہ ابھرا! جس پر پیار کی بے اختیاری تھی، آرزوؤں کی تپش تھی، لگاوٹ کی چاہت تھی۔ اور محرومی کے اندیشے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا "جب تم میرے قریب ہوتی ہو......."

اور یکایک اسے احساس ہوا کہ اس کا ساتھی بات کرتے کرتے خاموش ہوگیا ہو۔ سگریٹ کا آخری جلتا ہوا سرا اس کی انگلیوں کو جھلس رہا تھا اور وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے لہجے اور آواز میں شکایت سے اسے بڑی ندامت ہوئی۔

"آپ خاموش کیوں ہوگئے"

"بیکار ہے۔ آپ نے سنا ہی نہیں کہ میں نے پچھلے دس منٹ میں کیا بکواس کی ہے۔ آپ کافی ختم کرلیں تو میں آپ کو واپس چھوڑ آؤں"

تھکن سے چور وہ کمرے میں پہنچی۔ اگر اس وقت گرم پانی غسل کو مل جائے تو شاید کچھ تھکن دور ہو۔ اس نے سوچا۔ کمرے میں عجب بے ترتیبی کا عالم تھا۔ جانے سے پہلے اس نے جلدی میں بیگ خالی کیا تو تمام کتابیں پلنگ پر ڈال دی تھیں۔ اب کون گرم پانی مانگنے جائے۔ ویسے بھی ہوسٹل کے نوکر سوچکے ہوں گے۔ وہ پلنگ کتابوں سے خالی کرنے کے لئے بڑھی۔ اتنی موٹی موٹی کتابیں اور

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ پندرہ دن میں ساری کی ساری ختم بھی کر دی جائیں۔ ہنہ!

اس نے بڑی بیزاری سے کتابیں اٹھائیں۔ دائیں ہاتھ سے بائیں بازو کے آغوش نما خم میں ایک کے بعد ایک کتاب رکھنی شروع کی۔ وہ کتابوں کو اس خم میں بھر رہی تھی کہ یکایک اس کا ہاتھ ایک سرد چکنی سطح پر رک گیا۔ اس نے نظر جما کر اس اجنبی چکنی سطح کو دیکھا۔ عام سائز سے مختلف ایک نیلی خوبصورت سی نوٹ بک نظروں کے دائرے میں آئی اس نے حافظے پر زور دے کر اس نوٹ بک کا پھر سے جائزہ لیا اور جھنجھلا اٹھی۔

یہ نوٹ بک یہاں کیسے ہے؟

مگر یہ ہے کس کی؟ میری تو نہیں؟ کسی نے دی تھی؟ مگر کس نے؟

جھنجھلاہٹ اور دوہری اس کیفیت میں بائیں بازو کے خم کی ساری کتابیں پھسل کر فرش پر آ رہیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور بے بس ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

انگلیوں نے نوٹ بک کے ورق الٹنے شروع کئے۔ سادہ اور چکنے کاغذ ـــــ مگر خالی اور ناآشنا۔ پھر بھی اجنبیت کے باوجود اس کی انگلیوں کا لمس، ان سادہ اوراق کی چکنی سطح کو سہلانا چاہتا تھا۔ ان سے الگ نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر جھنجھلاہٹ کی ایک لہر دل و دماغ میں تیری۔ اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی انگلیاں اس کے ارادے کی تابع نہیں رہیں۔ کسی خارجی ارادے کی قوت جیسے ان کو اپنا مطیع فرمان کئے ہے۔

اس نے آہستہ آہستہ ایک ایک ورق پلٹنا شروع کیا۔

ذہن میں کسی انجانے طوفان کی پہلی لہر اٹھی۔ وہ ہلکے ہلکے ورق پلٹتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ نوٹ بک اتنی اجنبی ہوتے ہوئے بھی اسے اتنی عزیز کیوں تھی کہ اب وہ اسے الگ نہیں کر سکتی تھی۔ نوٹ بک کی نیم شناسا سا نیم اجنبی کشش اس کی انگلیوں سے چلتی ہوئی اس کے رگ رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ وہ ایک بے بس کر دینے والے جذبے کی کڑی گرفت میں تھی۔ ایک اور ورق پلٹا گیا جو باقی اوراق کی طرح خالی تھا۔ اس کی یادداشت کا تانا بانا اور الجھ گیا۔ پوری توجہ سے سوچنے کے بعد بھی کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ آخری صفحہ باقی تھا۔ اس کی انگلیوں میں ناامیدی رینگ رہی تھی۔ بوجھل انگلیوں سے اس نے آخری ورق الٹا۔ سامنے ورق پر دائرے ہی دائرے تھے۔ چھوٹے بڑے ہر پیمانے کے دائرے..... شاید تھکن سے اس کا ذہن واہموں کے دائرے بُن رہا تھا۔ پھر اس نے بہت احتیاط کے ساتھ ہلکے سے آنکھیں کھولیں کہ حقیقت کو اس دھوکے سے بچایا جائے، لیکن دائرے اب حقیقی شکل اختیار کر چکے تھے اور اُسے جواب طلب نظروں سے گھور رہے تھے۔

اور ایک دم بجلی کی تیزی سے جیسے ذہن سے ایک دبیز پردہ اٹھ گیا اور یہ دائرے اسے ایک لمحے میں لے گئے۔

رات ہو چکی تھی اور امتحان کے پرچے ختم ہی نہ ہو رہے تھے۔ وہ بیزار ہو گئی۔ اگلی صبح اُسے ایک مختصر کورس پر ایبٹ آباد جانا تھا۔ اسے بھی ختم کرنا تھا۔ ایک پیالی چائے پی جائے، پھر سے کام شروع کیا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور پانی کی کیتلی رکھ کر واپس کمرے میں آئی

تو دروازے پر اعجاز کو کھڑے پا کر اسے تعجب ہوا۔ اعجاز نہایت محتاط آدمی تھے۔ وضعداری ان کی سرشت میں تھی اور یہ ان کے آنے کا وقت نہ تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے جیسے وہ ٹھہرائے اور پھر فوراً معذرت کی۔ "میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ آپ سے خدا حافظ کہہ لوں۔ صبح جا رہی ہیں نا آپ"

"جی ہاں صبح سات بجے جانا ہوگا۔ آپ تشریف تو رکھئے" اور پھر ایک ناگوار، بے چین سی خاموشی طاری ہو گئی۔

اعجاز کو وہ پچھلے ایک سال سے جانتی تھی، نہایت خاموش، روایتوں کے پابند مگر خوش مذاق اور بے حد ذہین۔ اسی ذہانت سے

وہ بے حد مرعوب تھی اور اصل میں یہی دونوں کے درمیان شناسائی کے رشتے کی بنیاد تھی کیونکہ اعجاز نے ہمیشہ ہمیشہ اس بات کا اعلان کیا تھا کہ "میری نہایت براق اور صیقل شدہ ذہانت، تمہاری اس خداداد ذہانت کی بے حد معترف ہے جس سے تم کوئی کام لینے پر آمادہ نہیں"۔

اور وہ بار بار اعجاز کے منہ سے اپنی ذہانت کا یہ اعتراف سن کر اسے ہمیشہ ایک عجیب طرح کی فتح مندی کا احساس ہوتا رہا۔ اصل میں دونوں کے درمیان ذاتی قسم کی گفتگو اسی فقرے پر محدود تھی اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ آتی تھی۔

اس میں کسی اونچ نیچ یا اتار چڑھاؤ کا یوں بھی امکان بہت ہی کم تھا۔ اعجاز زرہ بکتر پہن کر زندگی گذارنے کے ماہر تھے۔ جذبات کی لطافت اور گہرائی سے بہرہ ور ضرور تھے مگر عقل اور ہوش مندی اور سود و زیاں کو جذبات پر ہر دم جذبات پر حاوی رکھنا ان کے نزدیک جیسے انسانیت کا سب سے اعلیٰ مقصد تھا۔

اعجاز نے اپنے ان تعلقات کو وہ ہمیشہ اپنی سہیلیوں کے سامنے "ذہنی یگانگت" کا کتابی نام دیتی تھی۔ اصل میں یہ ایک عجیب طرح کا اعتماد، ایک نرالے قسم کا بھروسا تھا جو اعجاز کو اپنے آپ پر تھا اور اسے بھی یہی بھروسا اعجاز پر تھا۔ اسی لئے اعجاز کو یہ اجازت تھی کہ جب وقت چاہیں اس کے گھر آ سکتے تھے۔

لیکن آج اعجاز کو یوں ناوقت دیکھ کر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ ایک ہی نظر نے اسے بتا دیا کہ جو اعتماد اعجاز کو ہمیشہ اپنی ذات پر رہا ہے وہ ان کے چہرے پر اور ان کی آنکھوں میں موجود نہیں تھا۔

وہ خاموش طبع آدمی تھے مگر آج اس خاموشی کی تہہ میں کوئی طوفانی لہر ضرور تھی۔ اکثر جب انہیں کسی سے اپنے کام کے سلسلے میں اختلاف رائے ہوتا تھا تو وہ اس سے ذکر کرتے تھے اور وہ ان کا بوجھ ہلکا کرنے میں کامیاب ہو جاتی مگر آج تو وہ کچھ بول ہی نہ رہے تھے اور بہت بے چین بھی نظر آ رہے تھے۔ اس نے بہت سوچا مگر کوئی ایسی بات ذہن میں نہ آئی جس سے ان کی اس خاموشی کو توڑا جاتا۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں"

اور جب وہ چائے بنا کر لائی اور ایک پیالی اعجاز کو دی تو اسے ان کے ہاتھ میں ہلکی سی بے معلوم سی کپکپاہٹ کا احساس ہوا۔ اونہہ! یونہی — اس نے یہ شبہ فوراً رد کر دیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اعجاز کے ہاتھ میں ایک نیلی نوٹ بک تھی۔

"یہ میں آپ کے لئے لایا ہوں"

"بہت خوبصورت ہے"

اور پھر خاموشی۔ اب اسے جھنجھلاہٹ شروع ہوئی۔ کیا مصیبت ہے۔ مجھے اتنا بہت سا کام کرنا ہے اور یہ کچھ بولتے ہی نہیں۔

کچھ نہ کچھ کرنے کو انگلیاں کانپ اٹھیں تو اس نے نوٹ بک کے سادہ اوراق الٹنے شروع کئے۔ ایک، دو، تین..... خیال آیا، کیوں نہ جو جو اشعار یا فقرے یاد ہیں یا کہیں سے پڑھوں گی وہ اس نوٹ بک میں لکھتی جاؤں۔ کم از کم روز کے تین اندراج ہوں..... مگر اتنا وقت کس کے پاس ہوگا — خیر — ،

یکایک اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ اعجاز کا ساکت و صامت چہرہ اب بھی اس کے سامنے تھا۔ اس کی شخصیت نے اپنے بچاؤ کے لئے جو نیم دائمی زرہ بکتر پہن رکھا تھا اس کی کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ اس کے آہنی حلقے اور فولادی دبیز پترے خزاں کے پتوں کی طرح اپنے ہی بوجھ سے ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ اس شخصیت کے گرد ایک کے بعد ایک دفاعی حصاروں کی جو فصیلیں تھیں، ان میں جگہ جگہ شگاف تھے۔ یہ اونچے

ہماری مٹی میں مل رہے تھے فیصلیں زمین بوس ہو رہی تھیں۔

وہ پھر چونکی۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ مسکرا رہی تھی۔ اعجاز کی آنکھوں میں نمی اور چمک دل کرب کی ہردوں سے دست و گریبان تھے۔ ان میں چاہت اور حسرتوں کے شعلے لپک رہے تھے۔

وہ ڈر گئی۔ اعجاز کی آواز نے اُسے ... ذ ... یا، وہ کہہ رہے تھے "تم مانو گی کہ جب، تم میرے پاس ہوتی ہو، اتنی قریب کہ میں تمہیں چھو سکوں تو تمہارے تبسم کی دلاوت میری ویران روح کے خلا بھر جاتے ہیں؟ تمہاری قربت مجھے ایسی آسودگی دیتی ہے جو ہر خواہش، ہر تمنا، ہر آرزو کی تکمیل ہو۔" اعجاز نے ٹھنڈی سانس لی۔ اتنی گہری اور ... ناک کہ جیسے دل سینے سے نکل پڑے گا۔

بہت آہستہ سے اُٹھ کر انھوں نے ایک سگریٹ سلگایا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ان کی آواز میں اب آنسو تیر رہے تھے "پھر تو میں تمہیں چھوتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پگھل نہ جاؤ، بکھر نہ جاؤ، تحلیل نہ ہو۔ تمہاری آنکھوں کی گہری اداسی مجھے محتاط کر دیتی ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں تمہیں کبھی سمجھ بھی سکوں گا...... شاید... شاید.... اچھا میں جاتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع اور اچانک تھا کہ اس کے اعصاب، اس کی عقل مفلوج تھے۔ کچھ نہ دیکھنے والی آنکھوں سے اس نے پہلے کرسی کی طرف دیکھا، پھر کھڑکی کو ٹٹولا — پھر اس نوٹ بک کو جس پر — اس کا کانپتا ہوا، بے زبان ہاتھ دائرے ہی دائرے بنا رہا تھا بے ہنگم، ٹیڑھے میڑھے، چھوٹے بڑے دائرے — دائرے ہی دائرے —

اب یہی دائرے ایک زندہ زنجیر بن کر اس کے رگ و پے میں ہیجان تھے اور وہ ان کی اسیر تھی

کمال مصطفیٰ

یہ خانہ بدوش لوگ

یہ لوگ جو ہمارے گھروں کے سامنے کھلے میدانوں میں یا سڑکوں کے کنارے اپنے ٹھکانوں میں آکر عارضی خیمے گاڑ لیتے ہیں، کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں، نیلے تاروں بھرے آسمان کے نیچے زمین پر سوتے ہیں، ہنستے ہیں، مگن رہتے ہیں اور باہر زمین پر آگ جلا کر وہ اسی کی طرح ہی جل جل کر کھانا پکاتے ہیں لیکن پھر بھی ہم سے الگ تھلگ اور دور رہتے ہیں اور یوں اکیلے اور تنہا نظر آتے ہیں اور پھر چند دن ایک جگہ قیام کر کے اپنے خیمے اکھاڑ کر کسی دوسری طرف چل دیتے ہیں ——— تو یہ لوگ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ انہیں زمین کا کوئی خطہ کوئی کونا پسند کیوں نہیں آ جاتا؟

اور وہ بھی تھے جو ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے نکلے، ان لوگوں کے ساتھ رہے، اُٹھے بیٹھے لیکن پھر بھی نہ جان سکے ——— کچھ زیادہ سکے اتنا بھی نہیں، جو ان سے آگے جانے والوں نے جان لیا تھا ——— کہ یہ لوگ دراصل اسی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں جو آج سے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس پہلے ان کے بڑوں نے اختیار کی تھی۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان کے بڑے تو ایسے اس لئے تھے کہ وہ مویشی چراتے تھے اور انہی کا گوشت کھاتے، انہی کا دودھ پیتے اور انہی کی کھالوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے اور جب ان کے جانوروں کے لئے گھاس ختم ہو جاتی تو وہ اپنے جانوروں کو ہنکاتے اور یوں ہی منہ اُٹھائے کسی اور سمت چل دیتے ——— کنبوں میں، قبیلوں میں، قافلوں میں۔

پر یہ جو آج ہیں، یہ کیوں پریشان و دربدر مارے مارے پھرتے ہیں؟ ان کو کون سا غم ستاتا ہے؟ ——— یہ کوئی نہیں سوچتا۔ البتہ چند تحقیق کرنے والے، تاریخ جاننے والے وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے پرانوں کے خلاف بغاوت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کا جواب پا لیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ خانہ بدوش لوگ ایک پرانی داستان کو دہرا رہے ہیں۔ وہ داستان جو سب داستانوں سے پہلے شروع ہوئی تھی اور جو ابھی تک ختم نہیں ہوئی ——— لیکن یہ سب باتیں پرانوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔

تو اس داستان کا آغاز یوں ہوا کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے قدیم انسان کو ایک حادثہ پیش آیا تھا بلکہ یوں تھا کہ یہ حادثہ قدیم انسان کو نہیں، قدیم زمین کو پیش آیا تھا۔ آج سے ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے سورج مغرب سے طلوع ہوتا تھا اور یوں تھا کہ ان دنوں زمین مشرق سے مغرب کی سمت گھومتی تھی۔ پر یہ بات جو اب ہم کو الٹی نظر آتی ہے، اس زمانے کے لوگوں کے لئے بالکل صحیح اور قدرتی ہوگی کیونکہ جو ہوتا آیا ہے، ہوتا آیا ہے اور انسان روایت کا مارا ہوا، عادت سے مجبور، عمل پیرا ہے۔ اس کے باوجود ان باتوں کا اب ہزاروں بلکہ لاکھوں برس بعد ہم صرف اندازہ ہی لگا سکتے ہیں کیونکہ ہمیں اس قدیم واقعہ کا کوئی شعوری علم نہیں ہے۔ ہمارے ذہن سے جو ویسے ان گنت صدیوں کا گہوارہ ہے یہ واقعہ بالکل ہی مٹ چکا ہے۔ پر ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر یوں ہوا تھا تو وہ کوئی بہت ہی بڑے ہیجان کا حادثہ ہوگا جو اب ہماری یادوں، ہمارے شعور

ضمیر شعور سے بھی بالکل مٹ چکا ہے۔

اور کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ حادثہ نہیں تھا بلکہ قدرت نے ہی ایسا چاہا تھا اور اس لئے یہ زندگی کا ایک عام سا واقعہ تھا جس طرح موت، تنزل، تبدیلی۔ اصل میں یہ واقعہ، یہ تبدیلی اس قدر آہستہ اور مسلسل تھی کہ انسان کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔ انسان کی کئی نسلیں اس کے دوران پیدا ہوئیں، آئیں اور چلی گئیں، اور انہیں اس بات کا علم ہی نہ ہوا کہ وہ کسی حادثے سے دوچار ہیں۔ اور کون جانے کہ آج کا انسان بھی ان اگلے گئے ہوؤں کی طرح صدیوں سے اسی قسم کے کسی حادثے کا شکار نہیں ہے اور شاید ہم سب صرف یہی جاننے کو بیتاب ہیں ــــ لیکن یہ ایک اور کہانی ہے۔

پر یہ جاننا بھی مشکل ہے کہ وہ حادثہ جو ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے پیش آیا، اس کا اثر اس زمانے کے انسان پر کیا ہوا۔ کون جانے کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ صرف اندازے ہیں، اور کچھ نہیں۔ اور کون جانے کہ ہم جاننا ہی نہیں چاہتے کیونکہ ہم ڈرتے ہیں کہ زیادہ جاننے کی کوشش میں جو کچھ ہم جانتے ہیں اُسے بھی نہ کھو بیٹھیں۔ اور جانتے ہی کتنا ہیں! صرف اتنا کہ آہستہ آہستہ زمین کی گردش سست ہوتی گئی اور دن اور رات بڑھتے گئے۔ سینکڑوں برس بیت گئے اور انسان کی کچھ نسلوں کو تو اس بات کا علم ہی نہ ہوا لیکن پھر اچانک، سب ہی کو یک ساتھ یہ احساس ہوا کہ ان کی دنیا میں کوئی تبدیلی آ رہی ہے جو اجنبی اجنبی سی ہے۔ اب دن کو زیادہ گرمی پڑتی اور رات کو زیادہ سردی۔

یونہی دن بیتا کئے اور پھر ایک دن یوں لگا جیسے دھرتی گھومتے گھومتے تھک گئی ہے اور اب آرام چاہتی ہے اور ایک دن ڈرے سہمے لوگوں نے اپنے بچوں کو جو غیر ارادی طور پر سمٹے سمٹائے بیٹھے تھے جب یہ بتایا کہ دھرتی دیوی تھک گئی ہے تو بچے بولے کہ اگر وہ تھک گئی ہے تو کچھ دیر کے لئے سو کیوں نہیں جاتی۔ اس پہ ڈری سہمی مائیں اور زیادہ ڈر گئیں اور ان کے ماتھوں پر شکنیں پڑ گئیں (شاید انسان کے ماتھے پر یہ پہلی شکنیں تھیں) "نہ نہ ایسے سوال نہیں کیا کرتے۔ اس طرح نہیں سوچا کرتے نہیں تو دھرتی دیوی خفا ہو جائے گی۔"

پر دھرتی دیوی تو پہلے ہی سے خفا ہو چکی تھی اس ہر وقت کے گھومنے سے وہ بیزار ہو چکی تھی اور اب وہ آرام چاہتی تھی لیکن بیچارے انسان کیا کرتے۔ شروع میں تو انہوں نے زمین کے اندر گہرے غار کھود لئے تھے۔ دن کی تپش سے بچنے کے لئے وہ تمام دن اپنے جانوروں کے ساتھ ان میں گھسے رہتے اور جونہی دن چھپنے لگتا اور سایے لمبے ہونے لگتے، انسانوں اور حیوانوں چرند اور پرند کے غول اپنی پناہ گاہوں سے شکار کی تلاش میں نکلتے جو جس کے ہاتھ آ جاتا اس کی خوراک بن جاتا اور جب سورج ڈوب جاتا اور افق کی سرخی سیاہی میں تبدیل ہو جاتی تو یہ دنگل، یہ آنکھ مچولی ختم ہو جاتی اور انسان، مویشی اور درندے پھر زمین کے اندر، زمین کی پناہ میں چلے جاتے۔ اپنے اپنے ٹھکانوں میں چھپ جاتے اور اگلی شام کا انتظار کرتے پر یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ اب گرمی اس قدر شدید ہو گئی تھی کہ درخت اور گھاس اور پھول رفتہ رفتہ مرجھانے لگے تھے۔ شام کے قریب ان میں کچھ جان آتی تو رات ان کو اپنی خنک تہوں میں پالیتی۔

پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ جب دن کی گرمی اور رات کی ٹھنڈک بیچارے انسانوں کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ انہوں نے اپنی بستیاں چھوڑ دیں اور مویشیوں اور حیوانوں اور انسانوں کے قافلے غیر ارادی طور پر مشرق کی سمت چل دیئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ مسافت بے انتہا طویل ثابت ہوگی۔ اتنی طویل کہ ان کو طوالت کا احساس بھی نہ رہے گا کیونکہ ان کی آنے والی بے شمار نسلیں مشرق کی طرف منہ اٹھائے چلے جانے والے اس قافلہ کا ساتھ دیں گی، بوڑھی ہو جائیں گی، تھک جائیں گی، ہار جائیں گی لیکن پھر دوبارہ نئی انسانی نسلیں پیدا ہوں گی جو ایک نئے عزم کے ساتھ پھر اسی قافلے میں شامل ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ قافلوں میں چلنا ان کی فطرت بن جائے گی ــــ اور وہ ازلی و ابدی قافلہ چلتا رہے گا۔ یونہی بے مقصد بے معنی راستوں سے ہوتا ہوا۔ ان لوگوں کی قسمت میں اب آرام نہ تھا۔ آرام کی تلاش میں جس منزل کی طرف وہ روانہ ہوئے تھے وہ ان کو نظر نہ آتی تھی۔ اپنے نہ ختم ہونے والے سفر کے دوران ان کی کوشش یہ ہوتی کہ وہ ہمیشہ اس علاقے میں رہیں۔

جہاں رات کی تاریکی اور دن کی روشنی دونوں دھندلکے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک دوڑ تھی جو جاری تھی لیکن دھندلکا آگے ہی رہتا۔ وہ برسوں اسی تگ و دو میں لگے رہے اور برسوں ہی اس میں ناکام۔ لیکن رفتہ رفتہ زمین کی گردش سست ہوتی گئی۔ دن اور رات زیادہ طویل ہوتے گئے، وہ ایک دن ایسا ہوا کہ دھندلکے کا علاقہ انسانی پہنچ میں آگیا۔ یہ ان کے لئے ایک خوش آئند دن تھا کیونکہ اب یہ مویشیوں اور انسانوں، پرندوں اور حیوانوں کا سیلاب ہر وقت دھندلکے میں رہتا اور دھندلکے ہی کے ساتھ سفر کرتا۔

اب دن اور رات اس قدر طویل ہو چکے تھے کہ گرمی کی شدت اور سردی کی تیزی اور دھندلکے کی تاریکی سے گھاس پھوس، درخت اور پھول مرجھا چکے تھے۔ زمین پر ایک مردنی سی چھا گئی تھی اور سمندری جانور ساکت، خاموش اور اندھیرے پانی کی عمیق تہوں میں جا چھپے تھے۔ پر انسان تو مجبور رہے۔ ان تمام بد بختوں کو اپنے مویشیوں کے لئے ہریالی کی ضرورت تھی اس لئے ان میں سے کچھ لوگ گھاس پھوس کی تلاش میں مختلف راہوں پر نکل پڑے۔ اسی لگن کے مارے کچھ لوگ، شمالی قطب کی طرف، اس کے نزدیک جا نکلے اور پہلی بار ہری بھری زمین کو دیکھ کر ان کی ترستی آنکھوں میں چین کی چمک نمودار ہوئی اور ان کے چہرے جو فکر اور پریشانی سے سیاہ اور نحیف پڑ گئے تھے پہلی بار خوشی سے دمک اٹھے۔ انھوں نے تو اس ہلکی ہلکی دھوپ میں ہری بھری جنت پالی تھی۔ چنانچہ یوں ہوا کہ شمالی قطب کے اردگرد آبادی کا بہت بڑا مرکز قائم ہو گیا —— لیکن افسوس کہ کچھ ہی دنوں بعد یہ بستی بھی اجاڑ ہو گئی۔ کیونکہ یہ آبادی سال میں صرف چھ مہینے تک قطب کے اردگرد رہ سکتی تھی۔ شمالی قطب پر جب راتیں لمبی ہونے لگیں تو ان لوگوں نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور پھر ہریالی کی تلاش میں جنوب کی طرف چل پڑے اور اس طرح یوں ہوتا کہ انسانی قافلے دو مختلف اور عمودی سمتوں میں چلا کرتے۔ ایک مستقل مغرب سے مشرق کی طرف اور دوسرا شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی طرف۔ اس مسلسل سفر کے دوران اکثر ایسا ہوتا کہ یہ دونوں قافلے آپس میں مل جاتے اور جب بھی ایسا ہوتا تو بہت سے لوگ اپنے پہلے قافلے کو چھوڑ کر دوسرے میں شامل ہو جاتے۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہ ایک ہی رخ چلتے چلتے اکتا گئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ منچلے تھے اور نئے نئے علاقوں کو دیکھنے کا شوق ان کو زمین کے مختلف حصوں میں لے جاتا۔ اور قافلے چلتے رہے، انہی دو سمتوں میں چلتے رہے۔

اور پھر یوں ہوا کہ زمین کی گردش بالکل ہی رک گئی۔ زمین کب رکی اور کتنی دیر تک ساکت رہی ہے —— کون جانے —— یہ تو وہ بھی نہیں جانتے جو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کچھ کا تو کہنا یہ ہے کہ زمین سالہا سال تک ساکت رہی لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کتنے سال تک تو وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکے۔ اور وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صرف چند لمحوں کے لئے زمین کی گردش بند ہوئی اور اس کے بعد اس نے الٹی سمت میں گھومنا شروع کر دیا۔ ہاں البتہ ساکت ہونے سے پہلے اور اس کے بعد بعد عرصے تک زمین کے گھومنے کی رفتار اس قدر سست تھی کہ اس زمانے کے لوگوں کو یہی محسوس ہوا جیسے زمین عرصے سے ساکت ہو۔ کیونکہ اب ان کا طویل سفر ختم ہو گیا تھا۔ شاید وہ منزل تک پہنچ گئے تھے —— اور اب ان کو دھندلکے کے پیچھے بھاگنا نہیں پڑتا تھا۔ زمین کو ساکت ماننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ایسے علاقوں میں منتشر تھے جہاں اگرچہ روشنی اور تاریکی کی حدیں آپس میں ملتی تھیں لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ روشنی کی حد کہاں ختم ہوتی تھی اور تاریکی کہاں سے شروع ہوتی تھی اس لئے وہ یہ محسوس نہ کر پائے کہ زمین کی حرکت کب بند ہو گئی۔ ان کے یہ نہ جاننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس دوران انسان کی کئی نسلیں آئیں اور چلی گئیں۔ انسان کی یہ نسلیں دھندلکے کی نسلیں تھیں۔ ان میں اکثر انسان تو رات کی تاریکی اور دن کی تمازت سے بالکل ہی ناواقف تھے۔ البتہ چند لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے بزرگوں سے دھندلکے سے باہر کی دنیا کے بارے میں عجیب و غریب قصے سن رکھے تھے جنھیں یہ کہہ کر ڈرا دیا گیا تھا کہ خبردار ان علاقوں میں نہ جانا۔ ایک طرف تو دھوپ کی تپش سے تم جھلس جاؤ گے اور دوسری طرف اندھیرے میں تم بھٹک جاؤ گے اور اپنا راستہ کھو بیٹھو گے لیکن ایک آدھ بار یوں ہوا کہ چند سر پھرے ایسے بھی پیدا ہو گئے جو اپنے بزرگوں کے کہنے کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ مشرق یا مغرب کی سمت کچھ دور تک نکل جاتے اور پھر واپس آ کر ان علاقوں کا جہاں تنہا دمکتا سورج تھا یا تاریکی تھی اور لق و دق صحرا یا برف کی ایک چادر —— وہاں کے حالات وہ اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کرتے کہ وہ کہانیاں بن کر رہ جاتے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جو نقشہ انھوں نے اپنی دانست میں بڑھا چڑھا کر کھینچا وہ حقیقت سے بہت کم تھا کیونکہ آخر کو وہ روشنی یا اندھیرے کی سرحد پر سے ہی تو لوٹ آئے تھے۔

اب جبکہ زمین رک چکی تھی، انسان دھندلکے کے خطے میں مستقل آباد ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آرام و آسائش کے لئے وہ تمام چیزیں پیدا کر لی تھیں جو بے فکری اور اطمینان کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس نے اپنی بستیاں بنائی تھیں اور وہ گھر بنا کر رہنے لگا اور انسانی آبادی کا یہ خطہ، یہ پٹی زمین کے چاروں طرف ایک دائرے کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اگرچہ اس آبادی کا یہ خطہ قطبین کے سوا تسلسل کے ساتھ زمین کے گرد پھیلا ہوا تھا مگر آبادی کی ایک پٹی میں رہنے والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ زمین کی دوسری طرف بھی دھندلکے کا خطہ موجود ہے اور وہ بھی انسانوں سے آباد ہے بلکہ ان میں سے اکثر لوگ تو اب یہ بھی بھول چکے تھے کہ وہ جس زمین پر رہ چکے تھے کہ وہ جس زمین پر رہتے ہیں وہ گول بھی واقع ہوئی ہے۔ اور پھر یوں ہوا ہوتا آیا ہے کہ ایک سرپھرے دماغ میں یہ بات سمائی کہ اگر شمال کی طرف چلا جائے اور قطب شمالی کے برفانی غیر آباد علاقے کو بھی پار کر لیا جائے تو دنیا کے دوسری طرف وہ انسانوں کی ایک اور بستی میں جا پہنچیں گے اور اس طرح کچھ لوگوں کی ایک جماعت انسانی توہمات اور مخالفت کے پردوں کو چیرتی ہوئی شمال کی طرف روانہ ہوئی۔ برفانی چوٹیوں کو سر کرتی ہوئی راستوں کو روندتی ہوئی یہ باہمت مردوں کی جماعت شمال کے قطب کو پار کرنے میں کامیاب ہو گئی اور بالآخر زمین کی دوسری طرف رہنے والے انسانوں میں جا پہنچی اور یوں رفتہ رفتہ زمین کے اردگرد قطبین کے راستے سے انسانوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔

زمانہ گزرتا گیا اور زمین کی گردش معکوس جو پہلے آہستہ تھی ـــ اتنی آہستہ کہ اس کا سراغ بھی نہ ملتا تھا یہاں تک کہ یہ بھی پتہ نہ چلا تھا کہ وہ سکوت سے حرکت میں کب آئی تھی ـــ اب تیز اور تیز تر ہوتی گئی۔ اور انسان جو اب تک غافل تھا چونک پڑا۔ اس کے لئے زمین کو حرکت میں تصور کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ پہلے اس کے آباؤ اجداد کا زمین کو ساکت تصور کرنا ـــ اور اس کے لئے یہ خبر بے حد حیران کن تھی۔ زمین کی حرکت کی خبر انسان کو کیسے ہوئی، یہ وثوق کے ساتھ نہیں معلوم۔ شاید پہلے ایک افواہ تھی جو مشرق کی سمت سے اٹھی اور دھندلکے کی پوری پٹی میں شمال سے لے کر جنوب تک پھیل گئی۔ افواہ پہلے تھی اور حقیقت بعد میں یا حقیقت پہلے تھی اور افواہ بعد میں، کوئی نہیں جانتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خبر انسان کے لئے ضرور پریشان کن ہو گی ـ جیسی بھی پریشان کن۔ قدرت کچھ یوں سفاک تھی کہ ان کی ننھی سی، عارضی خوشی کو بھی چھیننا چاہتی تھی اور اس بار قدرت کا یہ کرشمہ تو ان پر اس سے بھی زیادہ گراں گزرا جو ان کے آگے گئے ہوؤں پر گزرا تھا اگرچہ یہ تجربہ ـــ زمین کا گھومنا ـــ ان کے لئے اتنا نیا نہیں تھا جتنا زمین کا ساکن ہونا ان کے بڑوں کے لئے تھا۔ اور یوں ہوا کہ دھندلکے کی پٹی کے مشرق میں رہنے والے پناہ لینے کے لئے دھندلکے کے مغربی حصوں میں وارد ہونے لگے۔ شاید یہ ایک دوسرے بڑے قافلے کی پہلی لہر تھی جو مشرق سے اٹھی تھی اور مغرب کی سمت سفر کر رہی تھی یا شاید یہ پہلا ہی قافلہ تھا جو کچھ دیر پڑاؤ کرنے کے بعد اب اسی سمت چلنا شروع ہو گیا تھا جس سمت سے آیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کس سمت سے آیا تھا اور کس سمت اسے جانا تھا۔ اور یوں ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں سمندری لہروں کی طرح لوگوں کی کھیپ کی کھیپ دھندلکے کے مشرقی کنارے سے اٹھتی اور مغرب کی طرف چل دیتی اور رفتہ رفتہ انسانی سمندر میں مدغم ہو جاتی جو ابھی ساکن تھا لیکن حرکت میں آنے کے لئے تلا بیٹھا تھا۔ اور جس طرح پانی کی رَوئیں سمندر میں چلتی ہیں اور ارد گرد کے پانی کو بھی سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں، اسی طرح ایک روز جنگلی جانوروں کا طوفان مشرق سے ابھرا اور ہریالی کو روندتا ہوا، دھول کے بادل اڑاتا ہوا مغرب کی طرف بھاگ کھڑا ہوا اور یوں یہ حیوانی لشکر انسانی قافلے کا ہراول دستہ بنا۔ انسانوں کی عظیم آبادیاں پھر سے خانہ بدوش ہو گئیں جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور ایک ختم نہ ہونے والے سفر پر دوبارہ روانہ ہو گئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب وہ مخالف سمت چل رہے تھے اور جس طرف سے آئے تھے اسی طرف جا رہے تھے پر وہ نہ جانتے تھے جس طرح وہ اور بہت کچھ نہ جانتے تھے۔ اور یوں انسان اور قدرت کے درمیان دوبارہ ایک طویل کشمکش شروع ہو گئی ـــ وہ کشمکش جو اب بھی جاری ہے۔

وہ جو آج کل کے لوگ ہیں، جو ہمارے گھروں کے سامنے کھلے میدانوں میں یا سڑکوں کے کنارے اجاڑ علاقوں میں آ کر عارضی سے خیمے گاڑ لیتے ہیں، کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں، نیلے تاروں بھرے آسمان تلے کچی زمین پر سوتے ہیں، ہنستے ہیں، مگن رہتے ہیں اور باہر زمین پر آگ جلا کر وہ اور ان کی عورتیں کھانا پکاتے ہیں [illegible] تنگ اور دور رہتے ہیں اور یوں [illegible] ہیں اور پھر کچھ دن ایک جگہ قیام کر کے اپنے خیمے اکھاڑ کر دوسری طرف چل دیتے ہیں ـــ تو یہ لوگ کون ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ اور انہیں زمین کا کوئی خطہ کوئی گوشہ پسند کیوں نہیں آتا؟

نیرالحسن ہاشمی

ڈاکٹر سعدی

وہ مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے میرے ساتھ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اچانک میرا پاؤں رپٹا اور میں یکبارگی پانچ چھ سیڑھیاں لے کر گیا۔ بالکل اس طرح جیسے بچے پھسلنے والے تختہ پر سے پھسلتے چلے جاتے ہیں۔ سیڑھیاں سیمنٹ کی تھیں، اور ڈاکٹر سعدی کے سٹاف جس نے بھی مجھے گرتے دیکھا دم بخود ہو گیا اور مجھ سے اظہار ہمدردی کرنے لگا۔

ڈاکٹر سعدی کو میرے گرنے پر ہنسی کا جو دورہ پڑا وہ میرے لئے بیحد حیران کن تھا۔ اسے میں نے پہلی مرتبہ قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا۔ ہنسی کا ایک طوفان تھا جو تھمتا ہی نہ تھا۔ یکایک اس نے کہا "آپ کو ضرور چوٹ لگی ہے" اور وہ پھر ہنسی کے پالنے میں جھولنے لگی اور میں غم و غصہ کے عالم میں مٹھیاں بھینچ رہا تھا "یہ کونسا موقع ہے ہنسنے کا؟" دوسرے لوگوں نے مجھ سے اظہار ہمدردی کیا مگر ڈاکٹر ہے کہ ہنسے چلے جا رہی ہے یہ ماجرا کیا ہے؟ میرے لئے یہ نفسیاتی تحقیق کا ایک مسئلہ بن گیا۔ وہ اس لئے کہ میں نے ڈاکٹر کو قہقہے تو دور کنار کھل کر مسکراتے ہوئے بھی بہت کم دیکھا تھا۔ میں اسے اس معاملہ میں بیوقوف کہا کرتا تھا۔ وہ ہنسنے اور مسکرانے میں بیحد بخل سے کام لیتی تھی۔ وہ حد درجہ متین، حد درجہ سنجیدہ اور کم سخن تھی اور پھر اس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہی ۲۲ ۲۳ برس۔ ہر بات پر "نا" اور "نہیں" کہنا اس کی عادت ثانیہ تھی۔

"ڈاکٹر میرے ساتھ چائے پیوگی؟" "نہیں"

"ڈاکٹر کل پھر ملنے آؤں؟" "نہیں"

"ڈاکٹر آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو" "نہیں"

"ڈاکٹر میں تمہارے منفی انداز سے سخت تنگ ہوں۔ اب تم سے کبھی نہ ملوں گا" "نہ ملئے"

"ڈاکٹر تم کبھی مسکراؤگی بھی؟" "نہیں"

غرضیکہ "نا" اور "نہیں" اس کی شخصیت کا حصہ بن چکے تھے۔

میں نے بہت سوچا کہ آخر ڈاکٹر میرے گرنے پر اتنی لطف اندوز کیوں ہوئی۔ سوچ سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید اس کی زندگی میں طرب انگیز یا قہقہہ آور لمحات بہت کم آئے ہیں۔ شاید وہ ہوش سنبھالتے ہی ایک ایسی پگڈنڈی اور ہموار راہ پر چلنے لگی جس پر نہ کہیں اونچ نیچ تھی نہ آس پاس چرند پرند یا سبزہ یا درخت یا پھول یا ہنستے کھیلتے چہرے یا شریر لڑکے لڑکیاں۔ غرضیکہ اس کے ۲۲۔۲۳ برس نہایت ہی متین و سنجیدہ بلکہ شدید نظم و ضبط کے ماحول میں گزرے ہوں گے حتیٰ کہ اس کے سکول اور کالج کے زمانے میں یا اس کے محلے یا گلی میں کوئی لڑکا یا لڑکی پھسل کر گری بھی نہ ہوگی جسے دیکھ کر ڈاکٹر ہنستی۔

اتنا مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر کا گھریلو ماحول سخت مذہبی تھا۔ والدین صوم و صلوٰۃ کے سخت پابند۔ والدین کے علاوہ اس کی بڑی ہمشیرہ بھی حج

کے ڈیلیٹنے سے فارغ ہو چکی تھیں۔ وہ خود بھی پانچ وقت نماز پڑھتی تھی۔ خدا نے اُسے گلابی چہرے سے نوازا تھا۔ سانولی سلونی، تیکھے دلکش ناک نقشے والی۔ ڈاکٹر سعدی لباس نہایت سادہ پہنتی تھی۔ اسے میں نے کبھی ریشمی لباس میں نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ سوتی سفید شلوار اور ہلکے پرنٹ کی سوتی قمیض میں ملبوس رہتی۔ میک اپ کے قریب بھی نہ پھٹکتی تھی۔ بال اُس کے اکثر خشک ہی دیکھے۔ سیدھی سادی کنگھی اور جوڑا کر لینا۔ معمولی سینڈل پہنتی لیکن ساتھ جراب ضرور ہوتے۔

سیڑھیوں سے رپٹنے کے دو دن بعد ڈاکٹر نے فون پر مجھ سے پوچھا "اُس دن آپ کو چوٹ تو نہیں لگی تھی؟" یہ پوچھتے ہی اُس پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ میں نے غصّے میں فون بند کر دیا۔ اُس نے پھر فون کیا اور پھر یہی پوچھا۔ میں نے غصّے میں جواب دیا۔ "نہیں"

مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہنسی پر ضبط کر رہی ہے۔ اُس نے کہا "آپ کو ضرور چوٹ لگی ہے، آپ چھپا رہے ہیں" میں نے پھر کہا "نہیں" اُس پر اُس نے جلا کر پوچھا "یہ نہیں نہیں کیا لگا رکھی ہے؟" میں نے جواب دیا "یہ تم ہی سے سیکھا ہے۔ تم بھی تو ہر بات پر نہیں اور نا ہی کہتی ہو" اب کے اُس نے فون بند کر دیا۔

دوسرے یا تیسرے دن وہ میرے دفتر آ گئی اور کہنے لگی: "میرے ساتھ میرے گھر چائے پئیں۔ ابا بھی ہوں گے" میں نے فوراً کہا "نہیں" اُس کا متین اور سنجیدہ چہرہ سرخ ہو گیا۔ کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہنے لگی "اچھا تو نہیں آئیں گے آپ؟"

میں نے شرارت کے انداز میں پھر کہا "نہیں"

وہ فوراً اُٹھی اور جانے لگی۔ میں نے لپک کر اُس کا بازو پکڑا۔ اُس نے فوراً میرا بازو جھٹک دیا اور کہا "مجھے ہاتھ نہ لگائیے آپ بہت بڑھتے جا رہے ہیں" ــــ مجھے گویا پسینہ سا آ گیا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس طرح اُسے ہاتھ لگایا تھا۔

میں نے ملتجیانہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ وہ غضبناک چہرہ لیے ہوئے بیٹھ گئی۔

میں نے پوچھا "چائے پینے کس وقت آؤں؟"

چہرے پر کوئی تغیر لائے بغیر اُس نے کہا "کل صبح ساڑھے دس بجے" اُس کا لہجہ تحکمانہ تھا ــ

ایک منٹ بعد وہ اُٹھی اور میرے منہ پر "السلام علیکم" مار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے دن میں ٹھیک صبح کے ۱۰½ بجے سعدی کے گھر پہنچا۔ اُس کے ابا بھی موجود تھے۔ چائے نہایت پُر تکلف تھی۔ پھل، مٹھائیاں، کیک پیسٹری سبھی کچھ موجود تھا۔ مگر چاردانیاں دو تھیں۔ ایک بڑی، ایک ننھی سی۔ بڑی میں چائے اور چھوٹی میں دودھ تھا۔ مجھے کچھ اچنبھا سا ہوا۔ یہ لوگ اچھے خاصے خوشحال ہیں۔ مکان، زمین، بینک بیلنس سبھی کچھ ہے۔ پھر کراکری کے معاملے میں کنجوسی کیوں؟ معمولی دودھ دان دو ڈھائی روپے میں مل جاتا ہے۔ چاردانی سے دودھ ہونا اور وہ بھی ایک پُر تکلف چائے پر مجھے عجیب سا لگا۔

اس سے پیشتر بھی مجھے دو ایک بار سعدی کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اُس نے دونوں مرتبہ دودھ اور چینی سے بھر پور چائے کی پیالی مجھے پیش کی۔ اُس وقت تو میں زہر مار کر گیا۔ مگر بعد میں میں نے اُس سے احتجاج کیا۔ شاید اُسے یہ احتجاج یاد تھا۔ اسی لیے اگلی مرتبہ اس نے چائے دودھ اور شکر الگ الگ پیش کی مگر دودھ چاردانی سے ہی آیا۔ وہ چار دن کے بعد میں نے اُس سے پھر احتجاج کیا۔ اُس نے بہتیری تاویلیں پیش کیں مگر میں نے ایک نہ سنی۔ وہ جھلا اُٹھی اور کہا "آئندہ آپ میرے گھر نہیں آئیں گے"

اس پُر تکلف چائے پر ادھر اُدھر کی بیکار سی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے ابا کی موجودگی میں یہی کچھ ہونا تھا۔ چائے کے بعد میں چلنے لگا تو

ڈاکٹر نے کہا "مجھے کالج ڈراپ کر دیں" اس فقرے میں بھی حکم کا عنصر موجود تھا۔ اس کے ابا ہمیں سڑک تک چھوڑنے آئے۔ وہ میرے برابر بیٹھ گئی۔ کار اسٹارٹ کرتے ہی میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ خاموش رہی اور سامنے ٹریفک کا جائزہ لیتی رہی۔

میں نے دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر، تم بھلی چنگی لڑکی ہو، ہر لحاظ سے نارمل ہو۔ مگر تمہارے مزاج میں تکبر، درشتی، بے نیازی، پارسائی یا تو قدرتی طور پر موجود ہے یا تم ضرورت سے زیادہ بنتی ہو؟"

بس وہ تو تلملا گئی۔۔۔ چمک کر بولی: "تکبر سے مجھے سخت نفرت ہے۔ درشتی میرے مزاج کا حصہ ہرگز نہیں۔ بے نیازی سے نہ جانے آپ کا کیا مطلب ہے؛ تانہ مجھے ورثہ میں ملی ہے ۔۔۔ یاد رکھیے میں حاجی باپ کی بیٹی ہوں۔"

اتنا طویل فقرہ اس نے فرفر بولا۔ بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے۔ میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ باقی مختصر راستہ خاموشی میں کٹا ۔۔۔ ہسپتال کے قریب پہنچے تو اس نے نہایت رُوکھے پن سے کہا "بس مجھے گیٹ ہی پر اتار دیجیے" ۔۔۔ میں نے ذرا بریک لگائی وہ بگولے کی طرح اٹھی اور باہر نکل کر اس نے کار کا دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ تمام گاڑی ہل گئی۔ چہرہ کالج ہی کی طرف رکھتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر السلام علیکم میرے منہ پر دے مارا اور سامنے والی سیڑھیوں میں غائب ہو گئی۔

"کس لڑکی سے پالا پڑا ہے؟" میں بڑبڑایا اور کار موڑ کر گھر کا رُخ کیا۔

میرے لیے ڈاکٹر ایک معما تھی ۔۔۔ مجھے اس کی بے نیازی سے اتنا ڈر نہیں لگتا تھا جتنا اس کی پارسائی سے۔ وہ مجھے بےحد مقدس دکھائی دیتی تھی۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے اکثر یہ محسوس ہوا جیسے میں کسی نن سے باتیں کر رہا ہوں۔ وہ طویل فقرے بہت کم بولتی تھی؛ اس کی مختصر گوئی میں بھی ہاں اور نہیں کی بھرمار ہوتی تھی۔ میں اس کے پاس دو دو گھنٹے بھی بیٹھا مگر باتیں مجھی کو کرنا پڑیں۔ ان تمام حوصلہ شکن باتوں کے باوجود ڈاکٹر سے مجھے بے پناہ محبت ہو چکی تھی۔ میری زندگی نہایت پرسکون ڈگر پر چل رہی تھی۔ فرائض کی ادائیگی میں میرا بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان میں خواتین اور نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ خواتین اور لڑکیوں میں بعض اوقات نہایت دلکش اور شوخ و شنگ ہستیوں کا بھی سامنا ہوتا تھا لیکن حاشا و کلا میں کبھی پھسلا نہیں۔ ایک آدھ مرتبہ لغزش ہوئی مگر فوراً سنبھل گیا۔ مگر ڈاکٹر کا معاملہ ہی کچھ اور تھا ۔۔۔ وہ چپکے سے بلکہ پنجوں کے بل میری زندگی میں داخل ہوئی اور پھر بلا تکلف میرے سکونِ قلب پر چھاپہ مار کر بیٹھ رہی اور مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ بڑی دیدہ دلیر نکلی۔

وہ دن مجھے خوب یاد ہے جب وہ پہلی مرتبہ میرے کمرے میں آئی تھی اور بڑے موثر انداز میں اپنی ایک سہیلی کے کیس کی وضاحت کی تھی۔ اس کے سر اور بازوؤں کی جنبش نے اس کی زبان کا ساتھ دیا اور وہ بزعمِ خود میدان مار کر چلی گئی۔ چند دن بعد وہ پھر نمودار ہو گئی۔

"اور ہاں اچھا آپ نے اس کیس کا کیا کیا؟"

یہ معاملہ خاصا پیچیدہ ہو چکا تھا اور اسے حل کرنا کوئی آسان نہ تھا۔ میں نے کہا "ابھی کچھ دن لگیں گے"۔۔۔ چندے توقف کے بعد وہ چلی گئی اور ہفتہ عشرہ کے بعد پھر آن دھمکی۔

اسی دوران میں میں معاملہ کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ ماتحت عملے نے کیس خاصا خراب کر رکھا تھا اور درحقیقت ڈاکٹر کی سہیلی سے بے انصافی ہوئی تھی۔ میں نے معاملہ ٹھیک ٹھاک کر دیا اور اسے اب محض اطلاع ہی دینا تھی کہ فیصلہ اس کی سہیلی کے حق میں ہو چکا ہے ۔۔۔ دوسری طرف یہ خدشہ تھا کہ اگر فیصلہ سنا دیا تو ڈاکٹر کے ساتھ آج کی نشست آخری ہو گی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا آنا جانا بند نہ ہو۔ ڈاکٹر نے بیٹھتے ہی پوچھا "کچھ فیصلہ ہوا؟"

بس یہی مسکراہٹ مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ اس کے لبوں پر تبسم یہی کوئی پانچ سیکنڈ رہا ہوگا مگر اُس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں زندگی بھر میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگوں سے ملا ہوں گا۔ ان میں لڑکیوں اور خواتین کا تناسب بھی خاصا تھا مگر ایسی تو بہ شکن مسکراہٹ!! معاذ اللہ!

میں اُس کے خلوص اور دل کشی کا روز اول ہی سے قائل تھا۔ اپنی سہیلی کی وکالت اُس نے جس خلوص سے کی تھی، وہ بجائے خود میرے لئے ایک عظیم الشان تجربہ تھا لیکن اُس کی مسکراہٹ نے تو میری زندگی کا دھارا ہی موڑ دیا۔ اُس مختصر تبسم میں وہ میرے سامنے کائنات کی حسین ترین شے بن کر جلوہ گر ہوئی اور میں بقائمی ہوش حواس اُس کے قدموں میں تھا۔

جب پانچ چھ ملاقاتیں ہو گئیں تو ایک دن جی کڑا کر کے میں نے کہا، "ڈاکٹر ذرا مسکرا دو۔"

"اُس کی بھویں تن گئیں۔ پوچھا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ تم کبھی مسکراؤ گی بھی یا نہیں؟"

"نہیں، ہرگز نہیں"

"سنو سعدی۔ تمہاری مسکراہٹ نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میں نے ایسی مسکراہٹ زندگی بھر نہیں دیکھی۔ چلو بناوٹی تبسم ہی لبوں پر لے آؤ۔"

ڈاکٹر کا چہرہ غصہ سے تمتا گیا "دیکھئے جناب میرے سامنے ایسی بیہودہ باتیں نہ کیجئے۔ میں اس قسم کی خرافات کی عادی نہیں ہوں۔ میں آپ کو کہہ چکی ہوں کہ میں حاجی باپ کی بیٹی ہوں۔"

خرافات کا لفظ میرے منہ پر طمانچہ تھا۔ میں نے فوراً معافی مانگ لی اور وہ خاموش رہی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ جب بھی اُس سے ملاقات ہوگی تو صرف دو اور دو چار قسم کی باتیں کروں گا۔ یعنی اتنی ہی جتنی کہ اشد ضروری ہوتی ہیں۔

چنانچہ وہ پھر آئی تو اُس کے مختصر سوالوں کا جواب میں نے مختصر تر الفاظ میں دیا اور اُس کی طرف دیکھے بغیر۔ گفتگو میں بار بار وقفہ آیا۔ نہایت تکلیف دہ سکتہ مگر میں اپنی روش پر جما رہا۔

آخر اُس نے کہا۔ "اچھا میں چلتی ہوں۔"

میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ "دو منٹ بیٹھئے۔ ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ چائے کی پیالی پی لیں۔"

وہ بیٹھ گئی۔ چائے آئی۔ اردلی چائے بنانے لگا تو اُس نے کہا "تم جاؤ میں خود بناؤں گی۔"

اُس نے میرے آگے چائے کی پیالی رکھ دی اور حسب معمول خاموش بیٹھ رہی۔ میں نے طنزاً کہا "آپ نے بہت زحمت کی، شکریہ؟"

"نہیں"

"شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں۔"

یہ سوچ کر کہ شاید چائے کی پیالی پینا گوارا کر کے اُس نے اپنے بہتر موڈ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر کی ہانکنا شروع کی "سعدی تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میں اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جاؤں گی۔"

"کب؟"

"اگلے سال"

"پھر"

"پھر یہیں آکر پریکٹس کروں گی۔"

"خوب دولت کماؤ گی!"

"خدمتِ خلق کروں گی ــــــــ"

"پریکٹس شہر کے کس حصّہ میں کرو گی؟"

"یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا"

"پریکٹس وہیں کرنا جہاں تمہارے والد نے تمہارے لئے چار کنال زمین لے رکھی ہے۔ تمہارے آنے تک وہاں ایک بہت اعلیٰ کالونی آباد ہو چکی ہوگی۔"

میرے اس فقرے پر ڈاکٹر تیوراسی گئی۔"کہاں ہے وہ چار کنال زمین؟ آپ کو کیسے علم ہوا اس بات کا؟"

"چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتلایئے کہ اپنی زمین میں سے مجھے ایک کنال زمین دو گی؟"

ڈاکٹر کے چہرے پر پہلی بار میں نے اتار چڑھاؤ دیکھا۔ وہ کسمسا سی گئی اس کے لب ہلے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس نے ایک دم جانے کا فیصلہ کیا اور چند لمحوں میں وہ میرے کمرے سے باہر تھی۔

اُس کی اپیل کا معاملہ اُلجھ جانے کے دو تین ماہ تک اُس سے کوئی ملاقات نہ ہوئی اور نہ اس کا فون آیا۔ میں اُس سے قریب قریب مایوس ہو چکا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور ایک صبح ہسپتال جا نکلا۔ وہ راؤنڈ پر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ نرس کو کہا"تم چلو میں آتی ہوں۔" نرس آگے نکل گئی۔

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام۔ کیسے آنا ہوا؟"

"یونہی"

"کیوں وقت ضائع کیا آپ نے؟"

"بس آپ سے دو منٹ بات کرنا تھی"

"مجھے فرصت نہیں ہے۔"

"کیا اور کسی وقت آسکتا ہوں؟"

"کل"

"کس وقت؟"

ساڑھے پانچ بجے شام"

"کہاں؟"

"میرے کمرے میں"

"آپ کا کمرہ کہاں ہے؟"

ڈاکٹر نے سمجھا دیا۔

"مجھے دستک دینا ہوگی؟"

"دروازہ کھلا ہوگا۔ ہلکی سی دستک دے کر اندر آ جائیے گا"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنے کمرے کی نشاندہی کی تھی ــــ اُس سے خلوت میں ملنے کی امید نے میرا سکون قلب لوٹ لیا۔ دوسرے دن ساڑھے پانچ بجے سہ پہر تک میں بہت ہیجان میں رہا۔

دوسری سہ پہر میں اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو اُسے آرام کرسی پر سوتے ہوئے پایا۔ شاید تھکن کے مارے اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ میں چند منٹ اُسے دیکھا کیا۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ رخسار پر کنڈلی مارے ہوئے تھی مجھ سے نہ رہا گیا اور میں فرطِ جذبات سے مجبور ہو کر جھکا، وہ اُس کے دائیں رخسار کو ہلکے سے چوم لیا۔

ایک طوفان اُمنڈ پڑا۔ وہ نہ تقند بھر کر اُٹھی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ دروازہ اندر سے بھیڑا اور مجھ پر برس پڑی۔

اُس نے دوسری مرتبہ مجھ سے اتنی طویل بات کی جو نہایت ہی تلخ تھی۔

"آپ کو جرأت کیسے ہوئی؟ آپ نہایت ذلیل ہیں۔ میری غفلت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آئی؟ آپ نے کمینگی کی ہے آپ کی بیٹی کے ساتھ ایسی ہی حرکت ہو تو آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ میرے والدین نے مجھ پر اعتماد کر کے یہاں بھیجا ہے۔ اگر میں اُن کا اعتماد کھو بیٹھوں تو مجھ پر ہزار لعنت۔ کاش آپ کی اس حرکت سے پہلے مجھے موت آگئی ہوتی!! میں آپ کی صورت سے بیزار ہوں۔ نکل جائیے میرے کمرے سے اور خبردار جو کبھی ادھر کا رُخ کیا ــــ"

ایک ہی سانس میں وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گئی۔ وہ اگر میں اُس کے کمرے سے نکل نہ جاتا تو نہ جانے وہ اور کیا کچھ کہتی۔

ایک اُبھرتی ہوئی حسین عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ ایک دلکش غزل بڑے المناک اور تلخ مقطع پر ختم ہوئی۔

اس المیے کو دو ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے اچانک تبادلے کا حکم ملا ــــ انہی دنوں میرا ایک دوست گردے کے درد میں مبتلا ہو کر اسی ہسپتال میں داخل ہوا۔ میں لپک جھپک اس کی عیادت کو جاتا اور اسی طرح ہسپتال سے باہر نکل آتا کہ کہیں ڈاکٹر دیکھ نہ پائے اور سب کے سامنے مجھ پر برس پڑے۔

ایک صبح کیا دیکھتا ہوں کہ بڑا ڈاکٹر اُسے لئے میرے بیمار دوست کے کمرے میں داخل ہوا۔ سخت سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینہ آگیا۔

ڈاکٹر سعدی نے مجھے دیکھا اور فوراً اپنے سینئر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ سینئر ڈاکٹر نے میرے دوست کا معائنہ کیا، چارٹ دیکھا اور سعدی کو کچھ ہدایات دیں۔ میں اس دوران ٹہل کر کمرے کے ایک کونے کی طرف سرک گیا تھا۔

بڑے ڈاکٹر نے میرے دوست کو تسلی دی اور چلے گئے۔ سعدی اُن کے پیچھے تھی۔ اضطراب کی سی کیفیت میں میں بھی کمرے سے باہر نکلا اور سعدی کے پیچھے چلنے لگا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ ڈر کے مارے میرا کلیجہ منہ کو آگیا اور میں ٹھہرنے کی بجائے اُس سے آگے نکل گیا۔

اُس نے مجھے آواز دی ــــ میں گویا کانپ گیا۔

میرے نزدیک آکر وہ بولی "یہ آپ کے کون ہیں؟"

"میرے دوست ہیں"

"حالت کافی خراب تھی۔ اب اللہ کے فضل سے بہت بہتر ہے"

میری جان میں جان آئی ہمت کرکے کہا "ڈاکٹر صاحب میرا تبادلہ ہو گیا ہے"

"جھوٹ"

میں نے اپنے تبادلے کا حکم نکال کر دکھایا اور اس نے اُسے پڑھنا بھی گوارا کر لیا۔ کاغذ لوٹاتے ہوئے اُس نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نہیں جائیں گے"

میں سناٹے میں آگیا۔

"میں تو شاید پرسوں روانہ بھی ہو جاؤں"

"اچھا"

"جی ہاں——اور آپ ناراض بھی تو ہیں"

"فضول باتیں نہ کیجیے" پھر ایک لمحہ رُک کر بولی "تو گویا آپ جا رہے ہیں؟"

"گویا نہیں یقینی طور پر"

"تو پھر خدا حافظ!"

اور وہ السلام علیکم کہہ کے تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں اُس کے پیچھے دوڑا اور اُسے ٹھہرایا "کیا میں آپ کو خط لکھ سکتا ہوں؟"

"ہرگز نہیں"

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا؟"

اور مجھ سے سوائے "کچھ نہیں۔ کچھ نہیں" کے کچھ بھی تو نہ کہا گیا اور وہ پھر السلام علیکم کا طمانچہ مار کر آگے چل دی۔

"یا خدا! یہ کیسی لڑکی ہے؟" یہ سوچتا ہوا میں منہ لٹکائے اپنے دوست کے کمرے میں آ بیٹھا۔ مگر جی نہ لگا اور گھر چل دیا۔

تقریباً چار برس بعد ڈاکٹر سعدی کے شہر میں پھر میرا تبادلہ ہو گیا۔ ٹرانسفر سے چھ ماہ پیشتر میری بیوی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئی تھی اور میں ایک ایسے مکان کی تلاش میں تھا جس کے پڑوس میں ہمدرد اور غمگسار لوگ بستے ہوں کہ میں جب گھر سے باہر ہوں یا دورہ پر ہوں تو وہ میرے تین بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں۔ اس شہر میں میرے کوئی رشتہ دار نہ تھے جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے۔

ڈاکٹر سعدی کے شہر میں آکر دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا ملی اور وہ پھر سے دہکنے لگیں۔ ان چار برس میں میرا اُس سے مکمل قطع تعلق رہا۔ وہ نہ جانے کہاں ہوگی! شاید انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہو۔ ممکن ہے اُس کی شادی ہو گئی۔ اسی قسم کے خیالات ذہن میں آتے رہے۔

میں ہر روز شام کو مکان کی تلاش میں نکلتا اور ناکام لوٹتا۔ ایک پراپرٹی ایجنٹ کی زبانی معلوم ہوا کہ گلنار کالونی میں ایک صوفیانہ کوٹھی نما مکان خالی ہے اور مالک مکان نہایت نیک انسان ہیں۔ چنانچہ میں اتہ پتہ پوچھ کر اُس طرف روانہ ہوا۔

گلنار کالونی میرے لئے کوئی نیا نام نہ تھا۔ اسی کالونی میں ڈاکٹر سعدی کا چار کنال کا پلاٹ تھا جو اُس کے والد نے اس کے لئے برسوں پہلے خرید لیا تھا۔ ڈاکٹر سعدی کا اسی کالونی میں اپنا کلینک کھولنے کا پروگرام تھا یعنی نئے مکان کے ساتھ ہی کلینک بھی۔

دفورِ اشتیاق سے کار خود بخود تیز چلنے لگی۔ کالونی میں داخل ہوتے ہی مجھے سڑک کے ایک کنارے ایک ضعیفہ ایک نوجوان عورت کے ساتھ بیٹھی نظر آئی دونوں نہایت غریب لگتے تھے۔ میری کار آگے نکل چکی تھی۔ چنانچہ میں پیچھے آیا اور انھیں "لفٹ" لینے کو کہا تو وہ دونوں حیران ہو گئیں۔ ضعیفہ بولی "بیٹا! یہاں سے کئی موٹریں نکل گئیں کسی کو ہم پر ترس نہ آیا۔ یہ میری بیٹی ہے۔ بڑی بیمار ہے۔ چلا تک نہیں جاتا۔"

وہ دونوں کار میں بیٹھ گئیں تو میں نے اُن سے اُن کی منزل پوچھی، بڑھیا نے کہا "ہمیں ڈاکٹر سعدی کے ہسپتال جانا ہے"

خوشی سے میرا چہرہ تمتما اُٹھا۔

"مگر مجھے معلوم نہیں کہ اُن کا ہسپتال کہاں ہے"

"میں بتلاتی ہوں۔ آپ سیدھے چلیں اور پھر دائیں کو مڑ جائیں۔ پہلی ہی کوٹھی میں اُن کا ہسپتال ہے"

اور میں چند منٹوں میں منزل پر پہنچ گیا۔

راستے میں ضعیفہ سے میں نے ڈاکٹر سعدی کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی "نہایت رحمدل ڈاکٹر ہے۔ غریبوں سے فیس نہیں لیتی بلکہ اپنی جیب سے امداد کرتی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔ امیر غریب سب سے ہنس کر بات کرتی ہے۔ اُس کی مسکراہٹ سے ہی آدھا مرض دور ہو جاتا ہے"

اور مجھے اُس کی مسکراہٹ یاد آ گئی جس نے مجھے اُس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

ابھی ضعیفہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ مجھے ایک سادہ سی کوٹھی کے سامنے ایک بڑا سا بورڈ نظر آیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"ڈاکٹر سعدی کا کلینک"

میں نے کوٹھی میں کار ٹھہرالی اور دونوں خواتین اُتر گئیں۔ بڑھیا نے مجھے دعائیں دیں اور اپنی بیٹی کو کر سے تھامے برآمدے کی طرف جانے لگی۔ برآمدہ مریض عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ عورتیں سامنے والے لان میں بھی تھیں میں نے دومنٹ کوٹھی کا جائزہ لیا اور پھر وہاں سے نکل آیا۔ کرایہ پر پراپرٹی ایجنٹ کا بتلایا ہوا مکان ڈھونڈا۔ حسنِ اتفاق سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر مجھے وہ مکان مل گیا۔ برابر والی کوٹھی مالک مکان کی تھی۔ اُن سے ملا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر مکان حاصل کر لیا۔ دوسرے دن میں اُس مکان میں منتقل ہو گیا۔

ڈاکٹر سعدی میرے مکان سے لگ بھگ ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ پڑوس واقعی اچھا تھا اور مالک مکان نہایت مشفق اور ہمدرد۔ میرے بچوں کا اُن کے ہاں آنا جانا ہو گیا اور وہ نئے ماحول میں گھل مل گئے۔

مگر میرا اطمینانِ قلب چھن چکا تھا۔ کئی دن اسی اُلجھن میں رہا کہ ڈاکٹر کے ہاں حاضری دوں یا نہیں۔ نہ جانے وہ کیسے ملے؟ چار سال بعد تو وہ بالکل اجنبی ہو گئی ہو گی۔

آخر ایک سہ پہر ہمت کر کے میں اُس کی طرف چل دیا اس خیال سے کہ شام کو مریضوں کی یورش کم ہو گی اور شاید ملاقات کا موقع مل جائے خنک سہ پہر تھی۔ یہی پانچ ساڑھے پانچ کا وقت ہو گا

وہاں عورتوں کی وہی بھیڑ بھاڑ پائی۔ ایک نرس باہر آئی تو اُسے میں نے اپنا کارڈ تھما دیا۔ وہ پوچھنے لگی "کیا کوئی مریض ساتھ لائے ہیں؟"

"عرض کی ـــــ نہیں"

"تو پھر کیا کام ہے؟"

"بس یونہی ملنا ہے۔"

"پہلے سے وقت لے رکھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر وہ نہیں مل سکتیں۔ بےحد مصروف ہیں۔"

"آپ انہیں میرا کارڈ تو دیجئے۔"

"مجھے سخت ہدایت ہے کہ بغیر کسی خاص کام کے کسی ملاقاتی کو ان سے نہ ملواؤں۔"

"آپ میرا کارڈ ان کے سامنے تو رکھ دیجئے۔"

"مجھے ڈانٹ پڑے گی۔"

"میرا ذمہ ڈانٹ نہیں پڑے گی۔"

"کیا آپ ان کے عزیز ہیں؟"

"وہ مجھے بےحد عزیز ہیں۔"

ابھی نرس غائب ہوا اور کمتی کہ برابر کے جالی دار دروازوں والے کمرے سے آواز آئی — "بھیجا۔" اور نرس اندر چلی گئی۔ مجھے یہ آواز جانی پہچانی سی لگی مگر میں کچھ فیصلہ نہیں کر سکا۔ نرس فوراً باہر آئی اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں اس کے پیچھے برآمدے برآمدے چل پڑا اور اُس نے مجھے الگ چھوٹے سے کمرے میں بٹھا دیا جو جالی دار دروازوں والے کمرے کے عین مقابل تھا۔ نرس مجھے بٹھا کر چلی گئی۔ اور میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ چار کرسیوں کے درمیان ایک تپائی جس پر صاف ستھرا سفید میز پوش بچھا ہوا تھا۔ کوئی خاص سجاوٹ نہیں تھی۔ کرسیوں کے نیچے ایک معمولی مگر صاف دری تھی اور پردے گہرے نیلے تھے۔ تپائی پر چند رسالے پڑے تھے جو سب کے سب ڈاکٹری کے موضوع سے متعلق تھے۔ میں نے وقت کاٹنے کے لئے ایک رسالہ اٹھایا۔ مگر مضامین میری سمجھ سے باہر تھے۔

کوئی بیس منٹ بعد گہرا نیلا پردہ ہلا اور سعدی کھٹاک سے اندر آ گئی۔ سفید لمبا کوٹ، اس پر سٹیتھو سکوپ، چہرے پر وہی سنجیدگی، کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے مجھے سلام کیا اور دیر سے آنے کی معافی چاہی۔ میں نے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا اور پھر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

چند لمحے سکوت رہا پھر اُس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ میں نے بھی مشینی انسان کی طرح ہاتھ اٹھا لئے۔ اُس کے لب ہلتے رہے اور میں اُسے دیکھا کیا۔

پھر وہ بولی "آپ کی اہلیہ کے انتقال کا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ "تو آپ نے میری بیوی کے لئے دعائے مغفرت کی ہے؟"

وہ خاموش رہی اور میں حیران کہ اُسے میری بیوی کے انتقال کے بارے میں علم کیسے ہوا۔ نہ میری اس سے خط و کتابت رہی، نہ وہ میرے کسی رشتہ دار کو جانتی ہے، نہ کسی دوست کو۔ بہرحال میں نے اس موضوع پر اُس سے کوئی سوال نہ کیا۔

"بچوں کی دیکھ بھال کون کر رہا ہے؟"

"کوئی نہیں ـــــ اللہ پر بھروسہ ہے"

"آپ ایک مہینے سے یہاں ہیں۔ ملنے کیوں نہیں آئے؟"

"اول تو میری ہمت ہی نہیں ہوئی، دوسرے مکان کی پریشانی رہی"

"اب تو مکان مل گیا ہے نا!"

"جی ہاں"

اور یہاں قریب ہی نا!"

"جی ہاں"

"بچوں کو میرے ہاں بھیج دیا کریں"

"جی؟"

"جی ہاں۔ بچوں کو میرے ہاں بھیج دیا کریں"

"میری پڑوسی خواتین بہت نیک ہیں، وہ بہت اچھی طرح دیکھ بھال کر رہی ہیں"

"آپ کی مرضی۔ مگر میں بھی تو آپ کے پڑوس میں ہوں"

"میرا جواب سنے بغیر وہ اٹھی اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں پیچھے ہو لیا اور وہ مجھے اپنی کوٹھی کے عقب میں لے جا کر کھڑی ہو گئی"

شام گہری ہو چکی تھی۔ سرد ہوا جسم کے آر پار ہو رہی تھی۔ قریب ہی ایک مسجد سے موذن نے مغرب کی اذان دی۔

وہ اذان ختم ہونے تک خاموش کھڑی رہی۔ دھندلکے میں اس نے انگشت شہادت سے اپنی کوٹھی سے ملحقہ خالی قطعۂ زمین کی طرف اشارہ کیا اور میری طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں کہا "یہ رہی آپ کی ایک کنال زمین ـــ"

میں جیسے منجمد ہو کر رہ گیا اور وہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں تحلیل ہو گئی۔

میں فقط ایک سایہ کوٹھی کے برآمدے میں سماتا ہوا دیکھ سکا۔

اس مرتبہ اس نے جاتے ہوئے سلام بھی نہ کیا۔

نگہت مرزا

دریافت

پہلا زینہ!

اُس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے اور پان کی پیک داہنے ہاتھ کی دیوار پر پھینکی جو پرانے سرخ دھبوں کے ساتھ اس میلے زرد کپڑے کے پارسل کی مانند تھی جس پر کسی زمانے میں لاکھ کی مہریں لگی ہوں۔ پہلا زینہ اور یہ پیک!۔۔۔ تم گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہیں اس گھر سے نفرت ہے۔ تم اس کے چپے چپے کو حقارت سے دیکھتے ہو تم یہ پرانی بوسیدہ سیڑھیاں توڑ دینا چاہتے ہو اور اس ماحول سے بھاگ جانا چاہتے ہو۔

دوسرا زینہ!

خسرو پرویز میں ہوں، آنکھیں بند کرکے تصور کرو، ہونٹوں کو ہتھیلیوں سے سہلاؤ۔ تم سب کچھ پیچھے چھوڑ آئے بھائی میرے۔ اب تمہارے اور اس جگمگاتی گاتی دنیا کے درمیان پردہ حائل ہو چکا ہے۔ (رات کا پردہ جسے ہٹا کر وہ پہلے زینے پر قدم دھر رہا ہے) اب تمہیں رات بھر اس جہنم میں جلنا ہوگا حتیٰ کہ صبح ہوگی اور تم ان زینوں کو روندتے ہوئے خوش خوش نیچے اتر وگے اور بھاگ جاؤ گے کہ ایک اور دن تمہیں زندہ رہنے کے لئے مل گیا۔

تیسرا زینہ!

زینوں کے اوپر سے اس کے بھاری قدموں کی چاپ پر نصف درجن کے لگ بھگ کالے بھجنگ بچوں کی قطار سے تلے اوپر جھانکتی۔۔۔ یا وحشت! وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑتا۔۔۔ اور پھر مرجھکائے اوپر چڑھتا جاتا۔۔۔ بھجوا! تیسرا زینہ ایک بھجوتا تھا۔ تین زینے۔ وہ صرف تین زینوں سے آشنا تھا۔ اس کے بعد کیا تھا۔۔۔ صرف بھجوتا ۔۔۔ ایک اور رات کے لئے ۔۔۔ کون جانے رات کا عذاب کب ختم ہو۔

اور وہ حسب معمول باورچی خانے میں ہنڈیا کی جلتی باس سے لاپروا پڑوسن سے محو گفتگو۔۔۔ اف! جی کیسا میلا ہو گیا۔ پیچھے چھوٹ گیا خسرو پرویز۔ سب کچھ پیچھے چھوٹ گیا۔ اس نے لاپروائی سے کندھے اُچکائے اور اپنی تازہ ترین غزل کا مطلع اونچے سروں میں گنگنانے لگا۔ باورچی خانے میں بیٹھی وہ عورت اسے ہر شام پہلے قدم پر کیسی اجنبی سی لگتی۔ اس کا جی چاہتا چپکے سے اس کے قریب جا کر پوچھے۔۔۔ تم کون ہو؟ یہاں کس لئے آئی ہو! کیسا ایکدم سے سب کچھ دھندلا جاتا۔ اور وہ ڈیک پر جھکی ہر لمحہ اپنے بالوں کو ہاتھ کی جنبش سے پیچھے ڈالتی اور گاہے گاہے معصومیت سے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی۔۔۔ نہیں۔ وہ سر جھٹکتا۔۔۔ نہیں۔۔۔ اور اندر اپنے کمرے میں چلا آتا۔۔۔ بچے اس کے پیار بھرے لمس کو اس دن سے ترس رہے تھے جب سے ان کے شعور نے باپ کے وجود کا ادراک کیا تھا۔۔۔ بچے! بسا اوقات اس کا جی چاہتا سب کو باری باری اپنے پاس بلائے اور سب کا گلا گھونٹ دے۔
"ایک آگ۔۔۔ ایک شدید آگ بھری ہوئی ہے میرے اندر۔۔۔ میں نہیں جانتا اس آگ کا کیا ہوگا مریم۔۔۔" ایک سہ پہر جانے کس بات پر وہ انتہائی جذباتی ہو گیا اور اس چھپئی رنگت کی لڑکی سے جھک کر سرگوشی کی اور وہ تعجب سے چہرہ اٹھائے اسے دیکھا کی تھی: "مریم! قسم خدا کی تم کس قدر بھولی

ہو۔ کیسی معصوم ——" اور پھر یکایک وہ اپنے لمحہ بیشتر کے جذباتی پن پر قہقہہ لگا کر ہنستا تھا اور مریم نے خود سے کہا تھا

اور اب رات ہے اور داہنے ہاتھ کے بستر پر وہ عورت عجیب بے ڈھنگے طریقے پر لیٹی خراٹے لے رہی ہے یہ تمہاری عورت ہے۔ جی چاہتا ہے اُسے کھڑکی سے اُٹھا کر نیچے پھینک دوں یا خود کہیں بھاگ جاؤں کہیں دور جہاں اس کا بے ہنگم وجود نہ ہو۔ جہاں اس کے تیز گونجتے خراٹے نہ ہوں میں کس دوزخ میں جل رہا ہوں —— یہ کیسی آگ ہے جس کو سوا میرے کوئی نہیں جانتا —— پھر جونہی دن سیاہی مائل ہوتا تو اس کے قدم مختلف سڑکوں اور گلیوں کا چکر لگا کر بھوانہ بازار کی طرف مڑتے۔ وہاں کیفے ایران میں وہ انتہائی کونے کی میز پر بیٹھا لاپرواہی سے سگریٹ پئے جاتا اور سر اُٹھا کر سر پر لٹکتے ہوئے قمقموں کو دیکھتا۔ ایسے میں اس کی آنکھوں میں ایک انجانا سا دکھ اُبھر آتا —— خسرو پرویز تم کون ہو؟ کس لئے تمہیں وجود کے جہنم میں جھونکا گیا ہے؟ تمہیں کون سا اہم مقصد ادا کرنا ہے؟ "مریم —— اپنے وجود کا دکھ —— کیا تمہیں کبھی ایسے دکھ نے آگھیرا ہے جب تمہیں اپنے وجود سے دہشت ہوتی ہے، تم اپنے خول کو توڑ دینا چاہتی ہو؟ ——

—— مگر نہیں مریم! تم تو بہت بھولی ہو تمہیں ایسی باتوں کا کیا علم ——" اور مریم بسا اوقات اس کی لایعنی باتوں پر خوفزدہ ہو جاتی۔ پھر وہ جھینپے انداز میں ہنس پڑتا۔

—— اور مریم کوئی اور راہ نہ پا کر اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتی اور رات مریم اپنی روم میٹ سے کہتی "اللہ ربی تجھے کیا بتاؤں وہ شخص کیسی باتیں کرتا ہے۔ ایسی باتیں کہ جن کا نہ پہلا سرا میرے سامنے آتا ہے نہ آخری۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس کی باتوں کے دوران ہی سے آملی ہوں اور وہ پہلے بھی باتیں کر رہا تھا اور میرے جانے کے بعد بھی کرتا رہے گا!"

رات —— اس عورت کے خراٹوں سے جہنم بنی ہوئی۔ کمرہ اس عورت کے منحوس وجود سے گھٹا ہوا۔ اس عورت کے کپڑوں کی بساند —— سوتے میں اکثر اس کی نیند کھل جاتی۔ وہ بستر سے اُٹھ کر سرہانے کی طرف کھڑکی میں جا کر کھڑا ہوتا۔ چوڑی سڑک خاموشی سے رات کا بوجھ اُٹھائے۔ سڑکوں کے سامنے دکانیں سختی سے بھینچے ہوئے ہونٹوں کی مانند بند۔ ان کے اوپر مکان تاریکی کے ہیکل اسے —— وہ جمپئی رنگت اس اندھیرے میں کیسی رنگت اختیار کرتی ہوگی۔ اس کے سنہرے بال تکیے پر بکھرے کیسے لگتے ہوں گے۔ وہ گلابی اور کھلے ہونٹ —— خسرو پرویز —— اس کے اندر عجیب سا جذبہ اُبھر آتا۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں ملے کھلے آسمان کے خدا! میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔

اور کبھی جو یوں ہو کہ چپ چاپ بیٹھے تم اپنے آپ سے الگ ہو جاتا اور ایک اور وجود کا روپ دھار لو اور پھر سامنے بیٹھ کر قطعی اجنبیت اور بیگانگی سے اس میلے وجود کو دیکھو اور بتاؤ کہ تم کون ہو؟ —— مگر میں وہ تو ہرگز نہیں جسے میں روزانہ صبح شیو بنانے یا کالج جانے سے قبل دیکھتا ہوں —— کیا واقعی یہ وہی میں ہوں! آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے وہ اکثر لاشعوری طور پر اپنی انگلی سے اس عکس کو چھونے کی کوشش کرتا —— کہیں وہی میں تو نہیں! یہ سارا چکر کیا ہے؟ اس کا جی چاہتا سب کچھ ختم ہو جائے، وہ دو آنکھیں بند کر سے ۔۔ جانے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ مگر یہ صرف برس بھر ہی کی تو بات تھی۔ وہ لمحہ —— وہ دریافت کا لمحہ "شبلی! —— قسم جناب امیر کی۔ میں اس لمحے میں زندہ ہوا ——" اس نے بند آنکھوں، برس پہلے دم میں بیٹھ کر شبلی اپنے واحد دوست سے سرگوشی کی تھی۔ "وہ بات ساری یہ تھی کہ اس دوپہر جب وہ کلاس لینے بیٹھا تھا اور حسب عادت فائل کھول کر نوٹس لکھوانے شروع کئے تھے تو وہاں سب سے پیچھے اُسے دو چمکتی سیاہ آنکھوں نے جکڑ لیا۔ وہ چمکتی سیاہ آنکھیں اس کی آنکھوں میں تیرتی رہیں —— شبلی! —— میں اگر کچھ لمحے اور اسے دیکھتا رہتا تو یقیناً —— یقیناً شبلی میں —— مر جاتا —— اور یہی بات تھی کہ اس سیاہ آنکھوں اور چمپئی رنگت والی بھولی بھالی لڑکی نے اسے عجیب ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

رات کی سیاہی سگریٹوں دھوئیں کے ساتھ مل کر انتہائی پراسرار رنگت اختیار کرتی ایسے میں کیفے ایران میں بیٹھے سبھی لوگ اپنے اپنے معاملتوں (جو محدود نہ تھے

کی یادگار بھی تھے اور وقت کا مسئلہ بھی) کے پرانے چاک کیا کرتے۔ خسرو پرویز سگریٹ منہ میں دبائے چھت کے قمقموں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا۔ پہلا زینہ دوپل مرلہ میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔ میں اس گھر کا وجود ختم کر دوں گا ـــ مریم! میں بھی چاہتا ہوں تمہاری باتیں کروں۔ اپنے داہنے ہاتھ بیٹھے ان خوش باش لوگوں سے سرگوشی کروں ـــ سنو تم مریم سے واقف ہوگے ـــ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ نصف درجن بچوں کا گھ میرے ماتھے پر لکھا جا چکا ہے۔ اس عورت کے بخت کی تاریکی نے میرا وجود دھندلا دیا ہے ـــ میں مر چکا ہوں ـــ ایسے میں وہ ادھر ادھر کے لوگوں سے کاغذ قلم مانگنے لگتا کہ اس کا اثاثہ ایک لمبے سے رومال ایک مدوستے قسم کے سگریٹ کی ڈبیا اور دو چار تمباکو بھرے پان کے سوا کچھ نہ ہوتا اور کاغذ قلم مہیا ہوتے ہی وہ میز پر جھک کر آڑے ترچھے حروف میں نظم لکھتا ـــ "یہ لمحہ ـــ تم بھلا اسے کیا سمجھو گے شبلی! ـــ یہ لمحے کی کرامات ہوتی ہے۔ تم چپ چاپ بیٹھے ہو اور تمہارا ذہن آپ ہی آپ دیکھنے سننے میں مشغول ہے۔ دفعتاً تم محسوس کرتے ہو تم نے ذہن کی بند کلیاں کو نکاس کا راستہ نہ دکھایا تو تمہارے ذہن کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ تم اگلے ہی لمحے نظم سکتے ہو۔ یہ لمحے کی کرامات ہے شبلی! تم بھلا اسے کیا سمجھو گے۔"

رات ـ جناح کالونی کی اس دوکانوں والی سڑک کی رات لڑکیوں کے ہوسٹل پر چھائی رات سے مختلف ہوتی ہے۔ مریم کام ختم کر کے روشنی بجھاتی تو یونہی ذرا دیر بیٹھ سے کچھ نہ کچھ کہتی اور پھر لحاف میں ناک ڈبو کر بچوں کی سی معصومیت سے سو جاتی ـــ پھر ایک رات وہ روشنی بجھا کر رابعہ کے بستر پر جا بیٹھی۔ "آپی ـــ یہ شخص اتنا پست کیوں ہوتا جا رہا ہے ـــ" اور رابعہ نے لحاف اٹھا کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کالی اور مریم اور وجاہت اس کے ذہن میں گڈمڈ ہوگئے۔ وجاہت وہ خوش باش اور خوش مزاج لڑکا جو چند ہفتے گذرے شوفیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں آیا تھا۔ رابعہ نے اسے غور سے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو جھٹکا دیا "پگلی کیوں فکر کرتی ہے، دوستی کا نوٹ لے اس سے اور بحث کر ـــ پر اسے کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ وجاہت پہلے ہی سے بادل ہوا اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔

پہلا زینہ!

دیوار پر کے بے شمار دھبوں میں ایک اضافہ ـ نفرت ہے مجھے اس گھر کے چپے چپے سے نفرت ہے۔ میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔

دوسرا زینہ!

خسرو پرویز ـــ مریم کئی دن سے نہیں آرہی۔ وہ کیوں نہیں آرہی ـــ اگر وہ کل بھی نہیں آئی تو میں اس کے ہوسٹل میں چلا جاؤں گا ـ ـ

ـــ مگر ـ مگر میں کچھ کرنا چاہتا ہوں

تیسرا زینہ!

تنگ دھڑنگ بچوں کی قطار ـــ تم سب مر کیوں نہیں جاتے! میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔

رات ـــ جناح کالونی کی بیزار سی رات ـــ "نغمہ برلب تا کہ اس کی جان کا سناٹا ہو دور" مگر یہاں تو کوئی نغمہ نہیں۔ میرے لب تو نغموں سے ناآشنا ہیں۔ میں اس عورت کے جہنم سے کب نکلوں گا ـ مریم ـــ مگر مریم کیوں نہیں آرہی ـــ نغمہ برلب ـــ مریم ـــ

تم اتنے روز کالج کیوں نہ آئیں ـــ وہ وہاں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے بلانے پر وہ کیسی بھاگی بھاگی آتی تھی ـــ کیوں نہ جاؤں بھائی اپنا پروفیسر ہے ـــ وہ لڑکیوں کے ہنستے ہوئے چہروں پر جملہ پھینک کر بھاگنے کی کرتی ـ ـــ وہ اس روز اس سے کتنی نزدیک کھڑی تھی، ایک قدم کے فاصلے پر ـــ میں چاہوں تو اسے چھو سکتا ہوں۔ اس کی چھپی رنگت پر ہاتھ پھیر کر اس کی ملائمت محسوس کر سکتا ہوں میں ان ہونٹوں کو چومنا چاہتا ہوں (خسرو پرویز؟) پھر اس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے چھو لیا۔ اس کا نرم ملائم ہاتھ۔ اس چھونے سے گلابی ہاتھ کو اس نے

اپنے لبوں سے انتہائی درشت، خالص مردانہ انداز میں رگڑتا ـــــ "مریم!" اس کے اندر کی معصوم لڑکی نے چلا کر مریم کو متوجہ کیا۔ یہ تو کیا کر رہی ہے مریم! ـــــ کل کی شام اور وجاہت اور سڑک پر تیرتی کار میں گاہے دبے دبے لہجوں میں گفتگو۔ گاہے خموشی کا طلسم ـــــ اور اور گرد گرتی رات کے سناٹے میں وجاہت کی پیار بھری باتیں ـــــ مریم! تو کس قدر کمین عورت ہے۔ پر اس نے اندر کی لڑکی کی بات نہ سنی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا جو انتہائی جذباتی طریق پر اسے اپنے چہرے پر پھیرے جا رہا تھا ـــــ اور رات گئے مریم سوچتی ـــــ مریم! ـــــ یہ تو کیا کر رہی ہے؟ تو دو وجودوں کے درمیان پس کر رہ گئی ہے۔ تیرا سانس گھٹا جا رہا ہے ـــــ فیصلہ کر لے مریم! ابھی سے فیصلہ کر لے ـــــ پر وہ فیصلہ نہ کر پاتی۔ دن بھر وہ وجاہت کی آرزو کرتی اور اسے دیکھ کر خوش ہوتی پر اس سے ملتے ہی اس میں ایک جھنجھلاہٹ سی پیدا ہو جاتی اور وہ خسرو پرویز کی تلاش کرتی اور خسرو پرویز کو پاتے ہی اس کی جھنجھلاہٹ ختم ہو جاتی اور وہ بڑے رسان سے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ سکتی تھی ـــــ پر خسرو پرویز کی معیت میں اس کے اندر کی لڑکی اس سے جھگڑنے آ موجود ہوتی۔ اور وہ اس کے جھگڑے اور اس کی ملامت کی تاب نہ لا کر وہاں سے بھی اٹھ آتی ـــــ اور رات گئے تک سوچتی رہتی ـــــ مجھے کس کی ضرورت ہے ـــــ کسے میری ضرورت ہے ـــــ اور دن بھر وہ ادھر سے ادھر بھٹکتی پھرتی۔ اور رات یونہی گزرتی ـــــ پھر خسرو پرویز نے کہ انتہائی جذباتی موڈ میں تھا ایک سہ پہر اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر رگڑتے ہوئے بے حد دکھ سے کہا ـــــ "مریم! ـــــ میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا۔ کچھ نہیں دے سکتا ـــــ پر تو مجھے بہت کچھ دے سکتی ہے مریم ـــــ" مریم کا ہاتھ اس سخت رخسار پر کانپا ـــــ "مریم! میں تجھے اپنی زندگی میں جس حیثیت سے شامل کرنا چاہتا تھا ـــــ وہ حیثیت ـــــ مریم تب میں فرسٹ ایئر میں تھا جب میرے باپ نے میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں ـــــ" اس نے مریم کا ہاتھ چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا ـــــ "اس لڑکے کا تصور مجھے اب بھی مارے ڈالتا ہے ـــــ وہ معصوم لڑکا پروانے پہلے ہی جس کے پر کاٹ دیئے گئے ـــــ" پھر ایک دم سے وہ آنکھیں کھول کر مریم کی طرف جھک آیا ـــــ "کیا تم یقین کرو گی مریم! کہ میں عورت کی محبت سے محروم رہا ہوں میں نہیں جانتا عورت کی محبت کیا ہوتی ہے؟" اس نے ہاتھ بڑھا کر مریم کے بالوں کو چھوا اور وہ سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں ڈوب کر اس نے کہا ـــــ "شادی کا گناہ میرے ماتھے پر لکھا جا چکا ہے مریم! میں اس گناہ کو ماتھے پر سجائے جس جگہ گیا سب نے میری طرف سے اپنے چہرے موڑ لئے ـــــ" پھر ایک دم سے اس نے مریم کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک بلند قہقہہ لگانے کی کوشش کی ـــــ اپنے جذباتی پن کا تمسخر ـــــ "میں بھی کیا باتیں لے بیٹھا مریم ـــــ آؤ کچھ اور باتیں کریں!"

اس رات اس نے سوچا وہ اپنا سارا پیار، ساری توجہ خسرو پرویز کو دے گی اور دن کا بیشتر حصہ اسی کے ساتھ گزارے گی ـــــ خسرو پرویز کو محبت کی کتنی ضرورت تھی۔ اسے مریم کی کیسی ضرورت تھی ـــــ اور مریم نے آنے والے بہت سے دن خسرو پرویز کو جی بھر کے توجہ دیتے گزارے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی اس سے بچوں ایسی باتیں بھی کرتی اور اس کی غزلوں پر تنقیدی بحث بھی ـــــ اس سے جھگڑتی بھی اور اس سے پیار بھی کرتی لیکن ایک ہی ہفتے میں اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس کھیل کو زیادہ دیر نہیں نبھا سکتی۔ وہ خسرو پرویز کے پیار کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتی ہے ـــــ وہ ایک گھر بھی چاہتی تھی، ایک مستقل سہارا جس کے بارے میں اسے کوئی شک و شبہ نہ ہو، جس کے بارے میں وہ کبھی یہ نہ سوچ سکے کہ اب وہ اپنی عورت کے پاس خوش و خرم بیٹھا ہو گا۔ وہ اپنا اور صرف اپنا آدمی چاہتی تھی جس میں کسی غیر کی شرکت نہ ہو ـــــ اور اسی خواہش نے اسے وجاہت کی طرف پلٹنے پر مجبور کیا ـــــ یہی وہ دن تھے جب وجاہت نے اسے اپنے مستقبل کے ساتھی کے لئے چن لیا۔

اور رات گئے خسرو پرویز کا چہرہ اس کے لحاف میں گھس آتا۔ تب وہ لحاف الٹ کر بیٹھ جاتی۔ مریم کیوں پاگل ہوئی ہے۔ خسرو پرویز ناکام سہی، دکھی سہی لیکن وہ اپنی منزل پا چکا ہے اور تجھے بھی ایک منزل کی ضرورت ہے۔

کبھی جو ایسا ہو کہ میں خود کو پا جاؤں کیفے ایران میں بیٹھے ہوئے اس نے بلند آواز میں سوچا اور گنگنانے لگا:

اس جہاں کا وقت جیسے سو گیا پتھرا گیا جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا

دور بیٹھے ہوئے ایک قنوطی پروفیسر نے کہ جس کی ٹانگ کسی حادثے میں خراب ہو گئی تھی اور جو دانستہ طور پر لنگڑا کر چلتا تھا اور شہر کا زبردست سیکنڈل مونگر تھا کہ اس طرح اپنے احساس کمتری کو دور رکھتا تھا، دور سے ہانک لگائی ——— "میں نے کہا پروفیسر صاحب کہیں آنکھ تو نہیں لڑ گئی ——— سگریٹ خسرو پرویز کے ہونٹوں کی ایک ذرا سی لرزش سے کانپا اور فرش پر آ رہا۔ "لاحول ولا برادرم، جب بھی منہ کھولو گے واہی تباہی بکو گے ——— کسی مولوی نما پروفیسر نے کہا "کیا تم جانتے نہیں، ان کے گھر میں پانچ بچے ہیں۔" پانچ بچے ——— تیسرا زینہ ——— ننگ دھڑنگ بچے ——— باورچی خانے میں جلتی ہوئی ہنڈیا کی باس ——— میں اس کو آگ لگا دوں گا، مریم ——— مریم ——— تم کہاں ہو مریم ——— آؤ اس گھر کو آگ لگا دیں ——— مریم کیا مجھے یہ حق نہیں ——— مریم! میں کچھ کرنا چاہتا ہوں!

آخرکار اس نے اسے بلا بھیجا اور اس نے انکار نہ کیا۔ چپکے سے پرانے دنوں کی مانند چلی آئی۔ وہ اندر اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا ——— اس چہرے کی لکیروں میں اضافہ ہو چکا تھا اور کتنے دنوں سے اس کی کلاس میں بھی تو نہ آئی تھی ——— اسے یوں لگتا تھا: "اسے دیکھے گی تو اس شام وجاہت سے کئے گئے عہد کو بھول جائے گی"

لیکن اب ——— اس نے بلایا تھا، اور وہ اپنے قدموں کو روک نہ سکی تھی ——— خسرو پرویز نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا ——— یہ وہ نہ تھی ——— یہ اس کی مریم نہ تھی ——— چہرے پر وہ بھولپن نہ تھا ——— سیاہ آنکھوں میں وہ چمک نہ تھی ——— "مریم کہاں ہے؟" اس کا جی چاہا چلا کر کہے ——— مریم کو بلاؤ ——— مجھے مریم کی ضرورت ہے، تمہاری نہیں ——— پھر اس کی نظروں کی حدت سے وہ مصنوعی چہرہ پگھل کر ہوا میں تحلیل ہو گیا اور اس کی مریم، وہ بھولے معصوم چہرے اور سیاہ چمکتی آنکھوں والی مریم وہاں آموجود ہوئی ——— "مریم ——— اس نے بہت کچھ کہنا چاہا اور کچھ نہ کہہ سکا اور چپکا اسے دیکھتا اور دیکھتا رہا۔ تب مریم نے بازو موڑ کر وقت دیکھا اور اسے ایک دم سے وقت گزرنے کا احساس ہوا ——— "مریم ——— تم نے مجھے چھوڑ کیوں دیا ہے ——— میں تم سے کچھ نہیں چاہتا ——— صرف دوستی، کیا تم مجھ سے تمام عمر دوستی رکھ سکو گی ——— تم نہیں جانتیں مریم، تم میرے لئے کس قدر اہم ——— مریم ——— خدا کے لئے ہاں کہہ دو ——— صرف دوستی مریم ——— میں اور کچھ نہیں چاہوں گا ——— مریم کا جی چاہا اٹھ کر اس کے پاس جائے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہے ——— مگر اس نے سر جھکایا اور ہاتھوں سے کھیلنے لگی کہ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ تب وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا ——— مریم، مریم کے اندر کی لڑکی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ——— اور وہ اٹھ کر دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی ——— "مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے سر" اس نے درشت لہجے میں کہا اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی ——— وہ اپنے من کی نفی کرتی ہوئی چلی گئی اور خسرو پرویز سے دور ہوتی گئی۔

کیفے کی میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے بوڑھے اور جوان دانشور اعلیٰ پائے کے سیکنڈل مونگر تھے۔ ہر لڑکی کے بارے میں اوٹ پٹانگ قسم کی خبریں یہیں جنم لیتی اور یہیں پرورش پا کر باہر کی گلیوں میں آوارہ ہوتی ——— اس رات خسرو پرویز مریم کے بھرپور وار سے شکستہ اور نڈھال سست قدموں سے اندر داخل ہوا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر میز پر سر اوندھا لیا ——— "ہائیں خسرو پرویز! یار کیا ہوا؟" قریب کی میز سے ہمدردی کی آواز ابھری مگر وہ ویسے ہی پڑا رہا۔ بولنے چلنے کی تمام صلاحیتیں گویا سلب ہو چکی تھیں ——— "چہ چہ خسرو" دور کہیں آواز گونجی ——— "کیا ہوا ——— یہ لڑکیاں دولت کے پیچھے مری جاتی ہیں ———" "مگر یار بات کیا ہے ——" "یار وہی مریم ———" (خسرو کا کلیجہ پھٹنے لگا) "سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں ایک لونڈا سا آیا ہے۔ سلطان کے پاس کار ہے۔ دن بھر اسے اڑائے پھرتا ہے ——— خسرو پرویز کو دفعتاً اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا جی چاہا ایک جست لگا کر باہر بھاگ نکلے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر جلدی جلدی چہرہ پونچھا اور اپنی طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے باہر نکل آیا۔ رات آسمان سے قطرہ قطرہ گر رہی تھی ——— گر رہی تھی اور گہری ہوتی جا رہی تھی ——— ٹریفک کا ہجوم ——— کاروں اور سکوٹروں کا شور ——— اسے یکلخت اپنی کم مائگی کا احساس ہوا۔ وجاہت وہ جو سفید کار اڑاتا ہے اور ملاکھول اور کروڑوں کی

باتیں کرتا ہے — وجاہت اور مریم — مریم اور وجاہت — مگر خسرو بھائی سنو تو، تم کس امید پر اُٹھے تھے؟ تمہارے پاس کیا تھا؟ بھائی میرے، اس نازک کومل سی لڑکی کو تم دکھوں میں پالنا چاہتے تھے کیا؟ — مریم — نغمہ برلب تاکہ اس کی جان کا سناٹا ہو دور — مریم — اندر کیسا ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ وہ بلند آواز میں باتیں کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے اندر کے جہنم سے نجات پائے — نغمہ برلب — نغمہ برلب — پر کوئی نغمہ نہیں سوجھتا — مریم — مریم —

وہ سڑک سڑک پھرا — یہ گھنٹہ گھر ہے — وہ گھوم پھر کر وہیں آجاتا — یہ گھنٹہ گھر ہے — وہ سر اُٹھا کر گھڑی کو دیکھتا — ساڑھے گیارہ — اور پھر کسی بھوانہ بازار، کسی کچہری بازار یا کسی جھنگ بازار کی طرف اس کے قدم اُٹھ جاتے — وہ گھوم رہا تھا بے مقصد بے ارادہ، جیسے اُسے خود اپنے وجود کا احساس نہ ہو — جیسے وہ خود اپنے لئے بھی مر چکا ہو —

میں کون خسرو؟ — میں کون ہوں؟ — ایک بجھنے کو ہے خسرو — جیسے کسی بات کا کوئی مفہوم نہیں — ہر شے دھوکا ہے خسرو، ہر بات جھوٹ ہے — جئے جاؤ خسرو اور ہر جھوٹ کو نباہتے جاؤ — اور جب اس کا سر خود اپنے ہی خیالات کے بوجھ سے پھٹنے کو ہو گیا تو اس کے قدم کسی پالتو وفادار جانور کی مانند اسے کشاں کشاں جناح کالونی کی جانب کھینچ لائے۔

پہلا زینہ!

اس کے ہونٹ خشک تھے اور بے رنگ تھے اور اس نے تقریباً چار گھنٹوں سے پانی نہ کھایا تھا — جھکا ہوا سر، دکھتا ہوا بدن، ہوا اور مٹی سے بے ترتیب اُلجھے ہوئے بال —

دوسرا زینہ!

وہ سب سراب تھا خسرو پرویز — تم بھلا کاہے کی امید لگائے بیٹھے تھے — بے وقوف — تمہاری پہلی اور آخری پناہ گاہ یہی ہے —

تیسرا زینہ!

کہاں ہیں وہ — میرے بچے — زینے اداس ہیں خموش ہیں۔ کوئی ان کے سرے پر کھڑا چلا نہیں رہا — ابا آ گئے — ابا آ گئے —

چوتھا زینہ!

پانچواں زینہ!

چھٹا زینہ!

ساتواں زینہ!

آٹھواں زینہ!

نواں زینہ!

دسواں زینہ!

باورچی خانے کا دروازہ بند تھا۔ بچے سو چکے تھے۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں آیا۔ وہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اداس اور پریشان — دفعتاً اس کی نظر بائیں جانب اٹھی۔ وہاں وہ کھڑا تھا۔ گرد میں اَٹے ہوئے بال۔ خشک بے رنگ ہونٹ۔ سپاٹ آنکھیں — یہ میں ہوں — اس نے پہلی بار طمانیت سے سوچا جیسے اُسے یہی ہونا چاہیئے تھا اور کچھ نہیں — اور وہ — بستر پر وہ پریشان بیٹھی ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی — بے توجہی کا دکھ اس کے چہرے پر لکھا جا چکا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس بیٹھی ہوئی عورت کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اٹھا لیا۔

قیوم راہی

پتھر

"چچا میاں —— چچا میاں" سنیے احسن نے کمرے میں گھستے ہی رٹ لگائی۔

یہ اتوار کی حبس آلود دوپہر تھی اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ایک جاسوسی ناول میں کھویا ہوا تھا، احسن کی دخل اندازی نے یہ سارا فسوں آنِ واحد میں توڑ دیا۔ اس پر ایک خفیف سی جھنجھلاہٹ مسلط ہو گئی۔ کتاب کو ایک ہاتھ میں تھامے اس نے تیکھی نظروں سے احسن کو گھورا جس کے چہرے پر شرارت کے آثار جھلک رہے تھے —— دیکھنے میں بیشک احسن کا جسم دبلا پتلا تھا اور وہ کمزور سا لگتا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے ارادوں میں کس قدر مضبوط اور اٹل تھا۔

احسن چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر شاید اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تو اس نے وہی الفاظ دہرائے "چچا میاں ——!"

"کیا ہے ——؟" اس نے دانت پیسنے کے انداز میں پوچھا۔

احسن نے چند قدم آگے بڑھائے اور مدہم لہجے میں بولا "آپ —— آپ کیا کر رہے ہیں چچا میاں؟"

"بین بجا رہا ہوں" اس کی آواز قدرے کرخت ہو گئی "جاؤ باہر کھیلو"

احسن لمحہ بھر کو جیسے کچھ سوچتا رہا۔ پھر کمرے میں سے نکل گیا۔

"دیکھیے چچا میاں، عائشہ میرے لیے کتنی اچھی گڑیا لائی ہے" احسن نے ایک دن اسے نائیلون کی گڑیا دکھاتے ہوئے یہ خوش خبری سنائی تھی۔
سانولے رنگ اور بھدے نقوش والی اس کی ہم عمر سہیلی عائشہ بھی، اس سے چمٹی کھڑی تھی۔ عائشہ سامنے والے مکان میں رہتی تھی اور بیشتر اوقات سائے کی طرح احسن کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

اس کا سر ہلکی ہلکی ٹیسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا —— راستے بھر جیسے وہ انگاروں پر چل کر آیا تھا۔ مختار کو کتنی مدت کے بعد اس نے دیکھا تھا مگر کیسی بے اعتنائی سے وہ اسے نظر انداز کر کے اجنبیوں کی طرح اسکوٹر پر فرار ہو گیا تھا۔ یہ وہی مختار تھا جو مہینے میں کئی کئی بار چکر لگایا کرتا تھا لیکن جب سے وہ ایکسائز انسپکٹر بنا تھا اور اسکوٹر پر سوار ہوا تھا اس نے جیسے پیدل چلنے والوں کو لفٹ دینی چھوڑ دی تھی —— یہ کہیں کا —— اس نے آتے ہی اس دن کا خریدا ہوا رسالہ میز پر رکھ دیا تھا اور اس کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ رسالے کے سرورق پر بنے ہوئے نقش و نگار بڑے الوکھے تھے اور ان میں غیر معمولی کشش پائی جاتی تھی ——

احسن نے گڑیا کا پیٹ دبایا تو سیٹی کی آواز نے سناٹے کا جگر چیر دیا "چچا میاں —— گڑیا بول رہی ہے" احسن کے ساتھ عائشہ بھی ہنس پڑی

تھی اس بار بھی اس نے چپ رہ کر ہی احسن کو ٹالنے کی کوشش کی تھی مگر احسن تو جیسے اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

"چچا میاں"

"ہوں"

"آپ نے یہ ......" احسن نے رسالے کا سرورق پکڑ لیا تھا۔

"کیا ہے یہ؟" اس نے رسالہ کھینچا۔

پلک جھپکتے ہی سرورق رسالے سے جدا ہو چکا تھا۔ احسن کے ایک ہاتھ میں گڑیا تھی اور دوسرے ہاتھ میں سرورق۔ وہ بھاگنے ہی والا تھا کہ اس نے اٹھ کر سرورق چھین لیا تھا اور گڑیا کو باہر صحن میں پھینک دیا تھا' جاؤ ——— اب ایسی حرکت کی تو ہاتھ توڑ دوں گا ———"

احسن اس اچانک حملے سے ہونّق ہو گیا تھا۔ عائشہ ڈر کر بھاگی تھی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا صحن میں چلا گیا تھا ——— اور پھر اس کے سر پہ جیسے چھوٹے چھوٹے ان گنت پتھروں کا ڈھیر اکٹھا ہونے لگا تھا ——— میز پوش پہ روشنائی کے دھبے ——— کمرے کی دیواروں پر کوئلے سے بنائی ہوئی ٹیڑھی میڑھی لکیریں ——— سفید چادر پر ننھے پاؤں کے مٹیالے نشان ——— کاغذوں کے پرزے بکھرے ہوئے ——— ضد میں کر کے مچلنا اور رونا ——— عائشہ کے ساتھ مل کر اونچی اونچی آوازوں میں گانا اور سیٹیاں بجانا ——— پہلو بدل کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں ——— مارے درد کے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔

اور یہ واقعہ ——— یہ حادثہ اس وقت ہوا تھا جب وہ صبح کمرے کے فرش پر بیٹھا شیو بنا رہا تھا۔ بڑی سی گیند گولی کی طرح سنسناتی ہوئی دیوار پر لٹکے ہوئے کیلنڈر پر لگی تھی۔ ساتھ ہی احسن ہوا کے جھونکے کی مانند اندر آیا تھا اور اس کے داہنے بازو سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ سیفٹی ریزر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا ورنہ ——— بے تاب ہو کر اس نے احسن کے ایک بھرپور طمانچہ رسید کر دیا تھا" بالکل اندھا ہو گیا ہے ——— شرارتوں میں کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے ——— صحن میں عائشہ مٹی کی مورتی بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے ہونٹ کھلے تھے اور آنکھوں میں ایک بڑا سا سوال تھا۔ احسن بلکتا ہوا بھاگا تھا تو یہ مورتی بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی گئی تھی۔

شام کو اس کی بھابی نے انتہائی برہمی کے ساتھ اپنے خاوند سے شکایت کی تھی" دیکھئے آپ شہزاد کو سمجھاتے کیوں نہیں ——— آخر کسی بات کی حد بھی تو ہونی چاہیئے۔"

"ہوا کیا ہے آخر؟" بڑے بھائی نے حسب عادت مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شہزاد کی یہ بے راہ روی اور لاابالی پن محض اسی وقت تک ہے جب تک وہ شادی کی زنجیر میں نہیں جکڑا جاتا۔

"ہوتا کیا" بھابی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا" وہی پرانا رونا ہے۔ بات بات پر بچوں کو جھڑکتا ہے۔ جب میرے کسی بچے کو کبھی گود میں نہیں لیا تو یوں ہر وقت ڈانٹنے پھٹکارنے کا کیا حق پہنچتا ہے اس کو؟"

"میں پوچھتا ہوں معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ کیا ہوتا ——— صبح احسن کو اس بے دردی سے پیٹا ہے کہ بیچارے کا کئی منٹ تک سانس ہی قابو میں نہیں رہا۔ بچے سب ہی شریر ہوتے ہیں۔ چیزیں بھی خراب کرتے ہیں۔ شور بھی مچاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان سے ظالمانہ سلوک کیا جائے۔ پیار سے سمجھایا بھی تو جا سکتا ہے۔"

بڑے بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ کا دیپ بجھ گیا تھا اور اس سے جیسے ہلکا ہلکا دھواں اٹھنے لگا تھا۔ اس نے چھوٹے بھائی کو عجیب

نظروں سے دیکھا تھا۔ ان نظروں میں نہ غصہ تھا نہ شکایت تھی۔ وہ تو بس کوئی سوال کر رہی تھیں ـــــ سوال جو بڑا اہم تھا ـــــ سوال جس کی خاموش صدا سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔ اور جس کا جواب شہزاد کو زبان کی جنبشوں سے دینا تھا۔

"سنگدلی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" بھابی نے دونوں بھائیوں کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا تھا "ان بچوں نے بھلا کیا بگاڑا ہے ـــــ ہر وقت منہ سوجا رہتا ہے ـــــ ہر وقت مزاج کا پارہ چڑھا ہوا ہی ملتا ہے۔"

وہ گم سم بیٹھا تھا گویا اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو جیسے وہ یہاں موجود ہی نہ ہو ـــــ پھر ایکا ایکی وہ اٹھا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔

چند ہی منٹ بعد اس نے تصورات کی بجھی ہوئی قندیلیں پھر سے روشن کر لیں۔ بچھڑی ہوئی سٹرلی تو کمرے کے بند کواڑوں پر اٹک گئی کا زوردار دھماکا ہوا۔ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ نظریں گھمائیں تو سامنے دیوار پر سیاہ لکیریں کیڑے مکوڑوں کی طرح کلبلانے لگیں۔ کتاب کو تکیے کے نیچے رکھ کر اس نے داہنے ہاتھ کی کلائی سے پیشانی کو ڈھانپ لیا ـــــ کواڑوں پر ایک اور دھماکا ہوا ـــــ اس کے احساسات پر ایک اور چوٹ لگی۔ پھر صحن میں کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ احسن اور عائشہ کے ملے جلے قہقہے بھی شامل ہو گئے۔

کافی دیر تک وہ اسی گرداب میں پھنسا رہا۔ زندگی کے گلشن میں جب بھی اس نے خوش رنگ پھولوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا نکیلے کانٹوں نے اس کے ہاتھ کو زخمی کر دیا تھا پھولوں تک تو اس کا ہاتھ کبھی پہنچ ہی نہ سکا تھا۔ کبھی کبھی تو اس پر ایک عجیب سی سراسیمگی اور بیزاری کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ تمام جھمیلوں سے ایک انجانے سکون کی تلاش میں باغوں اور کھیتوں کی طرف نکل جاتا تھا۔

شعور ملا تو وہ اس تہہ خانہ میں پہنچ گیا جو ایک خطرناک گروہ کو پوشیدہ مسکن تھا اور جہاں اس وقت ایک بہت ضروری میٹنگ ہونے والی تھی ـــــ مگر وہ صرف چند سطور ہی پڑھ سکا کشتی نے تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ تلاطم برپا ہو گیا اور منہ زور تھپیڑوں نے اسے پیچھے دھکیل دیا ـــــ احسن کے چھوٹے بھائی کی روں روں کا ریکارڈ بجتے ہی اس کی بھابی چلائی "مر جا احسن کے بچے ـــــ ہزار بار کہا ہے کہ اس کا کھلونا مت چھینا کر، اسے مت رلایا کر ـــــ لیکن . . . ." لیکن احسن بھلا کہاں ماننے والا تھا چھوٹے بھائی کا کھلونا چھین کر یہ جا وہ جا ـــــ سیدھا عائشہ کے گھر پہنچ کر دم لیا۔

بچے کے بلکنے کی آواز پکے راگ کی طرح طویل ہوتی چلی گئی ـــــ برداشت کی دیوار دھڑام سے نیچے آ گری اس نے بددل ہو کر کتاب الماری میں پھینک دی اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا ـــــ چاروں طرف تپتی ہوئی جھلسا دینے والی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور ساری بستی پر سکوت طاری تھا۔ پتا پتا ساکت تھا۔ ذرہ ذرہ خاموش تھا۔ لیکن اندر ـــــ اندر کا لاوا اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ وہ رہ رہ کر احسن کی دھاندلی پر کڑھ رہا تھا۔ کھڑکی بند کر کے وہ ٹانگیں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھ گیا مگر اس کے ذہن کی وہ کھڑکی بدستور کھلی رہی جس پر احسن اچھل کود رہا تھا۔ اس کھڑکی کو بند کرنے پر شاید وہ قادر نہیں تھا۔ یہ امر شاید اس کی دسترس سے باہر تھا ـــــ ایکا ایکی اس نے کپڑے تبدیل کئے اور گھر سے باہر نکل گیا۔

دوسری ہی شام احسن اور عائشہ کی سنگتوں کی مالا ٹوٹ گئی۔ اس دن بھابی کے کسی عزیز کی شادی تھی اور وہ صبح سویرے ہی بچوں کو لے کر وہاں چلی گئی تھی۔ یوں عائشہ سیالکوٹ جاتے ہوئے احسن سے مل بھی نہ سکی تھی۔ اس کے والد کا تبادلہ اچانک ہو گیا تھا۔

خالی خالی گھر میں اسے بڑا اطمینان ملا۔ اس نے کئی ناول اور رسالے پڑھ ڈالے۔ کئی بار احسن کے خیال نے بھی گدگدی کی جیسے وہ آنے ہی والا ہو لیکن پھر جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو ـــــ احسن آئے گا تو اب شاید منفی کے پٹاخے نہیں چھوٹیں گے۔ دھما چوکڑی نہیں مچے گی ـــــ پھر نشیب و فراز کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ـــــ کچھ دنوں تک شاید ایسا ہو سکے۔ احسن کوئی نیا ساتھی ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ گلی کی کوئی اور عائشہ لے آئے گا ـــــ لیکن یہ چین عارضی ہی سہی، بہر حال غنیمت ہے ـــــ کچھ دنوں تک تو اس گھر کے آنگن میں آندھیاں نہیں چلیں گی۔

احسن دو دن بعد گھر واپس آیا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مگن تھا۔ باری باری اس نے اپنے تمام کھلونے دیکھ ڈالے تھے۔ اسے کافی دیر تک علم ہی نہ ہو سکا کہ عائشہ اب کبھی اس کے ساتھ کھیلنے نہیں آئے گی ـــــ عائشہ کو آنے میں زیادہ دیر ہو جاتی تھی تو وہ یا تو خود اس کے گھر چلا جاتا تھا یا باجا بجا کر اس کو بلا لیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے باجا اٹھا لیا تھا اور تین پہیوں والی سرخ رنگ کی سائیکل پر بیٹھ کر اپنے پھیپھڑوں کا زور باجے پر آزمانے لگا تھا۔

احسن کی ماں ان تمام حرکتوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ اسے سب باتوں کا اندازہ تھا۔ وہ احسن کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اسے یوں لگا جیسے باجے میں سے "عائشہ آؤ ـــــ عائشہ آؤ" کی صدائیں نکل رہی ہوں وہ رنجیدہ سی ہو گئی۔

احسن سائیکل چلاتے چلاتے اور باجا بجاتے بجاتے ہانپنے لگا تھا۔ اس نے سائیکل پر بیٹھے ہی بیٹھے اپنی سانسوں کو درست کیا، باجے کو نیکر کی جیب میں چھپایا اور سائیکل سے اتر کر صدر دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس کی ماں نے فوراً ہی اسے پکڑ لیا "کہاں جا رہے ہو بیٹے؟"

"عائشہ کے پاس"

"وہ" ماں احسن کے نزدیک ہی بیٹھ گئی "وہ تو چلی گئی"۔

"کہاں امی؟"

"سیالکوٹ ـــــ یہاں سے بہت دور" اس نے بیٹھے بیٹھے احسن کو گود میں اٹھا لیا۔

"کیوں چلی گئی امی؟"

"اس کے ابو جو چلے گئے"

"کب آئے گی وہ؟"

"اب وہ کبھی نہیں آئے گی بیٹے"

"نہیں امی" احسن مچلنے لگا "میں عائشہ کو بلاؤں گا"۔

احسن کی ماں نے کواڑ کھول کر سامنے اشارہ کیا "وہ دیکھو ـــــ دروازہ بند ہے اور کتنا بڑا تالا لگا ہوا ہے اس میں"

احسن نے ایک دم چپ سادھ لی۔ اسے شاید اپنی ماں کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس کی ماں اسے لے کر کمرے میں آ گئی۔ پھر اس نے احسن کو خوب پیار کیا اور طرح طرح کی باتوں سے اس کا دھیان بٹانے لگی۔

یہ بڑا ہی بے رنگ سا دن تھا۔ صبح ہی سے لو کے جھونکے سر سرا رہے تھے۔ سہ پہر ہونے کو آئی تھی لیکن گرم ہواؤں کا زور کم نہیں ہوا تھا۔

وہ جب گھر میں داخل ہوا تو پسینے میں شرابور تھا۔ چپل اور پاؤں خاک آلود تھے، کپڑوں پر بے شمار شکنیں تھیں اور سر کے بال پریشان تھے ـــــ نیچی نظریں کئے وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا ـــــ اب تو نہا کر ہی طبیعت کچھ بحال ہو گی ـــــ اس نے خود کو پلنگ پر گرا دیا ـــــ اس کی سوچوں نے اسے پھر دفتر میں پہنچا دیا اور منیجر کی تلخ کلامی کا خیال اس کے خون کو گرمانے لگا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ کھانے کی چھٹی کے بعد دیر سے دفتر پہنچا تھا۔ اس پر نوبت تو تو میں میں تک پہنچ گئی تھی ـــــ کام مشین کی طرح کرو، سخت پابندیوں میں جکڑے رہو اور معاوضہ ہے ـــــ اونہہ ـــــ نئی ملازمت کے لئے کتنے ہاتھ پیر مارے تھے اس نے ـــــ لیکن مقدر کا کیا کیا جائے ـــــ؟

"عائشہ چلی گئی چچا میاں"

اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ کب احسن داخل ہوا اور کب اس کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"تو میں کیا کروں" وہ اٹھا اور کھونٹی پر سے پاجامہ لے کر غسل خانے میں چلا گیا۔ اس نے احسن کو ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

احسن جو اپنے چچا کی ہمدردیاں حاصل کرنے آیا تھا خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا۔

جب وہ نہا رہا تھا تو اس نے اپنی بھابی کی آواز سُنی "بیٹے تو کیوں گیا تھا وہاں ——— وہ انسان تھوڑی ہے ——— وہ تو پتھر ہے ——— پتھر" ———
اس کے جبڑوں میں تناؤ پیدا ہوگیا تھا اور گردن اکڑ سی گئی تھی ——— بھابی کی آواز کا شیشہ پتھر سے ٹکرا کر کرچی کرچی ہوگیا تھا۔

احسن کی تمام چالاکیاں سرد پڑ گئی تھیں۔ وہ سست سست سا رہنے لگا تھا۔ کبھی وہ صحن اور کمروں میں بے مقصد گھومنے لگتا تو کبھی اپنے کھلونے بکھر کر یونہی انہیں اُلٹ پلٹ کرنے لگتا ——— گھر کا ماحول یکسر بدل گیا تھا۔ اب نہ نت نئی شرارتوں کی یورش تھی اور نہ احسن کی اوٹ پٹانگ باتوں کا کھٹکا تھا۔ فضا میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہوگیا تھا اور یہ ٹھہراؤ اس کے لئے تسکین کا پیغام بن کر آیا تھا۔ وہ گھر میں بڑا سکون محسوس کرنے لگا تھا۔

عائشہ کو گئے یہ پانچواں دن تھا۔

اس دن اس زور کی آندھی چلی کہ سارا شہر گرد و غبار میں اَٹ گیا ——— فرم کے مالک نے اسے اپنے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بلا کر چند نوٹ اس کی طرف بڑھائے تھے، ساتھ ہی یہ جانکاہ خبر بھی سنائی تھی کہ آج سے فرم کو اس کی ضرورت نہیں رہی۔

جب وہ دفتر سے باہر نکلا تھا تو چیختی چلاتی ہوائیں پاگل ہو رہی تھیں۔ درخت جھکولے کھا رہے تھے، سڑک ویران تھی اور بازار کی گہما گہمی ماند پڑ چکی تھی ——— بار بار ریتیلی مٹی اس کی آنکھوں میں گھس کر اس کو رُلا رہی تھی ——— بار بار بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر گر رہی تھیں ——— لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے یوں چلا جا رہا تھا گویا وہ خود نہیں چل رہا تھا، بلکہ ہوائیں اُسے دھکیل رہی تھیں ——— اچانک اسے یوں لگا جیسے یہ سارا شہر غیر آباد ہوگیا ہو ——— ساری کائنات اُجڑ گئی ہو ———

کافی دیر بعد جب ہواؤں نے ریلوں کی یلغار تھمی اور وہ اپنی گلی کے نکڑ پر پہنچا تو ٹھٹھک سا گیا۔ احسن خالی مکان کے دروازے کے ساتھ لگا کھڑا تھا ——— یہ اس وقت اکیلا یہاں کیا کر رہا ہے ——— کیا پھر کوئلوں سے مصوّری کا شوق چرّایا ہے اسے ——— ؟ پھر وہ عذاب میں جیتا ہوا احسن کے نزدیک پہنچ گیا۔

مکانوں کے عقب میں آسمان پر آگ لگی ہوئی تھی ——— اس نے دیکھا احسن کے ہاتھ میں کوئلے کی بجائے نائیلون کی گڑیا تھی ——— اور وہ کبھی گڑیا کو اور کبھی خالی گھر کے در و دیوار کو تک رہا تھا ——— اس کے جسم میں ایک سردی سی دوڑ گئی اور سانسوں کا زیر و بم تیز ہوگیا ——— وہ کبھی تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ احسن بھی یوں سنجیدہ ہو سکتا ہے۔ احسن تو اس کے لئے محض ضد اور شرارتوں کی علامت بن کر رہ گیا تھا۔ پتہ نہیں آج وہ نٹ کھٹ شریر احسن کہاں روپوش ہوگیا تھا ——— عائشہ کی یاد اسے اس دروازے تک کھینچ لائی تھی ——— عائشہ جو ہمیشہ کے لئے اس سے بچھڑ گئی تھی ——— اور یہ غم کی ایک مکمل تصویر تھی ——— دکھ کا یک المناک منظر تھا اسے یوں لگا جیسے آج احسن اس بیکراں دھرتی پر تنہا رہ گیا ہو ——— آج وہ خود بھی تو بے سہارا ہوگیا تھا ——— آج وہ خود بھی تو ایک بھاری بوجھ اُٹھائے اکیلا گھوم پھر رہا تھا ——— گڑیا پر نظر پڑی تو دفعتاً ایک خیال اس کے جگر میں نشتر بن کر پیوست ہوگیا ——— میں نے تو اسے کبھی کوئی کھلونا لا کر نہیں دیا ——— کبھی کوئی چیز نہیں دی سوائے جھڑکیوں کے سوائے غضبیلی نظروں کے ——— اس کے سینے میں کوئی شے تڑپ کر رہ گئی ——— اور پھر دبے دبے اضطراب اور سہمے سہمے غم نے سارے حصار توڑ ڈالے۔

احسن نے ایک بار کواڑ کی جھری میں سے اندر جھانکا۔ شاید وہ بیتے دنوں کی ایک ایک بات تازہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ننھے ہات سے لٹکے ہوئے تالے کو یوں پکڑ لیا جیسے سارا قصور اس تالے کا ہی ہو ——— وہ مڑا تو اس نے اپنے چچا کو دیکھا۔ گھبراہٹ میں گڑیا اس کے ہات سے چھوٹ کر گیلی زمین پر گر گئی۔

اس نے بڑھ کر احسن کی گڑیا اُٹھالی اور پتلون کی جیب سے رومال نکال کر اسے صاف کرنے لگا ——— پھر گڑیا کے ساتھ ساتھ جیسے اس کے دل کا میل بھی صاف ہوگیا ہو ——— احسن نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر ڈرتے ڈرتے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"چچا میاں ——— وہ عاشیہ تھی نا عاشہ ——— وہ ——— وہ ———"

اس نے بے اختیار احسن کو گود میں اُٹھا لیا۔ احسن کا بدن بخار میں جل رہا تھا۔ وہ اسے سینے سے چمٹا کر گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

عشرت نقوی

شمشاد والا

اور جب شمشاد والے نے تیسری شرط بھی جیت لی تو شکورا اتنا کبوتر کی گردن ہلا ہلا کر پنجوں کے بل جھومنے لگا۔ لطیف نے ہارتے ہوئے بھی گیندے کے زرد زرد پھولوں کا ہار اس کی گردن میں ڈال دیا جس میں ایک ایک کے نئے نئے دس نوٹ پھولوں کی طرح پروئے گئے تھے۔ منظور قصائی نے اپنی طرف سے ایک چھوٹا سا کپ دیا تھا جو کبھی اس نے جیتا تھا۔ اللہ دین سرخ سرخ گلاب کے پھولوں کا بنا ہار لایا تھا مگر وہ اس نے اسی وقت توڑ دیا پھولوں کی پتی پتی ادھیڑ کر رکھ دی اور منہ سے صابن کے سے جھاگ نکالتا ہوا، لطیف کو بے بھاؤ کی سناتا ہوا، اپنے ساتھیوں کو لے کر چلا گیا۔ وہ دراصل صرف پچاس ہی ہارا تھا لیکن لطیف نے تو پورے سو کی کھائی تھی۔ پھر بھی شکورے سے ایسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا جیسے اس کا مغل اعظم ہار نہ ہو بلکہ جیتا ہو مگر شریف سب سے علیحدہ خاموش کھڑا تھا۔ اس نے شکورے کو جھوٹے منہ بھی مبارکباد نہ دی تھی۔ سب اس کے دل کی بات جانتے تھے۔ وہ شکورے سے ہارے ہوئے اونٹ کی مانند خار کھاتا تھا۔ اس نے پچھلے جمعے کو ڈیڑھ سو ہارے تھے۔ سو نقد تھے اور پچاس کے بدلے میں بیوی کے چاندی کے پازیب اور جھمکے دیئے تھے۔

یکا یک باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ شریف لطیف سے مخاطب ہوا: "بھائی لطیف! شکورے سے کہہ دے اگلے جمعہ دو سو کی ہوگی۔ اب کے شاہین کو تیار کیا ہے۔ امریکہ کے جہاز کی طرح آواز سے تیز اُڑتا ہے۔ شاہین ہے شاہین۔ وہ ماسٹر کہتا ہے نا۔ اقبال کا شاہین بہت اُڑتا تھا۔ میرے شاہین سے مقابلہ کرے تو وہ وقت کا دانہ پانی بھول جائے۔ کل رات آٹھ بجے اترا تھا۔ محلے کی پانچ لالٹینیں اکٹھی کرنا پڑی تھیں۔"

اور شکورے نے کہا: "لطیف تو بھی اس سے کہہ دے، دو کی کیا چار کی لگا لے پر میں اس کی بیوی کے زیور نہیں لوں گا۔ پچھلے جمعے جس کا نقصان ہوا تھا جھمکے بالکل بیکار تھے۔ سالوں میں کھوٹ ملا ہوا تھا۔ میاں! شرط لگانی ہے تو نقد نارائن ہوگی نقد نارائن۔ کانوں کے کڑے کنگن تے نوٹ۔ اگر منظور ہے تو میں تیار ہوں۔ اپنا شمشاد والا زندہ باد، پاکستان پائندہ باد!"

شریف تھوڑی دیر تو چپ رہا گویا کوئی فیصلہ کر رہا ہو، اور پھر بکنے لگا: "نہیں دو سو کی ہوگی۔ نقد سودا ہوگا۔ پنچھے صبح چھ بجے چھٹیں گے۔ آخری ٹیم پانچ بجے جگہ رُپے لطیف رکھے گا دونوں کے۔" اور منظور قصائی نے بھی حسب معمول گھوڑوں کی ریس کی طرح لطیف سے شاہین پر پچاس کی بدلی۔

شکورا اپنے محلے کے مشہور کبوتر بازوں میں سے تھا جس کی عمر کا اکثر حصہ چھت پر آسمان کو گھورتے، گوڈی کے چکر لگاتے اور گلیوں میں گھومتے ہوئے گزرا تھا۔ یہاں تو محلے کا سب سے مشہور کبوتر باز منگو شاہ تھا کہ جب بھی اس سے شرط لگانے کی کہتے تو وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتا اور دل میں اپنے بجھے پنکھ، بوڑھے کبوتروں کو گھورنے لگ جاتا۔ اس کے پاس اعلیٰ سے اعلیٰ نسل کے کوئی ڈھائی سو کبوتر تھے۔ وہ شام تک اُڑتے نظر آتے۔ شکورے نے ایک دن تو للچائی ہوئی نظروں سے اس کے کبوتروں کو دیکھتے ہوئے کہہ ہی دیا: "چاچا! تیرے پاس یہ بڑھیا بڑھیا کبوتر ہیں۔ اُٹھتے ہی آسمان سے باتیں کریں ہیں۔ دن کے

تارے بن جاویں ہیں۔ چاچا! نُو تو مہینے میں ہزاروں کماتے۔ یہ تیرا چھیا اگر میرے پاس ہوتا تو مولا کی! پن کے وارے نیارے ہو جائیں۔ رمضو کی ماں کے ہاتھ سونے سے بھر دوں۔ باپ کو مہینہ بھر میں بیماری سے کھڑا کر دوں۔ اور چاچا! تیرا یہ ہرا تو اب ختم ہو گیا وہ نہ تو میں نے اسے رات میں اُڑتے دیکھا ہے۔ پہناں بہت چھوڑ دیا ہے اس نے۔ وہ خلا ہے نا سالا۔ پھر بچے بھی سفید ہیں اور چاچا! اپنے شمشاد والے کی بھی کیا بات ہے پرسوں ہی ڈیڑھ سو جیتا ہے۔ سو میں نے بیچے اور پچاس رمضو جیت گیا۔ اللہ دین نے اس سے پچھلے جمعہ عبدالغنی سے جیتے تھے۔ دس۔ اب پھر بد گئی ہے شریف سے دو سو کی۔ خدا مہربان رہا تو یہ بھی جیت جاؤں گا۔"

"شکورے! یہ شریف سے شرط نہ لگا یا کر۔ حرام زادے نے سارا گھر اس دھندے میں لٹا دیا۔ باپ نے بہن کے لئے کچھ زیور بنائے تھے۔ کتے کی اولاد نے سارے ختم کر دیئے۔ بیوی الگ قسمت کو روتی ہے۔ بہن بھی بائیس کے پیٹے میں ہو گی۔ ابھی تک گھر بٹھا رکھا ہے اسے۔ بھلا کبوتر بازی سے شادی ہوئے ہے خدائی میں کہیں!"

"چاچا! میں چاہوں تھوڑی تھا۔ وہ تو اس نے خود لگائی ہے۔ اُسے اپنے شاہین پر گھمنڈ ہے تو اپنا شمشاد والا کم نہیں کسی سے۔ اور چاچا! میں نے بھی اس سے کہہ دیا ہے کہ نقد نقد سودا ہو گا۔ جیو رشیو رنہیں لوں گا۔ اور چاچا ایک بات اور بھی ہے۔ باپ کا اپریشن ہونا ہے۔ ڈاکٹر کہے ہے چھ سو روپے لگیں گے ایک سو تو میرے پاس ہیں۔ دو سو نیلی چھتری والا چاہے گا تو یہ بھی ہو جائیں گے۔ باپ کا علاج ہو جائے گا۔ چاچا! وہ بہت مخالفت کرے ہے میرے شوق کی پر میں بھی بتا دوں گا کہ میرے کبوتروں نے ہی تجھے ٹھیک کیا ہے۔" شکورے نے پانی پیتے ہوئے چینے کو گھورتے ہوئے کہا۔

یوں تو شکورے کے پاس پورے پچاس جوڑے تھے مگر اس کے جگرے کبوتر تھوڑے ہی سے تھے۔ شریف والا اور مل والا اس کے پکڑے ہوئے پٹھے تھے شریف والا تو پار سال شریف کا کھیتا تھا۔ اب تو اس کے دو بچے ہیں۔ مل والا اس نے بھانا رام مل سے پکڑا تھا۔ چاند اس کے اپنے گھر کا تھا لیکن سب سے زیادہ اس کو شمشاد والا اور چھپا پسند تھے۔ چھپا کو وہ اس لئے زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ بڑی مشکل سے کئی کبوتریوں کے سر گنجے کر کے، آنکھیں خراب کر کے، شمشاد والے نے صرف اس کو ہی اپنے خانے میں جانے کی اجازت دی تھی اور چھپا بھی اس کی ایسی عاشق صادق نکلی کہ پہلی ملاقات میں اپنا دل ہار بیٹھی۔ وہ سہمی سہمی سی اس کے خانے میں بیٹھی رہی۔ اور جب شکورے نے اس کو شمشاد والے کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر اس کے نمانے میں دو دانے رکھ دیں تو اس نے ایک لمحے کے لئے اپنی گلابی گلابی گردن کو اٹھایا، شبنمی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور پھر گردن جھکا کر اپنی چھوٹی سی چونچ اس کے سرخ سرخ پیروں پر رکھ دی۔ شمشاد والے کو شاید اس کی یہی ادا بھا گئی۔ اس کی موتیا آنکھوں سے جھلکتا ہوا غصہ آہستہ آہستہ کافور ہو گیا۔ اس کی جگہ پیار پھیلتا چلا گیا۔ اس نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور اپنے سیاہ پنجوں کے بل اس کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے عجیب عجیب نغمے پھوٹنے لگے۔

جب شمشاد والے نے مسلسل تین شرطیں جیتی تھیں وہ پورے محلے میں چتا نیتر کی طرح مشہور ہو گیا جس کو بچوں سے لے کر بڑی بوڑھیاں تک جانتی تھیں۔ لوگ کہنے لگے۔ یہ شمشاد والا تو چتا نیتر کے روپوں سے بھرے ہوئے مٹکے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ وہ خاص طور پر اس کو دیکھنے آئے تھے۔ جیسے شمشاد والا کبوتر نہ ہوا ہو کوئی پہلوان ہو۔ وہ نسل کا چینا تھا مگر شکورے کی ماں اسے گلاب شاہ کہتی تھی۔ اس کی بیوی نے اس کا نام موتی رکھا تھا۔ موتی اس کا بڑا مناسب نام تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل موتیے کی طرح صاف شفاف رہتی تھیں۔ کبھی کبھار ان میں گلابی گلابی رنگ جھلکنے لگتا تھا۔ بعض وقت تو ایسے لگتا جیسے ابھی کئی موتی آنکھوں سے نکل کر گر پڑیں گے اس کے چھریرے جسم پر بھی سیاہ، سفید ہزاروں موتی بکھرے ہوئے تھے۔ چھوٹی سی چونچ، ابھرے سیاہ بادلوں کا سا سر جس کی سیاہی پھیلتے پھیلتے اس کی گردن تک آ گئی جس میں قوس قزح کے تمام رنگ پھوٹ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر اس کی ماں کہا کرتی تھی "ارے شکورے یہ تو اپنے سکتر صاحب کے باغ میں لگے ہوئے کالے گلاب سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ میں تو اسے گلاب شاہ ہی کہوں گی۔"

شمشادوالا دراصل اس کا باپ تھا جو اب بھی شمشاد بائی کے پاس ہے۔ شمشاد بائی ملتان کی مانی ہوئی کبوتر باز تھی۔ شکورے کا چاچا کہا کرتا تھا: "بلّی! کبوتر تو اپنی شمشاد بائی کے پاس ہیں۔ پرنہیں، جو کبوتر اس کی ماں نے (اللہ اسے جنت نصیب ہو) رکھے تھے وہ تو اس کے پاس بھی نہیں۔ یہی تو اسی سے لگا کرے تھی ہزار سے کم تو بات ہوتی ہی نہیں تھی۔ اپنے جوڑ کی تو وہی تھی۔ وہ بھی تھا کبوتری تھی بہترین پٹھوری تھی، پر کبوتر بازی کے علاوہ وہ بات ہی نہ کرے تھی۔ میرے کبوتر دیکھنے آوے تھی میں بھی اس کے کبوتر دیکھنے جایا کروں تھا۔ لیس، ابلق، طلسر، سرخا، چینا، کمری، کاغذی، ہرا ہرا کرے تھی۔ ران پہ تو ہاتھ دھرنے دیتی ہی نہیں تھی کنجری کہیں کی ہزاروں ہار گئیں پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہتی تھی کبوتر بازی کرنی ہے تو شوق سے اس وقت آؤ۔ رنڈی بازی صرف رات کو سجتی ہے۔ ہماری صبح جب ہوتی ہے جب شریفوں کی رات ہوتی ہے۔ اس وقت ہم شرفا میں شامل ہوتے ہیں۔ اب تو صرف کبوتروں کی بات کرو۔"

اور چاچا ایک سرد آہ بھر کر کہتا: "سالی ہر دم نشے میں دھت رہتی تھی۔ کبوتروں کو بھی گلی میں تیرتے ہوئے ملیدہ کے ساتھ ساتھ سوؤں روپے کی روز افیم کھلا دیتی تھی۔ زعفران بھی دیا کرتی تھی لیکن اکثر کبوتر اس کی طرح افیم ہی زیادہ پسند کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے وہ ان کو شراب پلاتی تھی پانی کی جگہ، لیکن یہ غلط ہے۔" چاچا جو سب محلے کا چاچا تھا سینے پر ہاتھ مار کے کہتا: "یہ صرف چاچا منگو ہی جانتا ہے کہ شراب اس کے تین کبوتر ہی پیتے تھے۔ کبوتری کوئی بھی نہیں پیتی تھی۔ حرامزادی میرے ہی سامنے شراب سے مست کبوتروں کو اپنے ادھ کھلے سینے پر بٹھا لیتی اور اس زور سے پیار کرتی کہ میری طبیعت بھی خراب ہو جاتی تھی۔ جی چاہتا کہ ان کبوتروں کی گردن مروڑ کر رکھ دوں اور ..... اور بس وہ شراب کی بوتل بن جاتی برانڈی کی طرح گرم۔ جی چاہتا ایک ہی گھونٹ میں پی جاؤں۔ میں اس سے کہتا: "کیا میں ان سے بھی بُرا ہوں" تو ہنستے ہوئے کہتی: "تم تو میرے بادشاہ کی طرح نرے لڑکے ہو۔ اس کی طرح کبوتروں کے پیچھے بھاگتے ہو اور بھاگتے بھاگتے تھک جاتے ہو۔ دوسرے کبوتروں کو گرد منڈلاتے دیکھ کر رہ جاتے ہو۔ منگو شاہ! تم جانتے ہو یہ کبوتر رات کو اندھے ہو جاتے ہیں اور میری آنکھوں پر بھی رات کو پٹی بندھی ہوتی ہے۔ کبوتر باز ہو کر بھی نہیں سمجھ سکتے، میرے بادشاہ کی طرح تمہاری عقل بھی موٹی ہو گئی ہے۔ بوڑھے ہو گئے۔ کاغذی بال تمہارے جسم پہ اگ گئے پر رہے بوڑم کے بوڑم ہی۔"

سال اور پر ہو گیا۔ شام کے کوئی چار بجے تھے۔ شکورا کبوتر کھرے حسب معمول آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت چینا اکیلا ہی نیچے اُڑ رہا تھا۔ شکورا اس کے اُڑنے کے انداز اور اس کے رنگ سے فوراً پہچان گیا کہ یہ دوسری جگہ کا ہے یا کسی نے نیا تیار کیا ہے۔ اس نے فوراً تمام کبوتروں کو کابکوں سے نکال دیا۔ چند کبوتر چھتری پر بٹھا دیئے۔ دو دو غٹے اور موٹے موٹے کبوتروں کو فضا میں اچھال دیا۔ پانی سے بھرے مٹکے سے تھوڑا تھوڑا پانی تسلے میں ڈالنے لگا تھوڑی ہی دیر میں شمشادوالا دونوں کبوتروں کے ساتھ اُتر آیا۔ اس وقت اس کی زبان چونچ سے باہر نکل رہی تھی۔ وہ لڑنے جوسنے مرغے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی پھیلی پھیلی آنکھوں میں زردی چھائی ہوئی تھی جس نے آنکھوں کے کٹورے سے سیاہ دانے کو بھی پھیکا کر دیا تھا۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ و سفید پر پھیل کر زمین سے لگ رہے تھے۔ وہ زمین کی طرف پڑے ہوئے دانوں کی طرف گیا لیکن بغیر ایک دانہ کھائے پانی کی طرف چلا گیا۔ اس نے پانی بھی نہ پیا اور گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شکورا سمجھ گیا کہ بس اب یہ اُڑنے والا ہے۔ اس نے فوراً ہی چھپکا مار کر اس کو دبوچ لیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں شمشاد بائی نے اس کے دروازے کا کنڈا کھٹکھٹا دیا اور اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا: "میرا شیرا یہاں اُترا ہے۔ اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہوگا۔ آج غصے میں میں نے اُسے ایک گولی بھی نہیں دی۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔ میرا شیرا مجھے واپس کر دو میں اُسے مناؤں گی۔ میں دو کی جگہ چار گولیاں دوں گی اُسے۔ میرا کبوتر واپس کر دو۔ آج وہ تمام دن غائب رہا ہے وہ بھوکا ہوگا جب تک وہ گولی نہ کھائے گا، وہ قطرہ نہ پی سکے گا، ایک دانہ بھی نہ کھا سکے گا۔"

"لیکن جناب! یہ کونسے قانون میں لکھا ہے کہ پکڑا کا مال واپس کر دو۔ پورے دو گھنٹے دھوپ میں سکتا رہا ہوں۔ میرا ایک پٹھا ابھی تک نہیں آیا۔ میں کیسے واپس کر دوں جناب کا شیرا؟" شکورے نے مرعوب نہ ہوتے ہوئے کہا۔ وہ دل میں سوچنے لگا۔ حرامزادی کبوتر لینے آئی ہے۔ نہ جانے

کتنے لوگوں کے پر قینچ کر چکے ہیں۔ اپنا ایک کبوتر ہاتھ سے جانے لگا تو آگئی رونے پر تو نذیا زدہ مارہٹ۔ یہ جواب پٹھہری ہے۔ اگر میرے ڈربے کی کبوتری بن جائے تو۔۔۔ کیا غضب کی چال پائی ہے ظالم نے۔ لقا کبوتر کی طرح چلتی ہے بالکل۔

وہ آگے نہ سوچ سکا۔ شمشاد بائی نے پھر کہا "سو روپے لو اور کبوتر واپس کردو۔ اس کا بچہ بڑا پریشان ہے۔ صبح سے چیں چیں کر رہا ہے۔ ہیرا بھی بڑی پریشان ہے۔ ابھی تک چھتری پر بیٹھی ہے۔"

"بس! سو روپے یہ تو بہت تھوڑے ہیں۔" شکورے نے کبوتر کی اہمیت اور سرخ رنگ کی کار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا دو سو لے لو۔"

ان پر تو تھوکر مارتی ہے یہ تو ہیرا ہے ہیرا۔"

"ڈھائی سو ہی لے لو" اس نے غصے سے لال بھبوکا ہو کر کہا۔

"یہ تو تیری مسکراہٹ کی قیمت بھی نہیں۔"

"اچھا تین سو لے لو" اس نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک گیت پر ہزاروں کمانے۔ رات لوگوں کو دیوالیہ کرنے اور اس انمول موتی کی قیمت صرف "تین سو"! پر خیر تو بھی کیا یاد کرے گی کوئی ملا تھا دل والا پر ایک شرط ہے۔ ایک بچہ بھی لوں گا ساتھ۔۔۔۔۔" اور شکورے نے اپنی بات منوا کر چھوڑی تین کی جگہ چار سو مارے، بچہ بھی لے لیا اور ایک رات اس کا گانا بھی سن آیا۔۔۔۔ ہائے کیا "عجب" کی گاوے ہے۔ میں تو نذرانہ بائی کو ہی سمجھا تھا پر کیا بات ہے اپنی شمشاد بائی کی۔ تڑپا دیا ظالم نے۔ چھری تھی چھری۔ کاٹ کے رکھ دیا۔ دل تو کرے تھا ان چار سو میں دس پانچ اپنے بھی ملا کر اس کے قدموں میں رکھ دوں۔ پھر سوچا کبوتر دینے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ دینا ہے تو اپنی نذرانہ بائی کو کیوں نہ دوں وہ تو اور بھی مہربانی کرے ہے۔

لیکن شمشاد والا کنجر کا جنا ہی ثابت ہوا۔ افیم کے بغیر حرامزادہ دو پر بھی نہیں مار سکتا۔ دو پہ روز کی افیم کھا جاتا ہے۔ ابھی پورے پر بھی نہیں آئے تھے کہ کبوتریوں کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ ڈربوں کی کوئی کبوتری بھی نہیں چھوڑی۔ کئی دفعہ مار کھائی۔ سر گنجا کیا۔ آنکھ بھی زخمی کر لی مگر عادت نہیں چھوڑی۔ جس خانے میں کسی کو اکیلا دیکھا پھاٹک سے پر پر کر اس میں گھس جاتا۔ مجال ہے کہ کوئی کبوتری اکیلی ہو اور یہ اس کے گرد گھومتا نظر نہ آئے۔ تمام کبوتریاں اس سے بلی کی طرح بھاگتی تھیں۔

شکورے کی بیوی کو اس کی یہ ادا بہت بری لگتی۔ پھر بھی دیر تک اس کی حرکتوں کو دیکھتی رہتی۔ وہ سوچتی۔ یہ شکورا میرے لئے اتنا دیوانہ کیوں نہیں ہوتا۔ میں نے کب اس کی خوشی کو اپنی خوشی نہ سمجھا۔ کون سی اس کی خدمت میں کسر رکھی ہے جو شمشاد والے کی طرح ہر کبوتری کی طرف بھاگنے لگتا ہے۔

شکورے کی ماں بھی اس سے بہت خوش تھی کیونکہ وہ شمشاد بائی کی طرح بڑا ہیرا ثابت ہوا تھا۔ مہینے میں چار سو کما رہے تھے۔ "ہتنے تو شکورا بھی نہیں کما"۔

شکورے کے باپ کا علاج تو دراصل یہی کر رہا تھا۔ وہ جب تک اڑایا نہ جاتا خود نہ اڑتا تھا۔ اکثر دیوار یا چھتری پر بیٹھ کر ہی سرخی مائل سفید آنکھوں سے دھوپ میں لیٹے ہوئے شکورے کے باپ کو گردن جھکا جھکا کر بڑی پیاری نگاہوں سے دیکھتا۔ جیسے اسے اس کی بیماری کی بہت فکر ہو، بہت دکھ ہو جیسے وہ صرف اس کے علاج کے لئے جیتا ہو۔ بعض دفعہ تو ایسے لگتا جیسے ابھی رو دے گا۔ اس کی آنکھوں میں پانی سا تیرنے لگتا۔

شکورے کے باپ میں بھی اچانک کئی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ وہ شکورے کے اس شوق سے سخت تنگ تھا لیکن اب خود اپنے سامنے اس کے لئے خاص گھی کا ملیدہ بنتا تھا حالانکہ خود انہیں اصل گھی کھائے ہوئے برسوں گزر چکے تھے۔ وہ افیم کے استعمال کو حرام سمجھتا تھا۔ اس نے کئی دفعہ شکورے کو ٹوکا تھا، کئی دفعہ مارا تھا مگر اب تنے

ڈھیٹ بن کر اس کی گولیاں بند نہ کی تھیں لیکن اب خود وہ شکورے کو یاد دلا دیتا۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے اس کے کبوتروں کا خیال کرتا رہا کہ مہینہ ہوا جب شکورے کے سات کبوتروں کو بلی مار گئی تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے کئی دفعہ اپنی گٹوا گٹوا کر کبوتروں کو کھلائی تھیں۔ کئی دفعہ رات کی بچی ہوئی روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ان کے سامنے ڈالے تھے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتا "یہ گلاب شاہ تیرے شکورے سے بھی اچھا نکلا۔ وہ تمام دن رکشا چلانے سے گھیٹنے میں دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں کماتا اور جو کماتا ہے پتہ نہیں کہاں کرتا ہے۔ میرا علاج تو یہ گلاب شاہ ہی کر رہا ہے۔ سارے دن چھتری پر بیٹھا مجھے تکا کرے ہے۔ ایسا لگے جیسے میرا دوسرا بیٹا ہو۔ مجھے تسلیاں دے رہا ہو ——— باپو! تو گھبرا نہیں، میرا علاج میں کراؤں گا۔ تیری بیماری میں دور کراؤں گا۔ یہ دو سو بھی جیت لوں گا۔ پھر تیرا آپریشن ہو جائے گا باپو! تو بالکل اچھا ہو جائے گا میں تمام دن اُڑتا رہوں گا۔ میں شرط جیت جاؤں گا ——— جب چھتری پر بیٹھا یا چھپا کے پیچھے غٹر غوں کرتا پھرے ہے تو ایسا لگے جیسے کہہ رہا ہو۔ چھپا! میں شرط جیتوں گا۔ میں شرط جیتوں گا۔"

اور جمعہ کے روز دونوں کبوتر چھوڑ دیئے گئے۔ شکورے نے لطیف کی جگہ پیسے چاچا منگو کے پاس رکھوا دیئے تھے۔ شریف نے اپنی رقم لطیف کو ہی دی تھی۔ لطیف اور رمضو قصائی نے اپنی رقم اپنے اپنے پاس رکھی تھی۔ شکورے نے آج شمشاد والے کو ایک کی جگہ دو گولیاں دی تھیں۔ آج وہ بہت پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شریف کا یہ چھارا نسکنے اترتا ہے۔ پھر اسے باپ کی طرف سے بھی فکر تھا۔ ڈاکٹر نے رات کو کہہ دیا تھا کہ حالت خراب ہے فوراً آپریشن کی ضرورت ہے۔

"آپریشن کے لئے چھ سو روپے۔ تیس بیسیاں چاہئیں تھیں۔ اور شکورے کے ساتھ سب ہی سوچنے لگے۔ چھ سو شام تک ہی ہو سکتے ہیں۔"

"اللہ کرے شمشاد والا جیت جائے۔ موتی جیت جائے" شکورے کی بیوی نے ظہر کی نماز پڑھتے ہوئے دعا مانگی

"اللہ کرے گلاب شاہ جیت جائے۔ گلاب شاہ جیت جائے" شکورے کی ماں نے خاوند کی خاک شفا کی سی رنگت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کرے شکورا جیت جائے شکورا جیت جائے" باپ نے پہلی دفعہ فضا میں گھورتے ہوئے دعا مانگی۔

اور شریف سوچ رہا تھا کہ اب کے خدا نے چاہا تو چار زیور ضرور ہی بن جائیں گے بن کے۔ سب سونے کے بنواؤں گا۔ پچاس کے بدلے میں شکورے سے پازیب ور جھمکے واپس لے لوں گا۔ اب کے تو ضرور ہاتھ پیلے ہو جائیں گے شبنو کے۔ موتا نے چاہا تو ایک ایک سے بدلہ لوں گا ہارنے کا ——— اور رمضو قصائی سوچ رہا تھا کل انشاء اللہ تین بکرے کاٹوں گا۔ پچھلا نقصان بھی پورا ہو جائے گا۔ دس روپوں کا ایک ہار شریف کو پہناؤں گا ——— اور لطیف سوچ رہا تھا اب کے تو پیٹ بھر کے ملے گی۔ دو آدھے لاؤں گا۔ ہیرا بائی کا مجرا سنوں گا۔ دس کی بازی ہو جائے گی۔ شاید قسمت ساتھ دے دے۔ ——— شمشاد والے نے تو ہارنا سیکھا ہی نہیں۔ بھلا کنجر کا نطفہ بھی کبھی ہارا ہے۔

تین بجے تمام لوگ اپنے اپنے ۔ تیسوں کو لئے چاچا منگو کے چوبارے پر اکٹھے ہو گئے۔ ابھی تک دونوں کبوتروں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بادلوں کی ہلکی ہلکی تہوں نے ان کو جانے کہاں چھپایا ہوا تھا۔ تین بج کر بیس منٹ پر سب سے پہلے لطیف کو ایک باریک سیاہ دھبا نظر آیا جو بڑا ہوتا چلا گیا۔ اس نے زور سے نعرہ مارا ——— یا علی ——— اور شکورے سے لپٹ گیا۔ جیسے جیسے یہ سیاہ دھبا واضح ہوتا گیا۔ شریف کا چہرہ اس کے کبوتر کی طرح سیاہ ہوتا گیا۔ آنکھیں بے جان ممی کی طرح ویران ہوتی گئیں، اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ سوچنے لگا یہ ابھی سے کیوں اترنے لگا۔ اس کو تو ابھی نظر بھی نہیں آنا چاہیئے تھا۔ یہ تو رات کو اترتا ہے۔ یہ تو شاہین ہے شاہین۔ کیا تھک گیا؟ نہیں یہ تھک نہیں سکتا۔ یہ ہار سکتا ہی نہیں۔ یہ ضرور جیتے گا۔ یہ شمشاد والے کو ہارنے ہی والا ہے۔ اس نے بے اطمینانی سے رمضو قصائی کی طرف دیکھا مگر وہ بھی اس بکرے کی طرح نظر آ رہا تھا جو چھتری تلے پڑا ہو۔

اور شکورا دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ اب میں باپ کا آپریشن ضرور کراؤں گا۔ میرا موتی ہار سکتا ہی نہیں۔ وہ کوئی ہارنے کے لئے تھوڑی پیدا ہوا ہے اس نے حلالی کے گھر آنکھ کھولی ہے۔ وہ کنجر کا جنا ہے۔ وہ بھلا کس سے ہار سکتا ہے۔ پھر وہ شریف کو دیکھنے لگا جو اسے اپنے باپ کی طرح زرد زرد نظر آیا

اس کو دیکھ کر اس کو اپنی جیت کا اور بھی یقین ہوگیا۔ چھ ـــ چھ سو ـــ تین بیساں ـــ وہ اپنے باپ کو ہسپتال کے صاف ستھرے کمرے میں دیکھنے لگا۔ کمرے میں چیتا ہوتا دیکھنے لگا، چاچا منگو شاہ کے ساتھ بازار میں گھومتا ہوا دیکھنے لگا۔ اسے اپنی پیشانی چومتے ہوئے پایا۔ شمشاد والے کو افیم کی گولیاں کھلاتے ہوئے دیکھا۔ دل میں کام پر جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا چہرہ قندھاری انار کی طرح سرخ ہوگیا۔ اس نے زور سے نعرہ لگایا۔ اپنا شمشاد والا زندہ باد۔ چاچا منگو زندہ باد۔ اور بطیف نے نعرہ مارا۔ شکورا زندہ باد۔ شمشاد والا زندہ باد۔

جا بجا شریف کا شاہین کافی نیچے اتر آیا تھا مگر شمشاد والا ابھی بہت اونچائی پر اڑتا ہوا یا ہی کے دھبے کی مانند نظر آرہا تھا۔ سب کو شکورے کی جیت کا یقین ہوگیا۔ یکایک سب کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شمشاد والا بڑی تیزی سے تباہ شدہ جہاز کی طرح نیچے آرہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک بیری لگی ہوئی تھی۔ اس نے کئی دفعہ اس کو پر مارا مگر بیکار۔ پھر شکورا گرتے گرتے بچا۔ اس کو لطیف نے سنبھال لیا۔ اس کے منہ سے کئی چیخیں نکل گئیں۔ بیری نے اپنا کام کر لیا تھا۔ دور اونچائی پر شمشاد والا کے پر اڑتے ہوئے نظر آئے۔ وہ جہاز سے پھینکے گئے اشتہار کی طرح جوہڑ کے پاس جا گرا۔ شکورا تیزی سے پاگلوں کی طرح اس کی طرف بھاگا۔

اور جب وہ اس کو اٹھائے روتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو اس کو سکتہ سا ہوگیا۔ اس کے آنسو تھم گئے۔ پیروں نے چلنے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک بت کی طرح ٹکٹکی باندھے صحن میں پڑی ہوئی چارپائی کو دیکھنے لگا، جہاں اس کا باپ مرا پڑا تھا۔ ایک دم اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے زور سے جھرجھری لی اور خون میں لتھڑے ہوئے شمشاد والے کو دیکھنے لگا۔

وہ سوچنے لگا کس کا غم مناؤں ـــ شمشاد والے کا یا اپنے باپ کا؟ ـــ گلاب شاہ کا یا ماں کے اجڑے ہوئے سہاگ کا؟ ـــ یا اپنی یتیمی کا؟

اس کی آنکھوں سے کئی آنسو ایک دم نکلے اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے شمشاد والے پر گرنے لگے۔ اس نے زور سے دونوں ہاتھوں میں اس کو بھینچ لیا۔ اس کو سینے سے لگایا اور مسلسل چومنے لگا پھر وہ تیزی سے مڑا اور اس کو دفنانے چلا گیا۔

لیلیٰ عطاء اللہ

ضد

یوں تو قصبے بھر کی لڑکیوں کا پورا گروہ ڈاکٹر صاحب پر دم دیتا تھا، مگر عطیہ کی حالت کچھ زیادہ ہی نازک تھی۔ اسی لئے وہ جو بھی دیوانہ پنے کی حرکت کرتی تو کوئی محسوس نہ کرتا۔ اس رعایت خصوصی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اُس کی دریافت تھے۔

انھیں اس دور دراز قصبے کے چھوٹے سے ہسپتال میں آئے چھ سات ماہ ہو چکے تھے مگر لڑکیوں میں سب سے پہلے اُن سے علاج کرانے کا اتفاق عطیہ ہی کو ہوا۔ اُسی نے سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کا غائبانہ تعارف اور پھر مختلف حیلوں سے ملاقات کرائی۔

اس علاقے کے سخت مزاج جاگیرداروں کی انتہائی سخت پابردہ بیٹیوں کی مجال نہیں تھی کہ وہ مرد ڈاکٹروں سے علاج کرانے کا تصور بھی کرتیں — وہ تو باپوں سے اپنی چھوٹی موٹی بیماریاں بھی اُن کے جلال کے مارے چھپاتی تھیں۔ پردے کی اس قدر پابندی تھی کہ غیر مرد تو کیا چچا تائے کے بیٹوں تک سے چھپا لیتا مگر عطیہ غریب کی بیماری ہی کچھ ایسی عشق مشک قسم کی تھی کہ چھپائے نہ چھپی۔ پہلے تو اماں جانی نے بہت کچھ کوشش کی اور کافی عرصے تک اس کوشش میں کامیاب بھی رہیں مگر کب تک — بے عطیہ بے چاری کو جب بھی دورہ پڑتا تو اس کی یہ حسِ امتیاز ہی ختم ہو جاتی کہ وہ کہاں ہے اور کون کون دیکھ رہا ہے —— اکثر ایسا ہونے لگا کہ بابا کو کھانا کھلا رہی ہوتی یا چائے پانی دے رہی ہوتی کہ اچانک دھم سے زمین پر گر جاتی، ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے، بتیسی بند ہو جاتی بالکل مردوں کا سا حلیہ ہو جاتا۔ پھر اُسی بے ہوشی میں اس قدر شدت کی اور بے ساختہ چیخیں نکلتیں کہ سارا شہر سنتا۔ بابا جان بے چارے مع اپنے سارے جاہ و جلال اور مزاج کی پابندی کے گھبرا گئے۔ پہلونٹی کی چہیتی بیٹی تھی اور پھر لکھی پڑھی ہوئی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ سارا جاتا دیکھئے تو آدھا دیجے بانٹ —— تو خیر خدا نخواستہ بانٹنے کا تو سوال ہی نہ تھا مگر میرا مطلب یہ ہے کہ باقاعدگی سے علاج پر خود بخود راضی ہو گئے۔ لیڈی ڈاکٹر وہاں دور دور تک نہ تھی۔ ایک ڈاکٹر صاحب تھے جن کی مسیحا صفتی اور ہاتھ کی شفا کا چرچا تھا۔ انھیں کا دم غنیمت نظر آیا اور ایک دن خود ہی ساتھ لے آئے۔ یہ مرض اُن کے لئے کچھ ایسا عجیب اور خوفناک تھا کہ مسہری کے پردوں میں سے کلائی نکال کر صرف نبض دکھانے سے بات نہیں بنتی تھی سو پردہ اتر گیا۔

ڈاکٹر صاحب مریضہ کی بیماری تو خیر فراٹنگ بھر کے فاصلے سے بھانپ گئے مگر اپنے طور پر نفسیات کا خاصا مطالعہ کر رکھا تھا۔ بیٹی کے علاج سے زیادہ گھبرائے ہوئے باپ کی تسلی کے لئے نبض دیکھی۔ سٹیتھسکوپ لگا کر اچھی طرح معائنہ کیا۔ ایک آدھ بے مزہ سا انجکشن لگایا اور نسخہ لکھنے کے لئے کاغذ قلم طلب کیا۔ اس دوران مریضہ ہوش میں آ کر اپنے طور پر خاصی تسلی سے ڈاکٹر صاحب کا معائنہ فرما چکی تھیں۔ بوکھلائے ہوئے والد صاحب کو خود ہی قلم کاغذ لے کر لپکے ہوئے آتے دیکھا تو بڑے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھنے پر تین چار سکون آور ٹانک اور ٹھنڈی دوائیں گھسیٹ کر کاغذ اُن کے ہاتھ میں تھمایا کہ کیمسٹ سے منگوا لیں اور خود چلتے بنے۔

دوسرے مریضوں کے لئے بلاسے ڈاکٹر صاحب کا علاج آگ پر پانی کا اثر رکھتا ہو مگر عطیہ کے لئے تو آگ پر تیل ثابت ہوا۔ بجائے کم ہونے کے دوروں کی شدت

بڑھ گئی۔ وقفہ بھی کم پڑنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کی نفسیات دانی اُن کے لئے بلا ہو گئی ——— ایک ڈاکٹر تھا اور تحصیل بھر کے مریض ——— مرض کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت، نیک مزاجی اور لیاقت کا شہرہ سن کر ڈاکٹر صاحب کے پاس اس سے بھی زیادہ دور دراز سے مریض آنے لگے تھے اور یوں جب وہ مریضوں کے اژدہام میں گھرے سر جھکا کر لکھنے لکھنے اور ان کمزور لاچار انسانوں کے دکھ سُن کر ان کا علاج ڈھونڈھنے میں مشغول ہوتے تو اچانک عطیہ کی خاص ملازمہ ایک مرد نوکر کے نمودار ہوتی اور سب کچھ چھوڑ کر اپنے ساتھ چلنے کی فرمائش کرتی۔ تب انھیں یہ سب کچھ بے حد شاق گذرتا۔ انھیں ان سب حاجت مندوں کو چھوڑ کر ایک بڑے گھر کی چنچل اور اپنی آسائش اور بیکاری کے ذہنی مرض میں مبتلا لڑکی کی خدمت میں گھنٹہ بھر کی غیر ضروری حاضری سخت کھلتی مگر مجبوری تھی کیا کیا جاتا!

انہی بے شمار دوروں کے درمیان عطیہ اپنی ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ سہیلیوں اور رشتے کی بہنوں کو بھی ڈاکٹر صاحب کا دیدار کرا چکی تھی اور مختلف موقعوں پر کم و بیش ساری لڑکیاں تیمار داروں اور بے حال مریضہ کو سنبھالنے والیوں کی صورت میں خود بھی ڈاکٹر صاحب کے سامنے آ چکی تھیں۔ سبھی نے اس پر صاد کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ویسے تو خیر مردوں ایسے مرد ہیں مگر ان کی مسکراہٹ میں کچھ ہے اور آنکھیں بھی لاجواب ہیں۔ خصوصاً جب اچانک پلکیں اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو ——— یا کسی بات پر اچانک جھینپ کر نظریں نیچی کر لیتے ہیں تو ——— وغیرہ وغیرہ

پہلے پہل تو ڈاکٹر صاحب کو بھی شک نہ گذرا۔ یہی سوچا کہ وہی ماں باپ کی لاڈلی بیٹی سے سابقہ ہے مگر آہستہ آہستہ وہ بھی چونکنے لگے۔

اس کے ساتھ ہی سبھی لڑکیوں کو طرح طرح کے مرض لاحق ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب آئے دن کسی نہ کسی حویلی میں بلوائے جاتے اور اچھی بھلی صحت مند سرخ و سفید مریضاؤں کو دیکھ دیکھ کر بوکھلایا کرتے۔ یہ بھی نہ کہہ سکتے تھے کہ تمہیں کوئی مرض نہیں ہے، اچھی بھلی ہو۔ ایک دفعہ کہہ بیٹھے تھے غلطی سے تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ اس بار مریضہ نے بڑی پیاری ادا سے منہ بنا کر کہا تھا: "ہونہہ! دیکھ لی آپ کی ڈاکٹری۔ مرض سمجھ میں نہ آیا تو کہہ دیا کہ کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔"

"آپ جیسا ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے۔" سامنے کرسی پر ٹکٹکی باندھ کر مسیحا کو تکتی ہوئی عطیہ نے اس قدر ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تھا کہ ایک دفعہ تو ڈاکٹر صاحب بھی کپکپا گئے، اور پھر ساری لڑکیوں کا یک آواز کورس کہ "ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر پینتی پر بیٹھی بزرگ خاتون کو دیکھا جو ان کی مریضہ کی غالباً والدہ تھیں اور انھوں نے جلدی سے ڈاکٹر صاحب کی نظروں اور اپنے چہرے کے درمیان جالی دار پنکھا حائل کر لیا ——— یہ لڑکیاں تو بلائیں ہیں۔ اس جوان مسٹنڈے ڈاکٹر سے ذرا نہیں گھبراتیں ——— پر مجھے تو بھائی لحاظ آتا ہے۔ کیسے ایک ایک کو ہٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ انھوں نے پنکھے کی جالی میں سے ڈاکٹر صاحب کو کٹی کے لٹو کی طرح مختلف آوازوں پر ادھر سے اُدھر مڑتے دیکھ کر سوچا۔

ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ اور خوبصورت آنکھیں قصبے بھر کی خواتین میں مشہور ہو چکی تھیں۔ بچیوں سے لے کر بڑی بوڑھیوں تک انھیں خاص طور پر دیکھ چکی تھیں اور جو ایک آدھ اس کار ثواب سے محروم رہ گئی تھی اسے یہ محرومی ختم کرنے کی حسرت تھی۔ پتہ تو چلے یہ ساری لڑکیاں آخر کیوں باؤلی ہوئی پھرتی ہیں ویسے تو یہ عمر ہی پاگل پنے کی ہوتی ہے اے بہن۔

انہی محروم خواتین میں سے خالہ حمیدہ بھی تھیں جن کی بدقسمتی سے کوئی اتنی بڑی اور خبر پڑی لڑکی نہ تھی جو اپنی باری پر سر یا پیٹ کے شدید درد میں مبتلا ہو کر ڈاکٹر صاحب کو تکلیف دیتی۔ مگر روز کے نئے نئے قصے سُن سُن کر ان کا جی مچلتا۔ بھئی آنکھ دیکھیں تو سہی وہ کون ہے ایسا یوسف ثانی جس کے پیچھے سبھی لڑکیاں اور خصوصاً عطیہ ——— اقبال بہن کی اتنی لاڈلی اور منہ چڑھی عطیہ بالکل جوگن سا لئے پھرتی ہے۔

انھیں یہ چھوکریوں کا سا ڈھونگ رچاتے خود بھی بڑی خفت سی محسوس ہوئی مگر تجسس ہر جذبے پر بازی لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب سرمئی سوٹ پہنے کارکار کرتے دروازے تک آئے تو کمپونڈر سے بیگ انھوں نے خود سنبھال لیا۔ کمپونڈر مقامی تھا اور اس سے پردہ نہ بس لازم تھا۔

حمیدہ خالہ کو زیادہ بننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ عمر کے تقاضے سے کئی بیماریاں بفضلہ ریڈی میڈ موجود تھیں۔ دل کی دھڑکن کی شکایت۔ بلڈ پریشر کی کمی بیشی تھا جوڑوں کا درد تو کہیں گیا ہی نہ تھا۔

جتنا عرصہ ڈاکٹر صاحب اُن کے بازو پر پٹی لپیٹے غور سے بلڈ پریشر ناپنے والے آلے کی طرف دیکھتے رہے وہ بغیر کسی جھجک کے بڑے اطمینان سے ڈاکٹر صاحب کو تکا کیں

سے ناچتی کودتی رہیں اور سوچتی رہیں کہ لڑکیاں تو سچ مچ پاگل ہیں۔ اب کوئی پوچھے بھلا اس سانولے سے لڑکے میں آخر رکھا ہی کیا ہے۔ اچھا ہے مگر خیر ایسا بھی کیا کہ انسان ہوش ہی گنوا بیٹھے۔ اپنے خاندان کے شہزادوں ایسے گورے چٹے، کالی بشیری آنکھوں والے لڑکوں کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ مگر ساتھ ہی انھیں یہ خیال بھی آیا کہ کنواری لڑکیوں کو بھلا خاندان کے لڑکوں کے نزدیک بھی کون پھٹکنے دیتا ہے۔ خیر پھر بھی ادھر ادھر سے تاک جھانک کر دیکھ تو رکھے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر نظر پڑ جائے وہ یہ سب سوچ رہی تھیں کہ اچانک ڈاکٹر نے آلے کو ڈھیلا چھوڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ پلکیں کچھ عجیب انداز میں گرگرائیں، اور مسکرا کر بولے "بلڈ پریشر تو آپ کا بالکل ٹھیک ہے۔ البتہ جوڑوں کے درد کے لئے نسخہ لکھے دیتا ہوں۔"

ممکن ہے اس کی وجہ اپنے دل کا چور ہو مگر خالہ حمیدہ کو ڈاکٹر کی مسکراہٹ میں شرارت کی جھلک نظر آئی اور اس خیال سے کہ کہیں ڈاکٹر ان کی بیماری بھانپ نہ گیا ہو۔ وہ لڑکیوں کی طرح شرما گئیں مگر ساتھ ہی وہ کچھ کچھ نڈھال بھی ہو گئیں۔ ڈاکٹر کی مسکراہٹ اور نگاہ میں واقعی کچھ ہے تو سہی ــ اب حمیدہ خالہ کو کون سمجھاتا کہ خالہ جان ہے تو بہت کچھ۔ پر آپ محسوس کرنے کی سرحد ہی سے نکل چکی ہوں تو کیا کیا جائے۔

معاملہ برداشت سے باہر ہونے لگا اور بدنامی کا اندیشہ بڑھا تو ڈاکٹر صاحب پریشان ہو گئے۔ اس سارے تماشے کا اول تو مطلب ہی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لاکھ لڑکیاں سنجیدہ بنیں وہ یہی محسوس کرتے کہ انھیں بنا رہی ہیں ــ اتنی بہت سی حسین لڑکیاں۔ آخر انھوں نے ان میں دیکھ ہی کیا لیا تھا؟ وہ اکثر سوچتے۔ عام مردوں کے برعکس وہ زیادہ خوش فہم نہ تھے۔ پھر ایک آدھ لڑکی ہوتی تو جب بھی بات تھی، وہ سنبھال لیتے مگر یہ اتنا بڑا غول بیابانی ــ داناؤں کا قول ہے کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام ہوتی ہے، ادھر یہاں تو خیر سے پورا لشکر تھا۔ مرغی بے چاری پھنسنے سے جان چھپائے پھرتی ــ آسان ترین طریقہ یہی نظر آیا کہ اب تک ڈاکٹر صاحب کی نظر سے جتنی محترمہ لڑکیاں گزری تھیں ان سب سے زیادہ قابل رشک ان لڑکیوں کی صحت تھی سو اس طرف سے تو ضمیر پر بوجھ پڑے گا نہیں۔ لہٰذا گھر میں جا کر مریضاؤں کو دیکھنا قطعی بند۔ اور یہ صرف ارادہ ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے پوری طرح نبھایا۔ تقریباً ہفتہ بھر تک اپنڈے سائٹس، اختلاج قلب اور آنکھوں اور سر کے سخت درد میں مبتلا جاں بلب مریضاؤں کے گھر جانے سے بالکل انکار کر دیا۔ سب مایوس ملازماؤں کو یہی جواب ملا کہ جو علاج کروانا چاہتے ہیں ہسپتال تشریف لے آئیں میں کسی کے گھر جانے کا پابند نہیں۔ کام میں حرج ہوتا ہے۔

یہ ایک ہفتہ ڈاکٹر صاحب نے بے حد اطمینان اور سکون سے گزارا۔ ڈیوٹی کا وقت ہسپتال میں مصروف رہتے۔ شام بے فکری سے اپنے کمرے میں مطالعہ کرنے اور ریکارڈ سننے میں گزارتے۔ سارے الجھاوے اور گتھیاں اپنے آپ ان کے دماغ سے دور ہونے لگیں۔ صبح بڑے تازہ دم اور خوشگوار موڈ میں ہوتے اس لئے مریضوں اور عملے میں مزید مقبول ہو گئے۔

ایسے ہی ایک دن ہسپتال کسی وجہ سے ذرا دیر سے پہنچے۔ برآمدہ اور روش کو مریضوں سے پٹا پڑا تھا وہ کرسی پر بیٹھے بھی نہ پائے تھے کہ بدحواس کمپونڈر جلدی سے سامنے آ گیا: "جناب! پہلے ذرا خواتین کے کمرے کو دیکھ لیجئے۔"

جائز بات تھی بیٹھنے کے لئے کھینچی ہوئی کرسی یونہی چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب خواتین کے کمرے کی طرف بڑھے اور دروازے میں جم کر رہ گئے۔ کمرے میں دیواروں کے ساتھ دو طرفہ لکڑی کے سخت بنچوں پر دیوالی کے دیئے سے جل رہے تھے۔

"آپ سب کس لئے آئی ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے ہکلا کر پوچھا۔

"کمال کرتے ہیں آپ ــ ہسپتال میں لوگ کس لئے آتے ہیں ــ" جواب ملا

ڈاکٹر صاحب کچھ سنبھل کر اندر آ گئے۔ "مگر آپ سب تو اچھی بھلی نظر آتی ہیں۔ کیا تکلیف ہے آپ کو؟"

"یہی تو ہمیں معلوم نہیں۔ آپ ڈاکٹر ہیں تشخیص کیجئے نا!" اور ساتھ ہی دبی دبی ہنسی۔ ایک بار تو ڈاکٹر صاحب بھی ساری احتیاط بھول کر ہنس پڑے۔

"کمپونڈر صاحب کارمینٹو مکسچر کی ایک ایک خوراک سب کے لئے بنا دیجئے۔" انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ پھر اچانک سنجیدہ ہو کر کمرے سے نکل گئے۔

یہ سلسلہ پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور خطرناک تھا۔ ہر صبح ڈاکٹر صاحب لرزتے کانپتے اپنے کوارٹر سے برآمد ہوتے۔ ہسپتال کے برآمدے تک پہنچتے پہنچتے حالت اور بھی غیر ہو جاتی۔ یہی دھڑکا لگا رہتا کہ وہ سب پھر موجود نہ ہوں۔ اب تو غالباً کمپونڈر بھی کچھ کچھ سمجھ گیا تھا جس دن ہسپتال پر پریوں کی یلغار ہوتی، ڈاکٹر صاحب کی سراسیمگی دیکھ

دیکھ کر انہیں مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو جاتا۔ بلا ضرورت گرد کی انچ انچ بھر موٹی تہہ چڑھے پرانے رجسٹروں سے پٹی ہوئی الماریوں میں منہ دے کر بیکار کی کھٹ پٹ کرتا پھرتا ڈاکٹر صاحب کی اور بھی جان ہوا ہوتی۔ کمپونڈر ہی تھا اور سب کو جاننے پہچاننے والا۔ اُس کے ذریعے کسی وقت بھی اُن کی ناکردہ گناہی کا جرم برسرِ عام کھل سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی نگاہ بے نیازی، بے پناہ سنجیدگی اور سارا زہد و اتقا بجائے لڑکیوں کو مایوس کرنے کے شاید اُن کے سمندِ ناز پہ تازیانہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بھی بچے نہ تھے بلکہ دور رہ کر بھی دنیا دیکھ چکے تھے۔ انہیں معاملے کی نوعیت کی سنگینی کا برابر احساس تھا اور وہ پہلے دن ہی سے جانتے تھے کہ یوں تو سبھی لڑکیاں دلچسپی لیتی ہیں اور موقع پا کر اظہارِ شوق بھی بڑی فراخ دلی سے کر دیتی ہیں مگر وہ سب اتنی سنجیدہ نہیں جتنی عطیہ — اُس کی حرکتیں بعض دفعہ تو مجنونوں کی سی لگتیں۔ شروع شروع میں وہ ایسے موقعوں پر بڑی سنوری ہوتی مگر پھر ایسی وارفتگی طاری ہوئی کہ سنگھار تک سے جو ایسے حالات میں لڑکیوں کے لئے اور بھی لازمی ہو جاتا ہے لاپروا ہو گئی۔ کپڑے قیمتی ہوتے مگر گندے ہوئے۔ صاف پتہ چلتا کہ رات انہی میں سوئی ہے اور اسی طرح آ گئی ہے۔ چہرہ قطعی سادہ — لمبے لمبے بھورے بال اُلجھے اور بکھرے ہوتے، اور کاجل بھری کجراری اکھیاں رُئی رُئی نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر صاحب کا ذہن بھٹکنے لگتا اور وہ گھبرا کر کمرے سے نکل آتے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ تقریباً سبھی حسین تھیں مگر ڈاکٹر صاحب کی بوکھلاہٹ کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہوں نے زندگی بھر ایسی لڑکیاں نہ دیکھی تھیں۔ یہ سب خوبصورت بھی مگر باقی دنیا میں صرف بدصورت تو نہیں بستے۔ وہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہی حُسن سے شناسا ہو چکے تھے پہلے کانونٹ میں پڑھتے رہے۔ ایف۔ ایس سی کے بعد میڈیکل کالج کے پانچ چھ سال اور پھر کامیاب ہونے کے بعد سال بھر کا ملک کے سب سے بڑے ہسپتال میں ہاؤس جاب' لاکھوں ہی تو لڑکیاں — ساتھی طالبات، کولیگز، نرسوں اور مریضاؤں کی صورت میں نظر سے گذر گئیں۔ جھجک یا مردگی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا — نہ ہی وہ ایسے زاہدِ خشک تھے کہ بیہودگی نہ سہی ان لڑکیوں سے مناسب دوستانہ بھی نہ رکھتے —— یہ تو اللہ کی دین ہے کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ (انہوں نے جب اس پوسٹ کے لئے درخواست دی تھی تو اپنے کو بالکل شہادت کے درجے پر پایا تھا۔ حالانکہ شروع ہی سے جب میٹرک میں سائنس رکھی تو ارادہ خدمتِ خلق کا ہی تھا مگر تعلیم کی تکمیل کے بعد اس دور دراز اور پسماندہ علاقے میں آنے کے لئے نفسِ امارہ سے زبردست جنگ کرنی پڑی تھی۔ ہر کیف یہاں آنے کے بعد یہاں کے سادہ اور خاموش ماحول میں غریب اور بے آسرا لوگوں کی اس بیچ بیچ کی بے لوث خدمت میں انہیں حقیقتاً روحانی سکون ملا تھا)

مگر انہیں نہ پتہ تھا کہ اس عجیب و غریب سے بے تکے جال میں اُلجھ کر رہ گئے۔ سارا سکون اور یکسوئی غارت ہو گئی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یوں کنواری لڑکیوں کی طرح شرمانے اور دامن بچانے کی بجائے، زبانی کلامی سب لڑکیوں کو بہلا کر جان چھڑا لیں۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ ان سرو قد، شفاف رنگ اور سیاہ چشم لڑکیوں کو دیکھتے ہی اُن کے تصور میں اُن کے ویسے ہی حلیے کے مگر اُن سے کہیں زیادہ تنومند، اکھڑ مزاج اور تند باپ بھائی آ جاتے۔ کیرئیر کیرئیر انہیں اپنی جان تک خطرے میں نظر آتی۔

پھر کچھ امن سا ہو گیا۔ ہفتہ بھر سے زیادہ گذر گیا۔ لڑکیوں کا ہسپتال کی طرف پھیرا نہ پڑا۔ ڈاکٹر صاحب کو کچھ خلش سی تو محسوس ہوئی جیسے گھر کا ریڈیو خراب ہو جائے یا سوتے وقت پڑھنے کو جی چاہے اور پسندیدہ کتاب میز پر سے غائب ہو مگر پھر بھی انہوں نے اسی میں عافیت جانی۔ خدا کا شکر کیا اور پوری دلجمعی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

اکتوبر کی ایک بڑی ہی کافر رات تھی۔ ایسی رات جس میں خواہ مخواہ کوئی پاگل پنے کی انوکھی سی بات کرنے کو جی چاہے۔ کھڑکی کے نیچے رات کی رانی کا پرانا گرد آلود چھتنار والا جھاڑ تھا جس پر دن کے وقت خواہ نظر ڈالنے کو جی نہ چاہے مگر اس وقت اُس نے قیامت مچا رکھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سمیت سارا کمرہ خوشبو کے سمندر میں تیر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کوئی ایسی انجانی حرکت تو اس گرد و پیش قصبے میں خیر کیا کرتے سو ساڑھے دس بجے تک لاہور سے 'جواب قرآن' دور معلوم ہوتا تھا کوئی نور سا جشنِ موسیقی سنتے رہے پھر کچھ دیر ایک بیہودہ سی روکھی پھیکی کتاب دیکھی پھر بیڈ لیمپ بجھا کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ لحظہ بیزار سے ہوئے، باوجود غنودگی کے، دل میں یہ سوچ کر کہ کوئی ضرورت مند ہوگا، انہیں کچھ اطمینان کی سی کیفیت محسوس ہوئی یوں زبردستی سونے سے تو اچھا ہے کہ کسی کے کام آئیں — انہوں نے اونگھتے اونگھتے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ ایک دم دھکا سا کھا کر پیچھے ہٹے۔ نیندیں غائب ہو گئیں جیسے کبھی آئی ہی نہیں تھیں۔ باہر چاندنی میں پیلے پیلے کپڑے پہنے لڑکیوں کی ڈار

اتری لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر صاحب کچھ کہتے وہ سب اندر آ گئیں۔ دروازے کے پاس لگا بجلی کا بٹن دبا کر مڑے تو اس دوران میں وہ سب بڑے اطمینان سے کرسیوں پر، پلنگ، میز پر اور کھڑکی کی سل پر بیٹھ چکی تھیں۔ عطیہ اُن سب میں نمایاں تھی۔ اُس کے ململ کے لاپروائی سے رنگے دوپٹے پر گوٹا لگا ہوا تھا، ہاتھ مہندی میں رچے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں جیسے مہندی کا رنگ آنکھوں میں پہنچ گیا ہو۔ وہ خلافِ معمول چپ بیٹھی، سر جھکائے دوپٹے کے کنارے کو انگلی پر کھول لپیٹ رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو باقی لڑکیوں سے معلوم ہوا کہ عطیہ تین چار دنوں تک دلہن بننے والی ہے۔ وہ شادی پر رضامند نہ ہوتی تھی مگر اماں نے اپنا دوپٹہ اس کے پاؤں پر ڈال کر بمشکل منایا ہے۔ آج اُسے مہندی لگی تو یہ یہاں آنے کے لئے اُس نے وقت سے پہلے ہی چھٹکارا لیا ہے۔ اور یہ کہ عطیہ ڈیڑھ ہفتے سے مایوں بیٹھی ہوئی ہے آج بڑی مشکل سے وہ لوگ کھلی ہوا میں ٹہلنے اور دریا تک جانے کے بہانے باہر نکلی اور یہاں تک آ گئی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کو خاصی سردی کے باوجود ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے، ساتھ ہی ان قید و بند کی عادی نازک اندام لڑکیوں کی جرأت پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ آخر اس وقت ان کی وجہ نزول کیا ہو سکتی ہے۔ یہ مشکل بھی عطیہ کی سہیلیوں نے حل کر دی۔ شادی چونکہ اپنے عزیزوں میں ہو رہی تھی لہٰذا عطیہ شادی کے بعد بھی یہیں رہے گی مگر سسرال سے چوری آنا ناممکن ہوگا اس لئے وہ ڈاکٹر صاحب کی کوئی اچھی سی تصویر لینا چاہتی تھی تاکہ آئندہ زندگی کے اُجاڑ اور بے رونق دنوں میں اس سے جی بہلا سکے۔

ڈاکٹر صاحب کو یہ مطالبہ کسی صورت منظور نہ تھا کیا پتہ کب اُن کی تصویر عطیہ کے سسرال والوں کے ہاتھ لگ جائے۔ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن تو سہہ بھی جاتے ہیں مگر سسرال والوں اور شوہر کا ایسی حرکت پر ردِ عمل ظاہر ہے جو ہو سکتا ہے۔ عطیہ کا جو حال ہوگا سو ہوگا۔ یہ کون مانے گا کہ ڈاکٹر صاحب اس سارے معاملے میں قطعی بے گناہ ہیں کسی قسم کی صفائی کا موقعہ تو ملے گا نہیں۔ ایسے سلسلوں میں کسی کو کب اتنی تاب ہوتی ہے۔

گوٹے کے سنگھے گوٹے لگے زرد کپڑوں، کھلے بالوں اور مہندی رچے ہاتھوں کے ساتھ سوگوار سوگوار سی عطیہ انہیں آج بہت اچھی لگ رہی تھی ــ پہلی بار انہیں یہ نشہ خیز احساس ہوا کہ اتنی پیاری لڑکی اُن کے پیچھے جان دیئے دے رہی تھی ــ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اپنے سسرال اور آئندہ زندگی کا ذکر سن کر عطیہ کی آنکھیں بے ساختہ برسنے لگی تھیں ــ ڈاکٹر صاحب نے الماری سے سیاہ جلد کا بیش قیمت البم نکال کر سارے کا سارا اُن کے سامنے رکھ دیا۔

شادی کے بعد عطیہ ــ کھڑکیوں پہ براؤن لگے پچھلے شیشوں پر موٹے آسمانی رنگ کے پردے لگی کار میں شوہر کے ساتھ مہینہ بھر کے لئے سوات چلی گئی ــ اسی دوران میں اچانک پردۂ غیب سے ڈاکٹر کے تبادلے کے احکام آ گئے۔ باوجود خدمتِ خلق کے حقیقی اور بے پناہ جذبے کے وہ بے حد خوش ہوئے اور بڑے اطمینان سے مختصر سا سامان باندھ کر چپکے سے چمکتے دمکتے شہروں سے پرے بستے ہوئے اس خاموش سے قصبے سے روانہ ہو گئے جس کی کوئی یادگار اُن کے پاس موجود نہیں تھی سوائے ایک اُجڑے ہوئے البم کے۔

ایک شادی کی تقریب میں بے انتہا بنی سنوری، زیوروں سے لدی، زری میں لپٹی، تین چار آیاؤں اور ملازماؤں کے باوجود اپنی پیاری سی بچی کو گود میں اٹھائے مسرور اور شاداں عطیہ کو دیکھ کر خدا جانے کیوں خالہ حمیدہ کو وہ ڈاکٹر یاد آ گیا، کبھی جس کی موہنی مسکراہٹ اور اچھی آنکھوں کا شہر بھر میں چرچا تھا اور جس کے پیچھے عطیہ لٹیں بکھرائے بے ڈھنگے کپڑے پہنے جوگ سادھے پھرتی تھی۔

ساری احتیاط اور نشیب و فراز کو بھول کر وہ عطیہ سے مخاطب ہوئیں "عطیہ! وہ ڈاکٹر یاد ہے"

"کون سا؟"

"وہ ــ وہ"

"ہاں وہ ــ یاد تو ہے" عطیہ لاپروائی سے ہنس دی۔

"لوگ کہتے تھے کہ تم ــ"

"ہاں خالہ" عطیہ نے جلدی سے اُن کی بات کاٹ دی "ٹھیک کہتے تھے لوگ کہ میں اُس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ میرا علاج کرتے ہوئے پتہ نہیں اُسے کیا تکلیف ہوتی تھی حالانکہ ابا جان فیس بھی ڈبل دیتے تھے ــ ضد ہو گئی تھی مجھے اُس ڈاکٹر کے بچے سے"

یعقوب ناسک

کروٹ

عابدہ سکول سے واپس آئی تو اس نے گلی کے موڑ پر بڑی کو جھومتے ہوئے قدم اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ سیاہ پتلون اور سفید قمیض پہنے وہ بڑا چھانگ رہا تھا سیاہ پتلون اور سفید قمیص اس کے کھلتے ہوئے رنگ پر بہت بھلی لگتی تھی۔ جب وہ چھوٹا سا تھا تو اس کے گال بڑے بڑے اور پھولے پھولے سے ہوتے تھے اور جب بھی وہ اسے کر گلی میں آتی ہر کوئی واقف ناواقف ضرور اس کے گالوں پر چٹکی بھرتا۔ عابدہ کی عمر اس وقت آٹھ سال تھی جب بڑی پیدا ہوا۔ اس دن بلکے بلکے بادل گھرے ہوئے تھے۔ وہ صبح سو کر اٹھی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کی چارپائی اور ہی کمرے میں تھی اور ابا اس کے پاس بیٹھے شیو بنا رہے تھے۔ "ارے بجو تو اٹھ گئی"

وہ آنکھیں ملتی ہوئی چارپائی سے اتر آئی اور پوچھنے لگی "امی کہاں ہیں؟"

"اندر دوسرے کمرے میں"

وہ اٹھ کر جانے لگی۔

"ارے ارے!" شفیق نے ہڑبڑا کر بازو سے پکڑ کر گود میں اٹھا لیا "وہاں نہ جاؤ بجی، وہاں بہت سی عورتیں بیٹھی ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ میں ضرور جاؤں گی"، وہ مچلنے لگی۔

"ابا اسے گدگدی کرنے لگے" نہیں بابا وہاں نہ جاؤ۔ چلو چونی لے لو"

"نہیں پانچ پیسے لوں گی" اس نے پانچوں انگلیاں پھیلا کر دکھا دیں۔

"اچھا بھئی پانچ پیسے ہی لے لو" ابا نے پانچ پیسے کا سکہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ "تم اب منہ ہاتھ دھو لو اور ناشتہ کر کے سکول چلی جاؤ"

وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف جانے لگی

"ارے عابو ذرا سننا تو" ابا نے اسے پکارا

اس نے مڑ کر دیکھا ابا باہیں پھیلائے کھڑے تھے۔ وہ بھاگ کر لپٹ گئی۔

"عابو تجھے ایک بھائی لا دیں؟"

"ہاں لا دیں" وہ مسکرانے لگی

"اچھا لا دیں گے۔ اب سکول جاؤ"

اور وہ گود سے اتر کر غسل خانے میں چلی گئی۔ جب وہ سکول سے واپس آئی تو گھر میں اسے چہل پہل نظر آئی۔ صغرا بوا اسے اٹھا کر اندر لے گئی "عابو تمہارے ہاں ایک ننھا بھائی آ گیا ہے"

امی رضائی اوڑھے لیٹی تھیں اور ساتھ سرخ سرخ سا چھوٹا سا بچہ رکھا تھا۔ اور وہ اُسے مسرت بھری نظروں سے تکنے لگی۔ ماں نے رضائی سے ہاتھ نکال کر اس کا سر سہلایا "عابدہ تیرا بھائی ہے"

وہ اس پر جھک گئی اور اس کے ہونٹوں کو چھیڑنے لگی "ابا لائے ہیں نا؟" اس نے کہا۔

کمرے میں موجود سب عورتیں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ اور ماں نے گھبرا کر دوپٹے سے منہ ڈھانپ لیا۔

اس کا نام ظہیر رکھا گیا لیکن سب اسے بڈی ہی کہتے تھے اور جب وہ ذرا بڑا ہوا اور اس کی طرف بانہیں پھیلا کر دیکھتا تو وہ اسے جھپٹ کر اٹھا لیتی۔

"چنچل ہے نری لگیا دبوچ لیتی ہے" ماں کہتی۔

عابدہ مسکرانے لگی اور اس نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیئے۔ بڈی اسی طرح بے ہنگم سی چال چلتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے بوٹوں کے تسمے کھلے ہوئے تھے اور قمیص نیکروں کی پچھلی جانب سے باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں اس نے دوات تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں تختی تھی جس کو وہ بڑے زور زور سے ہلا رہا تھا اور چلتے چلتے پاؤں سے کنکریوں کو ٹھوکریں بھی لگا رہا تھا۔ عابدہ نے قدم اور تیز کر دیئے۔ وہ اسے گھر میں داخل ہونے سے پیشتر جا لینا چاہتی تھی۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھائے اور اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر زور سے آواز نکالی۔ وہ ڈر کر اچھل پڑا اور پھر اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"ارے! آج تو نے پھر سیاہی سے منہ ہاتھ رنگا ہوا ہے۔ ذرا چل کے آئینے میں اپنی شکل تو دیکھ۔ پورا بھالو لگ رہا ہے"

وہ شرما گیا۔ پھر معنی خیز نظروں سے اسے تکنے لگا۔

"اچھی؟" وہ مسکرانے لگی۔ "لائی ہوں بابا فکر نہ کرو"

"تو پھر دو نا" اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔

"ایسے نہیں۔ پہلے منہ ہاتھ دھو تو پھر ملے گی"

"نہیں ابھی لوں گا" وہ مچل گیا "نہیں تو امی کو بتا دوں گا کہ روز املی کھاتی ہے"

"ہائے نہ بتانا" وہ گھبرا گئی "اندر چل کے دیتی ہوں"

دونوں نے کمرے میں کتابیں رکھیں۔ امی دوسرے کمرے میں تھیں عابدہ نے کاغذ میں لپٹی ہوئی املی جیب سے نکالی اور اس کے برابر برابر دو حصے کئے۔ وہ اپنے حصے کی جلد ہی چٹ کر گیا۔ عابدہ اپنے حصے میں سے تھوڑی تھوڑی کھٹے چوستی رہی۔ وہ اسے للچائی ہوئی نظروں سے تکتا رہا۔

"ارے۔ ساری کی ساری ہضم بھی کر گیا۔ تو تو بڑا لالچی ہے۔ کیا کھٹی چیزیں کھا جاتا ہے"

اور اس نے اپنا حصہ بھی اس کے حوالے کر دیا۔ وہ ہمیشہ ہی اسے اپنے حصے کی چیز دے دیا کرتی تھی

عابدہ کو روز دو آنے جیب خرچ ملتا تھا۔ مگر جب سے وہ آٹھویں جماعت میں گئی تھی اس کے دو آنے اور بڑھ گئے تھے۔ البتہ بڈی کو دو آنے ہی ملتے تھے۔ دونوں کی اپنی اپنی گلکیں تھیں جن میں وہ پیسے جمع کرتے تھے۔ بڈی بہت سارے پیسے جمع کر کے ان سے سائیکل خریدنا چاہتا تھا علاوہ اس کے بیشتر کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں لیکن ہوتا اکثر یوں تھا کہ جب بڈی کی گلک میں ایک آدھ روپیہ جمع ہو جاتا، وہ نکال کر اڑا دیتا تھا اور پھر نئے سرے سے جمع کرنے لگ جاتا۔ ان دنوں جب اس کے پاس کوئی پیسہ نہ ہوتا تو چوری چھپے عابدہ کی گلک میں سے پیسے نکال کے خرچ کر دیتا۔ اس کا راز یوں کھلا کہ ایک دن عابدہ نے اسے موقع پر ہی پکڑ لیا۔ اسکول سے واپس آ کر اس نے بستہ دیکھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر گلک اٹھالی۔ عابدہ اُسے چھپ کر دیکھتی رہی پہلے تو وہ گلک کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر پاس پڑی ہوئی سلائی اٹھا کے گلک کو الٹا اور پیسے نکالنے لگا۔

"بے ایمان، چور کہیں کا!" عابدہ نے آگے بڑھ کر اُسے پکڑ لیا۔

اس کو دیکھ کر بڈی کا رنگ اُڑ گیا تب عابدہ کو اُسے اس حالت میں دیکھ کر بڑا ترس آیا۔ بے اختیار اُس کی ہنسی چھوٹ گئی، اُسے ہنستا دیکھ کر بڈی کو بھی حوصلہ ہو گیا، اور وہ بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا: "باجی! مجھے گڑیاں خریدنی تھیں"، اس نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"اپنے سارے پیسے تو اڑا دیتے ہو، اور پھر میرے پیسے چرانے شروع کر دیتے ہو۔ سچ سچ بتا دو، کتنی بار پہلے چوری کی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"صرف ایک بار"

"اوں ہوں، سچی سچی بتا دو۔ پھر پیسے دوں گی"، اس نے لالچ دیا۔

"تین بار" اس نے بتا دیا۔

"جھوٹ" اسے پھر بھی اعتبار نہ آیا۔

"اللہ کرے اسے کوڑھ ہو جائے اور اس کی کیڑی جیتنی قبر نکلے جو جھوٹ بولے، بس تین بار ہی نکالے تھے۔ دو بار چونی اور ایک بار دو آنے۔"

"اچھا زیادہ قسمیں نہیں کھاتے"، اس نے بڈی کے ہاتھ پر دوآنی رکھتے ہوئے کہا، "جاؤ گڑیاں خرید لو لیکن منہ میں نہ ڈالنا، گلے میں پھنس جاتی ہیں۔"

رات کو وہ عابدہ کے پاس ہی سوتا تھا۔ سونے سے پہلے کہانی ضرور سنتا تھا۔ یوں تو عابدہ کے پاس کہانیوں کی بہت سی کتابیں تھیں اور وہ کتاب سے پڑھی ہوئی ہر کہانی اُسے ضرور سناتی تھی لیکن بڈی کو اس شہزادی والی کہانی بڑی پسند تھی جس کا وزن پانچ پھولوں جتنا تھا۔ اگرچہ یہ کہانی بڈی کو بھی یاد ہو چکی تھی لیکن وہ اکثر یہی کہانی سننے پہ اصرار کرتا۔

امتحان میں چند دن رہ گئے تو ان لڑکیوں کو جنھیں دسویں کا امتحان دینا تھا سکول سے آٹھ دن کی چھٹی مل گئی تاکہ گھر میں تیاری ہو سکے۔ عابدہ کی تیاری قریباً مکمل تھی ویسے بڑی مس صاحبہ نے کچھ ضروری نشانات لگوا دیئے تھے اور انھیں یاد کرنا باقی تھا۔ سکول میں مشہور تھا کہ مس کا گیس کبھی غلط نہیں ہوتا۔

کل دس سمریاں ہیں تو میں تین دن میں انھیں ختم کر لوں گی۔ باقی کے پانچ دن دہرانے میں لگ جائیں گے۔ اس نے سارا حساب تیار کر لیا۔

مارچ کا مہینہ تھا لیکن سردی اب بھی باقی تھی۔ وہ کتابیں لے کر چھت پر چڑھ گئی اور سمریاں یاد کرنے لگی۔ دو گھنٹے میں اس نے ایک سمری یاد کر لی اور پھر اسے دوہرانے کے لئے اس نے خلاصہ بند کر لیا۔ سامنے والی چھت پر اُسے نیلی نیلی آنکھوں اور بھورے بھورے بالوں والا ایک لڑکا کھڑا نظر آیا جو اُسے بُری طرح گھور رہا تھا۔ "کمبخت کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا ہے۔" اس نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تو وہ پیچھے ہٹ گیا لیکن تھوڑی دیر بعد تک پھر وہیں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس کی زیادہ پروا نہ کی اور پھر سے پڑھائی میں جٹ گئی۔

"یہ اس طرح کھڑا مجھے کیوں گھور رہا تھا؟" اچانک پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا۔ "اور یہ ہے کون؟ اس گھر میں تو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ خیر ہو گا کوئی مجھے کیا"، اس نے سمری کو رٹنا شروع کر دیا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ سمری یاد ہو گئی ہے تو اس نے خلاصہ بند کر دیا۔ مس نے یاد کرنے کا ایک طریقہ بتایا تھا کہ پہلے یاد کرو پھر آنکھیں بند کر کے ذہن میں دوہراؤ اور پھر لکھو تو یاد کی ہوئی چیز کبھی نہ بھولے گی۔ وہ مس کے بتائے ہوئے فارمولے کے مطابق سے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ آنکھیں بند کرنے سے پہلے اس نے دیکھا وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا لیکن کسی اور طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سمری دوہرانے لگی۔ اچانک ہنسنے کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ منڈیر پر جھکا ہنس رہا تھا۔ اُسے بہت غصہ آیا۔ "بھلا اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے، بیوقوف کہیں کا۔ چیزیں اسی طرح تو یاد کی جاتی ہیں"، اس نے سوچا اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں لیکن جلد ہی اس نے کتابیں سمیٹ لیں اور نیچے چلی آئی: "یہ مجھے پڑھنے نہیں دے گا، اب نیچے جا کر ہی پڑھوں گی۔"

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا، وہ ابھی تک وہیں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نیچے آکر اس نے دو مرتبہ پوری آنکھیں بند کر کے دہرائی اور پھر کاپی کھول کر لکھنے بیٹھ گئی۔

"آخر یہ تھا کون؟"۔۔۔ لکھتے لکھتے وہ رک گئی۔ "خیر ہوگا کوئی مجھے کیا غرض" اس نے پھر لکھنا شروع کر دیا لیکن دو دفعہ لکھنے کے بعد وہ بھول گئی۔ اس نے پھر سے آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن حروف اس کے ذہن سے پھسلتے ہی چلے گئے۔

ہائے اللہ! میں بھی کیا کوڑھ مغز ہو گئی ہوں" اس نے اپنے سر کو مکیاں مارتے ہوئے کہا۔ "کیا ہو گیا ہے میرے دماغ کو۔ یاد ہی نہیں ہوتا" اس نے خود کو کوسا۔

ناکام ہو کر اس نے پھر خلاصہ کھول لیا۔ ایک نظر ڈالی تو بھولی ہوئی سب چیزیں یاد آ گئیں مطمئن ہو کر اس نے خلاصہ بند کر دیا اور لکھنے بیٹھ گئی۔ جلد ہی اُسے پھر احساس ہوا کہ اس کے ذہن سے الفاظ پھسلتے جا رہے ہیں اور اس کا ذہن سلیٹ کی طرح صاف ہو گیا ہے۔ اسے خود پر بہت غصہ آیا۔ "اللہ کی مار ہفتہ امتحان میں رہ گیا ہے اور یہاں کچھ یاد ہی نہیں ہو رہا"

اس نے پھر سے خلاصہ کھول لیا۔ ایک دم سب کچھ اسے یاد آ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے ذہن میں قمقمے سے جل اُٹھے ہوں۔ اس نے کتاب بند کر کے لکھنا شروع کر دیا۔ اب کی بار وہ آخری سطروں پر آ کر رک گئی اور جب وہ حصہ یاد کرنے میں ناکام رہی تو اس نے جھنجلا کر کاپی پٹخ دی "جانے کیا گوبر بھرا ہوا ہے میرے ذہن میں"

"کیا کروں" وہ سوچنے لگی۔ "شہزاد کے ہاں چلی جاؤں؟ لیکن وہ بھی تو پڑھ رہی ہوں گی" اس نے سوچا۔ اٹھ کر اس نے الماری کھولی، سامنے کہانیوں والی کتابیں پڑی تھیں۔ یہ کتابیں چند روز ہوئے وہ شہزاد سے مانگ کر لائی تھی۔ اس نے ایک کتاب اُٹھا لی۔ اوپر جن کی تصویر بنی ہوئی تھی جس نے شہزادی کو اُٹھا رکھا تھا۔ اس نے جھنجلا کر کتاب پھینک دی "ہوگی وہی بکواس۔ ایک جن شہزادی کو اٹھا لے جاتا ہوگا اور ایک شہزادہ اسے بچانے کو نکل پڑتا ہوگا۔ یہ کمبخت شہزادے ہر جگہ کیوں آ موجود ہوتے ہیں؟" وہ بستر پر لیٹ گئی اور لیٹے لیٹے انگلیاں چٹخانے لگی۔

آخر میں نیچے اُتری کیوں آئی؟ مجھے کیا تھوڑا جانا۔ وہاں بیٹھ کے کیوں نہ پڑھتی رہی؟" اس نے بہت سوچا لیکن اس سوال کا جواب اُسے نہ مل سکا۔ اُسے اپنے اوپر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے خلاصہ اور کاپی اٹھائے اور پھر چھت پر چلی گئی۔ سامنے والا کوٹھا خالی تھا۔ شاید وہ جا چکا تھا۔ اس نے بیٹھ کے پڑھنا شروع کر دیا لیکن جلد ہی اُکتا کے اس نے کتاب بند کر دی اور چھت پر بے مقصد ٹہلنے لگی۔ اکتا گئی تو باہر گلی میں جھانکنے لگی کتنی دیر تک وہ اس طرح باہر دیکھتی رہی۔ پھر وہ پلٹی تو سامنے والا کوٹھا اسی طرح خالی تھا۔ اس نے خلاصہ بغل میں مارا اور نیچے اُتر آئی۔

"آدمی چھٹی ساری

میں نے تختی ماری"

بڈو سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔ وہ تختی بجا رہا تھا اور زور زور سے چلا بھی رہا تھا۔ اس کے کپڑے مٹی میں لت پت تھے اور منہ پر اور کپڑوں پر جگہ جگہ سیاہی کے داغ لگے ہوئے تھے۔

"کیا نوٹنکا رچی ہے؟ آ گیا ہے کان کھانے کو۔ منہ تو دیکھو اپنا آئینے میں اپنا۔ چوہڑا چمار۔ جی چاہتا ہے ماروں ایک تھپڑ تیرے منہ پر" وہ آگے بڑھی تو بڈو سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تک تو وہ سہمی سہمی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر بستہ پٹخ کر زور زور سے رونے لگا۔

شمع پروین

فن شناس

آرٹسٹ: (پکار کر) کلو—

کلو: جی سرکار—میں تو یہیں کھڑا ہوں آپ کے پاس۔

آرٹسٹ: کیا بجا گیا؟

کلو: سرکار، گھڑی تو آپ کی کلائی پر بندھی ہے۔

آرٹسٹ: اوہ! ساڑھے گیارہ بج گئے اور وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے

کلو: کون لوگ حضور؟

آرٹسٹ: ارے ایک سیٹھ صاحب ہماری تصویریں خریدنے آرہے ہیں۔ سنا ہے فن کے بڑے دلدادہ ہیں

کلو: (خوش ہو کر) کیا سچ سرکار؟

آرٹسٹ: ہاں۔ یہ تینوں تصویریں آج شرطیہ بک جائیں گی۔ سیٹھ صاحب نے نیا بنگلہ بنوایا ہے۔ اس کی آرائش کے لئے انھیں فن کے اعلیٰ نمونوں کی تلاش ہے۔ مگر، میں تجھ سے کیوں کہہ رہا ہوں؟ بھلا تو کیا جانے فن کیا ہوتا ہے؟

کلو: واہ سرکار، بھلا کیوں نہیں جانتا؟ آپ سمجھتے ہیں مجھے ان تصویروں سے سروکار ہی نہیں؟

آرٹسٹ: (ہنس کر) اچھا تو بتاؤ ان تینوں میں سے کون سی تصویر سب سے اچھی ہے؟

کلو: یہ والی سرکار جس میں ایک دوسیزہ (دوشیزہ) کالے کالے بال کھولے اداس بیٹھی ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہیں۔ میں اس تصویر کو ردوانہ (روزانہ) گھنٹوں دیکھا کرتا ہوں۔ مجھے یہ بہت اچھی لگتی ہے سرکار... یہ اکیلی تصویر ایک ہزار کی ہے۔

آرٹسٹ: (آہ بھر کر) اس میں تو میرا دل دفن ہے۔ میرے جگر کے لہو سے بنی ہے یہ تصویر—

کلو: (حیرت سے) کیا کہا سرکار؟ کس کے لہو (خون) سے بنی ہے یہ تصویر؟

آرٹسٹ: تم نہیں سمجھو گے کلو— یہ آرٹسٹ کی زبان ہے — اس کے دل کی آواز ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔

کلو: بہت اچھا سرکار— میرے لئے اب کیا حکم ہے؟

آرٹسٹ: تم باہر جا کر بیٹھو۔ جیسے ہی وہ لوگ آئیں مجھے اطلاع کر دینا۔

کلو: بہتر سرکار— (باہر گھنٹی بجتی ہے) اے لیجئے سرکار، وہ لوگ آگئے۔ میں انھیں اندر لئے آتا ہوں۔

آرٹسٹ: آیئے سیٹھ صاحب تشریف لایئے — تسلیم عرض کرتا ہوں

سیٹھ: (ہنس کر) معاف کرنا بھائی ہم کو دیری ہو گئی۔ آپ کو لوکو ٹیم (ٹائم) دیا تھا۔ ہم بھول گئے۔ منیم جی کو بھی یاد نہ رہا۔ ٹھیک گیارہ بجے یاد آیا تو اسی ٹیم کچھ بجنس (بزنس) والے لوگ آ گئے تو اور دیر ہو گئی۔ آؤ منیم جی تم بھی ادھر آ جاؤ

آرٹسٹ: (بجھی ہوئی آواز میں) کوئی بات نہیں۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ آپ تشریف لائے۔

سیٹھ: اچھا آرٹسٹ صاب — ہم کو وہ تصویریں دکھا دو — پھر ہم کو گودام چیک کرنے جانا ہے۔

آرٹسٹ: تصویریں یہ آپ کے سامنے لگی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

سیٹھ: آؤ منیم جی — تم بھی دیکھو آرٹسٹ صاب کی تصویریں —

آرٹسٹ: سیٹھ صاحب یہ پہلی تصویر بچپن کی — بھولپن — سادگی اور معصومیت کی —

سیٹھ: بچپن کی؟ کس کے بچپن کی؟

آرٹسٹ: انسان کے بچپن کی —

سیٹھ: پن اس انسان کا کوئی نام تو ہوگا؟ کیوں منیم جی؟

آرٹسٹ: (جل کر) حضور یہ میرے بچپن کی تصویر ہے۔

سیٹھ: ہی ہی ہی ... آؤ منیم جی تم بھی دیکھو آرٹسٹ صاب کے بچپن کا فوٹو۔

منیم: ہی ہی .... بچپن میں تو بہت موٹا تھا آرٹسٹ صاب — اب کیا ہو گیا؟ ایک دم سوکھ گیا۔

سیٹھ: آرٹسٹ صاب — تصویر تو بہت اچھی ہے، ہم کو پسند آئی۔ پن ایک مشکل ہے — یہ فوٹو اگر ہم اپنے بنگلے میں لگائیں گا تو وہ جو ہمارا پوتا ہے نا! وہ ناراج ہو جائیں گا۔

آرٹسٹ: (حیرت سے) آپ کا پوتا ناراض ہو جائے گا! کیوں؟

سیٹھ: وہ بولیں گا کہ اس کی جگہ میری تصویر لگا۔ بچے لوگ تم جانو بہت جدی (ضدی) ہوتے ہیں —

آرٹسٹ: (مایوسی سے) اچھا اسے چھوڑیئے — یہ تصویر ملاحظہ فرمایئے — یہ حسنِ سوگوار کی تصویر ہے۔

سیٹھ: حسن سوگوار؟ یہ کیا نام ہوا؟ کون ہے یہ؟ آؤ منیم جی تم بھی دیکھو چھوکری کی تصویر۔

آرٹسٹ: یہ ایک غمگین دوشیزہ کا عکسِ جمیل ہے

سیٹھ: گمگین دوسیزہ؟ کیوں کیا گم (غم) ہے اس کو؟

آرٹسٹ: زندگی کے بہتیرے غم ہوتے ہیں سیٹھ صاحب — آپ کیا جانیں —

منیم: ویسا نہ کہیے آرٹسٹ صاب — ہمارے سیٹھ صاب بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ پورے بازار میں ان کی ٹکر کا دوسرا بیوپاری نہیں —

سیٹھ: فوٹو چھوری کی بہت کھوبصورت ہے۔

منیم: اس میں کیا شک ہے — چھوری کی صورت اچھی بنائی ہے آرٹسٹ صاب نے۔

سیٹھ: یہی تو بات ہے۔ ہماری سیٹھانی اس کو ہرگز کوٹھی میں نہیں لگانے دے گی۔ عورت جات تم جانو دوسری عورت کی فوٹو سے بھی کھار (خار)

کھاتی ہے۔ ہی… ہی… ہی…

منیم جی: کیا کمانے کی بات کی ہے سیٹھ جی۔

آرٹسٹ: (چھاڑا سے ملاحظہ فرمایئے ——— بڑھاپے کی تصویر ہے

سیٹھ: آؤ منیم جی — تم بھی دیکھو بڈھے کی تصویر — ارے منیم جی — یہ تو اپنا مستری رمجان خاں سگے ہے ——— ہی… ہی… ہی۔

منیم: اس میں تو کوئی کمال بات نہیں۔ بس ایک بڈھا بیٹھا ہے۔

آرٹسٹ: بڑھاپا زندگی کا نچوڑ ہوتا ہے سیٹھ صاحب۔ اس تصویر میں ہر انسان اپنے مستقبل کا عکس دیکھ سکتا ہے۔ دیکھئے ——— یہ انسان زندگی کا طویل سفر طے کر کے ——— تھک ہار کر اس رہگذار پر بیٹھ گیا ہے۔

سیٹھ: ہو بڑھاپے میں اتنا پیدل نہیں چلنا چاہیئے تھکن ہو جاتی ہے۔

منیم: اس بڈھے کے پاس موٹر ووٹر کچھ نہیں؟

آرٹسٹ: (غصے سے) جی ہاں — اس غریب کے پاس موٹر ہے نہ تانگہ، نہ سائیکل نہ گدھا گاڑی کچھ بھی نہیں ——— بس یہی دو ٹانگیں ہیں — آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ بولیئے آپ کو کوئی اعتراض ہے؟

منیم: باپ رے باپ۔ آرٹسٹ صاحب تم ناراج ہو گیا ——— ہم تو خالی یہ پوچھا کہ یہ بڈھا گریب ہے تو سیٹھ صاب اس کو نوکری دلائیں گا۔

آرٹسٹ: آپ تشریف لے جایئے ——— میں کہتا ہوں ——— آپ اسی وقت یہاں سے تشریف لے جایئے۔

سیٹھ: آؤ منیم جی ——— آرٹسٹ صاب تو بہت ناراج ہو گیا ——— ہم تو کچھ بولا بھی نہیں ——— آؤ… منیم جی ہم کو گودام چیک کرنے جانا ہے۔ ادھر بہت دیری ہو گئی ——— (جاتے ہیں)

آرٹسٹ: (پکار کر) کلو ——— ارے او کلو ———

کلو: جی سرکار ———

آرٹسٹ: یہ تینوں تصویریں اتار کر یہاں رکھ دو ——— میرے قریب ——— یہ… میرے دل کے ٹکڑے ہیں۔ انہیں یہاں لے آؤ میرے پاس ———

(آواز جذبات کی شدت سے بھرا جاتی ہے) میرے…… پاس… لے آؤ انہیں ———

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

اصغر بٹ

ڈرامہ

ویرانہ

وقت: شام کے پانچ بجے ہیں۔ منظر: ایک چھوٹا سا دفتر کا کمرہ۔ پچھلے اور بائیں جانب دروازے ہیں۔ دائیں جانب دفتری میز اور کرسی اور ملنے والوں کے لئے دو کرسیاں سامنے رکھی ہیں۔ میز کے برابر سامنے کو ایک چھوٹی تپائی پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ دو پچھلی دیوار کے قریب چھوٹی تپائی پر بجلی کی کیتلی لگی ہے۔ میز پر بجلی کا لیمپ روشن ہے۔ ایک طرف دنگ برنگ کی فائلیں ترتیب سے رکھی ہیں۔ کرسی پر تقریباً پچیس برس کی سنجیدہ لڑکی چشمہ لگائے ایک مسودہ کا مطالعہ کر رہی ہے۔ قلم سے کاٹ کاٹ کر اس پر کچھ لکھتی جا رہی ہے۔ لڑکی نہ تو بہت اچھی شکل کی ہے اور نہ ہی بری شکل کی۔ پچھلے دروازے سے پردہ ہٹا کر ایک تقریباً پچاس برس کا سفید ریش آدمی داخل ہوتا ہے۔ اس نے کرتا پاجامہ پہن رکھا ہے۔ ایک ہاتھ میں زرد رنگ کا کاغذ ہے اور دوسرے ہاتھ میں قلم۔ ذرا خمیدہ کمر سے چلتا ہے۔

لڑکی: (مسودے سے نگاہ اٹھا کر) کیوں کیا ہے شکور؟

شکور: وہ جی پریس سے آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے ساری کاپیاں لگا دی ہیں۔ اداریے کے لئے کام رکا ہوا ہے۔ وہ جلدی سے بھجوا دیجئے

لڑکی: تو مجھ سے کیا کہتے ہو؟ ناظر صاحب سے کہو۔ اداریہ انھیں لکھنا۔

شکور: ہر دفعہ یہی ہوتا ہے کہ انھیں لکھنا ہوتا ہے اور آخر لکھنا آپ کو پڑتا ہے۔

لڑکی: ٹھیک ہے لیکن مدیر وہ ہیں، میں تو محض معاون ہوں۔ وہ کہیں گے تو میں لکھ دوں گی لیکن اپنے طور پر کیسے لکھ دوں۔

شکور: وہ سارا دن اشتہاروں کے چکر میں رہتے ہیں انھیں لکھنے کی فرصت کہاں ہوگی۔

لڑکی: اب تو اچھا خاصہ چلنے لگا ہے پرچہ۔ ماہنامہ سے ہفتہ وار پر آ گئے ہیں اور اشتہار کے لئے لوگ خود ہی آنے لگے ہیں۔ اب تو لکھنے پڑھنے کا وقت نکل سکتا ہے۔

شکور: (ہنستے ہوئے) دیکھ لیجئے وہ آپ ہی سے کہیں گے۔

لڑکی: کہانی کی کتابت ہو گئی ہے کیا؟

شکور: جی کر ہی رہا ہوں۔

[پچھلے دروازے سے پردہ اٹھا کر تقریباً تیس برس کا آدمی داخل ہوتا ہے۔ ذرا لمبا قد اور جسم دبلے پن کی طرف مائل۔ ایک ہاتھ میں کوٹ اٹھائے ہوئے۔ ٹائی ڈھیلی حالت میں لٹک رہی ہے۔ پتلون زیادہ ماڈرن نہ پرانی وضع کی۔ شکل معقول۔ چشمہ لگائے ہوئے ہیں]

نو وارد: (لڑکی سے) رفیعہ اس پریس کے آدمی کو روانہ کرو نا (سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) ابھی اداریہ نہیں لکھا تم نے؟

رفیعہ: بہت خوب! مدیر کون ہے دیں یا آپ ناظر صاحب؟

ناظر: بھئی میرے پاس اور ضروری کام تھوڑے ہیں! آخر معاون رکھا کس لئے جاتا ہے؟

رفیعہ: بیگار کے لئے

ناظر: (شکور سے) شکور اب وقت بالکل نہیں ہے۔ کل پرچہ نکل آنا چاہئے۔ پچھلی دفعہ بھی ایجنٹ نے شکایت کی تھی۔

شکور: جی۔

ناظر: (مُڑ کر واپس پچھلے دروازے کی طرف بڑھتا ہے) مسطر پر ہی لکھوا دیں گی اب کے جیسا پچھلے مہینے لکھوایا تھا۔ بیٹھ جاؤ سامنے۔ وقت بالکل نہیں ہے۔

(پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

شکور: دیکھا میں نے کیا کہا تھا!

رفیعہ: (بے بسی سے سانس لے کر کلائی پر گھڑی دیکھتی ہے) پانچ بجے ہیں اور صبح دس بجے سے کولہو کے بیل کی طرح کام کر رہی ہوں۔ اب تو مجھ سے بالکل کچھ نہیں ہوگا۔ چائے پی کر پھر کام کروں گی۔ چھ بجے آیئے گا شکور صاحب!

(اُٹھتی ہے۔ میز میں سے چائے کے برتن نکالتی ہے اور بجلی کی کیتلی کا بٹن دبا دیتی ہے)

شکور: چائے بن جائے تو مجھے بھی آواز دے دیجئے (پلٹ کر پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

رفیعہ: ہاں ہاں کیوں نہیں۔

(بائیں جانب بیرونی دروازے سے ایک نوجوان لڑکی جھانکتی ہے)

لڑکی: میں آ سکتی ہوں رفیعہ بہن؟

رفیعہ: (مسکرا کر) آؤ آؤ نکہت!

(نکہت تقریباً بیس برس کی ہنس مکھ اور خوبصورت لڑکی ہے۔ باس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی غریب گھر سے ہے۔ ہاتھ میں معمولی سا پرس ہے۔)

نکہت: خوب چائے کے وقت پر آئی (آ کر سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور میز پر پڑے مسودے کو جھک کر دیکھتی ہے) اُوہ اب کے تو بہت ہی بُرا لکھا ہے میں نے۔

رفیعہ: (چائے کے برتن درست کر کے دودھ کا ڈبہ ڈھونڈ رہی ہے) نہیں تو اچھا خاصہ ہے۔

نکہت: خاک اچھا خاصہ ہے۔ سارا آپ کا لکھا ہوا لگ رہا ہے۔ میرا تو بس یونہی نام ہو جائے گا۔

رفیعہ: (بدستور چائے کے سلسلے میں مصروف) بڑے تعریفی خطوط آ رہے ہیں تمہارے مزاحیہ خاکوں کے۔ تصویر لائی ہو؟ بڑی فرمائشیں ہو رہی ہیں تمہاری تصویر کے لئے۔

نکہت: (پرس میں سے ایک تصویر نکال کر دیتی ہے) تصویر تو لے آئی ہوں لیکن اچھی نہیں آئی۔

رفیعہ: (مسودے پر ہی رکھ دو۔ اگر تمہاری صورت کا دسواں حصہ بھی آگیا ہے۔ تب بھی تو دلوں میں کہرام مچانے کو بہت ہے (قریب آ کر تصویر اُٹھا کر دیکھتی)

تو اب تمہارے ڈویلنگٹن کی خیر نہیں : ایسی ایسی بُری دو چار تصویریں اور مل جائیں تو فلمی کاروبار کر سکتے ہیں ہم لوگ

نکہت : آپ میری حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہیں۔

رفیعہ : (پھیلی : نہ تو ناظر صاحب بھی پڑھ کر پھڑک گئے (تصویر وہیں سامنے رکھ دیتی ہے) کہنے لگے کہ خوب لکھتی ہے تمہاری سہیلی۔

نکہت : خیر پچھلے خاکے میں تو سوائے عنوان اور دستخطوں کے اور کوئی چیز تھی ہی نہیں میری۔ آپ نے ناظر صاحب کو بتا دیا ہوتا

رفیعہ : میں اس قسم کی چیزیں ناظر صاحب کو نہیں بتایا کرتی۔

نکہت : کیوں ؟

رفیعہ : وہ مجھے بیحد خشک، سنجیدہ، اور بخش سمجھتے ہیں اور مرعوب رہتے ہیں۔ اگر انہیں میری غیر سنجیدہ کاوشوں کا پتہ چل گیا تو ایک تو رعب ختم ہو جائے گا اور پھر دوسرے ہی دن نکال باہر کریں گے

نکہت : تو آپ کو نوکری کی ایسی کیا ضرورت ہے ؟

رفیعہ : یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔

نکہت : پیسے کی ضرورت ہوتی، وہ بھی نہیں۔ آپ تو شہرت کی خاطر بھی کچھ نہیں کرتیں۔ اداریے ناظر صاحب کے نام سے لکھتی ہیں، مزاحیہ خاکے میرے نام سے اور کہانیاں نہ جانے کس کس کے نام سے۔ آپ کا اپنا نام تو کہیں ہوتا نہیں میری تو بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ یہ نوکری کس لئے کرتی ہیں (رفیعہ واپس اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

رفیعہ : ہاں خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا چنانچہ میں نے سوچا ہے کہ یہ کام چھوڑ ہی دوں (میز کے دراز میں سے ایک کاغذ نکال کر نکہت کے سامنے رکھتی ہے) اس کاوش کے بارے میں کیا خیال ہے ؟

نکہت : (جلدی سے دیکھ کر) یہ تو استعفیٰ لکھا ہوا ہے آپ کی طرف سے (ذرا پریشانی سے) کیا مطلب ؟ یعنی آپ واقعی چھوڑ کر جانا چاہ رہی ہیں ؟

رفیعہ : سوچ رہی ہوں

نکہت : کیا کوئی اور کام مل گیا ہے ؟

رفیعہ : نہیں۔ میں نے ڈھونڈا ہی نہیں۔

نکہت : تو۔ ؟

رفیعہ : میں جو اپنا خون پسینہ ایک کر رہی ہوں تو کاہے کے لئے ؟ رسالے کے لئے ؟ سو وہ اب چلنے لگا ہے اور میرے بغیر بھی چلتا رہے گا۔ معاشرے کے لئے ؟ تو ہمارے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ کس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ذاتی مروت کے لئے ؟ تو آخر کب تک !

نکہت : میرا خیال ہے کہ ناظر صاحب آپ کو جانے نہیں دیں گے

رفیعہ : کیوں ؟

نکہت : اتنے دنوں ساتھ رہے اور۔ یوں بھی تو آپ کے عزیز ہیں نا۔ آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کے خالہ زاد یا پھوپھی زاد بھائی ہیں۔

رفیعہ : ہاں (کچھ سوچ کر سر جھکا لیتی ہے) ناظر صاحب کو معاون مدیر چاہیئے۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے (سر اٹھا کر) وہ تم بھی ہو سکتی ہو۔

نکہت : (امید و ناامیدی کے درمیان) نہیں بہن ہمیں کون پوچھتا ہے۔

رفیعہ: (اُٹھ کر چائے بناتی ہے اور آواز دیتی ہے) شکور صاحب (نگہت سے) تم شکر کتنی پیتی ہو؟

نگہت: ایک چمچہ

رفیعہ: (بناتی ہے) لو

نگہت: (پیالی لیتے ہوئے) شکریہ۔ لیکن جہاں تک معاون مدیر کا تعلق ہے (شکور داخل ہوتا ہے)

شکور: جی؟

رفیعہ: (چائے کی پیالی اُسے دیتے ہوئے) یہ لیجئے آپ کی پیالی بن گئی۔

شکور: (چائے کی پیالی لیتے ہوئے) شکریہ! اوجی ماہتاب میک اپ کا نمبر آیا ہوا ہے۔

رفیعہ: (حیرت سے) ماہتاب میک اپ! کون ماہتاب میک اپ؟

شکور: وہی جی جن کا خط آیا تھا ٹائیٹل پر اشتہار کے لئے۔

رفیعہ: تو مجھے کس لئے بتا رہے ہو۔ ناظر صاحب سے ملوا دو

شکور: وہ جی چلتے چلتے مجھ سے کہہ گئے تھے کہ شاید وہ آجائے اور ہو سکتا ہے نہ ہی آئے۔ بات پکی نہیں تھی اس لئے انھوں نے انتظار نہیں کیا۔

رفیعہ: یہ تو اور سنو نئی بات اب اشتہارات کا کاروبار بھی میرے حوالے ہو گیا۔ صاحب یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ اُسے کہہ دو کہ ناظر صاحب سے ہی ملے۔ اور جاؤ ناظر صاحب کو ٹیلی فون کرو۔ کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوں گے۔

شکور: جی چونکہ ناظر صاحب کہہ گئے تھے کہ آپ سے ملوا دوں اس لئے میں نے اُسے کہا کہ بیٹھئے آپ ابھی بلواتی ہیں۔ اب اگر کہہ کہ آپ نہیں ملنا چاہتیں تو وہ ناراض ہو جائے گا۔ کاروبار کا معاملہ ہے۔

رفیعہ: (ذرا جھنجھلا کر) اچھا تو بھیج دو۔ غریب خانہ یہ حاضر ہے ہر بلا کے لئے۔

شکور: جی اچھا آپ بات کیجئے۔ میں ناظر صاحب کو بھی تلاش کرواتا ہوں۔

(چائے پیتا ہوا پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

نگہت: تو میں چلتی ہوں

رفیعہ: نہیں بیٹھو چائے ختم کر کے جانا۔ اور یہ رخ بھی دیکھو تو۔ شاید کبھی اس سے واسطہ پڑے۔ کہاں ہے وہ میرا آئینہ (میز سے اٹھا کر پڑھتی ہے) اسے ایک نظر دیکھ لیتی ہوں تو طبیعت میں ایک گونہ سکون سا محسوس ہوتا ہے۔

(بائیں جانب دروازے سے مرد کی آواز)

آواز: میں حاضر ہو سکتا ہوں؟

رفیعہ: جی ہاں تشریف لائیے۔

[چھوٹے قد اور موٹے جسم کا ایک آدمی مغربی لباس میں داخل ہوتا ہے۔ شکل نہایت معمولی ہے چین آنکھیں اور ہونٹوں پر ایک بناوٹی سی مسکراہٹ ہے۔]

نو وارد: میرا نام مین بزمی ہے۔

رفیعہ: تشریف رکھیے۔ یہ میری دوست نگہت ہیں۔
معین: آداب عرض۔ (نگہت کی برابر والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
نگہت: آداب عرض۔
رفیعہ: آپ چائے پیجیے گا؟
معین: جی پی لیں گے شکریہ! (رفیعہ اُٹھ کر چائے بناتی ہے)۔ (نگہت سے) آپ بھی پرچے کے کسی شعبے سے متعلق ہیں؟
نگہت: جی نہیں مضامین لکھتی ہوں کبھی کبھی۔
معین: (اچانک گویا پہچان کر، گرم جوشی سے) تو نگہت ناز کے نام سے جو دلچسپ خاکے آپ کے یہاں چھپتے ہیں آپ ہی لکھتی ہیں۔
نگہت: جی ہاں، شکریہ!
معین: اے صاحب میں تو آپ کا بیحد دلدادہ ہوں۔
نگہت: (چونک کر) کیا؟
معین: (ذرا بوکھلا کر) جی میرا مطلب ہے آپ کے مضامین کا دلدادہ ہوں۔ واہ واہ کیا مزاح پیدا کرتی ہیں آپ، کیسے پیدا کرتی ہیں اتنا اچھا مزاح؟
نگہت: آپ ہی لوگوں سے مل کر کچھ حاصل ہو جاتا ہے

(رفیعہ ہنستی ہے)

معین: شکریہ، شکریہ، یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ابھی تک ہم اس سعادت سے محروم تھے لیکن اب انشاء اللہ ملاقات ہوتی رہے گی۔
نگہت: جی کیا۔؟
معین: (ذرا بوکھلا کر) جی میرا مطلب ہے یہیں دفتر میں، یعنی رفیعہ صاحبہ سے ملنے آپ تو آتی ہی ہوں گی۔ مجھے بھی اشتہارات کے سلسلے میں آنا ہی ہوگا۔
رفیعہ: (معین کو چائے پیش کرتی ہے) یہ لیجیے چائے۔
معین: (جلدی سے اُٹھ کر) جی آداب عرض، شکریہ!

جلدی سے چائے پیتا ہے اور چائے چونکہ گرم ہے اُسے نگلتے ہی زبان باہر نکل آتی ہے۔)

رفیعہ: میں بتانا بھول گئی کہ چائے ذرا گرم ہے
معین: جی نہیں کوئی بات نہیں، ہم ہر گرم و سردِ زمانہ کے عادی ہیں۔
نگہت: بہت خوب!
معین: جی آداب عرض کرتا ہوں۔
رفیعہ: آپ نے بڑی ادب دوست طبیعت پائی ہے
معین: (نگہت کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے) جی کون پوچھتا ہے ادب دوستی کو اس زمانے میں۔
رفیعہ: (مضمون بدل کر) آپ اشتہارات کے سلسلے میں کچھ فرمانے والے تھے۔

معین : جی ہاں حاضر تو اشتہارات کے سلسلے میں ہی ہوا تھا لیکن بات ذرا دلچسپ چل نکلی۔

رفیعہ : بے شک بے شک، آپ بھی ان تمام دلچسپ باتوں کو مضمون کی شکل میں لکھ ڈالئے۔ ادب پارہ بن جائیں گی۔ زبانی باتوں میں یہ
جوہرِ قابل نہ گنوائیے۔

معین : (اب خود اعتمادی واپس آجاتی ہے) ارے صاحب یہ کاروبار کا دھندا نہ ہوتا تو ہم بھی کچھ لکھتے۔ بہت شوق تھا لکھنے پڑھنے کا کسی زمانے میں۔

رفیعہ : (اپنے واپس بیزنس پر لانے کی کوشش میں) ماہتاب میک اپ کا کارخانہ آپ ہی کا ہے نا؟

معین : (انکساری سے) جی میں کس لائق ہوں۔ آپ ہی کا ہے

رفیعہ : تو اشتہار اسی میک اپ کے سامان کے بارے میں غالباً ہوگا۔

معین : جی ہاں۔ دراصل آپ کا پرچہ خواتین میں خاص طور پر مقبول ہے (نگہت کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے) نگہت نور صاحبہ
کے مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

نگہت : خواتین کے علاوہ آپ بھی تو پڑھتے ہیں۔

معین : بے شک۔ بے شک۔ میرا مطلب یہ تھا کہ عورتوں اور مردوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ چنانچہ اس میں میک اپ کا
اشتہار نہایت موزوں رہے گا۔

نگہت : تو مردوں کے لئے بھی میک اپ کا سامان تیار ہوتا ہے آپ کے ہاں؟

معین : جی مردوں کے لئے؟ میرے خیال میں مردوں کو تو میک اپ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو ویسے ہی اچھے خاصے ہوتے ہیں
لیکن عورتوں کے لئے میک اپ نہایت ضروری ہے۔

نگہت : یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یعنی عورتیں میک اپ کے بغیر اچھی خاصی نہیں ہوتیں؟

رفیعہ : (رُک کر) نہیں نگہت ان کا مطلب یہ ہے کہ میک اپ عورت کے حسن کو اور نکھار دیتا ہے اور مردوں میں تو حسن ہوتا ہی نہیں
جسے نکھارنے کی ضرورت ہو۔

معین : بے شک۔ بے شک (پھر چونک کر) جی نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا خیر اس بحث میں کیا پڑیں۔ ہمیں تو میک اپ بیچنا ہے۔ اسے
عورتیں استعمال کریں یا مرد۔ جو حسین ہے، میک اپ سے حسین تر ہو جائے گا اور جو مکروہ ہے وہ مکروہ تر ہو جائے گا میرا مطلب ہے
وہ بھی بہتر ہو جائے (چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے) ماشاء اللہ بہت اچھی چائے تھی۔

رفیعہ : تو کون سے صفحے کے لئے ہوگا یہ اشتہار اور کے مرتبہ کے لئے؟

معین : خیال تو ٹائیٹل کے لئے تھا۔

رفیعہ : ٹائیٹل پر تو ہمارے ہاں آپ نے دیکھا ہوگا اشتہار ہوتا ہی نہیں۔ ٹائیٹل کی دوسری جانب البتہ ہو سکتا ہے۔

معین : میرے ذہن میں یہ تھا کہ اگر کسی مشہور خاتون کے بارے میں پرچے میں کچھ چھپ رہا ہو تو ٹائیٹل پر اس کی تصویر چھاپ دی جائے اور
نیچے لکھ دیا جائے کہ یہ ماہتاب میک اپ استعمال کرتی ہیں۔

رفیعہ : (سوچتے ہوئے) اب کے بیگم خود غوث پر ایک نوٹ چھپ رہا ہے۔ ٹائیٹل پر اس کی تصویر دینے کا ارادہ تو نہیں تھا لیکن اگر آپ

ٹائیٹل خرید رہے ہوں تو ـــ

معین : (جلدی سے رُک کر) نہیں نہیں آپ سمجھیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ کسی بھی خاتون کے بارے میں کچھ چھپ رہا ہو تو آپ ہمارا اشتہار لگا دیں۔

رفیعہ : تو ؟

معین : میرا مطلب یہ تھا کہ ان کو تو شاید زیادہ لوگ جانتے بھی نہ ہوں گے۔ کوئی ایسی خاتون ہوں جنہیں ہر شخص جانتا ہو جن کے بارے میں ذہن پر زور نہ ڈالنا پڑے۔

نگہت : مثلاً اماں حوّا ؟

معین : (چونک کر) جی نہیں ـــ جی ہاں مشہور تو وہ بے شک ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کی تصویر کہاں سے آئے گی۔

رفیعہ : اور اگر ہو بھی تو غالباً ان کے ساتھ کوئی اشتہار موزوں نہ رہے گا۔

معین : قطعی قطعی ـــ جی نہیں ـــ ظاہر ہے کہ ایسی گستاخی کی کون جرأت کر سکتا ہے۔

رفیعہ : فلم ایکٹریسوں کی تصویریں تو بہت موزوں رہیں گی لیکن وہ ہم ٹائیٹل پر چھاپتے نہیں

معین : (میز پر سے نگہت کی تصویر اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے) اگر نگہت نور صاحبہ کو اعتراض نہ ہو تو ہمارے میک اپ کو ان کے ساتھ منسوب ہونے پر بے حد فخر محسوس ہوگا۔

نگہت : (ذرا جھینپ کر) جی نہیں، میں معذرت چاہتی ہوں

معین : (ناامیدی سے) اس سے بہتر جوڑ سوجھ نہیں سکتا (تصویر رکھ کر بیٹھ جاتا ہے رفیعہ تصویر اٹھا کر میز کے دراز میں رکھ دیتی ہے)

رفیعہ : اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ٹائیٹل پر اشتہار آ نہیں سکتا۔ اب آخری صفحے کے لئے کچھ سوچئے۔

نگہت : اگر آخری ہی صفحے پر چھپنا ہے تو رزمی صاحب کی اپنی تصویر کیوں نہ چھپ جائے۔

رفیعہ : اس عنوان کے ساتھ کہ یہ جناب میک اپ استعمال کرتے ہیں ؟

نگہت : نہیں بلکہ یہ کہ جناب میک اپ بناتے ہیں۔ صنعت اور صنعتکار دونوں کی شہرت ہو جائے گی۔

معین : (سوچتے ہوئے) خیال تو بُرا نہیں ہے۔

نگہت : بلکہ اگر میک اپ کو فروغ دینے کے لئے آپ اپنا رسالہ بھی شروع کر دیں تو شہرت کئی گنا بڑھائی جا سکتی ہے۔

رفیعہ : اور رسالے کا نام ہو "میک اپ" یا اور نام رکھنا ہو تو "سنگار"۔ اپنا رسالہ بہرحال اپنا رسالہ ہوگا۔

معین : (ہنس کر) واللہ ـــ واقعی اس بارے میں مزید سوچنے کی ضرورت ہے (اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

رفیعہ : تو آپ چل دیئے ؟

معین : جی ہاں۔ فی الحال آخری صفحے کے لئے میں اپنی تصویر بھجواتا ہوں (دروازے کی جانب بڑھتا ہے)

رفیعہ : بہت خوب۔

نگہت : اگر تصویر جوانی کی ہو تو زیادہ موزوں رہے گی۔

معین : (رک کر) تو کیا آپ کے خیال میں اب میں بوڑھا لگ رہا ہوں ؟

رفیعہ: نہیں نگہت کا مطلب یہ تھا کہ تصویر اگر دو ایک برس پہلے کی بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہوگا۔

معین: ہاں ظاہر ہے کیا مضائقہ ہو سکتا ہے اور سچ پوچھیے تو ہم نے میٹرک کے بعد کبھی تصویر اُتروائی ہی نہیں۔ کون ان فوٹوگرافروں کے چکر میں پڑے۔ تصویر اتروانے جائیے تو بالکل کاٹھ کے اُلّو کی طرح بٹھا دیتے ہیں اور پھر طرح طرح کی فرمائشیں کہ یہ پہلو دبا کر بیٹھیے اور اب وہ پہلو دبا کر بیٹھیے۔ پورا پیٹ کوئی دبا دے تو سانس کیسے لے۔

رفیعہ: (ہمدردی کے لہجہ میں) ظاہر ہے ظاہر ہے۔

نگہت: اور اوپر سے کہتے ہوں گے "ہنسو" بھی۔

معین: جی ہاں۔ آپ بتلائیے کہ اگر ہم سانس روکے بیٹھے ہیں تو ہنسیں کیسے!

رفیعہ: وہ میٹرک والی تصویر ٹھیک رہے گی۔ آپ بے تکلف بھیجئے۔ اکثر مشہور لوگوں کی تصویریں میٹرک ہی کے زمانے کی ہوتی ہیں۔

نگہت: اصل میں پرانے زمانے کے فوٹوگرافر بھی اچھے ہوتے تھے۔ اب تو اگر کسی سے تصویر بنوائیے گا تو وہ انتہائی غیر ذمہ داری سے بنائے گا۔ کمر کا ناپ کچھ بھی آئے اس کی بلا سے۔

معین: (ذرا سانس اندر کھینچ کر) یہ تو درزی نے کوٹ ذرا کھلا بنا دیا ہے اس لئے کمر کے پھیلاؤ کا شبہ ہوتا ہے۔ کوٹ نہ ہو تو دیکھئے۔ فوٹوگرافر چاہے بھی تو بگاڑ نہیں سکتا۔ اچھا خدا حافظ!

(یونہی سانس روکے اکڑے اکڑے بائیں جانب سے نکل جاتا ہے)

رفیعہ: ہائے بیچارہ۔

نگہت: بیچارہ کیوں؟

رفیعہ: آج سے کھانا پینا ختم کر دے گا۔ دیکھ لینا۔

نگہت: کمر کا ناپ ٹھیک کرنے کے لئے؟

رفیعہ: اور اس کے بعد تمہاری شامت آئے گی۔

نگہت: واہ کیوں؟

رفیعہ: جب کوئی مرد ناتے کاٹنے لگا کسی لڑکی کے لئے تو ظاہر ہے اُس کا بھی جی کرے گا۔

نگہت: (ہنس کر) رفیعہ بہن آپ کو سیدھی سادی باتوں میں بھی رومان نظر آنے لگتا ہے۔

رفیعہ: اگر ایسا ہوتا تو زندگی بڑی اچھی گذرتی۔ مشکل یہی ہے کہ مجھے سیدھی سادی باتوں میں رومان نظر نہیں آتا جہاں ہوتا ہے۔ وہیں نظر آتا ہے اور جہاں نہیں ہوتا وہاں مجھے ویرانہ بھی صاف نظر آنے لگتا ہے۔

(تھوڑی دیر خاموشی چھا جاتی ہے)

نگہت: اچھا تو میں اب چلتی ہوں۔ چائے کا شکریہ۔ (اٹھتی ہے)

رفیعہ: مجھے بھی تو چلنا ہے۔ اکٹھے چلتے ہیں (اٹھتی ہے)

نگہت: آپ کو تو ابھی اداریہ لکھوانا ہے۔

رفیعہ: سر پکڑ کر) او — ہاں — اچھا تو جاؤ تم۔ (آواز دیتی ہے) شکور! ذرا مسطر لیتے آئیے۔

نگہت: تو یوں کیوں نہ کریں کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آ جاؤں اور پھر اکٹھے چلیں۔

رفیعہ: تم میری وجہ سے خواہ مخواہ کیوں رُکو۔

نگہت: نہیں مجھے دراصل اپنی بھانجی کے لئے فراک کا کپڑا لینا ہے۔ آپ کے برابر میں جو دکان ہے وہاں سے لے لیتی ہوں۔ واپسی پر جھانک لوں گی۔ اگر آپ کا کام ختم ہو چکا ہو تو اکٹھے پیدل چلیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔ (پھر ذرا رُک کر) اور ہاں رفیعہ بہن وہ جو میں سکول میں کام کر رہی تھی چھوڑ دیا میں نے

رفیعہ: ارے اچھا! تو اب کیا بیکار رہو گی؟

نگہت: بیکار رہنے سے گھر کا سلسلہ کیسے چلے گا۔ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت تو کرنی ہی پڑے گی۔

رفیعہ: کوئی ہے نظر میں؟

نگہت: اُستانی کی ڈگری تو مل ہی جائے گی۔ اگر یہ تنگ آ گئی ہوں بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے۔

رفیعہ: اچھا تم آؤ تو اور باتیں ہوں گی اس بارے۔

نگہت: تو میں ابھی آئی رفیعہ بہن (بائیں جانب سے نکل جاتی ہے)

(شکور پچھلے دروازے سے مسطر، قلم اور دوات لئے داخل ہوتا ہے اور نگہت والی کرسی پر بیٹھ کر مسطر پھیلاتا ہے)

رفیعہ: (میز سے ہٹ کر سوچتے ہوئے ٹہلتی ہے اور آہستہ آہستہ لکھواتی ہے) ہم لوگ ہر ہفتے یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لئے زیادہ سے زیادہ ادب پارے، خاکے اور فیچر اس پرچے میں پیش کریں اور ان کے ذریعے آپ کے لئے سامانِ مسرت مہیا کریں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی اگر پُر بہار ہے تو اور پُر بہار ہو جائے اور اگر خدانخواستہ تنہا یا اداس ہے تو اُس کی تنہائی اور اداسی دور ہو جائے۔ لیکن کبھی آپ نے سوچا کہ ہم لوگ جو اس کاوش میں لگے رہتے ہیں خود کہاں سے مسرت حاصل کرتے ہیں۔

(پچھلے دروازے سے ناظر داخل ہوتا ہے)

ناظر: ہائیں ابھی تک لکھوا رہی ہیں!

رفیعہ: ابھی شروع ہی کیا ہے۔

ناظر: شکور نے ٹیلی فون کیا تھا کہ بزمی صاحب آئے ہوئے ہیں — تو چلے گئے وہ؟

رفیعہ: جی ہاں ابھی ایک دو منٹ ہوئے

ناظر: کیا بات ہوئی اُن سے؟

رفیعہ: آخری صفحے کا اشتہار چھاپ دیں گے

ناظر: ایک دفعہ کے لئے یا زیادہ؟

رفیعہ: یہ تو ابھی بات نہیں ہوئی

ناظر: اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟

رفیعہ: (ذرا چڑ کر) آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت اداریہ لکھوا رہی ہوں۔ تفصیلات کل پوچھ لیجیے گا۔
ناظر: (رہنے دیجیے کوئی بات نہیں وہ میں لکھوا دوں گا۔ آپ.....
رفیعہ: (ایک دم غصے سے) اداریہ جائے بھاڑ میں اور یہ پرچہ بھی جائے بھاڑ میں۔ اگر خود ہی لکھوانا تھا تو مجھے کیوں کہا۔ میں جا رہی ہوں اس جہنم خانے سے۔
ناظر: (ذرا پریشان ہو کر) ابھی آپ غصے کیوں ہو رہی ہیں؟ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی
رفیعہ: (بدستور غصے میں) نہیں، آپ نے مجھے زرخرید لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ پرچہ بھی لکھو، اداریے بھی لکھو، اشتہار بھی ڈھونڈو۔ اور مجھے کیا ملتا ہے اس میں؟ (میز پر سے استعفیٰ اٹھا کر اس کے سامنے پٹخ دیتی ہے) یہ رہا میرا استعفیٰ۔
ناظر: (ذرا برہم ہو کر) تو آپ نے پہلے سے لکھ کر رکھا ہوا تھا استعفیٰ؟
رفیعہ: ہاں۔
ناظر: تو میرے اوپر کیوں ناراض ہو رہی ہیں (استعفیٰ کو سرسری انداز میں دیکھتا ہے) اگر آپ کو میری بات بری لگی ہے تو میں معافی مانگ لیتا ہوں۔
رفیعہ: (سر جھٹک کر میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) نہیں میں اب تنگ آ گئی ہوں مجھے یہاں گھٹن محسوس ہوتی ہے مجھ سے یہاں کام نہیں ہوتا۔ بس۔
ناظر: (شکور سے) شکور تم جاؤ ابھی۔ تھوڑی دیر میں دیں گے اداریہ۔

(شکور اپنا سامان سمیٹ کر چلا جاتا ہے)

ناظر: آخر ہوا کیا ہے؟
رفیعہ: کچھ نہیں۔ (استعفیٰ کی طرف اشارہ کر کے) پڑھ لیجیے۔
ناظر: (استعفیٰ کو زیر لب پڑھتا ہے، اور پھر نظریں اٹھا کر) بہت خوب تو گویا ہمارا دفتر آپ کو ویرانہ لگتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو اس کام میں دلچسپی ہو گی۔
رفیعہ: جی نہیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔
ناظر: رفیعہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے بغیر یہ پرچہ نہیں چلا سکتا
رفیعہ: آپ کا مطلب ہے کہ مدیر معاون کے بغیر۔
ناظر: یونہی سہی۔
رفیعہ: تو مدیر معاون دوسرا رکھا جا سکتا ہے۔
ناظر: ابھی پرچے میں اتنی سکت کہاں ہے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کو صحیح تنخواہ پر رکھ سکیں۔
رفیعہ: جتنی تنخواہ مجھے دیتے ہیں اتنے میں کوئی اور مل جائے گا۔
ناظر: مجھے معلوم ہے نہیں مل سکے گا۔
رفیعہ: اگر کوئی ضرورت مند ہو۔
ناظر: تو کون ہے ایسا ضرورت مند؟
رفیعہ: میرا خیال ہے کہ نگہت تو مان جائے گی۔

ناظر: (ذرا حیرت سے) نکہت نور!
رفیعہ: وہ ابھی آ رہی ہے۔ اُس سے پوچھ لیتے ہیں
ناظر: لیکن تم کیوں نہیں رکتیں؟
رفیعہ: میں نے بتا دیا
ناظر: یہ آخری فیصلہ ہے؟
رفیعہ: قطعی۔
ناظر: تو فیصلہ آج نہیں کرتے کل کریں گے۔
رفیعہ: کل نکہت نور شاید یہاں نہ آئے۔
ناظر: مجھے نکہت نور میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔
رفیعہ: جب آپ اسے دیکھیں گے تو دلچسپی ہو جائے گی۔

(بائیں جانب دروازے سے نکہت داخل ہوتی ہے)

نکہت: کیوں ہو گیا کام رفیعہ بہن (ناظر کو دیکھ کر) اوہ معاف فرمائیے۔
رفیعہ: یہ ناظر صاحب ہیں
ناظر: آداب۔
نکہت: آداب (رفیعہ سے) پھر چلیے گا۔
رفیعہ: ہاں۔ لیکن میں اکیلی چلی جاؤں گی
نکہت: (جلدی سے) تو میں چلتی ہوں
رفیعہ: نہیں ابھی تھوڑی دیر رک جاؤ۔ ناظر صاحب تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔
نکہت: (ذرا پریشان ہو کر) اس خاکے کے بارے میں؟
رفیعہ: نہیں، دراصل ناظر صاحب بڑی مدت سے سوچ رہے تھے کہ یہ پرچہ کچھ ٹھس سا ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں انشائے لطیف کی اور گنجائش ہے اور اُن کا خیال تھا کہ اگر آپ تعاون کریں تو اس پرچے کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔
نکہت: (ویسے ہی پریشان) لیکن میں تو تعاون کر رہی ہوں۔
رفیعہ: لیکن آپ ادارتی فرائض میں بھی تعاون کریں۔
نکہت: (ذرا خوش ہو کر) ہاں ہاں میرے لائق کوئی کام بتائیں۔ میں ضرور کروں گی۔
رفیعہ: ناظر صاحب نے میرا استعفےٰ قبول کر لیا ہے۔
ناظر: لیکن میں نے ....
رفیعہ: (بات کاٹ کر) اور وہ چاہتے ہیں کہ آپ میری جگہ کام کریں۔

نگہت: (پھر پریشان ہو کر) لیکن میں یہ کیسے کر سکتی ہوں۔

رفیعہ: (دراز کھول کر کاغذ نکالتی ہے اور اپنے پرس میں ڈال لیتی ہے) اس میں پریشان ہونے کی بات نہیں۔ شروع میں مجھے بھی کچھ نہیں آتا تھا مجھے انھوں نے سکھا دیا تھا۔

نگہت: لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی جگہ لے لوں۔

رفیعہ: تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں خود ہی چھوڑنا چاہ رہی ہوں (بائیں جانب بڑھتی ہے) اچھا خدا حافظ

[بائیں جانب سے نکل جاتی ہے۔ ناظر اور نگہت خاموش کھڑے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ پچھلے دروازے سے شکور داخل ہوتا ہے ہاتھ میں مسطر اور قلم دوات ہے۔]

شکور: جی وہ چھاپے خانے سے آدمی آیا ہے

ناظر: (چونک کر) اچھا ہاں ابھی تو اداریہ لکھوانا ہے (نگہت سے) ذرا چند منٹ تشریف رکھیے (نگہت بیٹھ جاتی ہے) لکھو شکور۔

شکور: (بیٹھ کر مسطر پر رکھتے ہوئے) انھوں نے لکھوایا تھا۔۔۔

ناظر: نیا مسطر لگاؤ

شکور: (نیا مسطر لگا کر) جی

ناظر: قارئین کرام کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اردو کی مقبول ادیبہ نگہت نور صاحبہ ہمارے ادارے میں مستقل طور پر تشریف لے آئی ہیں۔۔۔

شکور: جی؟

نگہت: لیکن میں نے تو ابھی۔۔۔۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ

[وقت۔ صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ منظر وہی دفتر کا کمرہ۔ پردہ اٹھتا ہے تو میز پر کاغذوں کے انبار لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پچھلی دیوار کے قریب ناظر بے چینی اور قدرے غصے سے ٹہل رہا ہے]

ناظر: (آواز دیتا ہے) شکور شکور

(پچھلے دروازے میں سے شکور جھانکتا ہے)

شکور: جی۔

ناظر: شکور کب تک چلے گا آخر؟

شکور: کیا حضور! پرچہ؟

ناظر: ارے پرچہ تو معلوم نہیں چلے گا یا نہیں۔ یہ کب تک چلے گا کہ اب گیارہ بج رہے ہیں اور نگہت ابھی تک دفتر نہیں آئیں۔

شکور: جی عورتوں کو دیر ہو ہی جاتی ہے۔

ناظر: تو رفیعہ کیسے نو بجے دفتر پہنچتی تھیں۔

شکور: ان کو میک اپ کا شوق نہیں تھا۔

ناظر: یہ سب بزمی نے ستیاناس کر رکھا ہے۔ ہر ہفتے نیا میک کا سیٹ لا کر دے جاتا ہے۔ بزمی کا آنا بند کرنا پڑے گا۔

شکور: اب تو اُس نے دو صفحے کا اشتہار خرید لیا ہے۔

ناظر: ہاں یہ تو ہے۔

شکور: اور پچھلے ہفتے پانچسو کاپی واپس آگئی تھیں۔ یہ نقصان آخر اشتہاروں ہی سے پورا ہوگا یا نہیں۔

ناظر: اشتہار تو دو ایک زیادہ ہوگئے ہیں لیکن پرچے کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ ہر ہفتے بکری کم سے اور کم ہو رہی ہے۔

شکور: تو نگہت صاحبہ کو کام پر لگایئے نا

ناظر: کیا کام پر لگاؤں، خاک کام ہوگا جب محترمہ دو گھنٹے سے زیادہ دفتر میں بیٹھیں گی نہیں اور وہ بھی بزمی چلے آ رہے ہیں یا کوئی اور۔ آج تک ایک اداریہ لکھ کر نہیں دیا۔

شکور: خاک تو لکھ رہی ہیں ہر ہفتے۔

ناظر: لاحول ولا۔ وہ بھی کوئی چھاپنے کی چیز ہوتی ہے۔ یہ پہلے کیسے لکھ لیتی تھیں، انھیں تو کچھ ہوگیا ہے۔ دو جملوں میں ربط تو قائم نہیں کر سکتیں۔ کیا کسی سے لکھوا کر لاتی تھیں،

شکور: جی ہاں۔

ناظر: (چونک کر) کیا!

شکور: وہ رفیعہ کے لکھے ہوتے تھے۔

ناظر: ارے ہٹاؤ وہ کسی سے بھی لکھواتی ہوں لیکن رفیعہ سے نہیں۔ رفیعہ کی تحریر کو میں نہیں پہچانتا کیا؟

(میز کے پیچھے جا کر رفیعہ والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

شکور: کاتب سے کوئی کیا بات چھپا سکتا ہے، نگہت صاحبہ کے مسودے کی کتابت تو یہی خادم کرتا رہا ہے۔ شروع سے آخر تک سرخ روشنائی سے رفیعہ صاحبہ کے جملے کے جملے بلکہ پیرے کے پیرے ہوتے تھے۔

ناظر: کیا مطلب وہ طنز و مزاح بھی لکھتی تھیں؛ ناممکن!

شکور: پچھلی فائل نکال کر دیکھیے۔

ناظر: (سوچتے ہوئے) تو مجھے پہلے کسی نے کیوں نہیں بتایا ——— خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ (کاغذوں کے انبار کو اپنی طرف گھسیٹ کر) اور یہ کاغذوں کا ڈھیر کیوں یہاں پڑا رکھا ہے (کاغذ الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے) یہ خط تو دو مہینے پہلے آیا تھا۔

(بائیں جانب سے نگہت داخل ہوتی ہے۔ اُس کا لباس پہلے سے کہیں بہتر ہے۔ فیشن کی طرف پوری توجہ کی گئی ہے)

نگہت: آداب عرض ناظر صاحب!

ناظر: (مُسکرا کر) آداب عرض

نگہت: ڈاک آپ دیکھئے گا آج؟

ناظر: (کرسی چھوڑ کر سامنے آجاتا ہے) جی نہیں آپ ہی دیکھیئے۔ میں بیٹھ کر آپ کی مدد کروں گا

نگہت: (اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں بھی سوچ ہی رہی تھی کہ آپ سے کہوں کسی روز زحمت کریں اور ان خطوں کو دیکھیں۔

ناظر: (خطوں میں ایک اُٹھا کر پڑھتا ہے) بخدمت جناب نگہت نور صاحبہ۔ میں ہمیشہ سے آپ کی مداح ہوں اور آپ کا خاکہ بڑے شوق سے پڑھتی ہوں لیکن پچھلے چند ہفتوں سے آپ پوری توجہ سے نہیں لکھ رہی ہیں . . . .

نگہت: پڑھنے والوں کا ذوق عجیب بے ڈھنگا ہے کس کی سنیں اور کس کی مانیں (پرس کھول کر ایک خط نکالتی ہے اور پڑھتی ہے) میں ایک ادیب ہوں اور ادیب کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں کہ جب سے آپ نے رسالے کی ادارت سنبھالی ہے پرچہ نکھر آیا ہے اور آپ کے خاکے تو ماشاء اللہ کیا کہیئے۔ فقط منیر نگینوی"

ناظر: خوب (ایک اور خط اٹھا کر پڑھتا ہے) پچھلے دو مہینے میں تین خط لکھ چکی ہوں آپ نے ابھی تک جواب نہیں دیا۔ ہمیں پرچہ باقاعدگی سے نہیں مل رہا ہے۔

نگہت: اس طرح کے انتظامی امور کی طرف آپ توجہ فرمایئے نا۔

ناظر: (ایک اور خط اُٹھا کر پڑھتا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ پرچہ ڈوب رہا ہے۔ ناظر صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ مضامین کا معیار بہتر کرنے کی طرف کیوں توجہ نہیں دے رہے ہیں۔

نگہت: (اپنے پرس سے ایک اور خط نکال کر) اتفاق سے اس مضمون پر ایک اور خط ملاحظہ فرمایئے (پڑھتی ہے) میرے خیال میں پرچے پر مدیر کی چھاپ کا ہونا ضروری ہے اور مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ کے پرچے پر آپ کی چھاپ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جب سے ناظر صاحب نے انتظامی معاملات پر زیادہ توجہ اور ادبی معاملات پر کم توجہ دینا شروع کی ہے مضامین کا معیار پہلے سے بہتر ہو گیا ہے"

ناظر: خوب اور اس کے لکھنے والے کون ہیں؟

نگہت: منیر نگینوی

ناظر: آپ کے پرس میں اور بھی کوئی خط ہیں؟

نگہت: جی ہاں بہت (پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک پلندہ نکالتی ہے)

ناظر: ان کو فائل میں لگایئے گا یہ کس کس کی طرف سے ہیں؟

نگہت: سب منیر نگینوی صاحب کی طرف سے ہیں۔

ناظر: خوب! یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہم منیر نگینوی صاحب کا کلام کبھی نہیں چھاپتے۔

نگہت: جی نہیں مجھے نہیں معلوم۔ کیوں نہیں چھاپتے؟

ناظر: کیونکہ غیر معیاری ہوتا ہے۔

نگہت: مجھے تو منیر نگینوی صاحب بڑے معیاری ادیب لگے چنانچہ اس پرچے کے لئے میں نے ان کی تین نظمیں شامل کر لی ہیں۔

ناظر: (چونک کر) تین نظمیں! خدا کے لئے، وہ تو دو مصرعے بھی موزوں نہیں لکھ سکتے۔ آپ نے اکٹھی تین نظمیں کیسے چھپنے کو دے دیں!

نگہت: (ناپسندیدگی سے) میرا خیال ہے کہ مجھے ادب پاروں کے انتخاب کا حق تو پہنچتا ہے۔

ناظر: بے شک۔ بے شک۔ لیکن نظم چونکہ آپ کا میدان نہیں ہے، اس لئے اس میں غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ مجھے دکھا لیجئے۔ وہ نظمیں کہاں ہیں؟

نگہت: ان کی کتابت ہو گئی ہے۔ میں نے پریس بھجوا دی ہیں۔

ناظر: اس میں غلطی میری ہے مجھے چاہیئے تھا آپ کو بتا دیتا کہ چند لوگ ایسے ہیں جو اکثر اپنی تخلیقات ہمارے پاس بھیجتے رہتے ہیں اور ہم انہیں لوٹاتے رہتے ہیں دراصل وہ ادیب بننے ہی خورسند کا نام پڑھ کر ہیں۔

نگہت: کیا مطلب؟

ناظر: پہلے رفیعہ کا نام چھپتا تھا تو اس کی مدح میں خطوط آتے رہتے تھے۔ اب آپ کا نام یا آپ کی تصویر دیکھ کر آنے لگے ہیں۔ ہم لوگ عموماً ایسے خطوط کو نظر انداز کر دیا کرتے ہیں۔

نگہت: لیکن یہ تو انتہائی بے مروتی کی بات ہے۔

ناظر: کہیں آپ نے ان خطوط کے جواب تو نہیں بھیجے؟

نگہت: آپ ہی نے تو کہا تھا کہ پڑھنے والوں کے خطوط کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

ناظر: میرا مطلب یہ تھا.... خیر ہٹایئے

نگہت: معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آج صبح آپ کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔

ناظر: جی ہاں

نگہت: تو آپ ذرا دیر باہر ٹہل آیئے اور مجھے کام کرنے دیجئے (میز پرسے کاغذوں کو سمیٹتی ہے)

ناظر: نگہت میرا یہ خیال تھا کہ ہم دونوں مل کر اس پرچے کو بہتر بنا سکیں گے۔

نگہت: (ذرا ک اٹھا کر دیکھتی ہے) اگر آپ تنقید کم کریں اور تعمیر زیادہ تو پرچہ بہتر ہو سکتا ہے۔

ناظر: میں نے تو آج تک تنقید نہیں کی۔

نگہت: اور آج جو اگلی پچھلی کسر نکال رہے ہیں؟

ناظر: میں معافی چاہتا ہوں۔

نگہت: (مسکرا کر) خیر کوئی بات نہیں۔ ہر انسان سے غلطی ہو سکتی ہے آپ فرمایئے کہ پرچے میں کیا خرابی ہے۔

ناظر: ہر پرچے میں بہتری کی گنجائش رہتی ہے لیکن یہ بہتری اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہم دونوں میں ذاتی سطح پر تعاون ہو۔

نگہت: درست۔ ضرور ہونا چاہئے تعاون۔

ناظر: میں اپنے ساتھیوں کے قریب نہیں جا سکتا۔ مجھ میں ضرور کوئی خرابی ہوگی۔

نگہت: بظاہر اور کوئی خرابی تو نظر نہیں آتی لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خواتین سے آپ کا سابقہ بہت کم رہا ہے۔

ناظر: کوئی ایسی لاتعلقی بھی نہیں رہی۔ پچھلے کئی برس سے رفیعہ میرے پرچے میں کام کرتی رہی اور اب کچھ عرصے سے آپ ہیں۔

نگہت: ہمیں تو خیر آپ دفتر کو زنجیر سمجھتے ہوں گے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں کسی خاتون کا دخل نہیں رہا۔

ناظر: یہ بھی درست نہیں۔ میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اور ماں کا اکلوتے بیٹے کی زندگی پہ بہت اثر ہوتا ہے۔

نگہت: ہو سکتا ہے کہ ماں کی غیر ضروری حد تک توجہ نے آپ کو خود پرست بنا دیا ہو۔

ناظر: ہو سکتا ہے لیکن میں نے کبھی اپنی خود پرستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

نگہت: لیکن دوسروں کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔

ناظر: دیکھئے میں آپ کی طرف توجہ دینا چاہ رہا ہوں۔

نگہت: (ہنس کر) بہت دیر سے۔ بہت دیر سے۔ اتنے میں مجھے احساس ہو چکا ہے کہ آپ کی مجھ میں دلچسپی محض سطحی ہے۔

ناظر: تو آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ دلچسپی اور گہری ہونی چاہئے؟

نگہت: (یکایک بوکھلا کر) مجھے معلوم نہیں۔ (ڈاک کی طرف پھر متوجہ ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے)

ناظر: آپ بہت مصروف ہیں۔

نگہت: (بغیر نظریں اُٹھائے) جی ہاں۔

ناظر: تو میں چلتا ہوں۔ (اٹھ کر پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نگہت کاتب کو آواز دیتی ہے)

نگہت: شکور۔

(شکور پچھلے دروازے سے جھانکتا ہے)

شکور: جی؟

نگہت: ناظر صاحب نے اداریہ لکھوا دیا ہے؟

شکور: جی نہیں۔ انھوں نے ابھی ابھی باہر جاتے ہوئے کہا کہ آپ لکھوائیں گی۔

نگہت: لیکن وہ تو کل چلا جانا چاہیئے تھا۔ اور ہمیشہ وہی لکھتے ہیں۔

شکور: جی میں نے کل کہہ دیا تھا لیکن انھوں نے جب بھی کہا کہ آپ سے لکھوایا جائے۔

نگہت: (ذرا تامل سے) تو تعلّی ہے یہ؟

شکور: جی؟

نگہت: کچھ نہیں۔

شکور: مسطر لاؤں؟ اسی پہ لکھوا دیجئے۔ وقت اب کم ہے

نگہت: (میز سے کاغذ پنسل بڑھاتے ہوئے) نہیں یہ سادہ کاغذ اور پنسل لے لیجئے مجھے مسطر پر لکھوانے کا تجربہ نہیں ہے۔

(شکور کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جاتا ہے)

شکور: جی۔

نگہت: (سوچتے ہوئے) اوپر لکھیئے اداریہ۔

شکور: جی وہ تو میں نے پہلے ہی لکھ لیا۔

نگہت: اچھا تو آگے لکھیے (سوچتے ہوئے) کیا لکھا جائے۔۔۔ "ٹیڈی لباس کے بارے میں تو پچھلے ہفتے ناظر صاحب نے لکھوا دیا تھا۔ اس سے پچھلے ہفتے کیا تھا؟

شکور: عورتوں کا ادب میں حصہ۔

نگہت: اور اس سے پچھلے ہفتے؟

شکور: ادب میں مزاح۔

نگہت: ہاں یہ تو سب ہو چکے۔ اب میرے لئے مضمون کوئی چھوڑا ہی نہیں لکھواؤں کیا خاک۔ اچھا تعلّی ہے تو تعلّی ہی سہی۔ خیر لکھئے۔

شکور: جی۔

نگہت: (سوچتے ہوئے انگ کر ٹہلتی ہے) لکھیے "اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

شکور: جی لکھ لیا۔

نگہت: (رک کر) لیکن وہ اہم مسئلہ کیا ہے؟

شکور: یہ بھی لکھوں جی؟

نگہت: ارے نہیں میں سوچ رہی ہوں۔ اچھا تم بتاؤ وہ مسئلہ کیا ہو سکتا ہے؟

شکور: جی مجھے کیا معلوم۔

نگہت: اب اتنا میں نے لکھوا دیا ہے تو آپ لوگ بھی کچھ سوچیں۔ کیوں دنیا میں اس وقت کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے؟

شکور: مشرق بعید میں جنگ کا مسئلہ ہے۔

نگہت: ہم سیاسی مسائل پر نہیں لکھ رہے۔ کوئی ادبی یا سماجی مسئلہ بتاؤ۔ اچھا خیر میں خود ہی سوچتی ہوں۔۔۔ "شہروں میں صفائی کا مسئلہ" یہ کیسا رہے گا؟

شکور: لیکن اس پر تو رفیعہ صاحبہ ایک مرتبہ لکھوا چکی ہیں۔

نگہت: تو دوبارہ نہیں لکھا جا سکتا کیا؟

شکور: لکھوا دیجیے لیکن کوئی نئی بات تو نہ ہوگی۔

نگہت: تو یوں لکھو کہ اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایک ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔

شکور: جی لکھ لیا۔

نگہت: لیکن رفیعہ پڑھیں گی تو ہنسیں گی کیا لکھا۔

شکور: اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔

نگہت: "جس پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے" کاٹ دیجیے

شکور: کاٹ دیا۔

نگہت: اب پھر پڑھیے۔
شکور: اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔
نگہت: یہ تو فقرہ بے معنی ہوگیا۔ "ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں" کاٹ دیجئے۔
شکور: کاٹ دیا
نگہت: اب کیا رہ گیا؟
شکور: اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ۔
نگہت: یہ بھی کاٹ دیجئے
شکور: کاٹ دیا۔
نگہت: اب پڑھیے
شکور: اداریہ
نگہت: (واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) اداریہ — اداریہ (جھنجھلا کر) یہ ناظر صاحب کی سراسر زیادتی ہے (بائیں جانب دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے) کون ہے؟

(باہر سے آواز)

آواز: منیر نگینوی۔
نگہت: تشریف لائیے۔
شکور: تو میں جاؤں جی؟
نگہت: نہیں آپ بھی بیٹھیے۔

(منیر نگینوی بائیں دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ گندمی رنگ شکل نہایت معمولی درمیانہ قد دبلا پتلا جسم کرتا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں۔ پان چبا رہے ہیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا رجسٹر ہے)

منیر: آداب عرض ہے
شکور: (اُٹھ کر) آداب عرض
نگہت: یہ شکور صاحب ہیں۔
منیر: (دوبارہ آداب بجا لاکر) تشریف رکھئے شکور صاحب
شکور: آپ بھی تشریف رکھئے
منیر: نوازش

(شکور اور منیر دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

(نگہت سے) بہت دنوں سے آپ سے ملنے کی تمنا تھی۔ آج ہمت کر کے آن ہی پہنچا۔

نگہت: اس میں ہمت کی کیا بات ہے۔ یہ ایک ادبی ادارہ ہے اور آپ ادیب ہیں۔ لازم و ملزوم۔

منیر: اور شکریہ ادا کرنا تھا اس بات کا کہ آپ نے میری چند نظمیں انتخاب فرمائیں۔

نگہت: ہم پرچے میں نئے لوگوں کو بھی لانا چاہتے تھے۔ پرچے میں افسردگی سی آنے لگی تھی

منیر: یہ تو آپ کی عنایت ہے ویسے ہم کچھ ایسے نئے بھی نہیں ہیں آپ کی دعا سے بچپن سے شعر کہہ رہے ہیں۔

نگہت: (ذرا حیرت سے) بچپن سے؟

منیر: جی ہاں قدرتی طور پر طبیعت موزوں ہے۔ میں دو سال کا تھا جب بے ساختہ پہلا شعر میرے منہ سے نکل گیا۔

نگہت: (اور حیرت سے) دو سال کا؟

منیر: جی ہاں ابا مجھے گود میں لئے ہوئے بہلا رہے تھے۔ شعر سنا تو حیران رہ گئے۔

نگہت: خوب! کیا شعر تھا وہ؟

منیر: بچپن کی باتیں کسے یاد رہتی ہیں۔ یقیناً کوئی اچھا شعر ہوگا جبھی ابا مرحوم اس کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے تو عرض یہ ہے کہ صرف پچھلے ایک برس میں
میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس بیاض میں ہے۔

(رجسٹر اٹھا کر میز پر رکھتا ہے)

نگہت: تو آپ بیاض کو ساتھ کیوں رکھتے ہیں؟

منیر: یہاں قصہ یہ ہے کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے شعر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر بیاض ساتھ نہ ہو تو ایک ادبی خزانہ ہاتھ سے جاتا رہے۔

نگہت: بے شک

منیر: خیر چھوڑیے اس قصے کو ہمیں اپنے بارے میں تو کچھ کہنا نہیں تھا ہمیں تو آپ سے ملنا تھا اور واقعی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ جیسا سوچا تھا
اس سے بڑھ کر پایا۔

نگہت: شکریہ (موضوع بدلتے ہوئے) پرچے کا معیار بہتر کرنے کے لئے اگر آپ کے ذہن میں کچھ مشورے ہوں تو ہمیں بتائیے۔

منیر: جب سے آپ تشریف لائی ہیں پرچے کا معیار روز بروز بہتر ہو رہا ہے۔ کسی مزید مشورے کی گنجائش ہی نہیں ہے آپ کی ذات ہی بابرکات ہے
دیکھئے شعر ہو گیا۔

نگہت: جی کون سا شعر؟

منیر: آپ کی ذات ہے بابرکات

نگہت: (ہنس کر) یہ وہی شعر تو نہیں جو دو برس کی عمر میں کہا تھا۔

منیر: (ذرا بُرا مان کر) ہمارے یہاں آمد ہے، آورد نہیں اور آمد بھی ایسی کہ سہل ممتنع سمجھ لیجئے۔ یہ وہ چیز ہے جو شاید آپ کو آسان لگے لیکن بڑے بڑے
استادوں کے قلم لرز جاتے ہیں اس کے آگے

شکور: بے شک۔ بے شک

منیر: (شکور کی طرف متوجہ ہو کر) آداب عرض۔ آداب عرض۔

شکور: ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔

منیر: واہ — واہ — واہ آج جناب کی شعر فہمی کے ہم بھی قائل ہو گئے۔ واہ ۔ واہ ۔ واہ ۔ ذرا پھر ارشاد فرمائیے گا

شکور: (ذرا پشیمان ہو کر) ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔

منیر: (جھوم کر) واہ کیا زمین نکالی ہے۔ کیا رواں مصرعہ ہے۔ بہت خوب کہا ہے آپ نے!

شکور: (حیرت سے) جی؟

نگہت: (مسکرا کر) یہ تو مرزا غالب کا مصرعہ ہے۔ شکور صاحب تو شعر نہیں کہتے۔

منیر: مرزا غالب! آپ کیا فرما رہی ہیں؟ مصرع یوں ہے کہ غالب کے طرفدار نہیں۔ اب فرمائیے کہ کون شاعر ایسا ہو گا جو اپنا طرفدار نہ ہو۔

شکور: جی یہ مرزا غالب ہی کا مصرعہ ہے اور مقطع ہے۔

منیر: خیر اب آپ لوگوں کا اصرار ہی ہے تو مان لیتا ہوں ورنہ شعر کی داخلی کیفیت تو سب میری بات کے حق میں ہے۔

نگہت: اور خارجی کیفیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

شکور: اگر مجھے اجازت دیں تو تھوڑا سا کام کر لوں۔ چند خطوں کی کتابت باقی ہے۔

نگہت: اچھا! لیکن دفتر ہی میں رہیے گا کوئی ادارہ یہ کام ہے۔

شکور: (اٹھ کر پچھلے دروازے کی جانب بڑھتا ہے) جی بہتر۔

(پچھلے دروازے سے چلا جاتا ہے)

منیر: تو آپ کاتب ہیں۔

نگہت: جی ہاں

منیر: بہت خوب۔ خیر آپ نے بڑی خوبصورتی سے شکور صاحب کو باہر نکالا

نگہت: (ذرا حیرت سے) جی!

منیر: جی ہاں۔ جیسے ہی آپ نے خارجی کیفیت کہا میں سمجھ گیا کہ آپ اشارۃً شکور صاحب کو خارج ہونے کو کہہ رہی ہیں اور شکور صاحب اٹھ کر چل دیے

نگہت: جی نہیں میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا اور نہ ہی شکور صاحب سے اشارۃً کچھ کہنے کی مجھے ضرورت ہے،

منیر: خیر وضعداری کے تقاضے نباہیے۔ وگرنہ کیا ہم نہیں جانتے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

نگہت: (ذرا پریشان ہو کر) کیا فرما رہے ہیں آپ؟

منیر: نگہت صاحبہ آپ کا ایک ایک خط میں نے کئی کئی بار پڑھا ہے اور آپ کا طرزِ تکلم پہچاننے لگا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ لفظاً معصوم سی بات کے پردے میں کیا کیا کہہ جاتی ہیں۔

نگہت: (ذرا چڑ کر) مثلاً؟

منیر: مثلاً آپ کے ایک خط میں یہ جملہ تھا کہ اپنے کلام میں جذباتی رنگ قائم رکھیے۔ اب ہم اتنے بھولے بھی نہیں ہیں کہ اس کا مطلب بھی نہ سمجھ سکیں

(بائیں جانب سے دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)

نگہت: کون ہے؟

(باہر سے معین بزمی کی آواز سنائی دیتی ہے)

معین: میں حاضر ہو سکتا ہوں؟

نگہت: جی ہاں تشریف لائیے

(بائیں جانب کے دروازے سے معین بزمی داخل ہوتے ہیں)

معین: آداب عرض (منیر سے) آداب عرض۔

منیر: (قدرے ناپسندیدگی سے) آداب عرض (پھر بیٹھ جاتا ہے)

نگہت: (تعارف کراتے ہوئے) یہ معین بزمی صاحب ہیں اور یہ منیر نگینوی صاحب ہیں۔

(دونوں دوبارہ آداب بجا لاتے ہیں)

معین: میں مخل تو نہیں ہوا۔

منیر: جی ہاں ہم کچھ مصروف ہی تھے

نگہت: (جلدی سے) جی نہیں قطعی نہیں، منیر صاحب ہمارے پرچے کے لئے لکھتے ہیں اور آج یوں ہی آ گئے تھے۔

معین: (منیر کی موجودگی ... ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے) اگر آپ مصروف ہوں تو میں تھوڑی دیر میں دوبارہ آ جاؤں گا۔

منیر: اگر ایسا ہو تو بہت اچھا ہے (معین اٹھتا ہے)

نگہت: (منیر سے ڈانٹ کر) منیر صاحب آپ ہمارے مہمانوں سے اس طرح بات نہیں کر سکتے اور چونکہ آپ اشارے سمجھتے ہیں اس لئے میں عرض کروں گی کہ آپ کے لئے خارجی کیفیت بہتر رہے گی۔

منیر: (کرسی پر یوں بیٹھتے ہیں کہ برسوں نہیں اٹھیں گے) خارجی کیفیت تو یہ ہے کہ ہماری گفتگو ابھی نامکمل ہے اور میری داخلی کیفیت تو آپ جانتی ہی ہیں۔

معین: (ذرا پریشان ہو کر) میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ....

نگہت: (بزمی سے) بزمی صاحب آپ تشریف رکھیے (منیر سے) مجھے بزمی صاحب سے ایک ضروری بات کرنا ہے

منیر: نگہت صاحبہ آخر ہمارا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔ آپ نے خطوط میں اتنی حوصلہ افزائی فرمائی تو ہم حاضر ہوئے۔

نگہت: (غصے سے) آپ اب تشریف لے جائیے۔

منیر: بزمی صاحب آپ کے آنے سے پہلے حالات بہت اچھے جا رہے تھے۔

بزمی: (غصے سے مڑ کر) منیر صاحب، میں نگہت صاحبہ کو بہت عرصے سے جانتا ہوں معلوم ہوتا ہے آپ شریف آدمی نہیں ہیں آپ تشریف لے جائیے۔

منیر: (اکڑ کر) بہت اچھا تو ہم تشریف لے جاتے ہیں۔ لیکن یہ عرض کر دوں کہ ہمارے قلم میں ابھی زور ہے، جو بھی ہو سکتی ہے۔

(بزمی دھکیلتا ہوا اسے دروازے سے باہر نکال دیتا ہے ــ نگہت سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے)

نگہت: یہ ادیب ہیں یا غنڈے؛ عجیب مصیبت ہے!

بزمی: کوئی بات نہیں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

نگہت: (ایک کاغذ کرسی پر رکھتے ہوئے) میں استعفیٰ دے رہی ہوں۔

بزمی: یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں خود بھی کہنے والا تھا کہ آپ اس پرچے کو چھوڑ دیجئے۔

نگہت: (چونکتے ہوئے رک کر) اچھا! کیوں؟

بزمی: مجھے اپنا پرچہ نکالنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اور میں آپ سے درخواست کرنے ہی والا تھا۔

(بائیں جانب سے رفیعہ جھانکتی ہے)

رفیعہ: ہیلو نگہت۔ (بزمی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

نگہت: آئیے رفیعہ بہن۔ آپ بہت اچھے وقت پر آئیں۔

رفیعہ: (کمرے میں آکر) کیوں کوئی خوش خبری ہے؟

نگہت: جی ہاں۔

بزمی: آداب عرض کرتا ہوں۔

رفیعہ: آداب عرض۔ بزمی صاحب نے استعفیٰ دینے کے لئے پورا پرچہ لے لیا ہوگا۔

نگہت: (جو کاغذ رکھ دی تھی وہ رفیعہ کو دیتی ہے) جی نہیں خوش خبری یہ ہے

رفیعہ: (پڑھتے ہوئے) استعفیٰ — کیوں کیا ہوا؟

نگہت: بس یکایک فیصلہ کر لیا

رفیعہ: کہیں بزمی صاحب نے تو یہ مشورہ نہیں دیا۔ (کرسی پر بیٹھتی ہے)

نگہت: نہیں — لیکن سن کر خوش بہت ہوئے ہیں۔

بزمی: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) آپ کو اگر یاد ہو تو آپ نے مجھے اپنا پرچہ شروع کرنے کو کہا تھا۔ وہ آپ کی دعا سے نگار کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

رفیعہ: مبارک ہو اور نگہت اس کی مدیرہ ہوں گی۔

بزمی: زہے نصیب۔

نگہت: یہ ان کا حسن ظن ہے ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھ سے پرچے کا کام نہیں ہوتا۔

رفیعہ: تو کیا گھرداری کا ارادہ ہے؟

بزمی: زہے نصیب۔

رفیعہ: (ایک قہقہہ لگا کر) بہت خوب تو یہ ارادے ہیں۔

نگہت: بزمی صاحب آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟

بزمی: (دکھاوا کرتے ہوئے) — جی میں نے کچھ عرض نہیں کیا۔

رفیعہ: لیکن آخر حرج ہی کیا ہے؟

نگہت: بہناؤ بھی رفیعہ بہن (بزمی سے) بزمی صاحب آپ کی اجازت چاہیے گا۔

بزمی: جہاں آپ فرمائیں۔

رفیعہ: ہائیں تو تم جا رہی ہو کیا؟

نگہت: جی قطعی!

رفیعہ: اور ناظر صاحب سے بات نہیں کرو گی۔

نگہت: جی نہیں

رفیعہ: لیکن ہوا کیا ہے۔ آخر ایسی بھی کیا تنگی ہے کہ ان سے بات بھی نہیں ہو گی۔

نگہت: (اٹھ کر) بزمی صاحب آپ کار گھما کر لائیے۔ میں اپنی چیزیں سمیٹ لوں اتنے میں۔

بزمی: (بائیں جانب لپکتے ہوئے) جی ابھی لیجئے۔ (بائیں جانب سے نکل جاتے)

(نگہت میز پر سے چند کاغذ اٹھا کر اپنے پرس میں ڈالتی ہے)

نگہت: میں اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہی کہ میں پرچے کو کامیابی سے چلا رہی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر بزمی صاحب اشتہارات کی تعداد میں اضافہ نہ کرتے تو پرچہ بالکل بیٹھ گیا تھا۔ اور تعریفی خطوط سوائے دو تین سرپھروں کے اور کسی کی طرف سے آ نہیں رہے تھے۔

رفیعہ: تو اب کیا ارادہ ہے؟

نگہت: کچھ نہیں اگر آپ اجازت دیں گی تو آپ کے پرچے کے لئے خاکے لکھ دیا کروں گی۔

رفیعہ: میں اجازت دوں؟ اور میرا پرچہ؟ میرا اس پرچے سے کیا واسطہ؟

نگہت: میرا مشورہ مانیے آپ دوبارہ آ جائیے۔

رفیعہ: بہت خوب — کیوں؟

نگہت: تو کون سا ایسا ضروری کام کر رہی ہیں آپ؟

رفیعہ: آرام سے زیادہ ضروری کام کیا ہو سکتا ہے؟

نگہت: رفیعہ بہن اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کے "دو" پرچے کے علاوہ کسی اور سے بھی دلچسپی لے سکتے ہیں تو یہ غلط ہے۔

رفیعہ: میں کیسے مان لوں کہ تمہارے ہوتے ہوئے اس ویرانے میں کچھ فرق نہیں پڑا۔

نگہت: قطعی مان لیجئے کہ میں نے اس میں کوئی گل نہیں کھلائے۔

رفیعہ: تو اس ویرانے کو ویرانہ چھوڑ کر جا رہی ہو تم۔

نگہت: شاید اب وہ ویرانہ نہ رہا ہو۔

رفیعہ: اچھا؟

نگہت: کہاں آپ ہے اور باہر جا کر کونسا باغ مل گیا یا بہار مل گئی آپ کو۔

رفیعہ: اچھا میرا ذکر چھوڑو تم اپنا بتاؤ، خاکے لکھنے کے علاوہ اور کیا ہوتا... بزمی کیسے ہیں۔

نکہت: (سوچتے ہوئے) شریف اور بدھو ہیں۔

رفیعہ: یعنی ان میں میاں بننے کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔

(نکہت اور رفیعہ ہنستی ہیں۔ بائیں جانب سے ناظر داخل ہوتا ہے)

ناظر: ہیلو — ہیلو رفیعہ — کیسے آنا ہوا؟

رفیعہ: (اُٹھتی ہے) یوں ہی گذر رہی تھی۔ سوچا نکہت سے ملتی چلوں

ناظر: ہوں — تو آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں بیٹھیے نا — وہ تم نے چائے بنانے کا اچھا سلسلہ شروع کیا تھا۔ نکہت نے نہیں چلایا چنانچہ اب چائے باہر سے منگوانا ہو گی۔

نکہت: میں نے رفیعہ بہن سے درخواست کی ہے کہ وہ چائے کا سلسلہ پھر شروع کر دیں۔

(استعفیٰ ناظر کے حوالے کرتی ہے)

ناظر: (ایکدم چونک کر) یہ کیوں؟ ناراضگی کی وجہ؟

(بزمی بائیں جانب سے بڑی تیزی سے داخل ہوتا ہے)

بزمی: آئیے میں گاڑی گھما لایا ہوں (ناظر کی طرف دیکھ کر) آداب عرض ناظر صاحب۔

ناظر: ہیلو بزمی صاحب آئیے تشریف لائیے

بزمی: میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔ اس وقت نکہت صاحبہ کو جلدی ہے۔

نکہت: اچھا ناظر صاحب خدا حافظ۔ غلطی معاف فرمائیے۔ (بائیں جانب چلتی ہے)

بزمی: اچھا جی خدا حافظ۔

(نکہت اور بزمی دونوں بائیں جانب سے نکل جاتے ہیں)

(تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے۔ پچھلے دروازے سے شکور داخل ہوتا ہے

شکور: صاحب جی پریس سے آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے۔ ساری کاپیاں لگا دی ہیں۔ اداریئے کے لئے کام رُکا ہوا ہے وہ جلدی سے بھجوا دیجئے

(رفیعہ سے) آداب عرض۔

رفیعہ: کیسے ہو شکور؟

ناظر: میں ذرا پریشان ہوں رفیعہ۔ تم لکھوا دو گی اداریہ؟

رفیعہ: لیکن میں —

ناظر: وقت نہیں ہے تو مسطر ہی پر لکھوا دو۔ شکور مسطر لیتے آؤ۔

شکور: جی بہتر (پچھلے دروازے سے پھر نکل جاتا ہے)

ناظر: مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب بزمی کی طرف سے بہت سے اشتہارات نہیں ملیں گے۔ بہت دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی ہم دونوں کو۔ شکر ہے کہ تم آ گئیں۔

(پردہ گرتا ہے)

محمد خالد اختر

سواتی مہم

— ۳ —

باتاخیل کی سرائے

لاری باتاخیل کے بڑے گاؤں میں کوئی ایک بجے داخل ہوئی۔ یہ ان دیہات میں سے ہے جنھیں قصبہ کہنا چاہیے۔ اس کا بازار لمبا اور اژدھام ہوتا ہے۔ دوکانیں اچھی خاصی ہیں اور ہر قسم کا سامان وہاں بک سکتا ہے۔ باتاخیل مالاکنڈ ایجنسی میں ہے۔ لاری ایک لمبے چوڑے برآمدوں والے ہوٹل کے سامنے رکی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں لاری بہت دیر ٹھیرے گی اور ہم کھانا کھا اور سستا سکتے ہیں۔

ہوٹل کے برآمدے میں ایک لمبی میز تھی۔ اس پر ایک ستھرا میز پوش بچھا تھا اور میز کے چوگرد بید کی کرسیاں تھیں، اس لئے یہ ممکن تھا کہ تم وہاں کھانا بھی کھاتے جاؤ اور بازار کے منظر کی سیر بھی کرتے رہو۔ اس لحاظ سے یہ ہوٹل کسی قدر پیرس وضع کا تھا

ہوٹل کے ملازموں نے ہمارا خیر مقدم خوش اخلاق میزبانوں کی مانند کیا۔ یہ وہ چیز ہے جسے تم پنجاب کے ہوٹلوں میں بیکار ڈھونڈو گے۔ ہم پنجابی ایسا معلوم ہوتا ہے سچی مسافر نوازی کی روایات سے بیگانہ ہیں۔ ہمارے ہوٹلوں میں ایک غیر شخصی سی، معاندانہ سی فضا ہوتی ہے، سرحد میں ایسا نہیں۔ یہاں کے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تم ایسا محسوس کرتے ہو جیسے تم اپنے گھر میں اپنے کنبے کے افراد اور احباب کے ساتھ کھا رہے ہو اور تمہارے اپنے گھر کے ملازم تمہاری ضروریات پوری کر رہے ہوں۔ بلاشبہ تمہیں اپنے کھانے کے دام ادا کرنا پڑتے ہیں لیکن یہ ایک محض رسمی تکلف ہے اور اتنی ستھری اور صحت بخش خوراک اور خوش اخلاقی کے صلے میں کچھ بھی نہیں۔

ان اچھے لوگوں نے ہمیں یہ محسوس کرایا جیسے ہم کوئی شہزادے ہوں اور ہماری آمد اس ہوٹل کے ہر فرد کے لئے ایک بڑی اور طرفہ عزت افزائی کی موجب ہو۔ انھوں نے ہمیں بٹھا کر آفتابے اور چلمچی سے ہمارے ہاتھ دھلائے (یہ چیز کو پنجاب میں ڈھونڈنا ناممکن ہوگی)، ایک بوڑھا کھلے چہرہ والا شخص ——— وہ شاید صاحب خانہ تھا ——— خود ہی ہمیں ان چیزوں کی تفصیل بتانے آیا جو اس وقت تیار تھیں۔ کھانا جس وقت آیا سادہ اور مزے کا تھا۔ بڑے خمیری نان اور گوشت ——— یہ صحت بخش تھا اور تمہارے پنجاب کے ہوٹلوں کے کھانے کی طرح مسالے اور بناسپتی کی خوفناک لیپ نہیں تھا۔ خمیری نان سے زیادہ اچھی، زیادہ ایماندار روٹی دنیا بھر میں نہیں ہے۔

اور ان کا یہ سلوک صرف ہمیں سے نہیں تھا، بلکہ ہر غریب سے غریب مسافر جو اس دسترخوان پر بیٹھا تھا، ان کے لئے ایک ممتاز اور قابل قدر مہمان تھا۔ ایک مسافر کو میں نے دیکھا ——— پھٹا رومال بدحال جوان ——— وہ بڑا ہی غریب ہوگا کیونکہ وہ ایک روٹی کو کاغذ میں لپیٹ کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالے ہوئے تھا۔ اس نے میز پر بیٹھ کر اپنی روٹی کو کھولا اور سالن کی بجائے ملازم کو چائے کی صرف ایک پیالی لانے کے لئے کہا۔ مجھ کو اس پر تعجب نہ ہوا کیونکہ ان لوگوں میں افلاس عام ہے۔ اس جوان سے اس کی تنگدستی کی وجہ سے کسی نے تحقیر کا سلوک نہ کیا۔

اگر کسی کے ساتھ دوسرے مسافروں سے زیادہ لحاظ اور خاطر برتی گئی تو وہ لاری کا ڈرائیور تھا۔ یہ شخص بلاشبہ ہم سب عام مسافروں سے کہیں زیادہ معزز اور باوقار تھا اور ان عنایات اور مراعات کا ہر طرح مستحق جو ہوٹل والے اس پر نچھاور کر رہے تھے۔ اپنی بڑی بھوری مونچھوں اور تیکھے سرخ چہرے کے ساتھ وہ ایک شاندار مرد تھا ۔۔۔ اپنے جوتوں سمیت کوئی چھ فیٹ کا، تیر سا سیدھا، چوڑے مضبوط کندھوں کے ساتھ! البتہ اس قدر بہتر سلوک کی اصل وجہ اس کی یہ مرعوب کن شخصیت نہ تھی۔ اس سے ایک خاص مہمان کا سا سلوک اس لئے کیا گیا کہ وہ اس ہوٹل کے لئے گاہک لاتا تھا۔ اس کی خوشامد اور رضا جوئی ان لوگوں کے لئے ضروری تھی کیونکہ لاری کا ناخدا ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی لاری کو کچھ آگے اگلے ہوٹل کے سامنے بھی تو ٹھہرا سکتا تھا پھر سب مسافر اس ہوٹل میں جاتے اور ان لوگوں کا بزنس بالکل سونا ہو جاتا ۔۔۔ اس ڈرائیور کو ہوٹل کے کمرے میں ایک الگ میز پر کھانا کھلایا گیا۔ کون سے خاص کھانے اس کے سامنے چنے گئے ۔۔۔ میں نہیں بتا سکتا۔ ہاں میں نے ایک تازہ چاندی کے نیچے کا حقہ (شاید صاحب خانہ کا اپنا) اس بڑے آدمی کے لئے اندر جاتا دیکھا۔

کھانے کے بعد دو آدمیوں نے ہم سب کے ہاتھ چلمچی میں دھلائے۔ بڑی میٹھی چائے کے پیالے سرو کئے گئے۔ اور ہم ایک لذیذ کاہلی کے احساس سے سگرٹ پینے لگے ۔۔۔ اب ہوٹل کا گراموفون مہمانوں کی تفریح اور دل جوئی کے لئے بجنے لگا۔ یہ تو ایک مانی ہوئی بات ہے کہ موسیقی ہاضمے میں مددگار ہوتی ہے۔ گو یہ موسیقی سے زیادہ جھنجھناتا ہوا خوش آئند شور تھا۔ ایک ریکارڈ کا گانا مجھے یاد ہے ۔۔۔ اس کی لے عرصے سے میری جیتی ہے ۔۔۔ "ایلو۔ میں ہاری بالم!" ۔۔۔ اس جانی پہچانی پیاری لے کو اتنی دور یاغستان میں سننا ایک نادر مسرت تھی۔

ہمارے ساتھ ایک کھچڑی لمبی داڑھی اور کھلانڈرے سے تیز چہرے والا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی ٹمٹماتی آنکھوں میں عمر کی شفقت اور خوش طبعی آگئی تھی (جوانی میں وہ مختلف ہوگا) وہ ایک شگفتہ مزاج اور خوش صحبت بوڑھا آدمی تھا۔ ہم جلد ہی گفتگو میں مشغول ہوگئے۔ وہ چٹکلوں کی پوٹ تھا اور سوات کے متعلق ہر قسم کی دلچسپ اور عجیب معلومات کا خزینہ۔ بلاشبہ اسے ان لوگوں میں ایک دینی عالم ہونے کی سند حاصل تھی (یہ ہمیں بعد میں پتہ چلا) مگر اس کے شاداں قہقہے اور اس کے کسی قدر ہلکے مزاح کی حس ثابت کرتے تھے کہ وہ نرا زاہد خشک نہیں تھا ۔۔۔ اپنے زمانے میں بوڑھے آدمی نے زندگی کے سب ذائقے چکھے تھے۔

اس نے ہم سے پوچھا کہ آیا ہم اس ملک میں بیوپار کے لئے جا رہے تھے اور آیا یہاں ہماری یہ پہلی آمد تھی۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بیوپاری نہ تھے اور صرف سوات دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ اس پر وہ کچھ حیران معلوم ہونے لگا اور پھر اس نے ہمیں ایسی مشفقانہ شرارت آمیز نظروں سے دیکھا کہ ہم دوست بن گئے۔

سوات بڑا اچھا ملک ہے۔ بوڑھے آدمی نے کہا "اس کی وادی بڑی زرخیز ہے اور لوگ خوشحال اور پرامن اور شگفتہ ہیں۔ اب ہر گاؤں میں ایک مڈل سکول ہے۔ چوری اور قتل کا نام نہیں۔ بادشاہ صاحب کا زمانہ نہ ہوتا تو تم اس طرح ادھر نہ آسکتے۔ راستہ میں تم قتل ہو جاتے۔ بادشاہ صاحب کے زمانے سے پہلے لوگ بڑے خراب تھے۔ قتل ایک کھیل تھا۔ کسی کا جان، مال یا عزت محفوظ نہ تھے۔ بادشاہ صاحب نے آکر یہاں انصاف اور قانون بحال کیا۔"

"بادشاہ صاحب اب بہت بوڑھا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"بوڑھا آدمی کڑکڑاتا ہوا ہنسا "بادشاہ صاحب اب پچاسی برس کا ہے مگر بوڑھا؟ وہ کئی جوانوں سے اب بھی اچھا ہے۔ اس کی صحت رشک کے قابل ہے۔ اس عمر میں وہ ہر صبح روزانہ پانچ میل پہاڑ پر چڑھتا ہے۔ بعض وقت وہ اپنے افسروں کو اپنے ساتھ ان سیروں پر لے جاتا ہے۔ جس افسر کا چڑھتے ہوئے دم پھول جائے یا جو تھک جائے اس کی شامت آجاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ اس کو نوکری سے بھی برطرف کر دیتا ہے۔"

"کیا یہ بے جا سختی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ بادشاہ صاحب کہتا ہے کہ آرام طلب اور موٹا آدمی ماسوا اپنے دسترخوان کے بیکار ہوتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔"

دوسروں کے لئے مصیبت برداشت کر سکتا ہے۔ بادشاہ صاحب ایسے افسروں سے نفرت کرتا ہے:

ہمیں بادشاہ صاحب کی زیرکی اور اچھی سمجھ کی داد دینا پڑی۔ ایک آدمی جو اونچے پہاڑ پر چڑھنے کا دم رکھتا ہے یقیناً ایک صالح اور تندرست جسم کا مالک ہوگا۔ صالح جسم کا مطلب ہے صالح دماغ اور مطمئن ضمیر۔ پہاڑوں سے محبت کرنے والا شخص ظالم اور غاصب نہیں ہو سکتا اور بڑھے والی کا یہ اپنے افسروں کی اہلیت یا نااہلی کے امتحان کا طریقہ بڑی عمدگی سے سارے ملک میں رائج کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے مدبروں، ریاست دانوں اور بڑے عہدیداروں میں سے کتنے ہیں جنہیں پہاڑوں سے محبت ہے۔ ان میں سے کتنے ہیں جو کبھی کسی پہاڑ پر چڑھے ہیں؟ پھر کوئی تعجب کہ ان کے جسم اور دماغ اس قدر بیمار ہیں۔

باٹاخیل کی اس مہمان سرائے میں (ہوٹل کا نام ایسی صحت بخش جگہ کے لئے نہیں جچتا) ہم ایک گھنٹے تک سستاتے رہے۔ زندہ دل بڈھے سے خوشگوار باتیں کرتے ہوئے اور ریڈیو میں باری باری کو بار بار سنتے ہوئے۔ سرائے میں لے دے کے چار پانچ ریکارڈ تھے۔ وہاں ہم نے کچھ عرصے کے لئے سچی طمانیت محسوس کی۔ اس نعمت کو ڈھونڈ لینا اتنا مشکل نہیں جتنا ہر کوئی سمجھتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم اسے غلط جگہوں میں تلاش کرتے ہیں۔۔۔ بڑے اچھے سجے ہوئے مکانوں میں یا کسی بڑے ہوٹل کے لاؤنج میں۔۔۔ سچی طمانیت مل سکتی تو ایسی سراؤں میں جیسی باٹاخیل کی سرائے تھی۔ یا پھر ایک خانہ بدوش کے کلبے میں۔

اس اچھی سرائے سے جاتے ہوئے ہم نے وہاں کے لڑکوں اور خدمتگاروں میں چاندی کے سکے تقسیم کئے۔۔۔ شکرانے کے طور پر۔

قلعوں کی سرزمین

باٹاخیل سے چند میل آگے تک میٹلڈ روڈ اوپر چڑھتی ہے اور پھر ایک اور وادی میں اترتی ہے جسے "ارمغانِ سوات" کا قابلِ قدر مصنف اپر سوات کی وادی کا نام دیتا ہے۔ اس بستی اور اس کی کتاب کے بارے میں آگے اپنی من سب جگہ پر کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں وادیاں کے ضمن میں یہ درج کیا ہے: ریاست سوات میں دو وادیاں ہیں (۱) اپر سوات کی وادی (۲) لوئر سوات کی وادی۔ (ممکن ہے یہ نئی وادی اپر سوات کی وادی ہی ہو)

اس وادی میں اترتے ہوئے میٹلڈ سڑک یکلخت ختم ہو جاتی ہے اور ایک عام روڑی کوٹی ہوئی پختہ سڑک میٹلڈ روڈ سے قدرے تنگ مگر اچھی حالت میں اس کی جگہ لے لیتی ہے۔۔۔ ایک میدان، جو تقریباً ہموار تھا اور جس کے حاشیوں پر بید مجنوں کے درخت تھے۔ ہمارے بائیں کو وادی ایک زرخیز ٹکڑا سبز بہشت تھی اور درخشاں دھند پرے پہاڑوں کے فاصلے کو طویل کرتی تھی۔ صنوبر، دیودار اور چنار، اور کہیں کہیں ننھے چشموں میں بہار کے اجلے اجلے پیراہن اوڑھے وادی میں اور پہاڑ کی ڈھلانوں پر نمودار ہوتے لگتے تھے اور بے مثال کہانی کے لئے اور بے بھول آنکھوں کے لئے ایک نادر مسرت تھے۔ ایچ کیوری جھیل دیکھنے کا بیحد مشتاق تھا اور بڑی مدت تک ہم نے جھیل نہ دیکھی۔ یہ جھیل پانچ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر اگتا ہے۔۔۔ پھر ایچ کیوری نے اپنا جھیل دیکھ لیا۔ اکیلے محل میں یہ ایک اونچی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا تھا۔ ایچ کیوری نے بڑی خوشی اور فخر سے اس کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ دریائے سوات اپنے جنگلی پھولوں اور زمردیں دوب کے بستر میں ایک بلوریں فیتہ تھا۔

تقریباً یہیں ہم نے دور شمال کے پہاڑوں پر برف چمکتی دیکھی۔ بوڑھے سرفراز گل نے ہمیں بتایا کہ یہ پہاڑ ننگا ہنگار کہلاتا ہے۔۔۔ بے شک ایک پہاڑ کے لئے یہ ایک عجیب نام ہے مگر اس کے پیچھے ایک روایت ضرور ہوگی۔ اس انکشاف نے ایچ کیوری کو قدرے مایوس کر دیا۔ اس نے ایک بے لگام رومانک تخیل سے کام لے کر امید ظاہر کی تھی کہ یہ ننگا پربت کی برفیں ہیں۔۔۔ وہ قاتل پہاڑ جس پر جرمن بوہل چڑھا تھا اور جہاں عجیب عجیب آوازوں نے اسے اندھیرے میں پکارا تھا اور جس پر سے وہ گرتا پڑتا اور نیم پاگل اپنے دوستوں کے پاس لوٹا تھا۔۔۔ بعض لوگوں پر چاند کا سایہ پڑ جاتا ہے۔ ایچ کیوری کے لئے

برف بھی کچھ اسی قسم کا اثر کرتی ہے۔ وہ اتنا مضطرب تھا اور اتنی دفعہ برف پوش پہاڑیوں کی طرف وجد کی حالت میں اشارے کرتا تھا کہ بوڑھے آدمی نے سچ مچ اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ پاگل ہو۔

بڈھا سرفراز گل ہم سے پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا چٹکلے بیان کرتا تھا اور مذاق کرتا تھا۔ اس کی زبان کبھی نہیں رکتی تھی۔ کوئی انوکھی اور نئی چیز آتی تھی تو وہ ہمیں اس کے متعلق بتاتا۔ وادی کا آدمی ہونے کی وجہ سے وہ اس کے چپے چپے کو جانتا تھا اور چونکہ وہ ایک دنیادار عالم بھی تھا اس لئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں وہ احساسات دوسروں تک منتقل کر سکتا تھا۔

بعض وقت دریا پلٹتا اور عین سڑک کی بغل میں آجاتا۔ کیسا عجیب دریا، بلور بھی اس سے زیادہ صاف اور شفاف نہ تھا۔ ایک ایسی جگہ میں نے ایک خوبصورت پہاڑی عورت کو مشکیزوں کی بنی ہوئی ڈونگی میں کھڑے دیکھا۔ سورج کا سونا اس کے بالوں اور آنکھوں میں تھا اور وہ ایک لمبے بانس سے ڈونگی کو پیرا کر دریا کے دوسرے کنارے پر جا رہی تھی۔ یہ تصویر میرے ذہن میں محفوظ ہے اور لاتعداد دوسری تصویریں — خانہ بدوشوں کے قافلے اپنے گدھوں اور خچروں پر گذرتے ہوئے — ایک گاؤں میں چند بچے ایک آڑے تختے کے سروں پر بیٹھ کر جھولتے ہوئے — وہ دنیا کی ہر جگہ کے بچوں کی طرح تھے۔ غور کرنے والے دماغ کے لئے ایک ملک کے انسانوں اور دوسرے ملک کے انسانوں کی بنیادی خواہشات اور امنگوں میں چنداں فرق نہیں۔ تبت کے ایک بچے کو مغرب کے مہذب ترین ملک میں لے جاؤ تو وہ مشکل ہی سے وہاں اجنبیت محسوس کرے گا۔ وہ وہاں کے بچوں سے اس طرح گھل مل جائے گا جیسے وہ اس کے اپنے گاؤں کے دوست ہوں۔ انسان جب بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر نہ جانے انھیں کیا ہو جاتا ہے؟

ہم ایک چٹان پر تختوں میں بنے ہوئے پتھریلے قصبے کے بیچوں بیچ گذرے۔ حاجی سرفراز گل نے سوٹ اور سواتی ٹوپی میں ایک لمبے گٹھے جسم کے شخص کی طرف ہمیں متوجہ کیا۔ وہ اپنے معمولی مکان کے چھوٹے پھاٹک کے باہر گلی میں کھڑا تھا۔ "یہ" اس نے بتایا "والی کے ضلع کے حاکموں میں سے ہے — ایک عہدیدار جو ہمارے ہاں کے ڈپٹی کمشنر کے برابر تھا۔ سرفراز گل کو یا تو پتہ نہ تھا یا حب الوطنی کی وجہ سے وہ بتانا نہ چاہتا تھا مگر جب ہم نے اس سے ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنے چوڑے کندھے ہلا دیئے۔

اس سارے عرصے میں ہم شمالی یا شمال مشرقی سمت میں سفر کرتے رہے۔ اب ہم نے ایک چکر کاٹا اور ایک اور وادی میں داخل ہوئے۔ چٹان اب ہمارے بائیں کو تھی، وادی دائیں کو اور ہم جانے بغیر ۱۸۰ درجے کے زاویے میں سے گھوم گئے تھے (ایک تجربہ جو پہاڑی سفر میں کافی عام ہے) اور سیدھے جنوب کو جا رہے تھے — دریا اب ایک بل کھاتے ہوئے سیمیں اژدہے کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ لہراتا جاتا تھا — کبھی پلٹ کر آتا ہوا کبھی ہٹ کر بہتا ہوا اور کبھی مست خرام اور کبھی اس کے ایک بازو کا پانی دوسرے میں دھارے سے جڑ ہوا بہتا تھا۔ یہ ایک شاداں وادی میں شاداں دریا تھا پھر ہم رک گئے۔ سامنے ایک پھاٹک تھا۔ ہم سوائی محصول کی چوکی پر تھے۔ ہم نے اتر کر ایک چھوٹی چائے کی دوکان میں چائے پی اور سنہری سہ پہر میں وادی کے جادو کا نظارہ کیا۔ ہم تعجب کرتے رہے کہ کوئی دوسری جگہ بھی اتنی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ چوکی کے محصولئے ہماری لاری کی چھت پر چڑھ کر اسباب کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ بیشتر مسافروں کو اپنے ٹرنک یا بستر کھول کر معائنہ کرانا پڑا مگر انھوں نے ہم سے کچھ پوچھ گچھ نہ کی — سامنے پھاٹک کے پاس تین سائن بورڈ تھے — سیدو کے ہوٹلوں کے اشتہار — ایک بس سیدو کی سمت سے آئی اور پھاٹک کی پرلی طرف رک گئی۔ اس کے مسافر باہر نکلے۔ ان میں ایک اٹھارہ سالہ امریکن لڑکا تھا — چکنے خاکی میں ایک قدرے پھیلا پھولا ہوا لڑکا — تیز بین شیشوں کی عینک لگائے اور کندھوں سے ایک کیمرہ لٹکائے — اس کے ساتھ اس کا ایک پاکستانی ہم عمر دوست تھا اپنے انداز میں کسی قدر چھریلا اور دھان پان۔ وہ چائے کی دوکان پر آئے۔ امریکن لڑکا پاس پڑی کھاٹ پر لیٹ گیا۔ اس کا دوست کہیں سے بوڑھے سرفراز گل کو پکڑ کر

سے آیا۔ بوڑھا لڑکے کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھ گیا اور وہ آپس میں فارسی میں باتیں کرنے لگے۔

بعد میں جب ہم اپنی لاری میں سوار ہوئے تو سرفراز گل نے ہمیں بتایا کہ لڑکا امریکی تھا اور اکیلا بخارا سے آ رہا تھا۔ وہ فارسی اپنی مادری زبان کی طرح بولتا تھا۔

یہ امریکی لڑکا کون تھا؟ ہم نے تعجب کیا۔ وہ بخارا سے کیوں آ رہا تھا؟ وہ بخارا کیوں گیا تھا؟ کیا وہ امریکی جاسوس تھا؟ یا کیا وہ مانس اور سفر کی تلاش میں ہم سا آوارہ گرد؟ جو کوئی بھی ہو، وہ تھا بہرحال ایک لڑکا جو بخارا سے آ رہا ہو۔ اس سے زیادہ قابلِ رشک اور کون ہو سکتا ہے؟ وہ اپنے کئی ہم عمروں سے کتنا خوش قسمت تھا جو کلاس روموں میں خشک لیکچر سن رہے ہوں گے یا کسی فیکٹری میں کوئی پرزہ ڈھالنے میں لگے ہوں گے۔

چونگی سے گزر کر سڑک پر وادی کے گرد وسیع درانتی کے سے نیم دائرے میں گھومی اور جب ہم نیم دائرے کے دوسرے سرے پر پہنچے تو وادی ہمارے بائیں کو تھی اور ہم شمالی سمت کو جا رہے تھے۔ سب مسافروں کے لئے شمالی سمت اصل سمت ہے۔ دوسری سمتیں مسافروں کے لئے نہیں بلکہ دکیلوں بیوپاریوں اور کارخانوں کے مالکوں کے لئے ہیں (میں جانتا ہوں یہ محض بکواس ہے تاہم اس میں کافی صداقت کی رمق ہے)

ہم ایک گاؤں کے پاس سے گزرے۔ یہاں ایک سبزہ زار میں ایک چھوٹا سا قلعہ ایستادہ تھا۔ یہ ایک دوستانہ چھوٹا قلعہ تھا ——— شکل میں ایک کعب ——— اس کی دندانے دار فصیل کے چاروں کونوں پر برج تھے۔ برج شطرنج کے رخ تھے۔ پتھریلی دیواروں کی چنائی تھموں میں ہوئی تھی۔ لکڑی کی کھپیاں تھموں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں اور یہ سب کچھ سنہری بید کاری کا تاثر دیتا تھا ——— سرفراز گل نے بتایا کہ یہ "تھانہ" ہے۔ اب ایک تھانے سے اس کا مطلب پولیس اسٹیشن سے تھا یا فوجی چوکی سے یا محض غلہ جمع کرنے کی جگہ سے ——— ہمیں معلوم نہ ہو سکا ——— ہر نئے گاؤں میں یہ برج نما قلعہ موجود تھا۔ یہ ہمیں پتہ لگا۔ ایک طرح سے سوات کا قومی نشان ہے جس طرح شیر ببر اہلِ انگلستان کا اور جھپٹتا ہوا عقاب المانیہ کا۔

سڑک کے ساتھ ساتھ صنوبروں اور لمبے سروں کی چار دیواری میں محفوظ لوکاٹ اور اخروٹ اور سیب کے باغات تھے ——— اور دور دور تک پوست کے خرم سپید پھول ہوا میں ناچتے تھے۔ میں نے سرفراز گل سے پوچھا "تمہارے ملک میں لوگ پوست تو بہت پیتے ہوں گے؟"

اس کی آنکھیں تمتائیں "یہ خدا کا تحفہ ہے۔ لوگ پیتے نہیں۔ بس کاشت کرتے ہیں؟"

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ پوست کے ملک کے لوگ پوست کے ذائقے اور نشے سے محروم رہیں یہ ایسا ہی ہے جیسے انگوروں کے ملک میں لوگ انگوروں کی شراب کشید نہ کریں۔ آدمی کی زندگی میں ایسی منزلیں آتی ہیں جب نشیلی چیزیں ضروری ہوتی ہیں اس کے پاس زندگی کی تلخی کے مداوے کے لئے کچھ تو ہونا چاہیئے۔ وہ لوگ جو نفع نقصان کی دنیا میں رہتے ہیں نشیلی چیزوں کو مطعون کرتے ہیں کہ یہ صحت اور روپے کو برباد کرتی ہیں اور مذہب اور اخلاق کے خلاف ہیں ——— درست ——— مگر یہ آدمی کو ذہنی طور پر دیوتاؤں کے ساتھ اولمپیا پر بھی بٹھا دیتی ہیں ——— اسے لافانی خواب دیکھنے کی قوت عطا کرتی ہیں اور خدائی کا ایک لمحہ پچھتر سال کی باعزت بے حصول خود غرضانہ زندگی سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے ——— اور کہیں زیادہ طویل۔

حاجی سرفراز گل سیدو سے ایک دو میل اِدھر ایک مسافرخانے کے سامنے اترا "میں یہاں اتر جاؤں گا" اس نے کہا "میرا دل تو چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ چل کر تمہیں سیدو کی سیر کراتا لیکن میرا کام ضروری ہے"

ہمیں اس کے جانے کا افسوس ہوا۔ وہ ایک بے مثال بوڑھا آدمی تھا ——— ان خوش باش بوڑھوں میں سے ایک جو زندگی کی شام میں ڈھلان سے نیچے اترتے ہوئے اپنے دل کی استقامت نہیں کھوتے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے۔ وہ زیادہ رسیلے اور روادار ہو جاتے ہیں۔

شہرِ طلسمات

نیلی آنکھوں والے ایک خوش شکل، خوش اعضا نوجوان نے جس کے سرخ تیکھے چہرے میں دن کی تاب اور پہاڑوں کی شادمانی تھی، میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ایسا نوجوان تم میدانوں میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔

"یہ" اس نے کہا "سیدو شریف ہے ـــ والی صاحب ادھر رہتا ہے" اور اس نے بائیں طرف پہاڑی پر بنے ہوئے ایک شہر کی طرف اشارہ کیا۔ ڈھلتی ہوئی سہ پہر میں سیدو واقعی خوشنما لگتا تھا ـــ اور جدید ـــ ایک کوہستانی قصبہ نہیں، جیسا کہ ہم امید کر رہے تھے۔ رنگین روشنی میں بنگلے اور حویلیاں ایک اونچی پہاڑی کے گرد اکٹھی ہو رہی تھیں۔ ایک نیلی دھند سی شہر کے اوپر معلق تھی اور سیدو کہانیوں کی کتاب کا شہر لگتا تھا۔

یکلخت سڑک ہموار ہو گئی اور چوڑی بھی۔ بجلی کے پول سڑک پر نمودار ہونے لگے۔ ہم ایک چوڑے گلابی پینٹ کی دوکان کے بازار میں سے گذر رہے تھے۔ چوک پر ملیشیا میں ایک پولیس مین بجلی کے پول کے، دور تنی ہوئی چھتری کے نیچے کھڑا تھا۔ مستعدی سے اس نے ہمیں ہاتھ دیا۔ ہم آگے گذر گئے اور لاری کے اڈے پر جا رکے۔

خوش شکل پٹھان نے کہا "یہ منگورہ ہے۔ نہیں بس سیدو نہیں جاتی تم سیدو سیر کے لئے جا سکتا ہے، وہاں تانگہ جاتا ہے۔ تم ٹھہرے گا منگورا ہی میں سیدو میں ہوٹل نہیں ہے۔"

ہمارے اترتے ہی گویا منگورا کے سارے نفیر چھوکروں نے ہم اور ہمارے سامان پر ہلہ بول دیا۔ یہ وہی جو ہرآباد کا قصہ پھر دہرایا گیا۔ اور اس سے پیشتر کہ ہم جانتے کہ ہم کہاں تھے، ایچی کیورس اور میں کوئی بیس مزدور لونڈوں کی ہمراہی میں سڑک کے بیچ مارچ کر رہے تھے ـــ اور سارے بازار کے لئے ہنسی کا نشانہ ـــ میں نے ایچی کیورس کو اتنے مزدوروں کو اجرت دینے کی حقیقت سے بیکار آگاہ کیا۔ میں نے اسے ان لونڈوں پر نگاہ رکھنے کے لئے بیکار بار بار کہا۔ وہ ہمارے سامان کے ساتھ غائب ہونے کے اہل تھے۔ ایچی کیورس محض مسکرایا۔ وہ نفیر چھوکروں سے محبت کرنے کے موڈ میں تھا۔

ان بچوں کا سرغنہ ایک چالاک چھٹا ہوا لڑکا تھا۔ وہ ہمیں گلی کے آخر میں ایک محراب دار پھاٹک کے ہوٹل میں لے گیا۔ یہ جگہ ہوٹل سے زیادہ ایک بھٹیار خانہ تھی مگر چالاک لڑکے نے مجھے یقین دلایا کہ اس سے بہتر رہائش اور کہیں ناہمیں منگورا میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ ایچی کیورس سامنے کے ہوٹل کو دیکھنے چلا گیا تھا جو دو منزلہ تھا اور ایک چھوٹی سڑک کے اوپر دیکھنے والی بالکنی رکھتا تھا۔ موٹے چالاک لڑکے نے میرے احتجاجوں کے باوجود ہمارا سامان اس بھٹیار خانے کے ایک کمرے میں اٹھوا دیا۔ یہ کمرہ بڑا اور نہایت غلیظ تھا۔

"ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے۔" میں نے مزدور لڑکوں کو حکم دیا کہ سامان اٹھا کر سامنے کے ہوٹل میں لے چلیں۔ سامنے کے ہوٹل کا نام نشاط ہوٹل تھا۔

چالاک لڑکے نے شور مچانا شروع کر دیا "وہ نشاط ہوٹل والا چور ہے۔ اُدھر پانچ روپیہ روز کرایہ لیتا ہے۔ اِدھر کل ڈیڑھ روپیہ۔ دیکھو اچھا کمرہ ہے۔"

"ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے۔" میں نے غصے میں کہا اور سامان اٹھوا کر باہر سڑک پر نکل آیا۔ ایچی کیورس نشاط ہوٹل کی بالکنی میں ایک شریر مطمئن گوریلے کی طرح کھڑا مجھے اوپر بلا رہا تھا۔ مایوس اور گستاخ لڑکا اپنے ہوٹل کے باہر آکر چلا رہا تھا "بابو! وہ ہوٹل گندہ ہے۔ وہ چور ہے۔"

میں ہوٹل میں داخل ہوا۔ ڈائننگ روم صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ اس میں پتھر کی میزیں تھیں۔ کاؤنٹر پر ایک چھوٹا سا شخص کھڑا تھا ـــ اتنا معصوم کہ وہ مجھے ایک نورانی فرشتہ معلوم ہوا۔ اس نے دلآویز مسکراہٹ سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پشتو میں میری خیریت پوچھی اور مجھے سیڑھیوں کی راہ دکھائی۔

بالکنی کے کمرے میں سامان رکھوانے کے بعد میں بالکنی میں آیا تو وہی موٹا چھوکرا چلانے لگا "ادھر ابو دال بھات ملے گا ادھر بھنا ہوا گوشت ہے"۔ میں نے چاہا کہ نیچے جا کر اس کی ٹھکائی کروں۔ لیکن بزدل آدمی ہوں۔ آخر اپی کیورس اور میں نے کمرے کا دروازہ ہی بند کر دیا۔

مجھ میں اس کا اقرار کرنے کی غالباً ضرورت نہیں (وہ بڑا ہی خود داری کا مادہ نہیں۔ اپی کیورس میں خوش قسمتی سے یہ شے بدرجہ اتم موجود ہے۔

ہمارے دروازے پر جا ہوٹل کے تھے کہ وہ دو چپٹی ناکوں والے مسٹنڈے لڑکے تھے بیر گل اور گل نواز نامی) جھگڑا دوڑ کا شروع کر دیا۔ ایسے معزز اور اہم مہمانوں نے، ایسا لگتا تھا، تناطا ہوٹل کو کبھی پہلے عزت نہ بخشی تھی۔ انھوں نے بلاشبہ ہوٹل کا سب سے اچھا کمرہ ہمیں دیا تھا۔ صرف اسی کمرے کے آگے بالکنی تھی) ہم نے بستر کھولے، سامان ٹھیک ٹھاک کیا۔ نہا دھو کر تازہ دم ہوئے۔ ہم نے اچھے کپڑے پہنے اور مہذب آدمیوں کی طرح محسوس کیا۔ چائے پینے کے بعد جب ہم سیدو کا چکر لگانے کے لیے نیچے آئے تو گہری نیلی شام پڑ چکی تھی اور بجلی کے لیمپ روشن تھے۔ ہم سیدو شریف جانے والی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ کسی بڑے جدید شہر کی سڑک سے کسی طرح کم نہ تھی —— بڑی چوڑی اور پوری طرح میل کی ہوئی اس کے دورویہ بید مجنوں اور صنوبر ایستادہ تھے اور جنگلی پھولوں کی خوشبو ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ آسمان تاریک مخمل تھا اور نکھرے ہوئے چمکدار تارے جھرمٹوں میں اوپر سیدو پر گر رہے تھے —— سیدو کی سب پبلک اور سٹیٹ عمارتیں اسی سڑک پر تھیں۔ شہد کی مکھیوں کا ایک فارم تھا۔ اس سے آگے بائیں کو اسٹیٹ کالج کی عمارت تھی —— حرف ب کی شکل کی جس کے سامنے کے کونوں پر سانپ کی چھتری کے پودے کی شکل کے دو برج تھے۔ وہ اس جھٹ پٹے میں ایک عجیب پراسرار تاثر دیتے تھے۔ سڑک آگے بتدریج بڑھتی گئی۔ سٹیٹ ہسپتال اور سوات ہوٹل کی عمارتیں آئیں۔ اندھیرے میں ہم عمارتوں کو اچھی طرح ابھار نہ پاتے اور کھڑے ہو کر ان کے نام کے بورڈوں کو پڑھنے کی کوشش کرتے۔ ہم اسی طرح چلتے چلتے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے سڑک دو شاخوں میں بٹ جاتی تھی۔ بجلی کے پول کے نیچے اس نقطے پر ایک راہ نما تختہ تھا —— اور یہ قائمہ بناتے ہوئے دو بازوؤں کے ساتھ ایک بازو پر لکھا تھا "ولیعہد صاحب"۔ دوسرے پر "والی صاحب"۔ اس سے ہم خوب محظوظ ہوئے۔ گلیوں اور سڑکوں کے نام دینے کی بجائے فنگر پوسٹ پر ان ہستیوں کے نام دینا جو غالباً ان سمتوں میں رہتی تھیں ایک عجیب اور غیر معمولی اختراع تھی —— والی صاحب اور ولیعہد صاحب دونوں معزز ہستیاں شہر کے دو متقابل سروں پر فروکش تھیں۔

"اب فیصلہ کرو" میں نے اپی کیورس سے پوچھا "ولیعہد صاحب یا والی صاحب"۔

"ولیعہد صاحب" اپی کیورس نے جھٹ جواب دیا جیسے کہ اس کے بارے میں کوئی شک نہ ہو سکتا تھا۔

اور ہم ولیعہد صاحب کی سڑک پر ہو لیے۔ مخملی اندھیرے میں یہ جادو کی سڑک تھی اور یہ کسی طرح ہمیں سیدو شریف کی خوش کن پیچدار گلیوں میں لے گئی۔ شہر الجیریا "قصبہ" کی طرح گلیوں اور کوچوں کا جنتر منتر ہے —— گلیاں جو نیچے اترتی ہوئی سیڑھیاں ہیں اور زمین کی انتڑیوں میں جاتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور پھر اچانک پراسرار الاؤں کے پاس آ نکلتی ہیں —— سیدو شریف کا مزار ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ سب کوچے آخر کار یہیں مزار پر پہنچتے ہیں۔ تم کوئی بھی گلی پکڑو، گھوم پھر کر تم مزار پر پہنچ گئے۔ یہ ایک بڑی عمارت ہے دیکھنے کے قابل۔ اس کا ایک عیب یہ ہے کہ یہ فقیر جھونپڑوں سے پٹی ہوئی ہے —— اپی کیورس اور میں جوتیاں ہاتھ میں پکڑے اس کے ٹھنڈے صحنوں میں گھومتے رہے۔ فقیر بچوں کی فوج ہمارے جلو میں تھی ہم ایک جھروکے دار دریچے دالان میں گئے۔ جہاں مزار ایک قیمتی غلاف میں منڈھا ہوا تھا۔ ایک سیاہ داڑھی والا آدمی دوزانو بیٹھا گڑگڑاتے لہجے میں پیر سے کوئی منت مانگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عیاری تھی۔ کسی قدر [illegible] کی جھلک اور اس کا چہرہ ایک ایماندار چہرہ نہ تھا —— تم ان لوگوں کو جانتے ہوگے جن کے دل مذہب کی سچی روح سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ جو اپنے ہمسائے کی حالت کا خیال نہیں کرتے۔ اگر اس سے ان کا کچھ فائدہ ہو۔ ایسے لوگ اکثر پیروں سے فیض حاصل کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ فیض سے ان کی مراد دولت کی فراوانی ہوتی ہے۔ وہ اگر انھیں ایک پیر کے دربار سے فیض

نہیں ملتا تو وہ دوسرے پیر کے دربار پر جائیں گے اور فیض پانے کے لئے کڑی سے کڑی شب بیداریاں اور چلہ کشیاں کریں گے — مزار کے پاس ہی ایک وسیع ایوان میں مسجد ہے۔ بڑے فانوس چھت سے لٹک رہے تھے۔ مزار سے باہر ہم نے حاتم طائی بن کر جود و سخا کے دریا بہانے۔ میں نے ایک دوکان سے کیپسٹن کا پیکٹ خرید کر دس کے نوٹ کو چھوٹی ریزگاری میں تبدیل کر لیا تھا اور اب ہم نے اسے فقیر بچوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ ہم سیدو میں تھے اور اس مبارک سانحہ کی خوشیاں منانا چاہتے تھے۔ مگر یہ ہماری غلطی تھی۔ جلد ہی سیدو کے سارے گداگر بچے اور واپانچ ہمارے گرد جمع تھے۔ اتنی سی ریزگاری ان کے لئے کافی نہ ہو سکتی تھی۔ سو ہم وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ . . .

معطر اور مخملی رات میں ہم واپس ہوٹل میں آئے۔ پیر گل نے ہمیں کھانا کھلایا۔ تھکے ماندے تو ہم تھے ہم آتے ہی مثالی گھوڑے بیچ کر سوئے — اچھے اچھے خواب اپنے سروں میں لئے ہوئے۔ ٹھنڈی ہوا بالکنی میں سے اندر آرہی تھی اور تارے باہر کالی رات میں منگورہ اور سیدو پر دمک رہے تھے۔

خوازخیل

دوسرے دن (نو اپریل) چائے اور تلے ہوئے انڈوں کا ناشتہ کر چکنے کے بعد ہم نے پیر گل سے پوچھا "نورین اور بحرین کو لاری کتنے بجے جاتی ہے؟" پیر گل کی اردو پوری سوری تھی۔ جواب دینے سے پہلے اس نے سوچا۔ پھر اس نے کہا "نورین سے ایک لاری دس بجے جاتا ہے دوسرا پانچ بجے شام۔ دس بجے کا لاری پھر شام کو منگورہ سے واپس آجاتا ہے"۔

پیر گل 'سے' اور 'کو' کے فرق کے بارے میں پوری طرح واضح نہ تھا۔ وہ فقرے میں ایسی جگہ 'سے' استعمال کرتا، جہاں 'کو' زیادہ موزوں ہوتا۔ اس عادت سے اس کے فقرے اکثر اس کے مطلب سے بالکل اُلٹ مفہوم دینے لگتے اور سننے والے کے لئے ایک پرلطف الجھن کا سبب ہوتے۔ یہ جاننے میں ہمیں کچھ وقت لگا کہ 'نورین سے ایک لاری' سے اس کا مدعا نورین کو جانے والی لاری سے تھا —— وہ بعض دفعہ 'سے' کو ویسے ہی فقرے میں لے آتا جہاں وہ قطعاً غیر ضروری ہوتا۔

ہم نے اس سے پوچھا کہ "کیا مدین منگورہ سے اچھی جگہ ہے؟" —— ہمارا مطلب تھا قدرتی خوبصورتیوں کے معاملے میں۔ اس نے اس پر سنجیدگی سے غور کیا اور اپنے دل میں جواب مکمل کر کے کہا "مدین سے منگورہ کا بازار اچھا نہیں ہے۔"

بے چارہ چھوکرا! وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ مدین کا بازار منگورہ کے بازار سے اچھا نہیں ہے۔ مگر 'سے' کے بے جا استعمال نے اس کے فقرے کو بالکل مختلف معنی دے دیئے اور اس کے جواب کو معما بنا دیا۔

"تمہارا مطلب ہے مدین کا بازار اچھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مدین کا بازار اچھا نہیں ہے۔ منگورہ کا بازار بہت اچھا ہے۔" اس نے وضاحت سے کہا۔

مگر یہ وہ نہ تھا جو ہم جاننا چاہتے تھے یعنی یہ کہ مدین کے پہاڑی نظارے منگورہ سے زیادہ پر شوکت ہیں یا نہیں۔ ان باتوں کے متعلق لڑکا بھلا کیا سمجھ سکتا، اس نے کبھی ان جگہوں کے اس پہلو کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ ایک جگہ اچھی تھی اگر اس کا بازار اچھا تھا۔ اتنی اچھی نہیں، اگر اس کا بازار چھوٹا تھا۔ قدرت کی رنگینیوں کو اس میں دخل نہ تھا۔ آدمی سوچتا تھا کہ کیا کبھی اس لڑکے کا دل ایک جنگلی گلاب کو دیکھ کر اچھلا ہے؟ شاید نہیں۔ وہ ہمیں پتہ لگا مدین کے پاس کے ایک چھوٹے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا، لڑکا اپنی چھوٹی عمر میں ہی پہاڑ کی بے فکر آزادی کو چھوڑ کر ایک محنت دنیا میں مزدوری کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ جان اور روح کو اکتا دینے کی مستقل تگ و دو ایک لڑکے کو جھرنوں اور سبز پوش پہاڑیوں کی خوشبو دار فطرت کا

وقت نہیں دیتی۔ تاہم بیرگل کی بدقسمتی پر رحم کرنا اور اس بات کا ماتم کرنا کہ وہ کبھی غالب کی شاعری کے حسن سے متاثر نہ ہو سکے گا، یا یہ کہ شوبرٹ کے نغمے اس کی روح کو کبھی نہیں ہلائیں گے، بالکل فضول اور احمقانہ بات ہے۔ ایک اچھی زندگی گذارنے کے لئے آدمی کو ایک سادہ معصوم دل اور مضبوط صحت کی ضرورت ہے۔ تم غالب کا ایک لفظ جانے یا شوبرٹ کے نغموں کو سمجھے بغیر بھی خوبصورت زندگی گذار سکتے ہو اور ایک ریوڑ کا چرواہا ہونا، ایک روکھے چڑچڑے فلسفی ہونے سے کہیں بڑی خوش بختی ہے۔ غالب کی شاعری اور شوبرٹ کے نغمے ہی دنیا کا سارا حسن نہیں ہے اور اس کو سمجھنے کا اہل ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ تمہارا دل لطیف ہے یا تمہارا ضمیر صاف۔ ایک چرواہا اپنی بکریوں اور ریوڑ کے ساتھ اپنی پہاڑی ڈھلان پر گھنٹوں قدرت کے اسرار پر غور کرتا ہے۔ وہ گنگناتے ہوئے چشموں کے راگ سنتا ہے اور موسم کے بدلتے ہوئے چہرے اور موجیں دیکھتا ہے۔ وہ میز پر جھکے ہوئے تمہارے شاعر یا افسانہ نگار کے مقابلے میں چیزوں کے اصل جوہر سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ وہ چرواہا ان چیزوں کو نثر یا شعر میں بیان نہیں کر سکتا مگر تم اس کے لئے اس پر رحم کیوں کھاؤ؟ اُن کے نغمے کہے ہوئے نغموں سے کہیں میٹھے اور رسیلے ہوتے ہیں۔ ایک پہاڑی آدمی ایک نظارے کو دیکھ کر تم سے یہ نہیں کہے گا "یہ نیلی پہاڑی کتنی خوبصورت ہے" لیکن تم پہاڑی لوگوں کی آزادی اور شادمانی کو ان کی آنکھوں، ان کے سارے وجود میں دیکھو گے ــــ اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ ہم قدرتی نظاروں کا ذکر ضرورت سے زیادہ شعر اور نثر میں کرنے کے عادی ہیں۔ آرٹ زندگی کی ایک نامکمل مصنوعی تقلید ہے اور آرٹ کے حسن سے لطف اندوزی کی اہلیت بہت سے لوگوں میں بیتر یا بنگن کی ترکاری کی طرح ایک اکتسابی ذوق ہے۔ یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک آدمی میں خوبصورت ادبی چیزوں سے لطف اٹھانے کا ملکہ تو ہے مگر مصوری اور موسیقی کے لئے وہ اندھا اور بہرا ہے اور جب وہ دوسرے لوگوں کو بے خودی سے اور مست، کسی راگ پر سر دھنتے دیکھتا ہے تو اسے ان کی بے وقوفی پر جھلاہٹ ہوتی ہے۔ سننے والوں کو راگ وقت اور مکان کی حدود سے باہر لے جا رہا ہے اور ہمارا ادبی آدمی سوچتا ہے کہ آخر اس آ۔ آ۔ آ ــــ میں لوگوں کو کیا ملتا ہے؟

سو بیرگل کی زندگی پر رحم یا افسوس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ایک صحتمند گھا ہوا لڑکا تھا اپنی آپ خبر رکھ سکتا تھا اور اپنے ہوٹل میں (جو اس کا اسکول تھا) ہر قسم کے لوگوں کو دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کا موقع پا رہا تھا۔ یہ ایک تندرست دماغ کے لڑکے کے لئے بُری زندگی نہیں تھی۔

بیرگل سے مدین کی بس کے اڈے کا پتہ پوچھ کر ہم نیچے سڑک پر اُترے اور دھوپ میں نہاتے ہوئے بازار میں بتائی ہوئی سمت میں چلتے رہے۔ کچھ اوپر جا کر ہم ایک تراہے پر بائیں طرف مڑے۔ بنیر رنگت کی چوڑے فرنٹ کی دوکانیں ہماری دلچسپی کا مرکز تھیں۔ وہ پُر فریب مال سے بھری ہوئی تھیں ــــ طلے کے کام کی سواتی ٹوپیاں، جوتیاں اور رنگین موٹی دھاریوں کے پارچہ جات ــــ وحشی دور دراز پہاڑیوں میں یہ جدید شہر جس میں چوڑی میٹلڈ سڑکیں تھیں۔ ٹریفک پولیس مین اور بجلی کے پول اور ہوٹل تھے حقیقی نہ لگتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم نے اس سڑک پر یقین کرنا چھوڑ دیا۔ یہ طلسمات کا شہر تھا۔ جیسے کسی جن نے اپنے مالک شاہزادے کے حکم سے تہذیب کی ساری سہولتوں کے ساتھ ان پہاڑوں کے بیچ بنا دیا تھا۔ تھوڑی دیر اور ــ اور یہ شہر یہاں سے غائب ہو جائے گا ــــ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ٹریفک پولیس مین اور بجلی کے پول اور تاجر بھی۔ یہاں کے تاجر یقیناً طلسم کے کرشمے تھے ــــ حاجی سرفراز گل نے ہمیں بتایا تھا کہ سیدو ایک فوجی چھاؤنی ہے۔ ہم نے پر رونق بازار میں چست ملیشیا میں کئی جوان سپاہی دیکھے ــــ بعض کندھوں سے رائفلیں لٹکائے اور بے پروائی سے ٹہلتے ہوئے ــــ ابھی کیو ہیں سوات پر کوئی گائیڈ یا معلوماتی کتاب حاصل کرنے کا مشتاق تھا۔ ہم اسٹیشنری اور کتابوں کی ایک دوکان پر چڑھ گئے۔ پروپرائٹر کاؤنٹر کے پیچھے سے تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ نہیں اس کے پاس سوات کا نہ کوئی گائیڈ میپ تھا نہ کوئی کتاب۔ پھر اس نے ہمیں تھوڑی دیر کے لئے ٹھیرنے کو کہا۔ اپنے ایک جوان اسسٹنٹ کو پاس کی کتابوں کی ایک اور دوکان میں بھیجا۔ وہ گویا وہی کتاب لے کر آیا جس کی ہمیں ضرورت تھی۔ اس کا ٹائیٹل "ارمغانِ سوات" تھا اور یہ شیخ منظر حسین سی۔ پی۔ ایچ کی تصنیف تھی۔ اس میں چند فوٹوگراف بھی تھے۔ ہم نے اسے

خرید لیا۔ یہ ہمارا شیخ منظر حسین کی مشہور ہستی سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔ اس سے پہلے اس کا وجود نہ تھا۔ اب وہ نادر آب و تاب سے ایک واحد روشن سیارے کی طرح سوات کے ادبی اور علمی آکاش میں چمکنے لگا۔ ہم شیخ منظر حسین سے ملنا چاہتے تھے۔ ہم اسے کہاں مل سکتے ہیں؟ سی۔ پی۔ ایچ وہ کیسے تھا۔

مگر کتاب کو حاصل کر کے ہم وہاں سے بھاگے۔ وقت اب تھوڑا تھا۔ لاری دس بجے جاتی تھی۔ لیکن ایپی کیورس کی رائے تھی کہ ہمیں نشستوں کے متعلق مطمئن ہونے کی خاطر وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچنا چاہیئے۔ راستے میں ہم تین چار دوا فروشوں کی دوکانوں پر "وکس" کا پتہ کرنے کے لئے رکے۔ یہ دوکانیں انگریزی دواؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ بے شمار پیٹنٹ دواؤں کے ڈبے خوش اسلوبی سے الماریوں میں سجے تھے۔ "وکس" کے کئی پیکٹ ان میں مجھے نظر آئے لیکن دوکانداروں نے ہمیں یقین دلایا کہ مدت سے مال نہیں آیا۔ یہ سب ڈبے خالی تھے۔ اور محض دوکان کے شو کی خاطر رکھے گئے تھے ــــــ اس کے بعد ہمارے دل میں منگورا کے طلسماتی شہر ہونے کے بارے میں کوئی شک نہ رہا۔

بس تقریباً بھر چکی تھی جب ہم وہاں پہنچے۔ ایپی کیورس نے میری "وکس" کی تلاش کو اس تاخیر کا موجب گردانا۔ یہ اس کی قطعاً زیادتی تھی۔ ایک آدمی کرسی میز لگائے ٹکٹ بیچ رہا تھا۔ ایپی کیورس کو دیکھ کر وہ تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ ایپی کیورس ویسے بھی بارعب آدمی ہے اور اپنے فیلٹ ہیٹ اور چشموں میں تو وہ بہت ہی بارعب تھا۔ اس اچھے آدمی نے کسی نہ طرح ہمارے لئے دو نشستیں پیدا کر ہی لیں۔ ایک ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر، دوسری اس سے پیچھے۔ فرنٹ سیٹ پر ایک اور آدمی سوٹی ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا ــــ شلوار قمیض میں۔ اور کچھ کچھ ایک احمق سکول ماسٹر کا سا ــــ ہم اسے جانتے تھے۔ وہ مردان سے ہمارے ساتھ ہی سوار ہوا تھا اور ہم نے اسے نشاط ہوٹل میں بھی دیکھا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ واقفیت گانٹھنے کی کوشش کی تھی مگر ایپی کیورس کو وہ اپنی "خود اہم" مجہوری وضع کے سبب پسند نہ آیا تھا۔ اور ہم اس سے زہر کی طرح بچتے رہے تھے ــــ ایپی کیورس نے اس کے ساتھ بیٹھنے پر پیچھے بیٹھنے کو ترجیح دی اور مجھے اس بور اور خالی دماغ شخص کے سامنے بیٹھنا پڑا۔ وہ اپنی ٹانگیں پھیلا کر اور سوٹی پر ٹیک لگا کر زیادہ سے زیادہ جگہ گھیرے ہوئے تھا۔ میرے آنے کو اس نے پسند نہ کیا اور وہ اپنی گھیری ہوئی جگہ سے ذرہ بھر بھی نہ سرکا۔ میں دبک کر ایک غیر آرام دہ طریق سے بیٹھ گیا۔ میں اپنے پاؤں بھی نہیں پھیلا سکتا تھا۔ کیونکہ نیچے گیر باکس کے پاس اس بے تمیز شخص نے اپنی گٹھڑی اور چمڑے کا اٹیچی رکھا ہوا تھا۔ ایپی کیورس بھی پیچھے دو نسوار کھانے اور تھوکنے والے سواتی بزرگوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا ــــ کچھ آگے جھکا ہوا۔

ڈرائیور، جب وہ دس بجے اپنے سٹیرنگ پر آ کر بیٹھا تو ہالی وڈ کے سٹیورٹ گرینجر کا ہم صورت نکلا ــــ وہی تیکھا لمبا چہرہ پتلے حساس ہونٹ، چھوٹا ڈھیلا منہ، وہ پتلا اور خوبصورت تھا لیکن کسی طرح تم اسے پسند نہیں کرتے تھے ــــ جہاں تک میرا تعلق ہے میں دنیا کے اسٹیورٹ گرینجروں سے نفرت کرتا ہوں بعض عورتوں کے لئے شاید ان میں کشش ہوتی ہوگی۔ مگر میرا خیال ہے کہ کوئی آدمی اتنی جنسیت سے بھری ہوئی ہستیوں کو حقیقی طور پر دل میں جگہ نہیں دے سکتا۔ تم انسانی گرمی کو ان کے سرد، گدھے کے سے چہرے پر تمتماتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ اگر تم عورت ہو تو وہ تمہیں سیدھے بستر میں لے جانا چاہیں گے۔

منگورا کے نواح سے نکل کر سڑک مڑتی اور چکر کاٹتی، تدریجی چڑھائی چڑھتی ہے۔ یہاں شروع میں وہی پھلوں کے باغوں، مرغزاروں اور پیلے کھیتوں کی فراوانی تھی۔ مگر ہم اونچے پہاڑوں کی سمت جا رہے تھے۔ پہاڑ قریب آ گئے تھے اور وادی اپنے کو سمیٹتی ہوئی لگتی تھی۔ ایک مقام پر ہم نے خانہ بدوشوں کے ایک پورے قافلے کو لاری کی چھت پر بٹھایا۔ وہ اخروٹوں کے ایک چھوٹے سے ذخیرے کے ساتھ پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ لاری کے تھمنے پر انہوں نے جلدی سے خیمے اکھاڑے اور اپنے گھر کے سامان سمیت چھت پر بٹھا دیئے گئے۔

ایپی کیورس نے چیل کا دوسرا درخت دیکھا اور مجھے اس کی خوشخبری دی۔ پوست کے پھول ہواؤں میں ناچتے تھے اور سوات دریا اب ایک

پہاڑی نالہ بہتا ہیں بہتا تھا۔ پہاڑوں پہ برف میں شاندار تھیں۔ وہ کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتیں۔ —— پھر بید کاری کے وہی قلعے اپنے مرغزاروں میں ایستادہ تھے۔ خانہ بدوش پہاڑی عورتیں سڑک پر سے گزریں یونانی ناکوں اور تیکھے نقوش کی عورتیں —— اور قدرے جھکی ہوئی —— سیاہ کپڑوں میں ملبوس اور وحشیانہ زیورات میں لدی پھندی۔ ان کے سروں پر گول ٹوکریاں ہوتیں کنبے کی کل کائنات ان ٹوکریوں میں رہتی۔ ہر قسم کے برتن بھانڈے اور ہر رنگ کے چیتھڑے۔ — ان کے مرد (کاہل بد معاش!) اپنے گدھوں اور خچروں پر سوار ہوتے۔ ان لوگوں کی زندگی سخت ہے مگر گوناگوں دلچسپی کی۔ وہ خدا کے گھر کی کھلی چھت کے نیچے رہتے ہیں اور ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ راہ پیما رہتے ہیں۔ دنیاوی اسباب میں غریب مگر ہر اور چیز میں امیر —— صحت میں امیر، دماغ کی مستعدی میں امیر، قناعت میں امیر، جب تک دنیا کے پاس خانہ بدوش ہیں اسے ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔

خوازخیل —— ایک قصبہ جہاں ہم ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد پہنچے —— ایک پر رونق پہاڑی قصبہ ہے۔ یہاں پتھر کی دوکانیں ہیں —— بے شمار شگفتہ نفیس بچے، اور ملیشیا میں پولیس کے سپاہی۔ ہم ایک جگہ پر آ کر رکے۔ یہاں سے ایک سڑک نیچے بڑا سرار سنہری دھند میں اترتی ہے۔ دوسری اوپر چڑھتی ہے —— خوازخیل ہمارے لئے ایک رومینٹک، ہوشربا ناول کا پہلا باب تھا۔ یہاں سے دوسرا باب شروع ہوتا تھا اور ہم یہ جاننے کے لئے بے تاب رہے تھے کہ کونسی نئی روح کے ایڈوینچرز ہماری تفریح کے لئے ہمارے انتظار میں تھے۔

ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے بس سے اترے۔ ایچ کیورسن نے اپنے جرنل میں اس کے واضح تاثرات قلمبند کئے۔ بہت سے بچے ہمارے ہمارے گرد جمع ہو گئے —— چھکیلے، ہر جگہ کے بچوں کی طرح حیرانی سے پُر، وہ ہمیں گول حیرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے (خوازخیل کے بچوں کے پاس آٹوگراف بکس نہ تھیں!)

ایک گٹھیلے جسم اور رکھے خوشگوار چہرے والا پولیس کا سپاہی بندوق کندھے سے رکھے ہماری طرف سرکتا ہوا آیا۔ اس شادمان وادی کے ہر ننھے گاؤں اور بستی میں والئی نے پولیس کی چوکی بٹھا رکھی ہے اور یہ سپاہی ہر وقت چوکنے اور مستعد اس ننھے گاؤں کے رہنے والوں اور راہ گیروں کی حفاظت کے لئے اس کے کوچوں میں چلتے رہتے ہیں۔ یہ سپاہی دور کھڑا پہلے ہمیں متجسس نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا تجسس اس کی جھجک پر غالب آگیا اور اس نے آکر ہمیں السلام علیکم کہی۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ ہم نے کہا "مدین اور بحرین"۔ اچھے آدمی نے ہمیں کسی جنس کا تاجر یا بیوپاری سمجھا۔ وہ یہ خیال نہ کر سکتا تھا کہ کوئی شخص ایسی جگہوں میں ماسوا کسی کاروبار کے محض سیر کے لئے جا سکتا ہے۔ یہ کہ ایک آدمی کسی جگہ صرف سفر کے لئے یا دل کو خوش کرنے کے لئے جائے یا اس کے پاس ایسے بیکار مشغلے کے لئے وقت ہو۔ ان اچھے پہاڑی لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ ہمارے یہ بتانے پر کہ ہم کاروباری آدمی نہ تھے بلکہ صرف مسافر تھے وہ خاصا مایوس ہوا۔ اس کے پوچھنے پر ہم نے اسے اپنے نام اور عہدے بتائے اور جب ہم نے اسے اپنی ماہوار تنخواہ بتائی تو وہ اس سے کافی مرعوب ہوا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا اور اصرار کیا کہ ہم اس کا نام اور پتہ اپنے جرنل میں نوٹ کر لیں اور واپس اپنے دیس میں جا کر اسے خط لکھیں۔ ہم نے اس سے وعدہ کر لیا۔ (مسلسل)

سید فیضی

منٹو

زخم گہرے ہوں تو جرّاحی کا ہوتا ہے عمل
منٹو جرّاح تھا، زخموں کو کُریدا اُس نے
اندھی آنکھوں میں اُگائے ہیں بصیرت کے کنول
پردہ بے رنگ حقیقت سے اُٹھایا اُس نے

کون جانے یہ اندھیرے میں لپکتی ہوئی آگ
کب سے سیلاب کی مانند بہا کرتی ہے
زندگی ہے کہ حقیقت کا تڑپتا ہوا راگ
جو حقیقت ہے وہ عُریاں ہی رہا کرتی ہے

زندگی نام و نمُود، آئینۂ حرص و ہوس
زندگی پھُول سے گالوں پہ چمکتے آنسُو
زندگی فصلِ بہاراں کا نچوڑا ہوا رَس
زندگی روندے ہوئے جسم کی مُردہ خوشبُو

ایک نغمہ تھا جسے سینکڑوں عنوان ملے
کب سے مضرابِ طلب زیست کا یہ ساز بھی تھا
اس کے ہر پردے میں افسانے پریشان سے ملے
منٹو خود وقت بھی تھا، وقت کی آواز بھی تھا

شہزاد احمد

صفیہ بھابی

آغا خلش کاشمیری لاہور والوں کو بے تحاشا گالیاں دے رہے تھے اور وہ بھی گوالمنڈی کے ہوٹل میں بیٹھ کر۔ ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور انہیں لاہور انسانوں کا شہر نظر نہ آتا تھا۔ وہ آزادی سے کئی برس پہلے سے بمبئی میں آباد تھے اور بمبئی ان کے خون میں سرایت کر چکی تھی۔ لاہور سے انہیں خاصی نفرت تھی۔ اگر ان کی والدہ کا انتقال نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی لاہور کا رخ نہ کرتے۔ منٹو کی زبوں حالی اور شراب خوری کے قصے ان تک پہنچ چکے تھے۔ وہ خود دھوتی آدمی تھے اور منٹو کی شراب نوشی انہیں بمبئی میں بھی پسند نہ تھی مگر لاہور میں منٹو کی شراب اور دوستی دونوں کا معیار گر گیا تھا۔ روایت یہ ہے کہ منٹو کی شراب نوشی کی عادت چھڑانے کے لئے وہ خود اسے پاگل خانے تک لے گئے تھے۔ جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں اس دن منٹو پاگل خانے میں علاج کروا رہا تھا اور آغا صاحب گوالمنڈی میں دیوانے ہوئے تھے۔ انہیں منٹو سے عشق تھا۔ مگر ان سے کہیں زیادہ عشق صفیہ بھابی کو منٹو سے تھا مگر انہوں نے کبھی گالی نہ دی، کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔ انہیں منٹو کے شرابی دوست بے حد ناپسند تھے مگر انہوں نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔

جب منٹو پاگل خانے سے واپس آیا تو اس نے کئی دن تک شراب نہ پی۔ صبح سے رات تک جب بھی صفیہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر اس کھلنڈرے بچے کو کھلا چھوڑ دیا گیا تو یہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال لے گا۔ ان دنوں منٹو اور بیگم منٹو (جو ہمارے لئے صفیہ بھابی ہیں) متعدد بار تانگے میں اکٹھے نظر آئے۔ منٹو حسبِ عادت اگلی سیٹ پر اور بھابی پچھلی سیٹ پر۔ ان دنوں بھابی صفیہ نے ہر شام باغِ جناح جانے کا پروگرام بنایا۔ دو ایک بار مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت ملی۔ انہیں یقین تھا کہ کھلنڈرا منٹو اب سنبھل چکا ہے، مگر ان کے دل میں ایک نامعلوم خوف تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی منٹو کو آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھیں مگر منٹو معلوم نہیں کب دھوکہ دے گیا یا اجازت لے کر اکیلا اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا اور شراب نوشی پھر سے شروع ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ بھابی صفیہ کو جب یہ خبر ملی تو ان کے تاثرات کیا تھے مگر میرا خیال ہے کہ ان کے دل میں مایوسی اور خوف کی لہر اُٹھی ہو گی جس کا اظہار انہوں نے کبھی نہیں کیا۔

صفیہ بھابی کو پہلی بار میں نے منٹو کے ساتھ ہی کہیں دیکھا تھا جو کہ ان کی تصویر میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس لئے مجھے انہیں پہچاننے میں ذرا بھی مشکل نہ ہوئی۔ ان کی شخصیت میں مجھے کسی غیر معمولی چیز کا احساس نہیں ہوا سوائے اس کے کہ انہیں منٹو سے بے پناہ محبت تھی، ایسی محبت جس کا ذکر فسانوں میں ملتا ہے، مگر منٹو کے افسانوں میں نہیں ملتا۔ میرا خیال ہے کہ منٹو بھی ان سے محبت کرتا ہوگا مگر اس کا اظہار اس نے بھی کبھی نہ کیا۔ مجلس اقبال یا حلقہ اربابِ ذوق میں منٹو اور مسز منٹو کئی بار اکٹھے آئے تھے مگر بھابی صفیہ نے کبھی بھی اپنی موجودگی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اور وہ افسانہ پڑھنے کے بعد منٹو کی پنجابی گفتگو اس اعتماد اور خود پسندی کی حامل تھی کہ محفل میں کسی کو اختلاف کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ معلوم نہیں بھابی صفیہ منٹو کے اس فتحمندانہ رویے پر خوش ہوتی ہوں یا وہ صرف اس لئے ساتھ آ جاتی ہوں کہ ان کا وقت کٹ جائے۔ بہرحال جلسوں کے دوران منٹو کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ان کے چہرے کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہوتے نظر آتے۔

صرف ایک موقعے پر میں نے صفیہ بھابی کو رنج دیکھا تھا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے۔ بعد میں ان کے چہرے پر تاسف کی لہر دوڑ گئی تھی۔

واقعہ یوں ہوا کہ مجلس، قوالی کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بھابی صفیہ کے ساتھ منٹو کی بہن اور کالج کی کچھ طالبات بیٹھی تھیں۔ منٹو کو طالبات سے ملوانے کے لیے خاص طور پر بلوایا گیا تھا۔ شاید اسے یہ حرکت پسند نہ آئی۔ ایک لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے کسی نے منٹو سے یہ کہہ دیا کہ یہ لڑکی آپ کی طرح آرٹسٹ ہے۔ منٹو صاحب نے پوچھا، "تم شراب پیتی ہو؟" لڑکی سے کچھ جواب نہ بن پڑا تو منٹو نے کہا "اگر تم شراب نہیں پیتیں تو آرٹسٹ نہیں ہو سکتیں۔" اس دن میں نے صفیہ بھابی کو خفیف منٹو سے ناراض ہوتے دیکھا۔ مجھے ان کے الفاظ یاد نہیں مگر حافظے میں اتنا ضرور محفوظ ہے کہ منٹو باقی لڑکیوں سے ملے بغیر بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔ بھابی اس قدر شرمندہ تھیں کہ معذرت بھی نہ کر سکیں۔

معاف کیجئے میں نے ایک ایسا واقعہ سنا دیا جس میں منٹو بدتمیز اور واہیات نظر آتا ہے مگر یہ ایک تنہا واقعہ ہے۔ عام طور پر خواتین کے اجتماع میں منٹو بے حد مہذب اور پُرتکلف رہتا تھا، خواہ اس نے پی رکھی ہو، آداب اس کے ملحوظِ نظر ضرور رہتے تھے۔ منٹو کے افسانے پڑھنے کے بعد ان کے مصنف کی جو تصویر لوگوں کے ذہن میں عام طور پر ابھرتی ہے، منٹو اس سے خاصا مختلف تھا۔ وہ اچھا باپ اور گرہست دونوں تھے۔ اسے بچے بے حد پیارے تھے اور بچوں کے سلسلے میں اس کی یہ محبت اپنی اولاد تک محدود نہ تھی۔ وہ بچوں کی عجیب و غریب زبان بے حد غور سے سنتا اور ان کے معنی متعین کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بچوں کے بنائے ہوئے اوٹ پٹانگ الفاظ بے حد معنی خیز ہوتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ اسے زبانی یاد تھے اور بعض اوقات وہ خود بھی بچوں سے انہی کی زبان میں بات کرتا۔ اس وقت وہ ننھا منا سا بچہ محسوس ہوتا اور کوئی اندازہ بھی نہ کر سکتا کہ یہ وہ شخص ہے جس پر فحاشی کے مقدمے چل چکے ہیں۔ منٹو کی بیباکی اور عریانی اس کی حقیقت پسندی تھی۔ وہ معصوم بچوں کی طرح جو سوچتا تھا کہہ دیتا تھا۔ یہ فیصلہ کئے بغیر کہ تحریروں کا محاسبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اپنے افسانے "بُو" میں منٹو نے جو منظر بیان کیا ہے وہ سارے کا سارا اس کے بمبئی کے مکان سے متعلق ہے۔ اس افسانے پر مقدمہ بھی چلا۔ منٹو یہی کہتا تھا کہ صفیہ بھابی اس افسانے کو پڑھ کر بے حد ناراض ہوئی تھیں کیونکہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ منٹو واقعی کسی عورت کو بھابی کی عدم موجودگی میں اپنے گھر لے آیا تھا۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو مگر میں نے لاہور میں جس خاتون کو دیکھا تھا وہ ایسا نہیں کر سکتیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منٹو نے یہ کہانی گھڑی ہو کیونکہ معصوم ذہن اس قسم کی کہانیاں گھڑ کر ان پر خود بھی یقین کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

لاہور میں منٹو لکشمی مینشن کے ایک مختصر سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس کا خاندان ایک بیوی اور تین بچوں پر مشتمل تھا۔ بمبئی میں اس کے ہاں عارف میاں پیدا ہوئے تھے مگر ان کا انتقال ہو گیا۔ عارف میاں کی یادگار منٹو کی ایک کہانی ہے جس کا عنوان ہے 'خالد میاں'۔ بچے کی موت کے بعد منٹو کی ساری شخصیت میں اولادِ نرینہ نہ ہونے کا دکھ بری طرح سرایت کر گیا تھا۔ منٹو بڑے دکھ کے ساتھ یہ واقعہ سنایا کرتا تھا کہ عارف کو آخری غسل دینے کے لئے جب غسال نے نائٹ برا صابن مانگا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا کیونکہ عارف میاں کے لئے منٹو نے بڑھیا سے بڑھیا ولایتی صابنوں کا بکس بھر رکھا تھا مگر عارف میاں کی ضرورت منٹو سے کہیں زیادہ صفیہ بھابی کو تھی کیونکہ منٹو کا لاابالی پن جلد رنگ لانے والا تھا۔ اور بیٹیاں پرایا دھن تھیں تاہم سعادت حسن بھی تو ایک بچہ تھا، کھلنڈرا، لاابالی، ضدی اور خود پسند — منٹو کا جی پڑھائی میں کبھی نہ لگا تھا۔ خاندان کے دوسرے افراد کے مقابلے میں منٹو کی تعلیم واجبی سی تھی۔ اس کے گھر میں ایک انگریزی ڈکشنری اور دیوانِ غالب کے سوا کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ منٹو کا ادب اس کے سینے کے اندر ہی محفوظ تھا۔

لکشمی مینشن کا فلیٹ تین یا چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک ڈرائنگ روم جس میں پرانی وضع کا ایک صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دروازے کے بالکل سامنے جو صوفہ تھا اس پر اکڑوں بیٹھ کر منٹو کہانیاں لکھا کرتا تھا اور اسی کمرے میں اس کے بچے شور مچاتے رہتے تھے۔ ایک روز میں اور منیر احمد شیخ اس سے ملنے گئے تو منٹو بڑی ہیجانی کیفیت میں تھا۔ اسے کسی کباڑیے کی دوکان سے "حمیدہ کی آپ بیتی" مل گئی تھی۔ یہ کتاب مثنوی کی شکل میں تھی اور اس میں شبِ عروسی کی داستان کو کھل کر بیان کیا گیا تھا۔ اتفاق سے اس وقت کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ پہلے تو منٹو نے کتاب کی تشبیہات اور استعاروں

کی بہت تعریف کی پھر مثنوی کو پڑھنا شروع کیا۔ ابھی اس نے تین چار شعر ہی پڑھے تھے کہ اچانک صفیہ بھابھی کمرے میں داخل ہوئیں۔ منٹو نے جلدی سے کتاب چھپالی اور بڑی گھبراہٹ کے ساتھ میرا حال چال پوچھنے لگا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ منٹو کے دل میں اپنی بیوی کے سلسلے میں کتنا تقدس موجود ہے۔ منٹو اس وقت شریر اور شرمیلا لڑکا محسوس ہو رہا تھا۔

گھر کا دوسرا کمرہ جس تک میری رسائی ہو سکی سوٹ کیسوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں بمبئی کی یادگار ایک فریج تھا جو بجلی اور مٹی کے تیل سے چل سکتا تھا۔ انھیں سوٹ کیسوں کی تہوں میں بھابی اپنے پیسے چھپا کر رکھا کرتی تھیں۔ مگر بھابھی کی عدم موجودگی میں منٹو کپڑوں کی تلاشی لیتا اور پیسے چوری کرکے لے جاتا۔ بھابھی کو کئی کئی دن اس چوری کا علم نہ ہوتا۔ انھیں یہ بھی یاد نہ رہتا کہ انھوں نے کس سوٹ کیس میں کتنے پیسے رکھے تھے۔ چوری کا یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے بھابھی جانتی تھیں کہ ان کا چور کون ہے۔ مگر وہ جان بوجھ کر سب کچھ بھول جاتی تھیں۔ اور کبھی شکایت نہ کرتیں۔ شکایت تو وہ اب بھی نہیں کرتیں۔ پہلے ان کا چور منٹو تھا، اب منٹو کے پبلشر ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں اس کی کتابوں کے ایڈیشن چھاپتے ہیں اور اس کے بچوں کو کچھ نہیں دیتے۔ اس کا گھر اس قدر سونا ہو گیا ہے کہ منٹو کے پبلشر تو کیا اس کے دوستوں نے بھی کبھی بھول کر اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ عارف میاں کی موت کے بعد بھابھی نے جو اداس زندگی شروع کی تھی وہی زندگی انھیں منٹو کی موت کے بعد پھر سے شروع کرنا پڑی۔

ظہور الحسن ڈار

باغی

اگر میں نے اس کی میت کو اپنے سامنے لحد میں اترتے نہ دیکھا ہوتا تو میں اس خبر پر کبھی یقین نہ کرتا کہ وہ مر چکا ہے، مگر وہ مر چکا تھا۔ وہ جو کئی المیوں کا مصنف تھا، اب خود ایک المیے کا ہیرو بن چکا تھا۔ اس کے افسانوں کی طرح اس کے اپنے خاتمے میں بھی چونکا دینے والا فنشنگ ٹچ موجود تھا۔ تقریباً سال بھر پہلے جب وہ سخت بیمار ہوا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو وہ اچانک صحتیاب ہو کر تیزی سے افسانے لکھنے لگا اور اب جبکہ اس کے مرنے کا کوئی امکان نہیں تھا، وہ ایکا ایکی موت سے بغل گیر ہو گیا اور اس کا وہ آخری افسانہ بھی نامکمل رہ گیا جو وہ صرف چند گھنٹے پہلے ایک اخبار کے دفتر میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔

معلوم نہیں اس نے اپنے آخری افسانے کے لئے کیا فنشنگ ٹچ سوچ رکھا تھا لیکن اس کی اپنی زندگی کے افسانے کے مقابلے میں اس کے تمام افسانوں کے فنشنگ ٹچ ہیچ ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا منٹو کی موت کی خبر سن کر دوسرے لوگوں پر کیا گزری لیکن مجھے اس کی موت پر کوئی صدمہ نہ ہوا۔ اُلٹا مجھ پر حیرت اور تعجب کی ایک ملی جلی مگر بھرپور کیفیت طاری ہو گئی۔ ہو سکتا ہے یہ کیفیت ذہن کو صدمہ پہنچنے کا ہی نتیجہ ہو لیکن اس صدمے کا احساس مجھے بالکل نہیں ہوا۔ اس وقت بھی نہیں ہوا جب میری آنکھوں کے سامنے دو سیاہ فام گورکن اس کی قبر کو آخری ٹچ دے رہے تھے میں اس وقت بھی حیرت زدہ تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ منٹو سچ مچ سپردِ خاک ہو چکا ہے۔ گورکن اس کی قبر پر مٹی برابر کر رہے تھے اور مجھے ہر لحظہ اس چونکا دینے والے واقعے کا انتظار تھا کہ ابھی منٹو قبر سے باہر نکل کر انہیں پکڑ لے گا اور کہے گا: "تم یہ کیا کر رہے ہو، تم سمجھتے ہو میں سچ مچ مر گیا ہوں؟" اس کے بعد وہ اپنی قبر کے آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھ کر ہنسے گا۔

"منٹو مر گیا یہ ایک فراڈ ہے لیکن تم اسے قبر میں ڈالے رہتے ہو یہ اس سے بھی بڑا فراڈ ہے" یہ کہہ کر وہ ہنسے گا اور اوپر اٹھنا شروع کرے گا، تھوڑا اوپر اٹھ کر رکے گا، پھر حاضرین سے مخاطب ہو گا۔

"منٹو کی جگہ نیچے نہیں۔ نیچے فراڈ ہے اور اوپر دھواں۔ منٹو نیچے فراڈ تھا اور اوپر دھواں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اوپر اٹھنا شروع کرے گا اور تمام لوگوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔

منٹو سے یہ چیز غیر متوقع نہ تھی۔ اپنے افسانوں کی روشنی میں وہ ایک بہت بڑا شعبدہ باز نظر آتا تھا۔ قلم اور زبان دونوں کے زور سے عجیب شعبدے دکھاتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے آگ پر چلتا تھا، بڑے سکون سے شیشے کی کرچیں پھانک لیتا تھا۔ بڑی بے نیازی سے پیٹ میں خنجر اور چاقو بھونک لیتا تھا۔ اس کے باوجود اس پر کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔ وہ بار بار مرتا تھا اور بار بار زندہ ہوتا تھا۔ ابھی اس کی افسانہ نگاری کا آغاز تھا کہ اس پر تپ دق کا حملہ ہوا۔ پہلے ہلے میں تو دق نے منٹو کو پسپا کر دیا لیکن دوسرے ہلے کے بعد وہ خود پسپا ہو گیا۔ اسی طرح اسے چند ماہ ایک پاگل خانے میں رہنے کا اتفاق ہوا تو اس کے

باہر آکر پاگلوں کے متعلق بعض ایسے افسانے لکھے کہ پاگلوں کا علاج کرنے والے ڈاکٹر پاگل ہوگئے اور پاگل خانے سے باہر بسنے والی دنیا میں کئی پاگلوں کے دماغ ٹھکانے آگئے۔ اس تجربے کے بعد اسے ایک اور خطرناک مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اب کی دفعہ اس کا مقابلہ شراب سے تھا۔ لوگوں کا خیال تھا منٹو کو شراب خراب کر رہی ہے۔ منٹو کہتا تھا میں شراب کو خراب کر رہا ہوں۔ بہرحال اس گڑبڑ میں جب معاملہ بہت ہی خراب ہوگیا، تو منٹو ہسپتال پہنچ گیا۔ اور تین ماہ تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ اس دوران میں کبھی شراب اس پر غالب آجاتی اور کبھی وہ شراب پر، لیکن میدان اسی کے ہاتھ رہا، اور میدان اس وقت بھی اسی کے ہاتھ رہا، جب وہ کچھ عرصہ بعد شراب کا ایک چھوٹا سا جام زہر کے طور پر پی کر اسے ہمیشہ کے لئے شرمسار چھوڑ گیا۔

جان کر من جملۂ خاصان میخانہ مجھے   حشر تک رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

موت سے منٹو کی بار بار پنجہ آزمائی اور پھر فاتحانہ للکار کے تمام واقعات میرے ذہن میں محفوظ تھے مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ اس سے پہلے کئی بار موت سے فرار کر چکا ہے۔ شاید اسی لئے مجھے توقع تھی کہ وہ اس بار بھی موت سے فرار کرے گا۔ مگر جب اس کی قبر بالکل تیار ہوگئی، اس پر پھول بھی چڑھا دیئے گئے اور وہ قبر سے باہر نہ آیا تو مجھے اچانک اس تلخ اور دردناک حقیقت کا احساس ہوا کہ اب کی بار معاملہ مختلف ہے۔ اس بار خود زندگی منٹو سے فرار کر گئی ہے۔

وہ منٹو جس کا نام سعادت حسن تھا۔ جو لکشمی مینشن میں رہتا تھا جو ایک بیوی کا شوہر اور تین بچیوں کا باپ تھا۔ جو زندگی کے آخری دنوں میں عموماً شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔ جو اس دنیا کو وہ اپنے آپ کو ایک فراڈ سمجھتا تھا جس سے زندگی بھی نالاں تھی اور موت بھی ـــــ مر چکا ہے۔ اس لئے کہ اسے ایک نہ ایک روز مرنا ہی تھا۔ لیکن وہ منٹو جو بیسیوں افسانوں، ڈراموں اور خاکوں کا مصنف ہے۔ جو آئے دن کسی نہ کسی "خوشیا" کسی نہ کسی "سوگندھی" اور کسی نہ کسی "گوپی ناتھ" کو جنم دیتا رہتا تھا، کیا اسے بھی کوئی موت کسی قبر میں دفن کر کے بے نام و نشان بنا سکتی ہے؟ کیا کوئی اندھیرا بمبئی کے بنگلے کی ان پراسرار روشنیوں کو نگل سکتا ہے۔ جو آج بھی سوگندھی کے چہرے کو اجال رہی ہیں؟ کیا کوئی غبار اس سدا بہار چمک کو دھندلا سکتا ہے۔ جو صرف زرد روشنی کے پیلے آنسو ہی پیدا کر سکتے ہیں؟ اور جس کی آب و تاب سے "گوپی ناتھ" "سلطانہ" "خوشیا" اور بوڑھی ممی کے چہرے روشن ہیں ـــ!

ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا، کل کیا ہوگا، میں نہیں کہہ سکتا۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ منٹو سے زندگی بھی نالاں تھی اور موت بھی۔ موت تو اس سے اس لئے نالاں تھی کہ اس کے پے در پے حملوں کے باوجود منٹو اس کا شکار نہیں ہوتا تھا اور زندگی اس سے اس لئے نالاں تھی کہ وہ اس سے کسی طرح بھی سمجھوتا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے یہاں زندگی کا لفظ معاشرے کے معنوں میں استعمال کیا ہے، جس معاشرے میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں، وہ منٹو سے اس لئے نالاں تھا کہ منٹو اس کی تمام فریب کاریوں اور بداعمالیوں کو اچھی طرح جان چکا تھا اور ان کا پردہ چاک کرنے کی ہمت بھی رکھتا تھا، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایک گنہگار، صرف ایک خوبصورت عمامہ باندھ کر اور منبر پر کھڑا ہو کر کیوں کر نیکوکار واعظ بن سکتا ہے یا کوئی کس طرح اپنے مکروہ چہرے کے مہاسوں اور کیلوں کو غازے کی تہوں میں چھپا کر اپنے منہ سے اپنے حسن و جمال کے قصیدے پڑھ سکتا ہے۔ اس کی فطرت اس ریاکاری کے خلاف بغاوت کرتی تھی اور وہ نوک قلم سے پوری بے رحمی کے ساتھ عماموں کی تہیں کھول دیتا تھا، سچائی کے چھینٹوں سے غازے کی تہیں اتار دیتا تھا اور ان کالے چہروں کو ننگا کر دیتا تھا جو اس معاشرے میں بڑے بڑے شہ نشینوں پر بیٹھ کر نیکوکاری اور اخلاق پر وعظ سنا رہے ہیں۔

یہ اس کے فن کا ایک رخ ہے۔ اس کے فن کا دوسرا رخ یہ ہے کہ منٹو نے انتقام کے جوش میں نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر اور نہایت ایمانداری کے ساتھ ان لوگوں کو اپنے سینے سے لگایا جنہیں ہمارا معاشرہ ہمیشہ سے دھتکارتا چلا آیا ہے۔ اور جن کا ذکر چھڑتے ہی معاشرے کے نام نہاد نیکوکار توبہ استغفار

پڑھنے لگتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں سماج کے ان اچھوتوں کے لئے گہری محبت موجود ہے جو ہمارے ہی گناہوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ یہ ایسے بیٹے اور بیٹیاں ہیں جنھیں پیدا کر کے ہمارا معاشرہ بھول ہی نہیں گیا، بلکہ ان پر جرمانے اور عتاب بھی تانتا رہتا ہے۔ کیا کوئی بھی ایماندار فن کار ان بدنصیبوں کو اس ریاکار معاشرے کی طرح گنہگار کے نام سے پکار سکتا ہے؟ اگر یہ گنہگار ہیں، تو پھر ہمیں اپنے آپ کو سیاہ کاروں کے نام سے یاد کرنا چاہیے، کیونکہ ان گنہگاروں کو خود ہم نے پیدا کیا ہے۔

منٹو ایک ایماندار فن کار تھا، اس لئے وہ ریاکار نہ بن سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی بھر معاشرے کے قہر و غضب کا شکار رہا۔ اس کی تلخ صاف گوئی اور بیباکی اس کے لئے ہمیشہ بلائے جان بنی رہی۔ اس معاشرے نے جس کا ہمنوا ہو کر وہ عیش کی زندگی بسر کر سکتا تھا، اسے باغی قرار دے کر کبھی قبول نہ کیا اور اپنے ہتھکنڈوں سے بہت جلد موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ منٹو کو شراب نے ڈبو دیا۔ مجھے یہ سن کر ہمیشہ پنجابی کے مشہور شاعر اُستاد دامن کا ایک شعر یاد آتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے اسی صورت میں برداشت کیا جا سکتا ہے کہ آدمی شراب کے نشے میں چور رہے۔ جو آدمی شراب کے نشے کے بغیر معاشرے کی ریاکاریوں کو برداشت کرتا ہے وہ یا تو پاگل ہے اور یا پھر بے غیرت ـــــ

منٹو کو معاشرے نے کبھی قبول نہیں کیا، ادب میں بھی بعض دانشوروں نے اسے ہمیشہ کوئی اونچا درجہ دینے سے گریز ہی کیا۔ لیکن ان دونوں چیزوں کا تعلق منٹو کی زندگی سے تھا۔ منٹو کی موت کے ساتھ ہی ان باتوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اب جو چیز زندہ ہے، وہ منٹو کا فن ہے یا اس کے وہ کردار جنھیں اس نے اپنی فنی ریاضت سے، اپنی گہری محبت اور سچے خلوص سے امر بنا دیا ہے۔ یہ کردار آج بھی زندہ ہیں اور جب تک یہ زندہ رہیں گے انھیں جنم دینے والا فن کار بھی زندہ رہے گا۔

مجھے منٹو کے ان کرداروں کی اپنے خالق سے محبت اور عقیدت کا بخوبی اندازہ ہے۔ مجھے وہ منظر خوب یاد ہے جب میں منٹو کی قبر کے قریب کھڑا اس بات پر غمزدہ تھا کہ اس کے جنازے کے ساتھ بہت کم آدمی آئے ہیں اور جو آئے ہیں، وہ اسے منوں مٹی کے نیچے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ مگر عین اس وقت جب میں بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو رہا تھا میں نے ایک پل کے لئے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ منٹو کی قبر کے اردگرد ایک پراسرار سی روشنی پھیل گئی ہے اور منٹو کے تمام کردار اس کی قبر کے گرد جمع ہیں۔ ان میں خوشیا بھی ہے اور سوگندھی بھی، گوپی ناتھ بھی ہے اور سلطانہ بھی، ممی بھی ہے اور مسز ڈی کوسٹا بھی اور ـــــ اور ان کے درمیان ایک کتا بھی ہے، ٹیٹوال کا کتا، جو بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے خالق کی قبر پر کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔

آغا بابر

منٹو اور طوائف

طوائف ہمارے کلاسیکی ادب کی ہیروئن تھی اور بہت دیر رہی۔ مرزا سعید کے ناول "خواب ہستی" میں شمیم اور حسن آفرا دونوں اونچے درجے کی طوائفیں تھیں۔ ادیب اپنی ادبی ضرورت کے مطابق طوائف کو جتنا اونچے درجے کا چاہتا بنا دیتا تھا۔ ہماری تہذیبی زندگی میں طوائف کو اہم کڑی کی حیثیت حاصل تھی۔ پوری نصف صدی کا ادب اور معاشرہ محض طوائف کی ذات سے متحرک نظر آتا ہے۔ طوائف کہیں علامت ہے کہیں حوالہ۔ منٹو کے ادب میں طوائف حقیقت ہے۔

بنجر زمین سے فصل بڑی محنت اور مشقت سے اترتی ہے اور وہ بھی صرف اس وقت جب آپ کو بنجر زمین پر اعتماد ہو۔ منٹو کو طوائف پر صرف فنی اعتماد ہی نہ تھا بلکہ وہ طوائف کو ایک مذہب کی طرح مانتا تھا۔ مثلاً مرزا غالب پر فلمی کہانی لکھنے کے لئے جس چیز نے منٹو کو سب سے زیادہ اپیل کیا تھا وہ طوائف کا کردار تھا جسے وہ مسکرا کر "مغنی" کہتا تھا۔

منٹو پہلا ادیب ہے جس نے پرانے ادب کی اونچے درجے کی طوائف کو حسب ضرورت سنوارا نہیں بلکہ اس نے ادب کو کھیائی سے متعارف کرایا جو اس کی اپنی دریافت تھی۔ سعادت حسن کو طوائف کا کردار کیوں اپیل کرتا تھا؟

جب سعادت حسن نے ہوش سنبھالا، امرتسر میں پانچ ہزار طوائفیں تھیں۔ یہ عجیب شہر تھا۔ بازار حسن کنڈلی مارے سانپ کی طرح ٹیڑھا میڑھا لیٹا پڑا تھا۔ اس بازار کو کئی بازار کاٹتے مگر مختصر سے کٹاؤ کے بعد یہ لمبا طویل بازار پھر شروع ہو جاتا۔ ان ٹھیکروں اور نگینوں کا ایک روپے سے پانچ ہزار تک مول تھا۔ اور اس کے بعد جان کی بازی۔ جو امیروں کبیروں کے نکاح میں تھیں ان کی ایک اپنی دنیا تھی۔

سعادت حسن بچپن میں نہایت نٹ کھٹ نڈر اور دلیر تھا جب اس نے اس ہجوم دلبراں میں آنکھ کھولی ہوگی تو ظاہر ہے کہ اس کے مزاج نے کیا تاثر قبول کیا ہوگا۔

سعادت حسن اپنے عواقب و عوامل کی وجہ سے ذہنی طور پر جلدی بالغ ہو گیا تھا۔

ادیب صداقت کی تلاش اور حقیقت کی جستجو میں حسن کی دنیا میں جھانکتا ہے۔ حسن اور اسرار اس کے موضوع کے لئے بہت بڑی دولت ہوتے ہیں۔ طوائف کی ذات میں حسن بھی ہے اور اسرار بھی اور جو چیز اس موضوع کو زیادہ پرکشش بنا دیتی ہے وہ انسان کی ازلی کمزوری ہے ۔۔۔ جنس ۔۔۔

طوائف کی ادائے دلبری اور شوخ طرازی کے درمیان بیچارہ افسانہ نگار کھڑا دیکھتا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ بڑا مشکل مشن ہے جو افسانہ نگار سنبھال لیتا ہے۔ کیوں اٹھاتا ہے؟ اسے اپنی خداداد ذہانت پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اس کے بل پر وہ اس بار ذمہ داری کو اٹھاتا ہے ورنہ حسن اور اسرار حیات کا پردہ کیوں جھانکے۔

یہی اختراعی ذہانت اس کے مصورانہ پہلوؤں میں رنگ گھولتی ہے۔ ایک مرتبہ میرے یہ کہنے پر کہ میں نہیں مانتا آپ نے طوائف کو خطوط اور رنگوں میں قید کیا ہو، عبدالرحمن چغتائی نے مجھے چند وہ تصویریں دکھائیں جن کا موضوع محض طوائف تھا۔ مدعا یہ ہے کہ تمام فنون کا خمیر جن بنیادی عناصر سے اٹھتا ہے وہ ایک جیسے ہوتے ہیں خواہ افسانہ نویسی ہو یا مصوری ۔۔۔ ڈی ایچ لارنس ایک جگہ کہتا ہے:

If a woman hasn't got a tiny streak of harlot in her, she's a dry stick as a rule. And probably most harlots had somewhere a streak of womanly generosity. Why be so cut & dried? The law is a dreary thing & its judgements have nothing to do with Life

[illegible]

[illegible] نفاست پسندی کو نظر انداز [illegible]

طوائف کے لوازمات زندگی سے فکر کو تحریک دینے والا [illegible] منٹو [illegible] بڑی اخلاقی جرأت [illegible] یہی وجہ ہے کہ [illegible] جوہر قابل طوائف جیسی بنجر شخصیت میں [illegible] ڈھونڈ نکالتا ہے [illegible] راجندر سنگھ بیدی جیسوں نے طوائف کے موضوع کی طرف رجوع کیا مگر منٹو کی خیال انگیزیوں [illegible] کی بلندی کے نشیب [illegible] ہو سکی۔

[illegible] لکھنے کے لئے خام مواد ملتا تھا [illegible] دوسری جنگ عظیم [illegible] ایک فلیٹ میں [illegible] انگریزی فوج کی خوشی میں [illegible]

[illegible]

[illegible] زندگی کے [illegible] روحانی تجربہ [illegible] طوائف کا موضوع [illegible] بیان کرنے [illegible]

[illegible] زندگی [illegible]

[illegible] انسان [illegible]

حسن کا [illegible] تجھ [illegible] جاتا [illegible] دیوانہ دل

[illegible]

[illegible]

خالد حسن

منٹو اپنی موت کے دس سال بعد

سعادت حسن منٹو کو ہم سے جدا ہوئے ابھی دس سال ہی گذرے ہیں لیکن یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اردو میں مختصر افسانہ نویسی کا دیوالہ ہی نکل گیا ہو۔ منٹو ہم سے جوانی کے عالم میں رخصت ہوا تھا۔ چالیس سال کوئی زیادہ عمر نہیں ہوتی۔ افسوس کہ موت کے ہاتھوں سے وہ محفوظ نہ رہ سکا۔ اُسے کئی سال پہلے ہی اپنے مرجانے کا علم ہو گیا تھا۔ اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے اب اُس کے قویٰ بھی جواب دینے لگے لیکن اس اضمحلال سے بھی اس کو ایک حظ حاصل تھا۔ مصائب سے لطف اندوز ہونا اُس کی عادت تھی اور یہ عادت زندگی بھر اُس کے ساتھ رہی۔

آزادی کے وقت منٹو بمبئی میں تھا۔ یہاں اُسے دولت بھی حاصل تھی اور شہرت بھی۔ اُس کا اپنا ایک حلقۂ احباب تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بمبئی میں اُس کی طبیعت لگی ہوئی تھی۔ اس شہر سے اُس کو اُنس تھا۔ ایک قسم کی جذباتی علاقہ بندی تھی جو منٹو کی ذات سے علیحدہ نہیں ہو سکتی تھی بمبئی کے کوچہ و بازار۔ زندگی کی ہماہمی سے بھر پور بارونق، اُگلتے ہوئے، رات دن چلتی رہنے والی بسیں، ریڈ میں، چوپاٹی، اور جوہو کے دل کشا منظر، سربفلک عمارتیں۔ غلیظ قحبہ خانے، وتاؤں کے جمگھٹ، چمکتے ہوئے کاروبار، بمبئی تاجروں اور کمپنیوں کا شہر۔ ایکٹر، ایکٹرسوں کی نگری۔ اسی شہر بمبئی کو منٹو نے اپنی کہانیوں میں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

بمبئی سے منٹو کو اتنا پیار کیوں تھا۔ یہ بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں اسے ہر طبقے کے لوگوں سے میل جول میسر آسکتا ہو کیونکہ ہر قسم کے لوگ آسانی کے ساتھ یہاں مل جاتے ہیں۔ جیسے بنیے، امیر، غریب، ان پڑھ، پڑھے لکھے، قسمت کے دھنی اور مقدر کے راندے ہوئے۔ یہ شہر ہر طبقے کے افراد سے آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کو کئی کہانی لکھنے کے لئے اسی شہر سے بہترین کردار نصیب ہوئے۔ یہ شہر اُس کے سراج، بابو گوپی ناتھ، موذیل اور ممد بھائی کا شہر تھا۔ یہاں بازار حسن کے ٹھاٹ تھے۔ یہ دانشوروں کا مقام تھا ایکٹروں، ایکٹرسوں کی جگہ تھی، ماڈرن ٹیلنٹڈ لوگوں کا دیس تھا۔ ہو سکتا ہے منٹو کے قلم سے زندہ جاوید ہونے پر بمبئی منٹو کی کوئی یادگار قائم کرلے جس سے یہ اعتراف ملے۔ وہ جو کہ منٹو اس شہر کے عاشقوں میں سے تھا۔ بہت سے اہل قلم نے اپنے اپنے شہروں کے متعلق لکھا ہے لیکن اُن کی تحریروں میں احساس کی شدت نہیں پائی جاتی۔ وہ تحریریں پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی سیاحتی ادارے کے اشتہار ہوں۔ ان میں اطلاعات کا ذخیرہ تو موجود ہے مگر وہ ذوق و شوق نہیں مشاہدے کی وہ گرمی اور فکر کی وہ بلندی نہیں جو اپنے پسندیدہ شہر کے در و دیوار اور کوچہ و بازار دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

وہ کسی حال میں بھی بمبئی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے ایسا کرنا پڑا اور اس کے لئے شاید اُس نے اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کیا ہو۔ ۱۹۴۸ء کے بعد اُس نے بمبئی کے بارے میں جو کچھ لکھا اس میں حساس کی تلخی کے ساتھ ساتھ یاسیت بھی موجود ہے کیونکہ آزادی کے بعد بمبئی کا سہاگ اُجڑ گیا تھا۔ نئے نئے لوگ آرہے تھے جنہوں نے آتے ہی یہاں کی روایات کے شیشے کو چکنا چور کر دیا تھا۔ "مسلمان" اور "کالا" کے الفاظ عام طور پر کانوں میں پڑنے لگ گئے تھے۔ عام راستوں

پہنچا تو مارنے اور دنگا فساد کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ ان حالات میں منٹو بمبئی چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ نفرت کی یہ آگ اب ہر طرف پھیل چکی تھی اور سارا شہر اس آگ کی لپیٹ میں تھا۔ حد یہ ہے کہ منٹو کو اپنے جگری دوست شیام کی آواز میں بھی نفرت کا وحشی پن محسوس ہونے لگا۔ اسی لئے اس نے بمبئی چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لیا اور شیام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "شیام، ملنے! میں تو پاکستان جا رہا ہوں۔"

پھر چند سال بعد منٹو نے پنڈت نہرو کے نام دو ایک کھلے خط لکھے۔ ان میں سے ایک خط کو تو بہت ہی دلچسپ انداز میں ختم کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پنڈت جی! میں نے بمبئی چھوڑ دیا تھا، کیا آپ کشمیر نہیں چھوڑ سکتے؟"

پاکستان پہنچ کر منٹو نے اپنے آپ کو بالکل اکھڑا ہوا پایا۔ یہاں ہر چیز درہم برہم تھی۔ افراتفری کا عالم تھا۔ کسی کو کیا پڑی کہ پوچھتا آپ کون ہیں جسے دیکھو الاٹمنٹوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ کی بات کہ پائیداری تو جس میں نہیں تھی، چاہیے تھی، سب جو کچھ بھی کر لیں کم ہے اور منٹو کے سے شخص سے یہ توقع رکھنا عبث تھا کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ان دھندوں میں پڑ جاتا۔ یہاں اس کے لئے کوئی ملازمت نہیں تھی۔ نہ کسی کے نام وہ کارخانے اور فیکٹریاں الاٹ کرانا چاہتا تھا۔ ایسے اشاعتی ادارے بھی یہاں موجود نہ تھے جن کا مطمح نظر علم و ادب کی اشاعت ہو اور نہ ہی ایسے ادبی رسائل کا یہاں وجود تھا جو اہل قلم کو ان کی نگارشات کا بہتر سے بہتر معاوضہ پیش کرتے۔ منٹو کے لئے یہ کس قدر ناموافق حالات تھے پھر بھی اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ ہر افتاد کا مقابلہ کرتا رہا اور وہ بھی اپنے ہی ہم نوالوں کے ساتھ۔ اس کی روش سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن وہ اپنے ہی بنائے ہوئے راستے پر گامزن رہا۔

غربت و افلاس کی حقیقت کو تسلیم کر لینا ایک حساس ذہن کے لئے آسان بات نہیں۔ اگر وہ اسے تسلیم کر لیتا ہے تو پھر مشکل ہی سے نباہتا ہے۔ تنگ دستی سے اس کی مصالحت اس لئے بھی مشکل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے تخلیقی شاہکاروں کا معاوضہ بھی لینا چاہتا ہے۔ سماج سے اس کے چند مطالبات ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا سماج کا کام ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ انصاف کا سلوک ہوتا رہے۔ ان صورتوں میں افراد کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ وہ تو اپنے حالات ہی کی پیداوار ہیں۔ اسی لئے وہ اعمال کے جواب دہ بھی نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے کہ منٹو کے سوا اگر کوئی دوسرا شخص ان حالات سے دوچار ہوتا تو وہ پاگل بن گیا ہوتا یا دنیا سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لیتا، مگر منٹو نے کہانی لکھنا نہیں چھوڑا اور اگر سچ پوچھیے تو منٹو کی بہترین کہانیاں اسی دور کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں محبت ہے، عشق ہے، ایثار و قربانی کا جذبہ ہے اور اپنے مقصد سے وابستگی ہے۔ ان کہانیوں کے کردار وہ مرد اور عورتیں ہیں جو کسی مریض اور پاگل ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ ہماری ہی دنیا کے چلتے پھرتے انسان ہیں۔ ایسے انسان جن کے دل میں انسان کے لئے احترام اور ہمدردی کا جذبہ موجود رہتا ہے۔

منٹو کے آخری دنوں میں دنیائے ادب کے بھیڑیوں نے اس کی صلاحیتوں اور کمزوریوں کا بے دریغ استعمال شروع کر دیا تھا اور اس کے خون سے جی بھر کے ہاتھ رنگے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ منٹو نے بھی ان لوگوں کو اپنا خون پینے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس کا معمول تھا کہ وہ اخبارات و رسائل کے دفتروں میں پہنچ کر کسی ایڈیٹر سے کہتا، روپے کی ضرورت ہے۔ باہر سڑک کے کنارے کرائے پر کیا ہوا تانگہ جس میں سے وہ ابھی ابھی اترا تھا اس کے انتظار میں کھڑا رہتا۔ ابتدا میں اس کے دل و دماغ پر جو سکی لگانے کا خیال ہی سوار ہوتا تھا۔ وہ چھوٹتے ہی بڑے اکھڑ انداز میں ایڈیٹر سے پیسے مانگنے لگتا۔ ادھر اُدھر کا بہانہ کر کے ایڈیٹر حضرات اسے ٹال دیا کرتے تھے اور معاوضہ کی کہانی بھی کر دیتے تھے۔ منٹو ایک لمحے کے لئے کچھ سوچتا، پھر وہیں بیٹھے بیٹھے لکھنا شروع کر دیتا۔ بس کاغذ کی پیشانی پر ۷۸۶ لکھا اور مشین کی طرح لکھنے لگا۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر کہانی تمام کر کے وہ صفحات ایڈیٹر کے سپرد کر دیتا۔ وہ اپنی تحریر پر نظر ثانی کرنے کا عادی نہیں تھا۔ ایک ہاتھ سے کہانی حوالے کرتا اور دوسرا ہاتھ نقدی وصول کرنے کے لئے بڑھاتا۔ رقم گننا اس نے کبھی گوارا نہ کیا کیونکہ وہ اسے گھٹیا اور رذیل حرکت خیال کرتا تھا۔

زندہ یا مردہ مصنفوں کے زمرے میں منٹو کے سوا شاید ہی کوئی اور مصنف ہو جس کے ساتھ اتنی بے انصافی ہوئی ہو جتنی منٹو کے ساتھ ہوئی۔ بظاہر ہمدرد، نیک نیت اور با اخلاق پبلشر بھی منٹو کی بے نیازی سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ یہاں ان اشاعتی اداروں کا جو منٹو سے متعلق

بنے میں کچھ تو ندامت محسوس ہوگی کہ وہ منٹو کے ساتھ اس کی زندگی میں [illegible] اس کے مرنے کے بعد کیا کیا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ منٹو کی تمام تحریروں کا مجموعہ صرف اس لئے اب تک شائع نہیں ہوا کہ اردو اہل قلم کا ایک [illegible] شات پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اس کی تحریروں کے جملہ حقوق منٹو کی بیوہ اور ان حقوق کی تقسیم اور میعاد وغیرہ کا مقرر کرنا ایسے [illegible] سے نمٹنے کے لئے [illegible] کا رہین منت ہونا پڑتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ منٹو [illegible] کے معاملے میں بڑا سیدھا آدمی تھا۔ ہیر پھیر سے ناواقف [illegible] دھوکا کھانے کی تو اس میں صلاحیت بھی موجود نہ تھی۔ اس لئے منٹو اور اس کے پبلشر کے تعلق [illegible] آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم!

بہرحال دوسری طرف کوئی ایسی امید لگانا کہ حکومت کا کوئی ادبی ادارہ محکمہ منٹو کی تحریریں ایک مجموعے کی شکل میں شائع کرے گا، ابھی قبل از وقت ہے۔ وقت آنے پر اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ کیسے کم خدمت ہوگی جو منٹو کے لئے کی جائے گی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ منٹو کے متعلق کوئی نہ کوئی نیا شوشہ نکلتا ہی رہتا ہے۔ ابھی چند [illegible] کی اشاعت [illegible] پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم نے منٹو کو ابھی تک معاف نہیں کیا حالانکہ اسے مرے ہوئے بھی دس سال بیت چکے ہیں۔

منٹو کی وفات کے بعد جتنی کتابیں اس کی زندگی اور فن پر لکھی گئیں ان میں ایک کتاب تو ایسی بھی ہے جسے بکواس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ منٹو کے آخری دنوں میں اس کا قریبی ساتھی رہ چکا ہے لیکن منٹو کے حلقۂ احباب کو پہچاننے والے اس حقیقت سے واقف ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے حضرات ہیں جنہوں نے منٹو کے مرنے کے بعد اس کی شخصیت کو ذاتی شہرت حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے اہل قلم نے اور خود منٹو کے فن کو پسند کرنے والوں نے بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ان مضامین کو اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ایسا اقدام منٹو اور اس کے ادب کی بہت بڑی خدمت ہوتی۔ ماہنامہ نقوش لاہور نے منٹو نمبر شائع کرکے عظیم خدمت سرانجام دی ہے۔ جناب حامد جلال نے جو منٹو کے عزیز میں سے ہیں، منٹو کی چند کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کرکے BLACK MILK کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ لاہور کے ایک انگریزی کتابیں چھاپنے والے ادارے کی طرف سے شائع ہوا تھا مگر چند نامعلوم وجوہ کی بنا پر بازار میں نہ آ سکا اور پبلشر کے گودام ہی میں [illegible] جہاں منٹو کی یادگار [illegible] پر بھی گرد و غبار کی تہیں جم چکی ہیں۔ اس ترجمے کی ایک جلد میں نے بھی دیکھی ہے اور مطالعہ کے بعد اندازہ لگایا ہے کہ مترجم نے بڑی جانفشانی سے کام کیا ہے۔ اس مجموعے [illegible] پڑھنے والے [illegible] ترجمے [illegible] جو عام طور پر [illegible] ملک [illegible] جاتا ہے۔ [illegible] کے منظر عام پر آنے [illegible] کا مقابلہ ابھی تا حال تشنۂ تکمیل ہے۔ [illegible] منٹو کے [illegible] شخصیت [illegible] خود مصنف نے اپنے [illegible] شدید ہی کیسا [illegible] تحریریں [illegible] اس تحریر میں ہے۔

[illegible] منٹو کی تصنیفات [illegible] ہیں۔ اس لئے عرصے کے بعد بہت کم [illegible] بار چھپ سکے ہیں [illegible] وقت ذاتی یا پبلک کتب خانوں کی [illegible] منٹو [illegible] میں شائع ہوا تھا [illegible] اس کے بعد آج تک اسے [illegible] کتب خانوں کی [illegible] حیرت کی بات یہ ہے [illegible] کی کتابوں [illegible] سے علاوہ کئی بڑے بڑے غیر ادب [illegible] ہیں۔

... وہ تو منٹو کی تصنیفات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ انگریزی سکولوں میں تعلیم یافتہ حضرات منٹو کو اس لئے نہیں پڑھتے کہ اس نے جو کچھ لکھا ملکی زبان میں لکھا ہے۔ وہ ایسی، دیسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے جو ان کے انداز انگریزیت کو ٹھیس پہنچائے۔ کچھ دن ہوئے میں نے ایک پڑھے لکھے نوجوان سے دریافت کیا: کیا آپ نے دوستو وسکی کا کوئی ناول پڑھا ہے؟ اس پر نوجوان نے بڑے حقارت آمیز لہجے میں جواب دیا کہ "معاف فرمائیے: مجھے اردو کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں؟"

یہ حال تو انگریزی سکول میں جانے والوں کا تھا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم میں مشرقیت کے دلدادہ لوگ بھی منٹو کو پڑھنے کی زحمت نہیں کرتے۔ ان لوگوں کے نزدیک منٹو فحاشی اور عریانیت کا ترجمان ہے۔ وہی واہی تسم کے ادیبوں کی طرح۔ یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کل بھی منٹو کی کتابیں صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جنہیں منٹو سے شغف ہے۔ میرے احباب میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو منٹو کو پڑھتے پڑھتے اکتا گیا ہو۔ منٹو کے فن میں اب بھی پہلے جیسی تازگی موجود ہے اور وہ اب بھی ذہنوں کے لئے وجہ تسکین ہے۔ تیرگی کے چہرے سے روشنی کے جن مقدس نقابوں کو نوچ کر منٹو نے پارہ پارہ کردیا تھا، وہی زرتار نقاب خود ہماری ہی حوصلہ افزائی سے اب چھپنے جا رہے ہیں۔ ہمارے سماج کے وہ مکروہ بت جن کی قبا منٹو نے اپنے ہی بت بجا دی تھی، اب نئے سرے سے انہیں پھر معبدوں میں نصب کیا جا رہا ہے تاکہ پھر ان کی پرستش شروع ہو جائے۔ سماج کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو سنبھالنے کے لئے منٹو نے اپنے خون دل کی کشید پیش کی تھی لیکن یہ لوگ آج بھی اسی طرح گندی نالیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ سماجی تصنعات اور ریاکاریاں جن پر منٹو نے کاری ضرب لگائی تھی، آہستہ آہستہ پھر ہمارے معاشرے کا جزو بن کر ظاہر ہو رہی ہیں۔ وہ مکر و فریب جس کی اصلیت کو منٹو نے روز روشن کی طرح ہم پر عیاں کر دیا تھا، اسے آج پھر ہمارے معمولات زندگی میں خاصی جگہ مل رہی ہے اور وہ عزت و اخلاق کے راہزن کہ منٹو ساری عمر جن کا مضحکہ اڑاتا رہا، آج پھر اثر و رسوخ کے مالک بن بیٹھے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ منٹو نے ان سب عناصر کو ختم کرکے سوسائٹی کو پاک صاف بنا دیا تھا لیکن اس بات سے شاید کوئی شخص انکار کر سکے کہ جب تک منٹو زندہ رہا اور اپنے قلم کی طاقت سے کام لیتا رہا، یہ عناصر بھی خوفزدہ اور سہمے سہمے سے رہتے تھے۔ یہ منٹو ہی تھا کہ منٹو کے دم سے کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ نیکی کا لبادہ اوڑھ سکے۔ بد قماش اور آوارہ لوگ بھی اتنے بے حیا اور بیباک ہو کر اپنی پاکدامنی کا کم ہی ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے۔ ان کی نا انصافیوں کی راہیں نسبتاً مسدود رہا کرتی تھیں اور ان کی ڈراؤنی شخصیتیں نئی روشنی اور نئے رجحانات کا لباس بدل کر کم ہی منظر عام پر آنے کی کوشش کرتی تھیں۔ لیکن —

آج منٹو ہم میں موجود نہیں۔ منٹو مر چکا ہے اور ہم نے اس کی موت پر سوگ بھی تو نہیں منایا! منٹو کی یاد میں کبھی کبھی جلسے منعقد کرا لینے سے ہم اس فریضے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس تحریک اور جدوجہد کو آگے بڑھاتے رہیں جسے منٹو نے شروع کیا اور جاری رکھا۔ ریاکاری اور رجعت پسندی کے خلاف جہاد، سماج کے بے رحم شکنجے میں پھنسے ہوئے مظلوم انسانوں کی مدد، رسم و رواج اور قانون کے بندھنوں سے استبداد کی روک تھام ایسے اقدامات ہیں جن سے معاشرے کو صالح بنایا جا سکتا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ادیب اور لکھنے والے اب ان نشتروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جن سے منٹو نے بیمار معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کو کریدا تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو کو فحش نگاری کی حیثیت سے بے خطا اور بے جرم ثابت کیا جائے۔ میرے نزدیک اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بے خطا اور بے جرم تو اسے ثابت کیا جائے جو خطاکار اور مجرم ہو۔ منٹو نے زندگی بھر انسانی ذہن کو تعصبات اور دوسری برائیوں سے پاک کرنے کے لئے جدوجہد کی اور میری دانست میں وہ ایک کامیاب مصلح ثابت ہوا۔ میرے لئے یہ بات بھی موجب حیرت ہے کہ منٹو کے ناقد اس کے متعلق بات کرتے ہوئے منفعلانہ طرز گفتگو کیوں اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ منٹو اور اس کے فن پر کچھ کہتے ہوئے جھینپتے ہیں اور اس طرح ان کا یہ احساس ہی تاثر بتاتا ہے کہ منٹو کے

تعلق کچھ کتنا جنسی بے راہ روی پر اظہار خیال سے متعلق ادب سے۔ وہ کھلے طور پر اپنے آپ کو منٹو سے ملوث نہیں کرتے اور دیکھا جائے تو ان کی یہی عجیب منٹو شناسی میں سب سے زیادہ آڑے آ رہی ہے۔

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ منٹو ماضی سے تعلق رکھتا ہے۔ گذرے ہوئے دور میں جو برائیاں جس طرح ہمارے معاشرے کو چاٹ رہی تھیں، منٹو نے ان برائیوں کو ختم کرنے کے لئے براہِ راست ان کی ترجمانی کی۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے اور ان اعمالِ شنیعہ میں کیونکہ قدرے تخفیف واقع ہو چکی ہے جو منٹو کے زمانے میں عام ہوا کرتے تھے اس طرح منٹو اپنی تحریروں سمیت گذرے وقتوں میں سے جانے کی کوشش کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ تیزی سے بڑھنے والی آج کی دنیا میں منٹو کا مطالعہ بے سود ثابت ہوگا۔ اس نظریے میں کس قدر صداقت ہے اس کا آپ خود ہی اندازہ کیجئے میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ منٹو نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہ تا حال متروک نہیں ہوئے۔ وہ معائب جنہیں منٹو نے عریاں کیا تھا آج بھی ہمارے معاشرے کا جزو بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے وہ نوجوان ادیب جنھوں نے منٹو سے اثر قبول کیا ہے اُن کے متعلق بھی یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی تحریروں کو منٹو کے فن سے منسوب نہ کیا جائے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جیسے آج کل کا کوئی نوجوان اپنے ہم عمر دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہے۔ اتفاق سے اُس کا سگا چچا اگر وہاں آ جائے تو ان صاحبزادے کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کے دوستوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ صاحبزادے انہی کے بھتیجے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہمارے لئے باعثِ شرم اور کیا بات ہے کہ ہم منٹو کو اس لئے درخورِ اعتنا نہ سمجھیں کہ اس میں دورِ حاضر کی کوئی بات نہیں ہے اور وہ ماضی کا ادیب بن کر رہ گیا ہے۔ یوں اس سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا کیونکہ منٹو کے نقوش ہمارے دلوں پر مرتسم ہیں۔ اُس کی روح ہمارے سروں پر منڈلاتی رہے گی۔ منٹو کی روح ہیملٹ کے باپ کی شاہانہ روح ہے جس سے عام حیثیت کے آدمی اگر چاہیں بھی تو کنارہ کش نہیں رہ سکتے

پڑھے لکھے آدمیوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو منٹو اور اُس سے متعلق ہر معاملے کو غیر اہم سمجھتے ہوئے تمسخر سے ٹال دیتے ہیں۔ حکومت نے منٹو کی کتاب "شکاری عورتیں" کی اشاعت ممنوع قرار دے دی ہے۔ کسی صاحب نے بذریعہ خط اس پر احتجاج کیا تو اس کے جواب میں جو خط شائع ہوا اُس کا نفسِ مضمون یہ تھا کہ منٹو کی حمایت میں شائع ہونے والا یہ خط پوری طرح "پر لطف" نہیں۔ اسی خط میں یہ ذکر بھی کر دیا گیا ہے کہ "شکاری عورتیں" کو ممنوع قرار دینے کا حکم ذرا دیر سے صادر ہوا کیونکہ عصمت فروشی کے ساتھ ساتھ منٹو کو بھی ممنوع قرار دیا جانا چاہیئے تھا۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ منٹو کے سلسلے میں یہ گھٹیا رجحان آخر کس قسم کی ذہنی و علمی فکر کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس سے نہ تو کسی علمیت کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی اچھے مذاق کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ہمیں منٹو کی تمام کتابوں کو پھر سے شائع کروانے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے۔ بظاہر یہ کام مشکل ہے لیکن منٹو کو زندہ رکھنے کے لئے اسے سر انجام دینا ہوگا کیونکہ فن کار کا فن ہی مرنے کے بعد اُسے زندہ رکھ سکتا ہے وہ عوام کے دل و دماغ پر ایک غیر مرئی خیال بن کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی ذہنی تخلیقات کی نشر و اشاعت ہی اُسے دوام بخشتی ہے۔

منٹو جب تک زندہ رہا اُسے اپنی عظمت کا احساس رہا اور اپنے فن کے زندہ جاوید رہنے کا یقین بھی۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس کے اس دعویٰ کو زندہ رکھیں۔

احمد شریف

منٹو صاحب

منٹو کو میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ وہ ایسے حال میں تھے کہ بہت بے حال تھے۔ پیے ہوئے تھے۔ ریگل سینما کی دوسری منزل کی راہداری میں ایک بوسیدہ میز پر سر ڈالے پڑے تھے اور ایک ادھیڑ عمر کرسچین عورت میز کے دوسری طرف بیٹھی انھیں نمناک آنکھوں سے تک رہی تھی۔

قتیل شفائی اور احمد ظفر میرے ساتھ تھے۔ جب قتیل نے منٹو کا شانہ ہلا کر انھیں جگایا تو کرسچین عورت کو ناگوار گزرا۔ منٹو نے سر اٹھایا اور آنکھیں سکیڑ کر قتیل کی طرف دیکھا۔ قتیل نے ہمارا تعارف کرایا اور کہنے لگے "منٹو صاحب میرے دوست آپ سے افسانہ لینے پنڈی سے آئے ہیں۔"

"مل جائے گا" منٹو نے پیشانی پر سے بکھرے لمبے بال ہٹاتے "میرے پاس ایک افسانہ ہے۔ خالی بوتلیں، خالی ڈبے۔"

"منٹو صاحب" قتیل ہچکچائے "نیا پرچہ ہے۔ خالی بوتلیں، خالی ڈبے چھپا تو مقدمہ کھڑا ہو جائے گا۔"

منٹو آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے اور کہنے لگے "چنگا، پہلی چوری تے ای پھاہے لگن لگے او" پھر بولے "کوئی بات نہیں دوسرا لکھ دوں گا۔ — تیس روپے لوں گا۔"

بس میں فیصلہ ہو گیا۔ احمد ظفر نے دس دس کے دو نوٹ دیئے۔ منٹو نے وہ نوٹ کرسچین عورت کی طرف بڑھا کر کہا "میں نے کہا تھا اللہ مالک ہے۔"

نہ منٹو کا افسانہ ملا اور نہ ہم نے پرچہ نکالا۔

خالی بوتلیں، خالی ڈبے کچھ عرصہ بعد غالباً جاوید میں چھپا تھا۔

ایک بار دہلی میں میری ملاقات راجندر سنگھ بیدی سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں اس وقت کے افسانہ نگاروں کا ذکر چھڑ گیا۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی کی ان دنوں بہت شہرت تھی۔ میں نے بیدی سے پوچھا "منٹو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہنس کر کہنے لگے "منٹو بہت بدمعاش ہے۔"

میں ان کی بات سمجھ گیا۔ اس پر بھی انھوں نے اپنی بات کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس کی اور سنجیدہ ہو کر بولے "منٹو سر سے پیر تک مخلص ہے۔ لوگ کہتے ہیں منٹو مداری تھے، رنگ رنگ کے کاغذ منہ سے نکال کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ اگر دیکھا جائے تو افسانہ نگار — وہ جو ہو گئے، جو زندہ ہیں اور وہ جو آئندہ افسانے لکھیں گے — سب مداری ہیں اور زندگی کا تماشہ الفاظ کے ذریعے دکھاتے ہیں۔ کامیاب مداری وہ ہے جو تماشائیوں کو سحر زدہ کر دے اور منٹو نے تو بڑے بڑوں کو سحر زدہ کیا ہے کیونکہ وہ بہت بڑے فن کار تھے۔ اگر میں انھیں بڑا افسانہ نگار نہیں مانتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود بہت چھوٹا ہوں۔"

میں افسانہ لکھتے لکھتے جب کسی جگہ پھنس جاتا ہوں اور افسانہ آگے نہیں چلتا تو منٹو کو پڑھتا ہوں۔ وہ بھی افسانہ لکھتے وقت کئی بار ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ ایسے موقعے پر بڑی صفائی سے کہتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا یہ بات یوں تھی ـــــ اور پہلے کہی ہوئی بات کو بلا تکلف دہرا دیتے ہیں۔ تکرار افسانے کے تاثر کے لئے مہلک ہونے کے باوجود منٹو کے ہاں بری نہیں لگتی ـــــ وہ بہت اچھے داستان گو تھے

میں منٹو کے فن کی خوبیاں نہیں گنوا سکتا۔ البتہ پڑھے لکھے لوگوں کا کہنا ہے کہ منٹو نے کرشن چندر کی طرح نثر میں شاعری نہیں کی۔ ان کے ہاں زبان کا چٹخارہ نہیں۔ ان کے ہاں بیدی کی سی گہرائی بھی نہیں اور نہ انھوں نے احمد ندیم قاسمی کی طرح یوں بات کی ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت الفاظ کے گھنگھرو کانوں میں چھن چھن بجنے لگیں ـــــ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ منٹو کے ہاں وہ کون سی خوبی ہے جس کی بدولت منٹو کی کہی ہوئی بات دل کو لگتی ہے۔

منٹو کے ساتھ موپاساں اور او ہنری کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تینوں نے اپنے افسانوں میں اکثر ایک سی تکنیک برتی ہے۔ موضوع اور مواد کے لحاظ سے منٹو کا موپاساں اور او ہنری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

منٹو دریا دل رند تھے۔ ان کی زندگی میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جب انھوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کے بارے میں بڑی جرأت اور بیباکی سے برملا اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے منٹو بمبئی سے لاہور آئے۔ ان کے بمبئی میں قیام کے دوران فکر تونسوی خاصا نام پیدا کر چکے تھے۔ ادب لطیف کے دفتر میں کسی نے منٹو اور فکر تونسوی کا تعارف کرایا۔

"آپ ہیں سعادت حسن منٹو اور آپ ہیں رام لال فکر تونسوی"

منٹو نے حیران ہو کر فکر تونسوی کو بڑی سی گالی دی اور کہنے لگے "اوئے تو ہندو ایں!"

اور آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

اس واقعے کا ذکر میں نے یہ بتانے کے لئے نہیں کیا کہ منٹو پکے مسلمان تھے ـــــ وہ جو کچھ بھی تھے مجھے اور آپ کو معلوم ہے ـــــ لیکن اتنی سی بات ضرور ہے کہ ان کا دل آئینے کی طرح تھا۔

اردو ادب میں بے شمار اچھے افسانہ نگار ہیں لیکن اردو ادب کے منشی پریم چند کے 'کفن' سے لے کر اشفاق احمد کے 'گڈریا' تک شاہکار افسانے انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ کرشن چندر، بیدی اور ندیم چوٹی کے افسانہ نگار ہیں ـــــ لیکن میں جب ان کے ہاں ان کا شاہکار افسانہ تلاش کرتا ہوں تو فوری طور پر کوئی افسانہ میرے ذہن میں ایسا نہیں آتا جس کو شاہکار کہہ کر کرشن، بیدی یا ندیم کے نام سے منسوب کر دوں ـــــ اس کے برعکس جب میں منٹو کے ہاں شاہکار افسانہ تلاش کرتا ہوں تو "ممی" "ہتک" "موذیل" "بابو گوپی ناتھ" "نیا قانون" "ٹھنڈا گوشت" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "کھول دو" قطار باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم میں سے منٹو کا شاہکار افسانہ تلاش کرو ـــــ اور میں اس کام کو ہمیشہ اگلی فرصت پر ڈال دیتا ہوں۔

ایوب صابر

ایک مقروض کی وصیّت

(جسارت پر علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

ہے لازم کہ سب ہوں عداوت میں گُم — زن و مرد ہوں سخت نفرت میں گُم
جواں سب کے سب ہوں رقابت میں گُم — قبائل ہوں قرضے کی لعنت میں گُم
کہ ہو قرض لینے کی ہمت بلند

نہ کالوں سے ہے اور نہ گوروں سے ہے — تعلق مرا سود خوروں سے ہے
محبت مجھے اُن چکوروں سے ہے — اُنہی سنگدل کالے چوروں سے ہے
غریبوں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

وہ کہتے ہیں کمبخت ڈر ہی نہ جائے — وصولی سے پہلے گذر ہی نہ جائے
یہ بے فیض حرکت بھی کر ہی نہ جائے — ہماری رقم کھا کے مر ہی نہ جائے
یہ مقروض یہ بچۂ ارجمند

سناؤں تجھے ہمنشیں دل کی بات — یہ ہے ایک اندوہگیں دل کی بات
دلوں میں رہے جاگزیں دل کی بات — بجز اس کے کچھ بھی نہیں دل کی بات
وہ پوشیدہ مدفن ہے مجھکو پسند

جو مدفن ہو محرومِ شان و شکوہ — مرے مہربانوں کو ہو جس کی ٹوہ
وہ بے نام سی تربتِ ارضِ روہ[1] — اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مرے قرض خواہوں کی گردِ سمند

[1] روہ : سابق صوبہ سرحد کا قدیم نام

ارشد میر

موٹاپا

شخصیت سازی کے لئے موٹاپا نسخۂ کیمیا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس امر کے شاہد ہیں کہ موٹاپا اکثر خود بخود آتا ہے۔ لایا نہیں جاتا۔ آپ لاکھ جتن کریں، ہزار پاپڑ بیلیں، اگر آپ کے ہاتھوں میں موٹاپے کی ریکھا نہیں تو آپ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگانے کے باوجود اس خداداد تحفے سے محروم رہیں گے۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے بڑی چابکدستی سے اپنی اپنی دکانداری چمکانے کے لئے یہ شوشہ چھوڑ رکھا ہے کہ موٹاپا بیماریوں کی آماجگاہ ہے چنانچہ ضعیف العقیدہ، بھاری بھرکم، پیدائشی، خود ساختہ اور خاندانی موٹے ان کی مستند رائے سے متاثر ہو کر ڈائٹنگ کرنے اور موٹاپا دور کرنے کی گولیوں کا استعمال کرتے نظر آنے لگے ہیں لیکن ڈاکٹروں، حکیموں کے لاکھ ہاتھ پاؤں مارنے اور ان کے مریدان باوفا کی مکمل پرہیز کے باوجود موٹاپے کا بال تک بیکا نہیں ہو سکا بلکہ موٹوں کے عدد و ارقام یا تعداد و فربہی میں پہلے سے اضافہ ہوتا گیا ہے۔ اکا دکا ڈبل ڈیکر شاعروں اور تھوک ڈیل ڈول کے ادیبوں کو موٹاپے نے کافی سہولتیں مہیا کیں چنانچہ اب یہ لوگ بوقت ضرورت آسانی سے بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے پیٹ کو بطور میز استعمال کر لیتے ہیں۔

دراصل موٹا ہونے میں کئی اصولی اور نادر فائدے مضمر ہیں۔ مثال کے طور پر موٹا آدمی آسانی سے اپنے تیار شدہ پیٹ کو بیک وقت حیثیت میں بطور موڑھا استعمال میں لا سکتا ہے یا فراخ دل ہونے کی صورت میں دوسروں کی خدمت، قدموں میں پیش کر کے انہیں صوفہ سیٹ سے بڑھ کر لطف دلا سکتا ہے۔ پھر چھاوری پیٹ بوقت ضرورت نعمت اور گاؤ تکیہ کا اچھا خاصا نعم البدل ثابت ہو سکتا ہے۔ سیلاب کے دنوں میں موٹوں کو دریاؤں کے ٹوٹتے ہوئے بندوں میں کھڑا کر کے عوام کو عظیم نقصان سے اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا جیسے لایعنی اور فرسودہ نظریے کی بجائے موٹے کا سہارا دے کر بچایا جا سکتا ہے کیونکہ یہ عظیم الجثہ مخلوق نہ صرف بند باندھنے میں کافی موثر ہے بلکہ ان کے چوڑے اور فراخ نما اجسام میں دس بیس ہزار کیوسک پانی جذب کرنے اور کھپانے کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ اکثر سوشل قسم کے موٹوں کو بازار سے بنیان، جوتے، موزے وغیرہ جیسے درست اسے مفت کے اصول کے تحت دستیاب ہو جاتے ہیں جو پھٹنے پر اہل و عیال کی وردیاں اور جوتے بنانے کے کام آ جاتے ہیں۔ رہائش کی قلت اس دور کا سنگین مسئلہ ہے لیکن موٹوں کی آل اولاد آسانی سے اپنے اباجی کے جہازی جوتوں میں خواب خرگوش کے مزے لے سکتی ہے۔ اسی طرح موٹے آدمی کو دیکھ کر بچے دنگ تالیاں پیٹتے، اس کی ٹانگوں میں گولیاں کھیلتے، لمبے چوڑے گھیرے اور چکنے پیٹ پر اچھلتے کودتے کھیل تماشے کرتے پائے گئے ہیں۔ کئی تو مستقل بیوپاری انہی پیٹوں پر بہی کھاتے لکھ کر روکڑ ملاتے ہیں۔ فرخ نارووی نے شاید کسی موٹے کو دیکھ کر یوں کہا تھا کہ:

ہر بحر میں ساحل ہوتے ہیں اس بحر میں ساحل کوئی نہیں

رہی ان حضرات کی کمر جسے کمرہ کہنا زیادہ برمحل اور مناسب ہے تو اس کے بارے میں ایک زندہ دل شاعر کا یہ بولتا ہوا مصرع نذر ہے:

دھوم ہے ان کی کمر کے ناپ کی

یہ حضرات پیٹوں پر کمربند نہیں باندھتے بلکہ کمربندوں پر پیٹ باندھتے ہیں۔ یوں متعدد مرتبہ کمربند ٹوٹنے کی صورت میں ادوائن کی رسی کا استعمال بھی ہو جاتا ہے۔

غالب نے مٹاپے کو رسا باندھ کر شاعرانہ تعلّی نہیں کی بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے چنانچہ رسہ کشی کے مقابلوں میں مخالف ٹیمیں آخر میں ایک موٹے سے کنارے کی کمر میں رسہ باندھ کر بٹھا دیتی ہیں اور پھر جس ٹیم کو جتنا موٹا کھلاڑی دستیاب ہوگا عام طور پر وہی ٹیم فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوگی۔ ان دیوپیکروں کی اکثریت ربع دائم سے نابلد ہوتی ہے وضاحتاً عرض ہے کہ ان میں سے اکثر کا طول البلد تو نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے البتہ عرض البلد ہی عرض البلد ہوتا ہے، اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ایک دفعہ نہ جانے کس ترنگ میں یوں کہا تھا کہ "شیخ جی فربہ تھے ان کی طبع میں جدت کہاں" لیکن صاحب ہمارے محلے کے ایک زندہ دل اور بے حد موٹے نے جدت طرازی کا مظاہرہ رضاکارانہ طور پر خود ہی گرد و نواح کے بچوں کی فوجِ ظفر موج کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ اسکول سے واپسی پر ان کے جسم کو بطور تختی یا سلیٹ استعمال میں لے آئیں چنانچہ اس سہولت کے پیش نظر بچوں کے شیطانی ٹولے میں سے کوئی شوخ و شنگ بچہ قلم دوات لئے ان کے شہتیر نما بازوؤں پر حسب منشا ہندسوں اور پہاڑوں کی مشق کرتا نظر آتا ہے۔ اس عالم میں یہ صاحب بڑے سکون سے مسکراتے رہتے ہیں۔

موٹے آدمی کو حسبِ بقدرِ جثہ کے مصداق والد کی بجائے والدین اور بندے کے برعکس بندگان کہنا چاہیے۔ اس برادری کے لوگوں کو لاری یا گاڑی میں مسافر دیکھتے ہی "چل تو جہاں تو کاروانِ غم" کا ورد شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ کمانی تو ڑ سواریاں دورانِ سفر اونگھنے کی صورت میں جس طرف جھک جائیں اسی جانب لاری یا ریل کار کا رُخ بدل جاتا ہے۔ ایسے ہی حضرات کے حسب حال یہ شعر کہا گیا ہے:

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو   اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

چنانچہ اُٹھنے کی صورت میں کئی دفعہ لمبیں بھگوڑے کھاتی اور ڈولتی دیکھی گئی ہیں۔ بعض میونسپل کمیٹیاں موٹوں کے مکانوں میں پانی کے نل کے کنکشن توڑنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہی ہیں کیونکہ سینکڑوں گیلن پانی ان کے اجسام کو صرف ڈرائی کلین کے لئے درکار ہوتا ہے۔ میونسپل کمیٹیوں کو یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے بلکہ کنکشن توڑنے کی بجائے غسل سے پہلے موٹوں سے سڑک گھسائی اور فٹ پاتھ دھنسائی کا علیٰحدہ ٹیکس وصول کرنا چاہیئے۔ پھر ان پر تہہ بازاری لاگو کرنی چاہیئے۔

موٹوں کا ناپ لینا بھی بڑے دل گُردے کا کام ہے۔ بڑے بڑے اہلِ خیاط ان سے پناہ مانگتے ہیں۔ اکثر لطیف الجثہ درزی تو شرمن ٹینک جیسے پیٹنٹ وضع کے موٹوں کا نام لیتے ہوئے پسینے میں تر اور کبھی کبھار نیم بیہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ ان گرانڈیل شخصیتوں کا یہ دلچسپ پہلو خوب ہے کہ موسم سرما میں تو ان کے وارے نیارے ہوتے ہیں مگر موسم گرما ان کے لئے وبالِ جان بن کے آتا ہے خس کی ٹٹیوں، برف اور پنکھوں سے ایک منٹ چھٹکارا ملا تو پسینے سے شرابور۔ دو چار قدم چلے تو نظامِ تنفس درہم برہم۔ کم خوابی اس دور کا عام مرض ہے لیکن موٹے آدمی کو یہ مرض لاحق نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ شخص قسط وار سونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اگر کسی وقت سونے کے موڈ میں نہ بھی ہو تو بدن کے جس کا کوئی حصہ آرام کرنے کے لئے بیتاب ہو تو یہ بلا چون و چرا اپنی آٹومیٹک مشینری کے اس حصے میں چُپ پیدا کر کے اسے جمہوری تقاضوں کے پیش نظر وہ آزادی دلائے گے، احترام کے نقطہ نظر سے سو جاتے۔ چنانچہ اکثر پیلتن آپ سے بڑے زور کی گفتگو میں مصروف ہوں گے مگر ان کی ٹانگیں یا بازو وغیرہ سوئے ہوں گے۔

انگلستان کے مشہور ڈرامانگار برنارڈ شا اپنے ہم عصر معروف موٹے مزاحیہ انشا پرداز چسٹرٹن کو "ہمسفر" ڈٹن کہا کرتے تھے۔ ٹن کے سلسلے میں مزاحیہ شاعر جناب مجید لاہوری مرحوم کا ایک لطیفہ بھی حاضر خدمت ہے۔ ایک دفعہ انھیں ایک دھان پان سا عقیدت مند ملنے آیا تو وہ دورانِ گفتگو انھیں بڑے انکسار اور عاجزی سے جناب من کے خطاب سے نوازتا چند بار اس گردان کو سننے کے بعد مجید لاہوری کی رگِ ظرافت پھڑکی اور انھوں نے پان کی جگالی کرتے کرتے بڑی سنجیدگی سے فرمایا "حضرت انکسار، کسرِ نفسی اور تحمل سے کام نہ لیجیے۔ مبالغہ نہیں تو کم از کم صاف گوئی سے کام لے کر میری سو فیصدی خالص تعریف فرماتے ہوئے مجھے جنابِ ٹن ہی کہہ لیجیے کیونکہ مجھے من کا خطاب دینا تو پہاڑ کو رائی اور ہاتھی کو چیونٹی بنانے کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں تو من چالیس سیر کا ہوتا ہے لیکن ایران میں من تین کیلو یعنی سوا تین سیر کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے تو شیر خوار بچے کو بھی جنابِ من کا خطاب عطا کیا جا سکتا ہے:"

موٹوں کو دیکھ کر اکثر گھوڑے بدکتے دیکھے گئے ہیں۔ چنانچہ موٹی سواریوں کو تجربہ کار اور خرانٹ کوچوان تانگے کے عقب سے سوار کراتے ہیں اور گھوڑے بے خبری میں مارے جاتے ہیں۔ موجودہ ٹیڈی اور دبلے موٹوں کے برعکس پرانے زمانے میں ان دیوہیکلوں کا ہاتھی تک بھی وزن برداشت کرنے سے قاصر تھے، چنانچہ حالیہ ریسرچ کے مطابق راجہ پورس کی شکست کا واحد سبب بھی اس کے توندیل سپاہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تاریخی شکست کے بعد برصغیر کی فوجوں میں توندیلوں کو قانوناً و حکماً بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ میرے ایک قریبی موٹے دوست جنھیں میں متحرک پہاڑ کہتا ہوں، بڑے خوش خور ہیں۔ ان کی زندگی کا ماٹو یہ ہے:

میں شہیدِ دیگ ہوں ہوٹل میں ہو تربت مری خانساماؤں کے کندھوں پہ اٹھے میت مری

خوش خوراکی کے بعد ان کے افضل الاشغال میں سے ایک یہ ہے کہ وہ خاندانی یا پلے پلائے گھوڑے ٹیسٹ کرتے رہتے ہیں۔ گزشتہ سال ایک یخ بستہ رات کو ایک کوچوان لاہور شہر کے ایک چوراہے میں گلے کی رگیں پھلا پھلا کر نیلا گنبد جانے والی دو سواریوں کو مفت لے جانے کی خوش خبری سنا رہا تھا۔ اس دلچسپ گرانی آواز پر میں تانگے کے نزدیک گیا تو وہ پرشکوہ شخصیت پچھلی سیٹ پر براجمان تھی اور بے چارا کوچوان کافی دیر سے وزن برابر کرانے کے لئے صلائے عام کی رٹ لگا رہا تھا۔ بچوں قسم کے ایک اور موٹے حضرت کا واسطہ ایک زندہ دل گرچکڑ کوچوان سے پڑا۔ انھوں نے ایک دفعہ لاہور ریلوے اسٹیشن پر ایک کوچوان سے پوچھا "کیوں میاں چوک لکشمی کے کتنے پیسے لوگے؟" کوچوان نے ایک آدھ منٹ تک ان کا جائزہ لیا اور پھر بڑے دلربایانہ بلکہ دوکاندارانہ سے کہی "صرف دو آنے فی من!"

اسی طرح ڈبل عرض کے ایک ایسے ادیب کا بھی ایک واقعہ ہے جس کی توند اس انداز سے آگے بڑھی ہوئی تھی جیسے اس نے توند کو آگے روانہ کر دیا ہے اور خود اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ ادیب نے بڑی شان سے تانگے والے سے پوچھا "کیوں بھئی موچی دروازے کے کتنے پیسے؟" تانگے والے نے کہا "صرف ایک روپیہ" ادیب درشت لہجے میں بولا "غضب، خدا کا دلی دروازہ سے موچی تک کا ایک روپیہ؟ میاں ہوش کے ناخن لو، میں تو صرف آٹھ آنے دوں گا۔" اس پر مرنجان مرنج کوچوان بولا "منظور ہے حضور لیکن اس شرط پر کہ دو پھیرے کیجئے، نصف پہلے چھوڑ آؤں گا اور نصف بعد میں لے جاؤں گا۔"

انگلستان میں حال ہی میں ایک "ایکسٹ گرتھ کلب" بنائی گئی ہے جس کی جملہ اراکین موٹی اور جسیم عورتیں ہیں۔ یہ کلب تھوڑے ہی عرصے میں اپنی کشش اور انفرادیت کی بنا پر کافی مقبول ہو چکی ہے۔ موٹے مردوں اور پرستارانِ فن موٹاپا کے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے۔ انھیں بھی پہلی فرصت میں ایک "گرینڈ ٹرنک مینز کلب" یا "ڈبل ڈیکر مینز ایسوسی ایشن" کا اہتمام کرنا چاہئے۔

مظفر حنفی

وقت کے حمام میں

ٹھیک پندرہ سال بعد
وہ مجھے کل شام اک بھٹیار خانے میں ملا تھا
دیر تک اک دوسرے سے ہم گلے ملتے رہے
اور لنگڑی یاد کو سگرٹ سے سلگاتے رہے
اُس نے کہا:
یاد ہے وہ اُونٹ جو انگلش پڑھاتا تھا ہمیں ؟
وہ چنے کے کھیت والا واقعہ ؟
رات میں گنّے کی چوری ؟
دوپہر میں آم کے باغوں پہ ڈاکے ؟
اور لوگوں کا ہمیں ہمزاد کہنا ،

یاد ہے ؟
مسکرا کر میں نے اپنا سر ہلایا اور پوچھا :
کیا تمہیں بھی یاد ہے
گاؤں کا گندہ سا وہ تالاب ؟
ہم ننگے نہاتے تھے جہاں ؟
وہ ہنس پڑا
دیر تک اک دوسرے کو دیکھتے
خاموش ہم بیٹھے رہے
ان کہی باتوں کو بھی سنتے رہے
آخرش میں نے کہا:
آؤ تم کو شہر کے کچھ خاص لوگوں سے ملاؤں
اُس کی بوسیدہ قمیص اور "چیتھڑا پتلون" ہکلانے لگے
"یار کل سے پاؤں میں تکلیف ہے ! "

جابر علی جابر ـــ خالد احمد ـــ زاہد فارانی

میری رائے میں ـــ

ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا شعری تجربہ

تازہ فنون میں قاضی عبدالقادر کا مضمون پڑھ کر افسوس بھی ہوا اور حیرانی بھی۔ افسوس اس لئے کہ آپ نے اسے سنجیدگی سے چھاپ دیا اور حیرانی اس لئے کہ آخر صاحبِ مضمون کا مقصد کیا ہے؟ مضمون کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعری تجربے کی اصطلاح کو یک قلم موقوف کر دینا چاہیے کیونکہ یہ منطقی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عبدالقادر صاحب نے اپنے اعتراضات کی بنیاد کن نقادوں یا نقاد شاعروں کے "بیانات" پر رکھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ لاہور کے چند شور مچانے والے نوجوانوں کی باتوں سے انہوں نے شعری تجربے کے متعلق کچھ الٹی سیدھی باتیں سن لی ہیں اور ان باتوں کی "جزویت" سے فائدہ اٹھا کر اور منطق کی کسوٹی پر کس کر "شعری تجربے" کو بے معنی قرار دے دیا ہے اور یوں اپنی "منفیانہ تحلیل" سے اس اصطلاح کو "ہوا میں تحلیل" کر دیا ہے۔

قاضی صاحب فنِ شاعری اور فنِ تنقید سے یکسر بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انہوں نے اسی سال فلسفہ میں ایم اے کیا ہے اور نوجوان دانشوروں کی الٹی سیدھی باتیں سن کر "شعری تجربے" پر پل پڑے ہیں۔ انہوں نے فنِ شاعری یا فنِ تنقید پر کبھی غور نہیں کیا ورنہ وہ منطق کے ہتھیار لے کر حملہ آور نہ ہوتے۔ اس میں قصور سراسر ان نوجوان نقاد و شاعروں کا ہے جو نئی تحریکیں چلانے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ جب سے سمبلزم، امیجزم، آہنگ پرستی اور ایسی چھوٹی چھوٹی تحریکیں چلی ہیں اور ان کے بانیوں نے ایک دو نظمیں لکھ کر شہرت کمائی ہے، اور پھر چند سال کے بعد ہیوم جیسے سرپھرے دانشمند تاریخِ ادب میں اپنا نام لکھوانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمارے نوجوان بھی ان کی نقل کرتے ہیں اور گروپ بنا کر اور انجمن توصیف باہمی بنا کر تحریکوں کے بانی اور ارکان بن جاتے ہیں۔ تفصیل کی ضرورت نہیں، ہماری تنقید میں عجیب و غریب قلابازیاں لگائی جا رہی ہیں۔ آج سے سو سال پہلے میتھیو آرنلڈ نے انتشار کا رونا رویا تھا۔ آج اگر آرنلڈ آ کر دیکھے تو اسے انتشار کے صحیح معنی سمجھ میں آ جائیں۔ قاضی صاحب نے کسی اہم مغرب زدہ نوجوان شاعر سے سوال کیا ہوگا کہ کیا شاعری اپنا معروض آپ ہے؟ ظاہر ہے جواب دینے والا اعظم شاعر کیسے نہ کہے کہ شاعری اپنا معروض آپ ہی ہے۔ وہ معروض کے مفہوم سے آگاہ ہو نہ ہو منطقی نے اپنی منطق کا وار کر دیا اور "شعری تجربہ" دیوالیہ ہو جائے گا۔ دوسرے اعتراضات یعنی شاعری کی جزوی تعریفوں (عضویاتی تبدیلی، تصوریت، وغیرہ) سے فائدہ اٹھا کر کئے گئے ہیں۔ غرض شاعری کو نادان دوستوں نے مروا دیا اور شعری تجربے جیسی کارآمد اصطلاح کو قاضی صاحب کی منطق نے نئے سرنگوں کر دیا۔ میں نے اوپر چھوٹی چھوٹی تحریکوں کا ذکر کیا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی تحریکوں کے پیچھے دو چیزیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ جلد شہرت پانے کا جنون اور اوریجنل ہونے کا وہم۔ یہ نوجوان بوڑھے پروفیسروں کو بھی نرم کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نے مجید امجد کو عظیم موجد کہا کیونکہ انہوں نے اردو شاعری کے آہنگ کو ناقص قرار دیا تھا۔ ایسی گندی ذہانت اور جدت آج اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ ورنہ ہم آپ سے سیدھے سادے اور غیر معروف کو اوتار ہی ہے۔ شاعری کی جامع تعریف تعداد سے ہو نہیں سکتی۔ جدت کی داد لینے کے لئے لازمی ہو جاتا ہے کہ شاعری کے کسی ایک پہلو کو لے کر اس پر ایک نئی تحریک (ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا اسی کو کہتے ہیں) کی بنیاد رکھی جائے جیسے علامت نگاری، امیجزم، آہنگ پرستی وغیرہ وغیرہ۔ کیا آپ سلیم احمد، ظفر اقبال اور افتخار جالب کے ہتھکنڈے نہیں دیکھ رہے ہیں؟

یہ سے خانوں میں بیٹھ کر پاگلوں کی طرح شور مچا مچا کر ادھیڑ عمروں کو نئے تصورات کی تیز روشنی سے چندھیانا اس گروہ کا امتیازی کارنامہ ہے۔ یہ گر انھوں نے ایلیٹ سے سیکھا ہے جس نے پہلے ملٹن کو رگیدا، پھر شاعری کی ایک جزوی تعریف کرکے اپنی شاعری کو آگے بڑھایا۔ پھر ملٹن سے معافی مانگ لی نیز وہ تو زبردست ذہن رکھتا تھا اور ذمہ داری کا احساس بھی۔ اس نے اپنی شاعری کو تنقید اور علمیت سے منوا لیا ہی گر پروفیسر قسم کے شاعر بھی آزما رہے۔ جیلانی کامران، صدیق کلیم قسم کے لوگ۔۔ ابھی چند روز ہوئے جیلانی کامران کو ملتان کے ایک پروفیسر صاحب نے میتھو آرنلڈ سے مشابہت دیدی تو میری یہی طبیعت خراب ہوئی کہ محفل سے باہر نکل آیا۔ دوستیاں استوار کرکے رسالوں پر قبضہ کرنا ایک ایسا طریق کار ہے جو ایسے "مقابلے" کرکے کامیاب ہوتا ہے۔ کراچی میں یہ وبا زیادہ ہے۔ لاہور میں بھی کافی حد تک موجود ہے۔ "سیپ" اور "تحریک" میں شمس الرحمن فاروقی کے مضمون دیکھیے جرأت رندانہ کس طرح شور مچا مچا کر رسالوں پر قبضہ جا رہی ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی "گونگی" نظموں کی خاموشی کو لمبے لمبے مضامین سے پر کرتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو پڑھے لکھے ہیں مگر بدقسمتی سے اچھے شاعر نہیں ہو سکے۔ اس لئے جرأت رندانہ مضامین کی مدد سے اپنی شاعری کے بازار کو رونق دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ساقی فاروقی صاحب کی کتاب کے اشتہار کے ساتھ ان کا جو شعر منسلک ہوا ہے، بالکل بے، تراندر کا رہے۔ خصوصاً دوسرا مصرع:

تو کالی گھٹا ہے آ برستی کیوں نہیں جاتی

استفہامی انداز نے مصرع کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ ساقی فاروقی، اعجاز فاروقی، شمس الرحمن فاروقی کے مضامین اور لمبے لمبے خطوط پڑھ کر توقع ہوتی ہے کہ نظمیں بھی اچھی ہوں گی۔ مگر جب نظمیں پڑھتے ہیں تو ہمیشہ "دو چار ہاتھ لب بام رہ جاتا ہے" یقین جانیے پچھلے فنون (شمارہ ۶) میں فہمیدہ ریاض کی نظموں اور باقی صدیقی کی غزلوں کے سوا مجھے کچھ پسند نہیں آیا (فیض کی نظم "ٹیک آؤٹ" بھی)۔ تازہ شمارے (۷) میں احمد فراز کی نظم صحیح شاعری کا نمونہ ہے یعنی تاثر مکمل اور گہرا ہے۔ نظم "بام" پر پہنچ گئی ہے۔

دیکھا آپ نے جوا قبال کے اس شعر کو:

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو   طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

تجریدی کہا ہے تو یہ یکسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ تصویر بشرط تجرید نہیں ہے۔ اور غزل کا محبوب بھی تجریدی نہیں ہے۔ اس کا سراپا صاف نظر آتا ہے۔ مرقع چغتائی ہی میں دیکھ لیجئے۔ آپ کی بات ایسی ہے جیسے ہمارے بعض علما اشتراکیت کے غلبے سے متاثر ہو کر کہہ دیا کرتے ہیں کہ اسلام بھی اشتراکیت ہے۔

میں نے سنجیدہ ہو کر یہ سطریں لکھی ہیں۔ ایسے مضامین کے پیچھے کوئی تعمیری خلوص نہیں ہوتا۔ صرف اپنی علمیت اور انفرادیت کا رعب گانٹھنا ہوتا ہے۔ اگر صاحب مضمون نے ایک آدھ بھی تنقید کی کتاب پڑھی ہوتی تو کبھی ایسا "منطقی مضمون" نہ لکھتے۔

سید جابر علی جابر (ملتان)

تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

ایک صاحب ایک ادیب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہایت بیباک انداز میں کر رہے تھے کہ ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک اور صاحب نے انھیں ٹہوکا دیا اور اشارہ کیا کہ حضرت تو سامنے ہی تشریف فرما ہیں۔ ان صاحب نے فوراً ان الفاظ میں معذرت طلب کی "میں بہت شرمندہ ہوں، اور بے حد معذرت خواہ۔ مجھے علم نہ تھا کہ آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اگر مجھے علم ہوتا اور رائے کا اظہار بھی ضروری ہوتا تو میں یقیناً اظہار تو اسی رائے کا کرتا لیکن الفاظ یہ نہ ہوتے۔"

شہریار کی کتاب "اسم اعظم" پر حضرت سیف زلفی کا تبصرہ پڑھ کر مجھے یہ واقعہ یاد آگیا۔ یقیناً تبصرے کی موجودہ شکل ادارتی قطع و برید کے بعد نکلی ہوگی اصل تبصرہ تو نہ جانے کیا "چیز" ہوگا۔

شہریار ایک ذہین فن کار ہے اور شاید سیف زلفی صاحب کو بھی اس سے انکار نہ ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ صرف ذہانت کے بل بوتے پر فن کار عظیم فن کار نہیں ہو جاتے۔ اس کے لئے مسلسل محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے جو مشقت کی حدود چھونے لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جناب سیف زلفی شہریار کی ریاضت فن سے مطمئن نہ ہوں لیکن اس بے اطمینانی کا اظہار ایک ادیب کی زبان میں کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح ہم اسے فن میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں کہہ سکتے" تبصرے کا آخری فقرہ نہ ہوتا۔ اگر تنقید اور تبصرہ نگاری اسی چیز کا نام ہے تو اس تبصرے پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا جا سکتا ہے "سیف زلفی کے اس تبصرے کی اشاعت اردو کے تنقیدی ادب میں کوئی گراں قدر اضافہ نہیں ہے۔ لیکن میں کسی حال میں یہ نہیں کہوں گا کیونکہ اس طرح مجھے خود اپنے آپ سے بھی پوچھنا پڑ جائے گا کہ "تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟"

شہریار جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، ایک ذہین باشعور اور باصلاحیت فن کار ہے۔ اس کی شخصیت، اس کے فن کے توسط سے جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں، کافی جاذبیت رکھتی ہے اور اپنے فن کے آئینے میں وہ ہر طرح ایک متوازن شخصیت نظر آتا ہے جو ایک اچھے فن کار اور ایک اچھا مستقبل رکھنے والے فن کار کے لئے بنیادی ضرورت ہے۔

شہریار کی غزل کے بارے میں اچھی رائے رکھنے والا قاری سیف زلفی کا یہ فقرہ پڑھ کر چونک اٹھتا ہے "لیکن غزلوں میں ایک "نئے تغزل کی" نے ہمیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ غزل کو شہریار آگے نہیں بڑھا سکے جبکہ ان کے بعض ہمعصر ان سے آگے نظر آتے ہیں" کسی نقاد کا قول ہے کہ "عظیم شاعری روایت سے کم از کم انحراف سے جنم لیتی ہے" انحراف بہر حال ضروری ہے۔ اسی خفیف سے انحراف میں فن کار کو اپنی شخصیت، اپنا مخصوص لہجہ اور اپنا انداز فکر سب کچھ سمو دینا پڑتا ہے اور یہ پل صراط سے بخیر و عافیت گذرنے سے کم مشکل نہیں مجھے معلوم نہیں سیف صاحب غزل کو آگے بڑھانے سے کیا مراد لیتے ہیں۔ غزل کی موجودہ شکل اتنی "غیر اطمینان بخش" نہیں۔ اگر جدید روایتی شاعری کے بنے بنائے سانچوں میں خوبصورت الفاظ ٹھونس ٹھونس کر شعر پر "شعر" تیار کرنا غزل کو آگے بڑھانا ہے تو یقیناً شہریار غزل کو آگے نہیں بڑھا سکا لیکن وہ اردو غزل کی عظیم روایات کو جو اسے ولی، میر، غالب، حالی، اقبال، ندیم اور فیض سے ملی ہیں آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہے، اس سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن یہ فتویٰ صادر کر دینا کہ "شہریار غزل کو آگے نہیں بڑھا سکے" درست نہیں۔

اس بے دلیل فتوے کے ساتھ ایک اور اعلان بھی فرمایا گیا ہے کہ شہریار کے بعض ہمعصر شعرا اس سے آگے نظر آتے ہیں۔ اس کے لئے صرف یہ عرض ہے کہ اردو ادب پوری رفتار سے تخلیق ہو رہا ہے اور شہریار بھی اس میں اپنا حصہ بخوبی ادا کر رہا ہے لیکن موجودہ تخلیقی ادب کا معیار کیا ہے، کون آگے ہے اور کون پیچھے؟ اس کا فیصلہ میں یا سیف صاحب نہیں بلکہ وقت کرے گا کیونکہ ہم دونوں فرد ہیں اور وقت افراد کی طرح متعصب نہیں ہوتا۔

خالد احمد (لاہور)

فنون ۷ کا جائزہ

زیر نظر فنون (۷) کی سب سے بڑی کشش شفیق الرحمٰن کا طویل مختصر افسانہ "دجلہ" ہے۔ خود "دجلہ" کا لفظ ہمارے شعر و ادب میں ایک تہذیبی علامت کی حیثیت رکھتا ہے، دوسرے افسانہ نگار نے مشرق و مغرب کی قدیم و جدید تہذیبوں کے ملاپ اور ارتقا کی طویل داستان اس خوبصورتی سے

ستائی ہے کہ سو صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی قاری کا ذوق و شوق اور تجسس ختم نہیں ہوتا۔ کسی عظیم ناول کے مواد کو ایک مختصر افسانے میں سمیٹ دینا شفیق الرحمن جیسے ذہین فن کار ہی کا کام تھا۔ ان کے لطیف مزاح، روانیٔ طبع اور قوتِ بیان نے کہانی کو "گیسوئے دجلہ کی طرح" بدار بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ منیر احمد شیخ کا افسانہ "لمحے کی بات" ہمارے ان پڑھے لکھے نوجوانوں کے المیے کا اظہار ہے جو اپنی مغرب زدگی کے باعث حقیقی زندگی سے کٹے ہوئے ہیں اور اطمینان کی دولت سے محروم ہو چکے ہیں۔ محمد خالد اختر کی مہم جوئی بھی کامیاب جا رہی ہے۔ تیکھے انگریزی لہجے میں اپنی سرزمین کی باتیں سنانا انہیں خوب آتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کا انشائیہ بہت پرلطف اور ذہانت آمیز ہے۔ ان کے انشائیے کے بعد ماہرینِ لسانیات پر کامیاب طنز کرنے کا شاید ہی کوئی پہلو باقی رہا ہو۔ شعری تجربے پر غور و فکر کرنے میں قاضی عبدالقادر کی محنت قابلِ داد سہی لیکن میری ناقص رائے میں آمد یا آورد کی پہلی اور آخری شہادت خود شعر ہوتا ہے۔

پروفیسر سعید احمد خاں اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے تجریدی مصوری کے بارے میں آپ کی رائے سے بجا طور پر اتفاق کیا ہے۔ آپ نے ان مصوروں کے ہاں قول و فعل کے جس تضاد کا ذکر فرمایا ہے۔ ہمارے کچھ افسانہ نگار اور شاعر بھی اس تضاد کا شکار ہو چکے ہیں۔ حیرت ہے کہ اپنے معاشرے اور اپنی زندگی سے بے تعلق رہنے کے باوجود یہ لوگ فنکار ہونے کے دعویدار ہیں۔ آپ نے اپنے مضمون میں فنی تجرید کا جو صحیح مفہوم واضح کیا ہے خدا کرے یہ لوگ اسے سمجھ پائیں۔

حصۂ شعر میں مختار صدیقی نے اپنی نظم "حجابات" میں اور احمد فراز نے اپنی نظم "دوزناجرمن نژاد" میں خیال کی جدت اور اظہار و بیان کے حسن کا اچھا امتزاج پیش کیا ہے۔ الیاس عشقی اپنی نظم کا نثر "کٹ برج" اگر رومن رسم الخط میں لکھتے تو قارئین کو پڑھنے میں آسانی ہوتی۔

غزلوں میں شکیب مرحوم کی آخری غزل اُن کی فنی عظمت کا بھرپور اظہار ہے۔ مظفر علی سید، شہزاد احمد اور سیف زلفی کی غزلیں اس بے بنیاد مفروضہ کی نفی کرنے کے لئے کافی ہیں کہ صنفِ غزل میں ہم عصر عہد کے خیالات و مسائل پیش نہیں کئے جا سکتے۔ آپ کی غزل کا مقطع ؎

اب تو پتھر کے زمانے سے نکل آؤ ندیم
اب تو سوچوں کے تصادم سے شرارہ نکلا

ان لوگوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے جو اپنے عہد کی قدروں کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ موجد کے پرمعنی سرورق نے شمارے کا ظاہری حسن دوبالا کر دیا ہے۔

معیاری پرچوں کے اس قحط میں "فنون" کا وجود یقیناً ادب کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ قارئین کو ہم عصر ادبی اقدار سے ہمہ وقت آگاہ رکھنا ہمیشہ "فنون" کا نصب العین رہا ہے۔ "ہمارے شاعر" کے زیرِ عنوان آپ نے نئے شعراء کو قارئین سے ایک وسیع تر پس منظر میں متعارف کرانے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا وہ اسی نصب العین کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا لیکن اس کے بند ہو جانے سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ "فنون" کا یہ عظیم نصب العین کہیں فن کاروں کی انا یا زیادہ کھلے لفظوں میں معاصرانہ چشمک کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے آپ سے اس سلسلے کے دوبارہ اجراء کی درخواست کرنے میں تمام وابستگانِ فن میری ہمنوائی کریں گے اور اہلِ فن سے زیادہ وسیع الظرف کون ہو سکتا ہے؟

زاہد فارانی (لاہور)

فتح محمد ملک —— محمد خالد اختر —— محمد کاظم
آغا سہیل —— سیف زلفی —— حسین شاہد

تبصرے

دردِ آشوب [1]

مصنف: احمد فراز — ناشر: کتاب نگار راولپنڈی

صفحات: ۲۴۰ — قیمت: پانچ روپے

یہ واقعہ ہماری ادبی اور تہذیبی تاریخ میں یادگار رہے گا کہ سن پچاس کے لگ بھگ ترقی پسند ادب کی تحریک اپنی مقبولیت کی انتہا پر تھی۔ حساس اور بے چین نوجوانوں کے لئے اس میں بے پناہ کشش تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سانحہ بھی یادگار رہے گا کہ:

ہو گئے اپنے طراروں میں گرفتار آہو

یعنی اسی دور میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے تنگ نظر ادبی آمریت کو نظریاتی استقامت کا پر فریب نام دیا اور قرار پایا کہ ترقی پسند رسائل اور جرائد میں نہ تو کسی غیر ترقی پسند شاعر کی ترقی پسند نظم شائع ہو گی اور نہ ہی کسی ترقی پسند ادیب کی کوئی تحریر غیر ترقی پسند رسائل میں بار پا سکے گی۔ آزادیٔ اظہار کی خاطر قابلِ فخر اور بے مثال قربانیاں دینے والوں کی انجمن کی طرف سے آزادیٔ اظہار پر اس پابندی نے جس ادبی سیاست کو جنم دیا وہ بالآخر سیاسی ادب تک کی تخلیق میں حائل ہو کر رہ گئی۔ ہوا یہ کہ بسا اوقات ادب کے تازہ واردان کا استقبال کرتے وقت صرف ترقی پسندی پر قناعت کر لی گئی اور یہ نہ دیکھا گیا کہ موصوف ترقی پسند تو خیر ہیں شاعر بھی ہیں یا نہیں —— اس پر مستزاد نقادوں کی سخت گیری۔ ما و شما تو کس شمار قطار میں ہیں، تحریک کے رہنما تک پر نیا قانون والے یا جشن طفولیت ایسے جرم عائد کرنے لگے کہ "دیس خانہ" میں ندیم نے ترقی پسند موضوع کو ندیم کے انداز میں پیش کیا ہے گورکی کے انداز میں نہیں لہٰذا افسانہ غیر معیاری!——
نتیجہ یہ کہ اس فضا میں فنی سفر کا آغاز کرنے والے نوجوانوں کے شعری مجموعوں کو دیکھیے تو ان کی ترقی پسندی پر تو آپ کوئی حرف نہ رکھ سکیں گے البتہ ان میں سے بیشتر کے شاعر ہونے میں آپ کو کلام ہو گا۔ ان کے موضوعات، لفظیات اور تلازمات رسمی ہیں تو جذبات، تاثرات ساختہ اور مصنوعی۔ یہ نئی روایتی شاعری ہے جو سلسلۂ کی ترقی پسند شاعری کی روایت میں غیر تخلیقی مشقِ سخن سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہ شاعری فرد کی شاعری نہیں تحریک کا منشور ہے۔ یہاں ہمارا واسطہ آدمی سے کم اور امیر شہر اور غریب شہر، سرمایہ دار اور مزدور کے سکہ بند تصورات کے بندھے بندھائے مجسموں سے زیادہ۔ ان نوجوانوں کے پاس بھی وہی خنجر نغمہ ہے، بادہ و جام ادجائیت ہے، ناگفتنی رقت ہے جو سردار جعفری جیسے مکمل اور کٹر ترقی پسند بزرگوں کے پاس ہے اور وہ نہیں جو ندیم اور فیض کے پاس ہے یعنی انفرادی فکر اور اپنا انداز بیان، اور جسے آپ ایک لفظ میں سمیٹنا چاہیں تو شاعری کہہ سکتے ہیں۔

---

[1] پاکستان کونسل کے راولپنڈی مرکز میں مصنف سے ملنے کی تقریب میں احمد فراز کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ (تبصرہ نگار)

احمد فراز بھی اسی فضا میں انہی نوجوانوں کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوئے اور انجمن سے ہدایت کے طلبگار رہے مگر اپنے بیشتر ہمسفروں کے برعکس احمد فراز دوسری راہوں پر چلنے والوں کے اندازِ خرام سے بھی متاثر ہوتے رہے۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام میں حفیظ جالندھری کا نام راشد اور باقی صدیقی سے لے کر ناصر کاظمی تک سے گہرے اثرات قبول کرنے کی نشاندہیں بآسانی مل سکتی ہیں۔ نظریاتی گھٹن اور پابندی کے مذکورہ بالا ماحول میں کھل کر سانس لینے اور اپنے ذہن سے سوچنے کی جسارت کر سکنے کا کرشمہ یہ ہے کہ "تنہا تنہا" میں جہاں غزل کے ایسے اشعار موجود ہیں:

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

وہاں "تخلیق" جیسی نظم بھی مل جاتی ہے جہاں فراز کی ترقی پسندی مقامیت سے پھوٹی ہے۔ درحقیقت فراز نے مقبول احمد پوری کی بجائے دورِ اول کے ندیم کی روایت سے منسلک ہو کر رحمٰن عزیز کی شمال مغربی سرحد پر بسنے والے گرد و پیش سے مقامیت سے آفاقیت کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ثبوت پیش کیا ہے کہ بقول فیض احمد فیض "تنہا تنہا شاعری ہے شعر کی نمائش نہیں ہے..... (یہاں)..... خیال اور جذبے کا قالب اور شعر کا لباس الگ الگ دکھائی نہیں دیتے، آپس میں پیوست ہیں۔"

"دردِ آشوب" احمد فراز کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس کا آغاز "تنہا تنہا" کی آخری نظم سے ہوتا ہے۔ یہ نظم "تنہا تنہا" کے مقابلے میں نہ صرف اپنی طوالت اور تکمیل کی بنا پر مختلف ہے بلکہ بعض مصرعوں کو فراز نے بدل کر بہتر بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب فراز کا صحیح دوسرا مجموعہ ہے اور اس میں شاعر نے موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے "تنہا تنہا" سے زیادہ خوبصورت تخلیقات پیش کی ہیں۔ "دردِ آشوب" میں فراز کا احساسِ جمال اور احساسِ لذت پہلے سے زیادہ نکھرا ستھرا بھی ہے اور رنگا رنگ بھی ہے۔ اقتصادی اور سیاسی استحصال کو موضوعِ سخن بناتے وقت بھی ان کی آواز اب اجتماعی سے زیادہ انفرادی لہجہ ڈھونڈتی نظر آتی ہے۔ فتوحات کے ساتھ ساتھ شکستیں بھی نمایاں ہونے لگی ہیں:

وہ پیمان بھی ٹوٹے جن کو ہم سمجھے تھے پائندہ
وہ شمعیں بھی داغ ہیں جن کو برسوں رکھا تھا زندہ

اور وہ ان ناکامیوں پر تخلیقی انداز سے سوچنے میں مصروف ملتے ہیں۔ "شاخِ نہالِ غم" اور میں "اور تو" اس طرزِ احساس کی آئینہ دار ہیں۔

نظم سے ہٹ کر غزل کی طرف آئیے تو میر، غالب اور آتش سے اکتساب فیض کی دھن میں وہ معاصرین اور معاصر مسائل سے اغماض نہیں برتتے۔ ضیا جالندھری نے ان کی کئی ایک نظموں کے بارے میں جو یہ کہا ہے کہ "ان میں کسی دوسرے شاعر کی گونج سنائی دیتی ہے" وہ غزل کے بارے میں بھی سچ ہے خاص طور پر احمد ندیم قاسمی کا اثر روز بروز گہرا ہوتا جا رہا ہے مثلاً فراز کے چند شعر سنیے:

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کر لیں ہم جسے چھو نہ سکیں اس کو خدا کہتے ہیں

اس انتہائے قرب نے دھندلا دیا تجھے کچھ دور جا کہ دیکھ سکوں تیرا بانکپن

ہم نے تجھے دیکھا تو کسی کو بھی نہ دیکھا اے کاش ترے بعد گزرتے کوئی دن اور

ہم کو اس نام نے مارا کہ جہاں بھی جائیں خلقتِ شہر نے طوفان اٹھائے رکھا

ان اشعار پر پہلے ندیم کے بہت سے اشعار یاد آتے ہیں۔ چند سماعت فرمائیے :

نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا   حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

دور سے دیکھا تو پلکوں تک کے سائے گن لئے   جیسے جیسے تم قریب آئے دھواں بنتے گئے

یا

تو اتنا قریب ہے کہ تجھ سے   میں پوچھ رہا ہوں تو کہاں ہے

یوں تو اس جلوہ گہِ حسن میں کیا کیا دیکھا   جب تجھے دیکھ چکے کوئی نہ تجھ سا دیکھا

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے   کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

اپنے بزرگ معاصرین سے استفادے کا ذکر کرکے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلیم احمد کے لفظوں میں ان کی اچھی شاعری اچھی شاعری کو آواز دیتی ہے ورنہ غزل میں تازگیٔ احساس اور رعنائیٔ خیال کی جو کیفیات فرازؔ نے پیدا کی ہیں، وہ ان کی فنی انفرادیت کا بہترین ثبوت ہیں :

اس اک چراغ کی لَو جھومتی ہے آنکھوں میں   تمام شہر ہو روشن تو اپنا گھر دیکھوں

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ   گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

وہ خار خار ہے، شاخِ گلاب کی مانند   میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اُسے

ان اشعار میں اُس رنگِ سخن کے ابتدائی نقوش موجود ہیں جسے ہم آگے چل کر رنگِ فراز کہہ سکیں گے بشرطیکہ فرازؔ موجود کامیابیوں پر قناعت کئے بغیر خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھ سکیں

فتح محمد ملک

دو پاٹن کے بیچ

تصنیف : رضیہ فصیح احمد   اشاعت : مکتبۂ ادبِ جدید، لاہور

صفحات : ۲۱۵   قیمت : پانچ روپے

یہ رضیہ فصیح احمد کے سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے دو افسانے "فنون" کی بعض گزشتہ اشاعتوں میں شائع ہو چکے ہیں کسی افسانے سے لطف اندوز ہونے کی سب سے اچھی صورت تو یہی ہے کہ اسے علیحدہ کسی رسالے میں پڑھا جائے۔ ایک مجموعے میں شائع کے ساتھ شائع ہوئے افسانے ایک پکچر گیلری کا سا تاثر دیتے ہیں جس میں ایک تماشائی تصویروں کے جنگل میں کھو کر رہ جاتا ہے، اور جب وہ کچھ لمحے فن کی اس نمائش کے درمیان بسر کرکے باہر آتا ہے تو اس کے ذہن پر کسی ایک فن پارے کا متعین اور دیرپا تاثر نہیں ہوتا، بلکہ سب فن پاروں کا ایک ملا جلا بھرنگ قسم کا تاثر ہوتا ہے جو آسمان کی دھنک کی طرح تھوڑی

دیرہ کر زائل ہو جاتا ہے ——— لیکن جب تک انسانوں کی اس دنیا میں افسانے لکھے جاتے رہیں گے، ان کے مجموعے بھی چھپتے رہیں گے، اور پھر افسانوں کو رسالوں کے اوراق میں چھوڑ دینا بھی تو انھیں گویا فنا و نسیان کے گھاٹ اتار دینا ہے۔ کتنے ایسے افسانے ہوں گے جن سے ہم نے اپنی زندگی کے کچھ لمحوں کو فروزاں کیا تھا اور جن کی لو ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں ابھی تک جلتی ہے لیکن وہ ہم سے ہمارے بچپن کی طرح ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے ہیں۔ ہم ان سے شاید پھر کبھی دوچار نہ ہوں گے ———

اس صورت حال میں سب سے اچھا طریقہ وہ ہے جو میں نے اس کتاب کے مطالعہ کے لئے اختیار کیا۔ کچھ اوپر دو سو صفحوں کی یہ چھوٹی سی کتاب اگر میں لے کر بیٹھ جاتا تو یہ بمشکل جاڑوں کی ایک لمبی، ٹھٹھری ہوئی رات میں میرا ساتھ دے سکتی لیکن میں نے ایسا نہ کیا، بلکہ اس کتاب کو سات آٹھ روز یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصے میں پڑھا۔ میں اس سے ایک افسانہ پڑھ لینے کے بعد کتاب کو بند کر دیتا اور کچھ وقت اس افسانے کی دنیا میں، اس کے کرداروں کے ساتھ گھل مل کر بسر کرتا۔ جیسے کسی میچ کے وقفے کے دوران تماشائی میدان میں آکر کھلاڑیوں کی پیٹھ تھپکتے اور ان سے ہمدردی جتانے لگتے ہیں ——— میں نے محسوس کیا کہ یہی طریقہ افسانوں کے پڑھنے کا موزوں ترین ہے، اور اس طرح پڑھے ہوئے افسانوں کے متعلق انسان اگر کوئی بات کرے تو وہ اتنی ہلکی اور سطحی نہیں ہوگی ———

لیکن کیا آپ یہ طریقہ افسانوں کی ہر کتاب کے ساتھ برت سکتے ہیں؟ ——— میرے خیال میں یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ افسانے فی الواقع اتنے اچھے اور کامل مسرت پہنچانے والے نہ ہوں کہ آپ کچھ لمحے ان کی دی ہوئی اس خوشی میں گزارنا پسند کریں! ایک کامل مسرت کا ——— چاہے اس کا تعلق انسان کے کسی حاسہ سے ہو ——— ہمیشہ ایک 'مابعد' (AFTERMATH) ہوتا ہے جس میں انسان پر دیر تک ایک ٹھنڈا، دھیما سرور اور ڈھلان پر سے نیچے اترنے کی کیفیت طاری رہتی ہے (ڈاکٹر دین ڈی ویلڈی کے مسرت کے گراف بھی اسی حقیقت کے عکاس ہیں) ——— اور مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ "دو پاٹن کے بیچ" کے افسانے واقعی اتنے اچھے اور کامل مسرت پہنچانے والے ہیں!

رضیہ فصیح احمد ہمارے موجودہ ادبی منظر میں اب تک مشاہیر کی دوسری صف کی ممتاز شخصیتوں میں سے تھیں۔ یعنی کسی ادبی مجلے کے پوسٹر پر ان کا نام جلی قلم سے لکھے ہوئے ناموں کی اگر پہلی دہائی میں نہیں تو دوسری دہائی میں ضرور نمایاں ہوتا تھا۔ اب ان کے ناول "آبلہ پا" کے انعام پانے کے بعد مشاہیر کی پہلی صف پر ان کا دعویٰ قائم ہو جانا چاہیے لیکن اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ اب تک سیکنڈ ریٹ تھیں! وہ یقیناً فرسٹ ریٹ تھیں، اور ان کے افسانوں کی اس کتاب کو پڑھ کر کوئی بھی انھیں سیکنڈ ریٹ نہیں کہہ سکتا۔

ان صفحات میں اس سے پہلے بھی افسانوں کی بعض کتابوں کا جائزہ دیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں یہ خاص بات یہ دیکھنے میں آتی تھی کہ وہ ہمیں اپنے گرد پوش پر، اندر اور باہر اپنے موضوع اور مصنف کے متعلق بہت کچھ بتاتی تھیں۔ ان میں سے کسی کتاب کے فلیپ پر کوئی افسانہ نگار قلعہ توڑ کر افسانے کی قلمرو میں داخل ہوتے ہوئے دکھایا جاتا، اور کسی کے سرورق پر آفتاب و ماہتاب کے طلوع ہونے کا منظر کھینچا جاتا، اور بعض دوسری کتابوں کے آغاز میں ادب کی بزرگ ہستیوں کے پیٹھ تھپکنے والے مقدمے ہوتے، جن میں ادب اور اہلِ ادب کو بہت سہانے مستقبل کی خوش خبری سنائی جاتی ——— وہ ہمارے رویے کی ایک صورت تھی، اور ہمارے رویے کی ایک دوسری صورت اس کتاب میں ہمارے سامنے آئی ہے جس میں کوئی مقدمہ یا پیش لفظ نہیں ہے، ادب کے حال یا مستقبل کے بارے میں کوئی اظہار خیال نہیں، اور گرد پوش پر اندر یا باہر کوئی تحریر نہیں جس سے کم از کم اتنا ہی پتہ چل سکتا کہ رضیہ فصیح احمد کون ہیں، کب سے لکھ رہی ہیں، اور کیا لکھ رہی ہیں؟ اور ان کی اب تک کی تخلیقات کے بارے ادب کی پرکھ رکھنے والوں نے کیا رائے قائم کی ہے! یہ معلومات بہت ضروری اور بنیادی ہیں جنھیں، ایک قاری کسی کتاب کے سرورق پر ہمیشہ دیکھنا چاہتا ہے لیکن ہمارے ناشر صاحبان نے خدا جانے کیوں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ یا تو اپنی کتاب کے سرورق پر کاتب اور نقاش کے کرشموں کا مظاہرہ کریں گے اور ستائش اور تحسین کی آتش بازیاں چھوڑیں گے، ورنہ پھر پورا سرورق خالی رکھیں گے جس سے کتاب اور اس کے مصنف کے ہر طرف اور پس منظر میں دور دور تک تاریکی چھائی رہے گی ——— ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک اعتدال کی راہ بھی ہے جو کاش ہمارے ناشر حضرات انگریزی مطبوعات میں اور خاص کر پیپر بیک کتابوں کے سلسلوں میں، اندر

کی جانب اور پشت پر ملاحظہ کر سکتے!

اب کچھ باتیں ان افسانوں کے متعلق! ——— "دو پاٹن کے بیچ" کے افسانوں میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ ہے ان کا تنوع۔ ان کے موضوع عام روش سے کچھ ہٹ کر ہیں۔ افسانے تو یہ سب آج کے اسی معاشرے سے لئے گئے ہیں جس میں ہم آپ اور رضیہ فصیح احمد رہتے ہیں لیکن ان کی فضا اور کردار ایک سے نہیں ہیں اور افسانہ نگار کہیں بھی اپنے آپ کو دہراتی ہوئی محسوس نہیں ہوتیں۔ پھر ان کے موضوعات میں ایک نیا پن اور تازگی ہے۔ عورتوں کے افسانوں کا ماحول عموماً گھریلو ہوتا ہے اور ان کے کرداروں کا عمل زیادہ تر چار دیواری کے اندر ہی واقع ہوتا ہے۔ باورچی خانے میں، تخت پوش پر یا ڈرائنگ روم میں! رضیہ کے افسانوں میں اس کے برخلاف کھلی ہوا اور دھوپ کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ان کے کردار ایک وسیع اور کھلے ہوئے کینوس پر اپنی چلت پھرت دکھاتے ہیں۔ وہ پہاڑوں پر آتے جاتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں، سیر و تفریح کرتے ہیں، کاریں چلاتے ہیں! ——— ہمارے یہاں جب اچھی انگریزی فلموں کی نمائش ہوا کرتی تھی تو ہم یہ دیکھ کر متحیر ہوتے تھے کہ ان میں سے کسی ایک فلم کی تھیم بھی دوسری فلم سے میل نہیں کھاتی تھی (یہ ایجنٹ 007 وغیرہ کے زمانے سے پہلے کی بات ہے!) اور ہم سوچتے تھے کہ مغرب میں زندگی کیونکر اتنی ہمہ رنگ اور گوناگوں ہو سکتی ہے! افسانوں کی یہ کتاب ہمیں یاد دلاتی ہے کہ زندگی ہمارے یہاں بھی، باوجود اپنی ظاہری سادگی اور یکسانی کے، کچھ کم گوناگوں نہیں ہے، سوال صرف آنکھیں کھلی رکھنے، اور اس زندگی کو قریب سے دیکھنے کا ہے!

ایک دوسرا وصف ان افسانوں میں ان کی فنی پختگی اور ان میں کہانی کہنے کا وہ سیدھا اور قدرتی اسلوب ہے جو شروع سے آخر تک چلا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے کہیں بھی تکنیک کے کرتب دکھانے کی کوشش نہیں کی، نہ افسانوں کے اسلوب کو خواہ مخواہ گمراہ پُراسرار اور شاعرانہ بنانا چاہا ہے۔ اور نہ ان میں کہیں بلا ضرورت شعور کی رَو (stream of consciousness) ہنڈائی ہے۔ ان کے پلاٹ اصل زندگی کے بہت قریب اور قابلِ تسلیم قسم کے ہیں۔ ان میں کوئی ڈرامائیت نہیں، کوئی تیزی و تندی نہیں، کوئی melodrama نہیں! اس کے باوجود ان کی کہانیاں دلچسپ اور گرفت کرنے والی ہیں، اور ان میں سارا کمال رضیہ فصیح احمد کے کہانی کہنے کی اس غیر معمولی صلاحیت کا ہے، جو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے اور جس کے بغیر کوئی افسانہ نگار، افسانہ نگار نہیں بن سکتا۔

اس کتاب میں بعض افسانے بلاشبہ شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ چاہے کسی زبان میں لکھے جاتے ان کا شمار منتخب افسانوں میں ہی ہوتا تھا۔ ان میں "دو پاٹن کے بیچ"، "جوا"، "یہ دکھی مائی"، "یہ گم نصیب"، "یہ کبھی شعلہ کبھی شبنم"، "پامسٹ" اور "ماموں" شامل ہیں۔ کچھ دوسرے افسانے ہیں جو ان سے کمتر ہیں لیکن ان کو پڑھتے ہوئے بھی آپ کو افسانہ نگار کی خامکاری یا ناپختگی کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔ فن کا ایک کم سے کم معیار ان میں بھی قائم ہے۔ کہانی کہنے کے انداز میں وہی دلکشی ہے، شعور و احساس میں وہی خلوص اور متوازن کیفیت ہے اور اسلوب میں وہی بے ساختگی اور بے ریائی ہے۔ ایسے افسانوں میں اگر کچھ کمی محسوس ہوتی ہے تو اس پہلو سے کہ ان میں کہانی کی اٹھان اور اس کے نقطۂ عروج یا اس کے عروج اور اس کے مابعد میں وہ توافق قائم نہیں ہوتا جو ہمارے نزدیک فن کا کم سے کم تقاضا ہے اور جس سے کہانی ایک یونانی مجسمے کی طرح خوش قامت اور متناسب الاعضاء دکھائی دیتی ہے کہیں نقطۂ عروج کچھ زیادہ ہی سیدھا اور سپاٹ ہو کر رہ گیا ہے، جیسے "بدلہ" میں! ——— کم از کم میری حسِ انتقام اس بات سے بالکل آسودہ نہ ہوئی کہ میرے رسالے اور کتابیں دوسرے ڈبے میں اس جھگڑالو مسافر کے سر پر گر گر کر ناس ہو رہے ہیں جس کو چھوڑ کر میں گاڑی کے دوسرے ڈبے میں چلا آیا تھا۔ اور کہیں ان کا مابعد (anticlimax) ضرورت سے زیادہ مختصر اور تشنہ محسوس ہوتا ہے، جیسے "پچھتاوا" میں! اس کہانی میں آخری پیراگراف یا تو بالکل نہ ہوتا۔ کہانی ——— منٹو کے سٹائل میں ——— ختم ہوتی:

"نہیں اصلی ہے۔" عدنان نے اپنی بات کے جواب میں پھول کی ساری پتیاں نوچ کر قالین پر پھیلا دیں اور خود کسی سوچ میں دور چلا گیا ———!

یا پھر اس کے اندر جذبات میں ہلچل برپا کرنے والی کیفیت کچھ زیادہ ہونی چاہیئے تھی۔ اس پیراگراف پر اگر مصنفہ کچھ زیادہ محنت کرتیں تو اس کا علاج انہیں ضرور ملتا، اور ان کی کہانی کا تاثر زیادہ گہرا اور دیرپا ہو جاتا! —— لیکن ایسے افسانے بھی اپنے لطف کے بغیر نہیں، اور رضیہ فصیح احمد کے کہانی کہنے کا انداز ایسے افسانوں میں بھی قاری کی دلچسپی کو کہیں سست اور خوابیدہ نہیں ہونے دیتا۔

گجرات کے شاہ دولہ کے چوہے ہم سب نے دیکھے ہوں گے۔ چھوٹے چھوٹے سروں والے، اور پنکھے جیسے کانوں، اور ڈھیلی ہوتی باچھوں والے یہ بیلٹے ہمارے خانقاہی ماحول کا ایک ایسا عجیب اور المناک نمونہ ہیں جن کے متعلق میں جتنا بھی سوچتا ہوں سوائے دکھ اور گھٹن کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ رضیہ فصیح احمد نے ایک ایسے ہی بیلٹے کے کردار کا مطالعہ بڑی ہمدردی اور حقیقت پسندی کے ساتھ اپنی کہانی "چوہا" میں کیا ہے۔ اس کہانی کی شہلا کو خاندان کے باہمی تعلقات کی وجہ سے ایک چوہے اجی کے ساتھ ہمدردی ہو جاتی ہے۔ اور اس عجیب الخلقت لڑکے کا خیال اس کے ذہن میں اس طرح بس جاتا ہے کہ جب وہ آرٹ کی کلاس میں اپنے ہاتھ سے پہلی مورت بنا کر پیش کرتی ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اسی چوہے ہی کی ہوتی ہے۔ اُنس اور ہمدردی دو طرفہ ہوا کرتی ہے چنانچہ اجی بھی شہلا کی ذات میں دلچسپی لینے لگتا ہے، اور —— شاید اسی وسیلے سے —— اس کا جنسی شعور بیدار ہو جاتا ہے، اور وہ بیچارہ اس عجیب بے نام جذبے کے ہاتھوں بڑی ٹھوکریں اٹھانے لگتا ہے:

> جب وہ سکول جانے کے لئے نکلتی تو اجی رات کے کپڑوں میں سڑک پر کھڑا سکول جانے والی لڑکیوں کو حسرت سے دیکھا کرتا……
>
> جب وہ پاس سے گزرتی تو وہ اسے ہاتھ اٹھا کر اپنی موٹی آواز میں سلام علیکم کہتا۔ ……سکول کے اندر کی سڑک پر جیتی ہوئی وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی وہیں کھڑا رہتا، پھر لوٹ آتا۔ شروع شروع میں نہ اس کے پروگرام میں اتنی باقاعدگی تھی، نہ شہلا نے اس طرف دھیان دیا۔ مگر اس کے آٹھویں کلاس میں پہنچتے پہنچتے اجی کا سڑک پر کھڑے ہو کر سلام علیکم کہنا اور پھر گرجے میں آ کر آ بیٹھنا اتنا ہی اٹل ہو گیا جتنا سورج کا طلوع ہونا"

یہاں سے تو ٹرسے ڈیم ڈی پیرس کے اُس کوزہ پشت کی کہانی شروع ہوتی ہے جو باوجود اپنے جسمانی عیب اور بدصورتی کے اپنے سینے میں ایک سچا اور اُجلا دل رکھتا تھا اور اس میں از امیرالڈا کی خانہ بدوش جوانی نے آ کر ڈیرا ڈال دیا تھا —— ایک دن جب ایک نا عاقبت اندیش ہمسائی نے اجی اور شہلا کی موجودگی میں اجی کی شادی کا ذکر اس کی ماں کے سامنے چھیڑا تو وہ جیسے مسرت سے بے قابو ہو گیا:

> "وہ خوشی کے جنون میں اس کی طرف اشارہ کر کے پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور پنکھے کی طرح کھڑے ہوئے کان مارے خوشی کے سرخ ہو گئے تھے، اور وہ مارے شرم کے گلنار ہو گئی تھی۔ سب کے ہنس پڑنے پر وہ کیسی بے تحاشا اُٹھ کر وہاں سے بھاگی تھی!……"

لیکن اس کہانی کی از امیرالڈا کسی ایسے المیے سے دو چار نہیں ہوتی اور نہ اس کی خاطر کوزہ پشت کو جیتے جی اس کی نعش کے پہلو میں خاک ہونا پڑتا ہے۔ اس میں حالات کچھ مختلف رخ پر چلتے ہیں جب اس چوہے کا یہ آسودہ جنسی جذبہ مرض کے دوروں کی خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے تو شہلا مالی قربانی دے کر، اور ساتھ ہی اپنے خاندان کی نیک نامی کو خطرے میں ڈال کر اس کے لئے ایک کرائے کی عورت کا بندوبست کرتی ہے، اور اس طرح اسے بے موت مرنے سے بچاتی ہے۔

شاہ دولہ کے ان چوہوں میں جنسی جذبہ واقعی اتنا صحتمند اور توانا ہوتا ہے یا نہیں، اس کے متعلق تو ماہرین ہی بہتر جانتے ہوں گے (یا خود شاہ دولہ کے چوہے!) میرے سامنے البتہ ایک مثال ایسی ضرور ہے جس سے افسانہ نگار کے مشاہدے کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے شہر میں ایک آوارہ مزاج عورت ایک ایسے دیوانے لڑکے کی طرف مائل ہو گئی جسے نہ اپنے کپڑوں کا ہوش ہوتا تھا اور نہ ستر ڈھانپنے کا، اور رفتہ رفتہ اپنی تدبیروں سے اسے اس قابل بنا دیا کہ جنسی اعتبار سے وہ اسے ایک بالکل نارمل مرد کا سا کام دینے لگ گیا —— یہ قدرت کی نیرنگیاں اور طرفہ کاریاں ہیں! قدرت اپنی باتوں میں بعض اوقات کتنی ناقابل فہم لگتی ہے!

'زکی مائی'، 'گم نصیب' (غم نصیب) اور 'ماموں' اس مجموعے میں کرداری کہانیاں ہیں۔ 'زکی مائی' ایک ایسے بُت کے گہنے اور پاش پاش ہونے کی کہانی ہے جو پارسائی کے چبوترے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ یوں تو ایک ادھیڑ عمر کی ایک بیوہ تھی بھولی بھالی والی لیکن اس کا رنگ روپ ابھی تک قائم تھا۔ اس کا کام گھر کی لڑکیوں کو باہر لانا لے جانا اور ان کی نگرانی کرنا۔ وہ اپنا یہ فریضہ جس تندہی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتی تھی۔ اس نے ماؤں اور خالاؤں کو یقین دلا دیا تھا کہ ان کی لڑکیاں اگر محفوظ رہ سکتی ہیں تو صرف مائی زکی کے ہاتھوں میں!

"کسی کا دوپٹہ سر سے ڈھلک جاتا تو جھٹ ٹوک دیتی۔ ایک طرف پھیر دیکھتی تو کئی گز پہلے ہی بڑی صفائی سے دوسری طرف موڑ دیتی۔ راہ چلتے لوگوں کی نظامیں ٹٹولتی چلتی کہ کہیں کنواری بیبیوں کے چہرے کا بال تو نہیں گئے ہیں۔۔۔"

ایک دفعہ گھر میں ریلوے کے چوکیدار کی شوقین مزاج بیٹی زبیدہ کوئی چیز لینے آئی تو اس نے اسے دور ہی سے دیکھ کر سب کو چوکنا کر دیا کہ مشتبہ کردار کی لڑکی ہے، اس سے احتیاط لازم ہے ــــ لیکن حالات نے جو پلٹا کھایا تو مائی زکی، جانک کچھ عرصے کے لئے گم ہو گئی۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنی بہو اور بچوں سے لڑ کر کہیں باہر چلی گئی، اور پھر ایک دن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی مشتبہ کردار کی لڑکی زبیدہ نے گھر میں آکر یہ خبر سنائی کہ "مبارک ہو بی بی جی، زکی کے لڑکا ہوا ہے!" ــــ منزگرنڈی کے ان نمونوں کی ہمارے معاشرے میں کوئی کمی نہیں ہے، اور کوئی نہیں جانتا کہ ان کی ظاہر شرافت اور پرہیزگاری کے پیچھے ان کے دل کی دنیا میں کیسے کیسے طوفان اُٹھتے رہتے ہیں، لیکن یہ امیر ان میں سے کسی بدنصیب مائی زکی کے ساتھ ہی پیش آتا ہے کہ وہی خالہ جو اس کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات سننا گوارا ہی نہیں کرتی تھیں، آخر کہنے لگیں "اُف توبہ! مگر ایمان کی بات کہوں گی، اس کی چال بیوہ عورتوں کی سی نہیں تھی"!

"گم نصیب" کو میں ایک کرداری کہانی اس لحاظ سے کہتا ہوں کہ اس میں افسانہ نگار نے ریستوران کے ایک بیرے کے کردار کی تصویر اس کے ایک طویل اور مسلسل مونولاگ میں اتاری ہے۔ کسی کردار میں زندگی بھرنے کا اس سے زیادہ کارگر اور موثر طریقہ اب تک دریافت نہیں ہوا کہ آپ اس کی اصل گفتگو ٹھیک اسی کے الفاظ و لہجے میں نقل کر دیں۔ اور یہ تو پوری کہانی ہی بیشتر بیرے کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ اس لئے اس میں بیرے کا کردار جتنی اصلیت اور وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے وہ ہمارے اردو ادب میں ایک نادر چیز ہے۔ میں اس کہانی کو رضیہ کی شاہکار کہانیوں میں شمار کروں گا۔ اس لئے کہ اس میں انھوں نے فنِ محاکات MIMICRY کا ایک نادر فن پیش کیا ہے۔

"یہ دن والی بھرتی تو چھوکر نہیں گئی نہیں، اک منٹ میں ادھر تو تو منٹ میں اُدھر۔ ایک کو کھانا دیا، ایک کو پانی دیا، کسی کو کھانی ہمیں ہال میں ٹرکایا، مگر جب دن بہ سوائے جی صاحب، آیا صاحب، ابھی لایا حضور کے سوا اور کچھ نہیں ــــ اور یہ بڑھنی لوگ صاب لوگ کی کدر کرنا جانتے ہی نہیں۔ کوئی نیا بسنجر آئے گا تو میں یوں دانت کھول کر کھی دکھاؤں گا جانو میرا سگا ہو اور اسے لوگ ماتھے پر یوں بل ڈال ـــ بیٹ گے جو بس گھنٹہ جیسے سوکھی لکڑی میں بل پڑ گیا۔۔۔

۔۔۔۔ اور مجھے اس وخت یوں لگا جیسے میں کیراں کو کبر میں اتار کر اس کے اوپر مٹی ڈال کر آ رہا ہوں۔ کتے ہی دن مجھے اپنے تن بدن کا ہوس نہ تھا۔ صاحب ہی چلتے وخت مجھے اس ہوٹل میں رکھ گیا تھا۔ اُس جاتے میں اس کا مالک ایک بھلا مانس تھا۔ میں نے اس سے چھٹی لی اور گھر میں پڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کر کے ہوٹل جانا سرو کر دیا کہ کسی طریوں وخت تو کٹے۔۔۔۔"

'ماموں' ایک ایسے بخیل اور پیسہ پیسہ جوڑنے والے بزرگ کی داستان ہے جن پر سو روپے کی رقم جمع کرنے کی دُھن بُری طرح سوار تھی۔ اس مقصد کے لئے انھیں کیسے کیسے جتن کرنے پڑے اور کتنی ہی محرومیوں میں سے گزرنا پڑا، لیکن جب وہ ہرا نوٹ ان کے ہاتھ میں آیا تو زیادہ دن رہنے کے لئے نہیں، اور انھیں اپنی جدائی کا ایسا داغ دے گیا کہ اس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ماموں کا یہ کردار جس بصیرت اور جزیہ نگاری کے ساتھ کھینچا گیا ہے

وہ ایک اول درجے کی چیز ہے۔ اگر ایسے افسانے آج بھی لکھے جا رہے ہیں تو ہمارے لئے افسانہ نگاری کے حال یا مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

ٹائیٹل سٹوری کا عنوان بھگت کبیر کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا رو　　　　دو پاٹن کے بیچ آ ثابت گیا نہ کو

اور کہانی میں اس انوکھے تجربے کا بیان ہے جس میں انسان اپنے کسی گذرے ہوئے خیال یا ماضی میں دیکھے ہوئے کسی خواب کو ہو بہو حقیقت کی شکل میں اپنے سامنے دیکھتا ہے اور یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ کسی فلم کا دیکھا ہوا منظر دوبارہ دیکھ رہا ہو۔ یہ تجربہ میں نے ایک دفعہ اپنے لڑکپن میں کیا تھا جب شام کو سکول کی گراؤنڈ میں کھیلنے کے لئے ہندو زرگروں کے ایک محلے میں سے گذر کر جاتا تھا۔ ایک دن اس محلے میں سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک ہندو لالہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی سے نکلا۔ اسے دیکھتے ہی معاً میرے جی میں آئی کہ اب یہ باہر نکل کر پہلے اپنے ہاتھ والی تھیلی نیچے رکھے گا، پھر اپنی پگڑی ٹھیک کر کے باندھے گا، اور پھر کواڑ بند کر کے قفل لگائے گا۔　اس نے باہر نکل کر بعینہٖ یہی کیا اور اسی شکل میں کیا جو میرے ذہن میں پہلے سے تھی ——— میں نے اُسے ایسا کرتے ہوئے شاید پہلے خواب میں دیکھا تھا ——— یہ کیا فینامینا ہے؟ اور کیونکر انسان کو پیش آتا ہے؟ میرے پاس اس بارے میں کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اس معاملے میں شاید مشہور انگریزی مصنف اور ادیب جے۔ بی۔ پریسٹلے کی تازہ کتاب Man and Time کوئی رہنمائی کرتی ہو، جس میں اس قسم کے متعدد واقعات مع تصویروں کے، تاریخ کے صفحات سے نکال کر پیش کئے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے میں یہ کتاب پوری طرح نہیں پڑھ سکا۔

رضیہ فصیح احمد کا آبائی وطن مراد آباد ہے، اور ان کے خود نوشتہ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلیمی کیریر بہت شاندار رہا ہے۔ بی۔ اے کے امتحان میں وہ یونیورسٹی میں اول آئی تھیں عجیب بات ہے کہ درسی و تعلیمی قسم کی ذہانت ان کے ادبی و تخلیقی عمل میں بھی بدستور قائم رہی۔ ورنہ ان دو قسم کی ذہانتوں میں یہ تسلسل کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اول آنے والے اور وظیفہ پانے والے طلبہ ادب اور فنون لطیفہ میں اکثر گمنام ثابت ہوتے ہیں ——— اردو ان کی مادری زبان ہے، اور ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے مدعا کے اظہار کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی ——— یا اس کاوش کا اثر ان کی تحریر میں دکھائی نہیں دیتا، جو اس سے بھی زیادہ بڑا کمال ہے۔ ان کے ان افسانوں میں (اب میں اپنے آپ کو دہرانے لگا ہوں) کوئی پرشور کیفیت نہیں، جذبات کی کوئی گرما گرمی نہیں، ان کے پلاٹوں میں رونگٹے کھڑے کرنے والی کوئی ڈرامائیت نہیں، اور نہ ان میں جھٹکا پہنچانے والے اچانک موڑ [illegible] ہیں ——— اس کے باوجود یہ بہت سیدھی، سچی، اور دل لبھانے والی کہانیاں ہیں جو بغیر کسی شعوری کوشش اور بناوٹ کے ایک دھیمے دھیمے لب و لہجے میں سیانے پن کے ساتھ کہی گئی ہیں!

عورتوں کو مژدہ ہو کہ ناول اور افسانے کی صنف میں ان کے اندر ایک اور پختہ اور منجھی ہوئی قلمکار کا اضافہ ہوا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب اس میدان میں ان کا پلڑا مردوں کے مقابلے میں بھاری ہوگا ——— عصمت، خدیجہ، ہاجرہ، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، واجدہ، الطاف فاطمہ، بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، فرخندہ لودھی، خالدہ حسین، نثرت الطاف، فہمیدہ ریاض ——— کہیں یہ صورت آج ہی تو واقع نہیں ہو چکی؟ کوئی کیا کہہ سکتا ہے!

محمد کاظم

جرمنی نامہ

تصنیف: حکیم محمد سعید دہلوی
اشاعت: مکتبۂ جدید لاہور

صفحات: ۵۸۴
قیمت: پندرہ روپے

دس برس ہوتے ہیں طب کی دنیا کے دو گرامی قدر بھائی حکیم محمد سعید اور ان کے برادر بزرگ عبدالحمید دہلوی یورپ کی یاحت پر نکلے" یہ سفر جو دو ماہ، پچیس دن بیس گھنٹے تیس منٹ میں ختم ہوا تھا ہمارے لئے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اس سفر کے مقاصد کی فہرست میں دس امور شامل تھے جن میں سے نو طب اور دوا سازی اور قدرتی اور نفسیاتی علاج کے اداروں سے متعلق تھے۔ دسواں مقصد "اسلامی مطالعے اور تحقیق کے مرکزوں کو جہاں یہ موجود ہیں" دیکھنا تھا۔ اس سفر کی داستان کا لکھنا چھوٹے بھائی کے حصے میں آیا، اور انھوں نے اس کی پہلی جلد "یورپ نامہ" (صفحات ۵۰۰) میں چار ملکوں یعنی ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کی سیاحت کا قصہ نبیڑا۔ مغربی جرمنی چونکہ ایک ہمہ گیر ملک تھا جس میں اس سفر کے سب مقاصد کی تکمیل ایک ہی جگہ ہو گئی تھی، اس لئے اس ملک کے لئے انھوں نے ایک الگ جلد مخصوص کی جو جرمنی نامہ (صفحات ۵۸۴) کے نام سے اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کے بعد ہالینڈ، برطانیہ، فرانس، سپین، یونان، اٹلی اور ایران کے ممالک رہ جاتے ہیں، جن کے بارے میں اگرچہ قطعیت کے ساتھ کوئی اقرار اس کتاب میں نہیں کیا گیا، تاہم یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان باقی ملکوں کے سفر کے حالات میں دو مزید کتابیں، کم و بیش اتنے ہی حجم کی، با آسانی شائع ہو کر قارئین کی تسکین کا باعث بن سکتی ہیں۔

"جرمنی نامہ کو عام سفرنامے کی طرح محض تفریح طبع کا ذریعہ نہ سمجھا جائے" بڑے بھائی اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں "بیانیہ واقعات کے پس منظر میں جو روح عمل ایمائی انداز میں کارفرما دکھائی گئی ہے اس سے سبق حاصل کیا جائے" تو یہ کتاب گویا عام سفرناموں کی طرح نہیں ہے جن کا مقصد سب سے پہلے مسرت اور تفریح کا پہنچانا ہوتا ہے اور اس کے بعد کچھ اور، بلکہ یہ ایک متین اور عالمانہ چیز ہے جس میں "گذشتہ عالمگیر لڑائی کے اس پٹے ہوئے مہرے" کی حیرت انگیز پیش قدمیوں کا احوال بیان کر کے پسماندہ قوموں کو عبرت دلانا مقصود ہے۔

برطانیہ میں ایک مفکر فرانسس بیکن گزرا ہے جس کا زمانہ سولھویں صدی کا آخر اور سترھویں صدی کا آغاز تھا۔ اس نے جہاں اور موضوعات مثلاً مطالعے، دوستی، کتابیں وغیرہ پر اپنے ناقابل تقلید اسلوب میں مضامین لکھے، وہاں سفر کے موضوع پر بھی اظہار خیال کیا۔ اس مضمون میں وہ لکھتا ہے "سفر میں جن چیزوں کا مشاہدہ کرنا لازم ہے وہ یہ ہیں ... شہروں کی دیواریں، قلعے، فصیلیں، گودیاں، ساحل، آثار قدیمہ، کھنڈرات، کتب خانے، درسگاہیں، مکانات، باغات، بارودخانے وغیرہ ..." آگے چل کر وہ اپنے اس نظریئے کی مزید وضاحت کرتا ہے "باقی رہیں ... دعوتیں، شادی بیاہ کی رسوم، ماتم کی تقریبات، اور اس طرح کے دوسرے تماشے ... تو سیاحوں کو ان کی طرف زیادہ دھیان نہیں دینا چاہیئے!" ——— تو سفر کا ایک یہ ڈھنگ ہے جو بیکن نے تجویز کیا ہے۔ اس طرح کے سفر میں جب ایک مسافر کسی اجنبی ملک میں وارد ہوتا ہے تو اس کے مشاہدے کا موضوع اس ملک کی عمارتیں، اور درخت، اور کھنڈر، اور بارودخانے قرار پاتے ہیں اور ان در و دیوار کے درمیان بسنے والی انسانیت اور اس کی خوشیاں اور محرومیاں اور غم — یہ سب کچھ اس کے موضوع سے خارج رہتا ہے۔ خدا جانے اس میں بیکن کی اس رائے کا کہاں تک اثر تھا کہ اس کے بعد بہت عرصہ (قریباً اڑھائی سو سال) تک مغرب میں جب بھی سفر نامہ لکھا گیا، اسی انداز میں لکھا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جا کر البتہ سفر ناموں کے ایک نئے ڈھنگ کا آغاز ہوتا ہے جس میں بیکنی فلسفہ و حکمت کے بخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سیاح کے مشاہدے کا مرکز انسان قرار پاتا ہے اور اجنبی ملک کے در و دیوار اور قلعے اور کھنڈر اور بارودخانے اس انسان کی مرکزی کہانی کے پس منظر اور ماحول (SETTING) کا کام دیتے ہیں۔ ایک انگریز چارلیس ایم ڈاوٹی نے صحرائے عرب میں بیس مہینے کا طویل عرصہ پر خطر سیاحت اور مہم جوئی میں گزارا، اور عرب کے بدوؤں کی زندگی، ان کے کردار اور

عادات کا مطالعہ ان کے اندر رہ کر کیا۔ اس نے اپنے اس مطالعے کی داستان جب اپنی کتاب "ٹریولز ان عریبیا ڈیزرٹا" میں بیان کی، تو پڑھنے والے سفرنامہ کی ایک انوکھی اور دلچسپ صورت سے آشنا ہوئے۔ اس کتاب نے جو آج بھی سفری ادب میں ایک اونچی آن گھڑ چٹان کی سی عظمت کے ساتھ موجود ہے سفرنامہ لکھنے کی ایک ایسی طرح ڈال دی جس پر لوگ آج تک چل رہے ہیں، اور جس کی مقبولیت، مرورِ زمانہ کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی زمانے میں مشہور ادیب آر۔ ایل اسٹیونسن نے بھی دو یا تین سفرنامے اپنے سحرکار اسلوب میں لکھے اور یہ ثابت کر دیا کہ مشاہدے کی سچائی اور بیان کا حسن ایک سفرنامے کو بعض اوقات ناول اور افسانے سے بھی زیادہ پُرلطف اور دلآویز بنا دیتا ہے، حالانکہ اس میں حقیقت اور واقعے کا بیان ہوتا ہے ——— انگریزی ادب میں ان دو پیشروؤں کے بعد ایسے ناموں کی ایک بہت ہی طویل فہرست ہے جنھوں نے اسی انداز میں اپنے سفروں کی کہانیاں لکھیں، اور سفری ادب کو مالا مال کر دیا۔ ٹی۔ای لارنس، ہڈسن، ناملنسن، نارمن ڈگلس، ڈی۔ایچ لارنس، آلڈس ہکسلے، فریا سٹارک، ولیم ایچل سمتھ، پیٹر فلیمنگ، ایکرلی، مارٹن، لارنس ڈریل، مارک پوسٹ، ایلن مورہیڈ، پیٹرمین اور الفریڈ تھیسیجر! ——— یہ کچھ نام ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس لڑی کا دوسرا سرا معلوم نہیں۔ اس زمانے میں وہاں ایک معمول سا بنا ہوا ہے کہ ہر بڑا ادیب، چاہے اس کا اصل میدان ناول ہو، یا افسانہ یا شاعری، ایک یا دو سفرنامے بھی ضرور لکھتا ہے، اور اس صنفِ ادب کو پُرمایہ بنانے میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ سمرسٹ مام، ایولن واہ، گراہم گرین، ارنسٹ ہیمنگوے، آڈن، ایشروڈ، جے۔بی پریسٹلے، ان سب نے سفرنامے لکھے ہیں اور ان میں اپنے اپنے خاص فن کا بہت عمدگی سے مظاہرہ کیا ہے ——— ایسا لگتا ہے کہ سفر و سیاحت کی خواہش انسان کی ایک فطری خواہش ہے۔ اور ہم سب کی جلد کے نیچے ایک مارکوپولو چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لئے کتنا کچھ بندوبست کر سکتے ہیں۔

سفرنامہ ڈاؤٹی اور سٹیونسن سے چل کر زمانۂ حال تک پہنچتے پہنچتے ادب کی ایک ایسی موضوعی اور داخلی صنف بن چکا ہے جس میں ایک فن کار کو اپنی ذات کے اظہار کے لئے سب سے موثر، راست اور نسبتہً سہل ذریعہ میسر آتا ہے۔ ناول اور افسانے میں وہ اس اظہار کے لئے اپنے تخلیق کئے ہوئے کرداروں کا محتاج ہوتا ہے، شعروں میں اسے قافیہ، وزن اور فنی کمال کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن سفرنامے میں وہ جب اپنے قارئین کو ساتھ لے کر چلتا ہے تو اپنی نظر کے زاویے میں، واقعات کے انتخاب و ترتیب میں، اور ان پر اپنے ڈھیلے ڈھالے اور بے تکلف انداز کے تبصرے میں، نیز سفر میں ملنے والے انسانوں کے ساتھ اپنے رویے میں ——— ان سب باتوں میں وہ اپنی دلچسپیوں اور امنگوں، اپنی حسرتوں اور نارسائیوں اور اپنی حیرت و استعجاب کے ساتھ اس طرح کھل کر سامنے آتا ہے کہ ہم پڑھنے والے اس کے ذہن اور ضمیر کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے بالکل قریب ہو جاتے ہیں اور اس کی رفاقت میں ایک انس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ افسوس ہے میں نے سفرنامے کی اس صنف کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف مغربی ادب کے ناموں کے حوالے دیئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرز کے سفرنامے نے ابھی مشرق کی ادبیات میں رواج نہیں پایا۔ مشرق کی دوسری زبانوں کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ رہا ہماری اردو زبان میں تو حالت یہ ہے کہ اس میں سفرنامہ کو اب تک گویا صنفِ ادب ہی تسلیم نہیں کیا گیا۔ اردو زبان میں سفرنامے یوں بھی کم لکھے گئے ہیں، اور پھر اس جدید طرز کے سفرنامے میں تو یہ زبان بالکل مفلس، اور تہی دامن ہے۔ اگر یہاں مجھے کچھ جرأتِ رندانہ اظہار رائے کی اجازت دی جائے تو میں یہ کہوں گا کہ اردو سفرنامے کی اس طرز کا آغاز کرنے والے محمد خالد اختر ہیں (خدا نہ کرے کہ اس کی انتہا بھی انھیں پر ہو)۔ ان کے دو چھوٹے سفرنامے "کاغانی مہم" اور "سوات کی مہم" فنون کے قارئین کی نظر سے ضرور گذرے ہوں گے۔ لیکن میرے خیال میں بہت کم لوگوں نے ان کا اس طرح سے نوٹس لیا ہوگا کہ سفرنامہ لکھنے کا یہی وہ انداز ہے جو آج مغرب کے ادب اور فن کی دنیا میں پسندیدہ اور مروج ہے۔ اور جس میں اتنی رفتار کے ساتھ وہاں اضافے ہو رہے ہیں کہ تعجب نہیں یہ صنف ایک دن اپنی وسعت اور مقبولیت میں ناول اور افسانے کی حریف ثابت ہو۔ یوں محمد خالد اختر سے پہلے بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس طرز میں طبع آزمائی کی ہے جن میں ہمارے نزدیک محمود نظامی "نظر نامہ" سب سے کامیاب رہے ہیں لیکن انھوں نے اپنے سفرنامے کے لئے جو زبان اور اسلوبِ اظہار اختیار کیا ہے وہ اس کے لئے موزوں نہیں ہے۔ دوسرے ان کی کتاب میں اس بے تکلفی اور

لاابالی پن کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے جو اس صنفِ ادب کی جان ہوتی ہے۔ سفرنامہ دیکھنے میں ایک سہل چیز ضرور ہے لیکن دراصل یہ ایک بہت ہی نازک صنفِ تخلیق ہے۔ اس میں اگر شعور و خود آگہی اور تکلف و آورد کی تھوڑی سی بھی آمیزش ہو جائے تو اس سے اس نے اس کی لطافت اور مہک بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔ اختر ریاض الدین کا "سات سمندر پار" بھی یوں ایک سفرنامہ تھا۔ لیکن اسے مفید اور معلوماتی بنانے کی ایک شعوری کوشش نے بہت نقصان پہنچایا اور وہ ایک ایسی کتاب بن کے رہ گئی جس میں جاپان، روس، مصر وغیرہ ممالک کے متعلق کچھ دلچسپ معلومات تھیں —— ایک ذہین مسافر کی جمع کی ہوئی معلومات!

تو حکیم محمد سعید صاحب کا یہ سفرنامہ بھی بیکن کے سٹائل میں ہے لیکن اس کا انداز عالمانہ اور سنجیدہ ہے۔ ملک جرمنی کے متعلق ایک قاری کے ذہن میں جتنے سوال پیدا ہو سکتے ہیں ان سب کا شافی جواب اسے اس سفرنامے میں مل جاتا ہے۔ مثلاً پہلے دن کی کہانی کے آغاز میں ہی قاری کو جرمن زبان میں ہفتے کے دنوں کے ناموں اور کچھ گنتی سے آگاہ کرا دیا جاتا ہے۔ آگے چل کر جہاں یہ فقرہ آتا ہے کہ "چند منٹ بعد ریل گاڑی چلی اور فراٹے بھرنے لگی" وہاں اس کے فوراً بعد "ریلوے نظام" کے عنوان سے سات صفحوں پر مشتمل ایک پورا مضمون ہے جس میں جرمنی میں ریلوں کے ارتقا کی ساری تاریخ آ جاتی ہے اور جس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ "اس ملک میں پہلی ریلوے لائن ۱۸۳۵ء میں تعمیر ہوئی جو نورمبرگ سے لے کر فرتھ تک صرف چھ کلو میٹر لمبی تھی۔" جرمنی کے بڑے بڑے شہر: ہائیڈل برگ، فرینکفرٹ، بان، دسلا وف، برلن اور ہمبرگ، اپنی تاریخی عمارتوں، عجائب گھروں، یونیورسٹیوں، گرم پانی کے چشموں، اور شفاخانوں سمیت پوری تفصیل کے ساتھ اس سفرنامے میں بیان ہوئے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ حکیم صاحب اس بارے میں کوئی بھی معلومات اور کوئی بھی تفصیل اپنے قاری سے چھپا کر نہیں رکھنا چاہتے! ہائیڈل کے قیام کے دوران ہمارے سیاحوں کا گزر چند ایسے گرجا گھروں کے پاس سے ہوا جو سب کے سب گوتھک طرز میں بنے ہوئے تھے۔ اس پر حکیم صاحب کا ذہن گوتھک کی طرف منتقل ہوتا ہے اور وہ ہمیں اس طرزِ تعمیر کے بارے میں اپنی معلومات سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ "گوتھک طرزِ تعمیر وہ ہے جو روم اور بازنطین کے آرائشی طرزِ تعمیر کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آیا جس میں اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ اس میں تصنع بھی نہ ہو اور اس کے ساتھ وہ جاذبِ نظر بھی ہو۔ یہ گوتھک کیوں کہلایا؟ اس کے متعلق حکیم صاحب کہتے ہیں "میرا خیال ہے کہ اس طرزِ تعمیر کے لئے جو سادہ سا لفظ گوتھک وضع کیا گیا وہ شاید جرمن زبان کے لفظ گوتھا سے مشتق ہے۔ گوتھا جرمنی کے ایک علاقے تھورنگیا میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا!" اس طرح وہ قاری کی ملی دلچسپی کے لئے کتاب کے شروع میں یہ معلومات بھی ہم پہنچاتے ہیں کہ جرمنی میں ریلوں کے ہفتہ وار اور ماہانہ ٹکٹ جاری کئے جاتے ہیں جنھیں ٹس کا رٹے کہا جاتا ہے۔ اگر آپ وہاں ایک ٹکٹ خرید لیں تو پورا ایک ہفتہ یا ایک مہینہ آپ بلا روک ٹوک جس گاڑی سے چاہیں اور جہاں چاہیں سفر کر سکتے ہیں!

یہ سفرنامہ اگرچہ موضوعی انداز کا نہیں ہے تاہم اس میں ہمیں حکیم محمد سعید صاحب کی شخصیت کی کچھ جھلکیاں یہاں وہاں دکھائی دے جاتی ہیں۔ مثلاً ان کی پابندیٔ نماز، نیز ریستوران میں کھانا کھاتے وقت حلال و حرام کے متعلق ان کی بے چینی، ہوٹل کے کمرے میں عورتوں کی تصویریں نہ پا کر ان کی راحت، اپنے کمرے کے ذخیرۂ کتب میں سے صرف معلوماتی کتابوں کا انتخاب ("قصے کہانیوں اور ناولوں کی بجائے میں نے تاریخی کتابوں کا جائزہ لیا") مغربی لباس سے طبعاً نفرت، اور حسن و عشق کی باتوں سے نابلد ہونے کا اعتراف ("حسن و عشق کے کوچہ و بازار میں اپنا گزر کبھی نہیں ہوا، اپنی زندگی اس منزل سے ناآشنا ہی ہے")۔

یہ ان کی شخصیت کا ایک رخ ہے جس میں حکیم صاحب اپنی شیروانی کے گلے کا بٹن بند کئے اور چہرے پر متانت قائم کئے دکھتے ہیں۔ کتاب میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں حکیم صاحب کی طبیعت کچھ دیر کے لئے بشاش ہو جاتی ہے اور وہ اپنے گلے کا بٹن کھول کر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے مقامات پہ پڑھنے والا چاہتا ہے۔ کاش حکیم صاحب اس موڈ میں باتیں کرتے چلے جائیں لیکن اس کی یہ خواہش عموماً تشنہ رہتی ہے اور حکیم صاحب کی شخصیت کا آفتاب ایک لمحے کے لئے اپنی چمک دمک دکھا کر پھر کالت اور رکھ رکھاؤ کے بادلوں میں چھپ جاتا ہے۔ ہمارے ان سیاحوں کو ایک دن ایک شفاخانۂ جراحی دیکھنے جانا تھا۔ وہاں ایک خاتون پہلے سے ان کی منتظر تھیں۔ ہمارے سیاح پاکستانی روایت کے مطابق ذرا تاخیر سے پہنچے تو وہاں انھیں کچھ معذرت کرنی پڑی۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ "اس کے جواب میں جو جملہ نازک لبوں سے ادا ہوا اس کی کرختگی کو ہم دونوں بھائی اور معنی و مفہوم کو صرف محبوب سمجھ سکے تھے!" آگے انھی استقبال کرنے

والی خاتون کے متعلق لکھتے ہیں "ان کا نام — میں یہ تو ہرگز نہیں کہوں گا کہ جو زبان پہ بار خدایا کس کا نام آیا — کیونکہ تین دفعہ سننے کے بعد بھی میں اس کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکا..... میں نے ان کی آنکھوں کی رعایت سے ان کا نام مس نرگس رکھ دیا۔ ہم نے لفظ فرزلین کے استعمال سے سمجھ لیا تھا کہ یہ محترمہ یعنی مس صاحبہ ہیں، . . . . اور جب میں نے مطلب بیان کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں، اور اس طرح ایک اور قسم کے غیر مرئی پھول برآمدے میں بکھر گئے....."

——— لیکن اس معاملہ میں زیادہ خوش فہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ کتاب میں ایسے مقامات بہت شاذ اور نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہمیں حکیم صاحب کو وہی کچھ سمجھنا چاہیئے جو وہ خود چاہتے ہیں کہ ہم انہیں سمجھیں، اور جس کا بیان کتاب میں بیشتر جگہوں پر ملتا ہے:

اس کتاب کے فاضلانہ اور معلوماتی ہونے سے کسی کو یہ گمان نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ عالمانہ کتابوں کی طرح خشک اور غیر دلچسپ بھی ہے۔ جرمنی کے متعلق ہر طرح کی جغرافیائی، تاریخی اور معاشرتی معلومات کو جس طرح حکیم صاحب نے ترتیب دیا ہے اور اس کے لئے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس نے اس کتاب کو بہت دلچسپ اور قابل مطالعہ [redacted] بنا دیا ہے۔ حکیم صاحب اہل زبان ہیں، اور ان کی تحریر میں لطافت اور چاشنی ہے، اور یہ ان کے اسلوب بیان کا اعجاز ہے کہ یہ بظاہر ضخیم اور معلوماتی کتاب پڑھنے میں بہت کم وقت لیتی ہے اور قاری کو کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ کتاب میں فاضل مصنف نے کہیں کہیں ظرافت اور طنز کا عنصر بھی شامل کر دیا ہے۔ جہاں ایسے مقامات آتے ہیں وہاں قاری کی مضمحل ہوتی ہوئی دلچسپی پھر سے تازہ دم ہو جاتی ہے۔ جرمنی میں ایک جگہ کا نام "باڈن باڈن" ہے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں:

> "کسی طرح یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس چھوٹے سے شہر کے نام میں ایک ہی لفظ دوبار کیوں استعمال ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ شہر کی داغ بیل ڈالے جانے کے وقت یہ نام کسی ہکلے شخص نے تجویز کیا ہو۔ وہ صرف باڈن کہنا چاہتا تھا، لیکن اپنی معذوری کے باعث، جیسا کہ عموماً ہوتا ہے وہ اسے دو بار کہہ گیا۔ اور لوگوں نے جس طرح سنا، اختیار کر لیا۔"

ایک اور جگہ میونخ کے عجائب گھر کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں:

> میرے دل نے دعا کی کہ کبھی پاکستان میں بھی ایک ایسی چیز قائم کی جا سکے۔ بلکہ اسے میونخ کے عجائب گھر سے بھی زیادہ مضحکہ خیز انداز میں آراستہ کیا جائے۔ پاکستان میں مضحکات کی کمی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے بعض ارباب اقتدار کو ذرا سجا سنوار کر ایک خاص صورت میں بٹھا دیا جائے تو جرمنی کے مذکورہ عجائب گھر کے تماشے بازی لے جائیں گے"

یہ بات انھوں نے غالباً ۱۹۵۸ء میں "جرمنی نامے" میں لکھی ہوگی۔ اس کے بعد حالات کیا سے کیا ہو گئے۔ اب شاید حکیم صاحب اپنی طنز کے اس انداز سے زیادہ خوش ہوں!

اس کتاب کو پڑھ کر میں نے یہ تہیہ کیا ہے کہ میں اگر کبھی جرمنی گیا (جس کا فی الحال دور دور تک کوئی امکان نہیں)، تو اپنے سفر میں "جرمنی نامہ" ضرور اپنے ساتھ رکھوں گا کہ اسے پڑھ لینے اور ہضم کر لینے کے بعد ہی جرمنی کی سرزمین پر قدم رکھوں گا۔ اس وقت مجھے کسی ٹرین میں سفر کرتے وقت یہ تک معلوم ہو گا کہ جس ریلوے لائن پر سے میں اس وقت گزر رہا ہوں اس کی داغ بیل کس سن میں پڑی تھی، اور یہ انجن جو اس گاڑی کو کھینچ رہا ہے کونسی قسم کا ہے اور اس کا رواج جرمنی میں کب پڑا ——— "جرمنی نامہ" میں وہ سب کچھ لکھا ہے جو گائیڈ کی ضخیم کتابوں اور رسالوں اور پمفلٹوں میں الگ الگ دیا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن جو حسن ترتیب اور خوبی بیان "جرمنی نامہ" میں ہے وہ سیاحت کی ان رہنما کتابوں کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے!

کتاب کی طباعت اور گٹ اپ اور سرورق میں مکتبہ جدید نے ایک دفعہ پھر اپنے اعلیٰ معیار کا مظاہرہ کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک انڈکس بھی شامل ہے۔ اور میں بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم اپنے اشاعتی معیار میں اب مغرب سے زیادہ پیچھے نہیں رہے!

حکیم محمد سعید دہلوی کی شخصیت کے متعلق میں نے کچھ نہیں کہا، اس لئے کہ وہ آج ہماری سوسائٹی کے مشاہیر میں سے ہیں۔ حکومت و اقتدار کے دائرے سے

باہر رہتے ہوئے بھی جو شخصیتیں محترم اور معزز اور ناموری ہیں۔ ان میں حکیم صاحب نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ہوائی اڈے پر کسی وزیر کا استقبال ہوتے ہوئے دیکھا۔ تو ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ کون سے وزیر تھے، جواب ملا حکیم محمد سعید دہلوی! حکیم صاحب کو جو لوگ جانتے تھے وہ تو جانتے ہی تھے جو نہیں جانتے تھے وہ انہیں شامِ ہمدرد کی ماہانہ تقریبات کے حوالے سے جان گئے ہیں!

محمد کاظم

اسلامی ریاست (ایک تاریخی جائزہ)

تالیف: ڈاکٹر امیر حسن صدیقی — ترجمہ، اضافہ و حواشی: نثار احمد

اشاعت: جمعیت الفلاح، کراچی — صفحات: ۳۲۰ — قیمت: آٹھ روپے (مجلد)

یہ کتاب اپنی موجودہ شکل میں اسلامی تاریخ کے دو فاضلوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے جو تاریخِ اسلام میں لندن یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی ہیں، اصل کتاب انگریزی میں لکھی تھی جسے اب ان کے شاگرد رشید نثار احمد ایم اے نے نہ صرف اردو کا جامہ پہنایا ہے بلکہ اس میں مناسب حذف و اضافہ کر کے اس پر مفصل حواشی بھی لکھے ہیں۔ استاد کے اصل متن اور شاگرد کے حواشی کے ساتھ اب یہ کتاب اسلامی ریاست کی تاسیس اور اس کے عہد بعہد ارتقاء کے موضوع پر ایک مفید اور اہم دستاویز بن گئی ہے۔ زمانۂ حال کے تاریخی ذہن میں اسلامی ریاست کے بارے میں جو سوالات ابھرتے ہیں، ان سے ہماری تاریخ کی قدیم کتابیں اول تو بہت کم تعرض کرتی ہیں اور اگر ان کے اندر ان سوالات کے بارے کچھ مواد ملتا بھی ہے تو وہ اتنا بکھرا ہوا اور غیر مرتب ہوتا ہے کہ اس کو جمع کرنے کے لئے ہزاروں صفحات کی خوش چینی کرنی پڑتی ہے۔ تین سو سے کچھ اوپر صفحوں کی اس مختصر سی کتاب میں "اسلامی ریاست" کے بارے میں تقریباً سب اہم سوالات کا جواب آ گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ کتاب ہمارے نزدیک اسلامی تاریخ کے موضوع پر ایک ایسی ٹکسٹ بک کا درجہ رکھتی ہے جس کا مطالعہ طلبہ کے لئے ناگزیر ہے۔

اسلام کے ظہور سے قبل عرب کی سیاسی حالت کیا تھی؟ اس کا ایک بنا بنایا جواب ہمارے نیم تاریخ داں اساتذہ طلبہ کو یہ دیتے چلے آ رہے ہیں کہ بس ہر طرف افراتفری تھی۔ انارکی کا بازار گرم تھا، نظم و اجتماع کا تصور سرے سے غائب تھا، ہر بپھرا بدو کسی کے امر و اقتدار کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے ـــــ حالانکہ یہ نری مبالغہ آمیزی ہے۔ اسلام سے پہلے جاہل عربوں کا ایک پورا قبائلی نظام تھا جس کے قواعد و ضوابط تھے، روایات تھیں، حقوق اور فرائض تھے۔ پھر عرب میں بعض مجامع کا رواج تھا یعنی مختلف مقامات پر مختلف تقریبوں سے میلے لگتے تھے جن میں تجارت بھی ہوتی تھی، قبائل کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ بھی ہوتا تھا۔ شعر و سخن کی محفلیں بھی جمتی تھیں اور ان میں اشعر العرب (عرب کے سب سے بڑے شاعر) کا انتخاب بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح عربوں کی اپنی چھوٹی چھوٹی شہری مملکتیں موجود تھیں جن میں سے مکہ کی شہری مملکت نے قصیٰ کے عہد میں ایک ایسی ارتقائی شکل اختیار کر لی تھی کہ اس کی تفصیل پڑھ کر ہمیں آج بھی حیرت ہوتی ہے۔ اس مملکت میں اکیس عہدے تھے: حجابہ (کعبۃ اللہ کی نگرانی) سقایہ (حجاج کے لئے پانی کی رسد کا انتظام)، رفادہ (خدمت اور اعانت کے متفرق کام) ندوہ (اسمبلی) مشورہ، قیادہ، سفارہ، وغیرہ..... جن میں ندوہ یعنی اسمبلی کے محکمے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی کہ اس میں قریش کے تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے تھے!

اس طرح کی معلومات جو تاریخ کو اپنے صحیح رنگ میں پیش کرتی ہیں، اس کتاب کی خصوصیت ہیں۔ کتاب کا اسلوب عالمانہ اور محققانہ ہے اور حقائق کو زیادہ تر معروضی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد کب اور کہاں پڑا؟ اس ریاست کی خصوصیات کیا تھیں؟ اس کے ذرائع آمدنی کیا تھے؟ اس کا ڈھانچہ کس طرح کا تھا؟ پھر اس ڈھانچے نے عہدِ نبوی سے چل کر عباسی خلفا کے دور تک پہنچتے پہنچتے کیا کیا تغیرات دیکھے اور اس کی بنیادی خصوصیات میں کس طرح سے رد و بدل ہوتا چلا گیا ـــــ

اس طرح کے تمام سوالوں کا جواب اس کتاب میں واقعات و حقائق کی روشنی میں ملے گا۔ اور چونکہ اس کتاب میں کوئی بات بھی سند اور تحقیق کے بغیر نہیں کہی گئی اس لئے اس کے مندرجات کے بارے میں ہر طرح سے اعتماد کیا جا سکتا ہے!

بس ایک سوال قاری کے ذہن میں ایسا رہ جاتا ہے جس کا جواب شاید اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے، وہ یہ کہ ایسی اسلامی ریاست جو اپنی اصل خصوصیات کے ساتھ صرف پہلی صدی ہجری کے کچھ حصے تک قائم رہ سکی، اب اس زمانے میں اس کے قائم ہونے کے امکانات کس قدر ہیں؟ —— اس سوال کا جواب آج سے بیس پچیس برس پہلے اتنا دھندلا اور غیر یقینی دکھائی نہیں دیتا تھا جتنا اب دکھائی دیتا ہے۔ اسلامی ریاست کو پھر سے بروئے کار لانے کے لئے جو تنظیمیں عالم اسلام کے اطراف میں اٹھی تھیں وہ اس زمانے میں اپنے عروج پر تھیں اور حالات کافی امید افزا تھے۔ لیکن افسوس کہ وہ تنظیمیں قبل اس کے کہ وہ اپنی حریف طاقتوں کے ساتھ کسی فیصلہ کن مرحلے میں زور آزمائی کر سکتیں داخلی انتشار اور خود شکستگی کے ایک ایسے عمل سے دوچار ہو گئیں جس کے بعد کوئی تنظیم مشکل ہی سے اپنے آپ کو سنبھال سکتی ہے —— ایسی حالت میں یہ جذبہ تو اپنی جگہ قابل تحسین ہے کہ اسلامی ریاست کے اس مطالعے سے قوم کے اندر اس ریاست کو پھر سے قائم کرنے کا عزم و ارادہ پیدا ہو، لیکن اس کی صورت کیا ہوگی اور اس منزل کی طرف پیش قدمی اب تک کیوں اتنی دشوار اور لاحاصل ثابت ہوئی ہے؟ اس کے جواب کے لئے افسوس ہے کہ محض یہ جذبہ کوئی کام نہیں دیتا۔ ہمارے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے اہل بصیرت اور مورخین و محققین اس امر کی تحقیقات کریں کہ اسلامی ریاست کے احیا کی خاطر اٹھنے والی تنظیموں کو یہ کیا عارضہ لاحق ہو گیا کہ تقریباً ہر جگہ ان کے اندر تفرقہ و اختلاف کی ہوا چل پڑی، ان کے دو دو گروپ بن گئے اور ان کے کارکنوں کا جذبہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرد پڑتا چلا گیا۔ یہ تنظیمیں کہنے کو آج بھی موجود ہیں اور کیا عجب کہ شاید ان کے ممبروں کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہو اور وہ بظاہر پھلتی پھولتی ہوئی دکھائی دیں لیکن ورم اور موٹاپے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ان کا اگر آپ قریب سے جائزہ لے کر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ وہ اب اپنے anticlimax میں سے گزر رہی ہیں اور خون کی کمی کا شکار ہیں:

یہ بہرحال ایک سوال ہے جو اسلامی ریاست کے موضوع پر یہ مفید اور جامع تصنیف پڑھ کر میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ یہی سوال دوسرے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر اس پہلو سے بھی کتاب میں، اس کے کسی اگلے ایڈیشن میں تھوڑی سی بحث ہو جائے تو میرے خیال میں کتاب کا یہ پہلو جو اس وقت تشنہ محسوس ہوتا ہے مکمل ہو جائے گا۔

اصل کتاب کا ترجمہ کافی اچھا ہے، اور اس پر ترجمے کا گمان کم ہی ہوتا ہے۔ کتاب میں البتہ کہیں کہیں بعض جملے ایسے بھی نظر آ جاتے ہیں جن میں زبان اس معیار کی نہیں جو تاریخ کی ایک اچھے پائے کی کتاب کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً

"یہ دنیا کے سب سے بڑے سیاست داں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم تھے جنہوں نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔"

یہ جملہ کسی سکول کے طالب علم کا لکھا ہوا لگتا ہے نہ کہ اسلامی تاریخ کے کسی فاضل کا! پھر کہیں "جگھوں بڑھ رہی" کا استعمال دیکھ کر ہمیں مولانا ماہر القادری کی بے بسی کا خیال آیا، زبان کو صحیح اور آمیزش سے پاک رکھنے کے لئے "فاران" کے صفحات پر وہ جو جہاد ایک عرصے سے کر رہے ہیں، اس کا اثر کم از کم کراچی کے اسلام پسند حلقوں پر تو ہونا چاہیئے تھا۔ اسی طرح شروع کے مقدمے میں ایک جملہ ہے: "جنہوں نے ترجمہ کے ابتدائی مسودہ کو تیار کیا۔" مجھے یقین ہے کہ مولانا اس ترکیب سے بھی خوش نہیں ہوں گے لیکن حیرت کی بات ہے کہ بات ہے کہ ان کے شہر میں، اور شاید ان کے حلقے کے اندر لوگ اس طرح کی عبارتیں بھی لکھ جاتے ہیں۔

لفظ خلافت کی بحث میں (ص ۱۰۷) ایک جگہ حاشیہ میں لکھا ہے کہ خلف عموماً برے معنی میں آتا ہے یعنی: خلف (برے جانشین) جیسا کہ قرآن میں ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ —— عربی زبان سے کچھ مس رکھنے والے جانتے ہیں کہ عربی میں خلف اچھے اور برے دونوں معنوں میں آتا ہے اور کسی معنی کو رجحان یا عمومیت حاصل نہیں ہے۔ نعت کی ترکیب کوئی عربی نہیں عجمی ہے۔ عربی میں کہتے ہیں: وَخَلَفَهُ عَلَى أَهْلِهِ فَأَحْسَنَ الخِلَافَةَ (اس نے اپنے اہل و عیال پر اسے اپنا جانشین مقرر کیا، اور اس نے اپنی جانشینی کو بہت عمدگی سے نبھایا) اسی طرح ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں وَهُوَ خَلَفُ صِدْقٍ مِنْ أَبِيهِ

وہ اپنے باپ کا صحیح جانشین ہے (یعنی جو صفات باپ میں تھیں وہ بیٹے میں بھی آگئیں ـــــ علمی اور تحقیقی کتابوں میں کوئی ایسی بات لکھنے سے احتراز ہی کرنا چاہیئے جس کے بارے میں پوری تحقیق نہ ہو! امید ہے کتاب میں زبان و بیان کی یہ چھوٹی چھوٹی فروگذاشتیں اگلے ایڈیشن میں دور کردی جائیں گی:

کتاب کی طباعت اور گٹ اپ بہت اچھا ہے اور ایک معیاری کتاب کے لائق! اسلامی ریاست کے موضوع پر اس کتاب کو ایسے نوٹس (NOTES) کا مجموعہ سمجھنا چاہیئے جو اس کے مصنف اور حاشیہ نگار نے برسوں کے مطالعۂ تاریخ سے اکٹھے کئے ہوں گے۔ علم کے صحیح قدردان جانتے ہیں کہ ایسے نوٹس کتنے قیمتی اور لائق تحفظ ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی قیمت چار پانچ سات روپے ہو یا آٹھ روپے، درحقیقت کچھ بھی نہیں ہے!

محمد کاظم

ناولوں کی کھیپ

۱- دو چار غم محفل	ذکا الرحمٰن	؍
۲- کیا وہ ناٹک ہی تھی	عثمان علیم	کتاب منزل لاہور
۳- قربانی	مہدی علی صدیقی	〃 〃 〃
۴- دیدۂ تر	عابدی جعفر	〃 〃 〃
۵- انکار	عابدی جعفر	〃 〃 〃
۶- نوشاد- ایک معاشرتی ناول	انجم پرواز	چودھری اکادمی لاہور
۷- داغوں کی بہار	اختر سلیمی	حسن کار اشاعت گھر لاہور

اور بہت سے دوسرے ناول جو چھپ چکے یا چھپنے والے ہیں

ہمارے نوجوان اور ناپختہ لکھنے والے ناولسٹوں میں کیا خرابی ہے؟ آخر اتنے بُرے ناول ــــ بڑا اور آپ کے الفاظ میں ــــ لکڑی کے ناول ــــ کیوں لکھے جاتے ہیں؟ کیا یہ عجیب نہیں کہ اردو میں پچھلے پندرہ بیس برس میں صرف ایک دو ناول ایسے لکھے گئے ہیں جنہیں صحیح معنی میں ناول کہا جا سکتا ہے اور جن کے کردار جیتے جاگتے اور قابل یقین لگتے ہیں کسی نے لکھا ہے کہ ہر شخص میں ایک ناول ہے لیکن ہر کوئی ناول نہیں لکھ سکتا۔ ناول لکھنے کے لئے زندگی کا وسیع، گوناگوں تجربہ، زرخیز اور گہری قوت تخیل، فراواں تخلیقی جودت وغیرہ کئی قدرتی صلاحیتیں ضروری ہیں اور بہت تھوڑے لوگ ان صفات کو حاصل کر پاتے ہیں۔ کوئی صرف خواہش کرنے سے موپساں، طالسطائی یا ہارڈی نہیں بن سکتا۔ ہم سب البتہ اپنے نام کو جلی حروف میں ایک کتاب کے سرورق پر چھپا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سب ابدی حیات پر اپنی کمند ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ ہم سے بعد میں آنے والے یہ جان سکیں کہ ہم بھی کبھی اس راستے پر سے گذرے ہیں۔ ہمارے ناولسٹوں کے ساتھ یہی مصیبت ہے۔ وہ ادبی آسمان پر تارے بن کر چمکنا چاہتے ہیں اور اس خواہش سے تملاتے جاتے ہیں کہ ادب کے شاہسواروں میں ان کا شمار ہو۔ مجھے اس خواہش سے پوری ہمدردی ہے۔ میں نے بھی اپنی خوابوں میں موپساں سے ٹکریں لینی ہیں اور اسے گرا دیا ہے۔ میں نے بھی اپنا نام کئی شاہکاروں کی جلدوں پر سونے کے حروف میں دمکتا ہوا دیکھا ہے۔ مگر خواہش سے مراد تکمیل نہیں۔ سالوں کی اذیت کوشی کے بعد میں حقیقت کی اس کڑوی گولی کو نگل سکا کہ میں ناولسٹ نہیں بن سکتا۔ میری قسمت میں روشنیوں کے پیچھے سٹیج پر ظاہر ہونا نہیں تھا بلکہ یہ کہ میں ان گیلری میں بیٹھے ہوئے ہزاروں تماشائیوں میں سے ہوں جو تالیاں پیٹتے اور واہ واہ کرکے تماشے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد میں اپنے تماشائی کے رول پر قانع ہو گیا اور مزے کی نیند سونے لگا۔

گو یہ سچ ہے کہ محنت کے بغیر کوئی منزل پر پہنچ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے میں ان ناولسٹوں کے : رد و کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ان کی امنگ کی میرے دل میں قدر ہے۔ ان کے ناول خاصے برے اور بھونڈے اور بناوٹی ہیں مگر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ ناول لکھنا ایک معصوم بے ضرر شغل ہے اور اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر ناول برا یا غیر دلچسپ ہے تو تم اسے غصب کر سکتے ہو اور اپنے آپ کو بہلانے کے لئے کچھ اور کر سکتے ہو۔ ایسا کرنے سے ناول لکھنے والے کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا بھی کوئی خدشہ نہیں۔ اسے یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ سیکڑوں میل دور ایک پڑھنے والے نے اس کے عظیم الشان ناول کو لائق توجہ نہیں جانا۔ اور اگر اسے کسی طرح یہ پتہ بھی لگ جائے تو وہ یقیناً تمہاری کور ذوقی پر بست تاسف ملے گا اسے یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ اس نے برا ناول لکھا ہے۔ سب ناول ان کے لکھنے والوں کے نزدیک شاہکار ہوتے ہیں۔ اس طرح ناول نویس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کا نام ناول کے سرورق پر سرخی میں اپنی آب و تاب دکھاتا ہے اور وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ میرا خیال ہے بگ ... نے کہا ہے کہ ناول لکھنا خواہ برا ناول لکھنا اعصابی تشنج کے لئے مفید ہے اور پانچ چھ فل سکیپ صفحے لکھنے کے بعد آدمی ایک مطمئن ضمیر کے ساتھ سو سکتا ہے۔

میرا ان ناولسٹوں سے جھگڑا یہ ہے کہ اگر انھیں ناول لکھنا ہی تھے تو وہ مختلف قسم کے ناول لکھتے۔ انھوں نے وہی رومانی، سماجی اور جنسی زمین روندی ہے جو ہزار بار پہلے روندی جا چکی ہے۔ میں نہیں سمجھتا ایسا کرنے میں انھیں کیا لطف ملا ہوگا اور جب کسی چیز میں کوئی لطف نہ ہو تو آدمی اسے کیوں کرے۔ انھیں پٹے ہوئے تاریک راستے سے ہٹ کر ارد گرد سبز جنگلوں میں بھٹکنا چاہیئے تھا جہاں وہ درختوں میں پرندوں کو گاتے اور گلہریوں کو پھدکتے دیکھتے ۔ . . . اور اس میں بھی کوئی ہرج نہ تھا اگر وہ اپنے کرداروں کو عام نارمل انسانوں کی طرح ملنے چلنے دیتے۔ اور "ادبی" ہونے کی مریضانہ کوشش نہ کرتے۔ اگر تمہیں ایک کہانی کہنی ہے تو اسے سادگی سے صفائی سے اور قدرتی طریق سے کہو جیسا کہ بوڑھا میرا امن کہتا ہے۔ اگر کہانی کہے جانے کے لائق ہے تو پڑھنے والے کو گرفت میں لے لے گی مگر اس میں شاعرانہ اختراعی فقرے ٹانکنا، دور از کار تشبیہیں ڈھونڈ کر جڑنا اور فلسفیانہ موشگافیاں بگھارنا اسے ناقابل برداشت اور بھونڈا بنا دے گا۔

ذکاء الرحمٰن کے ناول کو لو۔ یہ بڑے دیدہ زیب ٹائپ میں چھپا ہے اور مجھے اس کی جلد کافی پسند آئی۔ جلد کے اندر جو کچھ ہے وہ مبتدیانہ بافت سازی ہے ——— ایک ناقابل یقین کہانی، کردار سب الٹ پلٹ۔ اور کوئی فقرہ ایسا نہیں جس سے کھرے ہونے کی کھنک آئے۔ اس ناول کے متعلق ہر چیز جھوٹی ہے۔ میں نے اسے بڑی جھنجلاہٹ سے پڑھا اور ذکاء الرحمٰن کی چھپے خاصے کو سنے دیئے۔ مجھے امید ہے کہ اگلی بار وہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرے گا۔ اس ماحول کے بارے میں لکھے گا جس میں وہ پلا بڑھا ہے اور جسے وہ جانتا ہے اور اپنے بیان کو نقلی کرب اور سستے جذبات سے بوجھل نہیں کرے گا۔ اس کی خواہش تو ناگتی ہے لیکن اپنے نام کو سرورق پر دیکھ لینے کے بعد اسے اب ادبی شہرت پیدا کرنے کے لئے بیتابی سے کام نہ لینا چاہیئے۔ اسے ابھی کافی دور چلنا ہے۔ اگر وہ حقیقی چیز لکھنا چاہتا ہے تو اسے اس فن کی ابجد ایک طالب علمانہ لگن سے سیکھنی ہوگی اور مغربی کلاسکی اور جدید ناولوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھتے ہیں کہ یہ ہے۔ جیسا کہ اسٹیونسن نے کہا ہے، یہ ایک ڈھلانی پہاڑی پر چڑھنے کی طرح ہے۔ بے حد صبر آزما اور مشقت طلب کام۔ اور لکھنے والے کے لئے تنگ گھوٹیں اور گڑھے جا بجا آتے ہیں جس میں اس کا اوندھے منہ گر پڑنے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔

دوسری کتابوں کے متعلق میں کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر چونکہ میں نے اسٹیونسن کا ذکر کیا ہے سو میں اس بڑے اور ناقابل تقلید کہانی کہنے والے کی ... رومانس کے آغاز کے باب کا ترجمہ دینا چاہوں گا۔ اس نمونے سے کہانی لکھنے کے فن کے بارے میں بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے اور مجھے سارے انگریزی ادب میں اس باب سے بہتر کسی ناول کا آغاز نہیں ملا۔ کاش سماجی اور جنسی خرافات کے بجائے سامنے نئے ناولسٹ ہمیں KIDNAPPED جیسے ناول دیں۔ ہمیں ہوا کے تازہ جھونکوں اور چمکیلی دھوپ کی ضرورت ہے اور قطبی روشنیوں کی۔ ہم ایسی کتابیں چاہتے ہیں جو پہلے فقرے سے ہمیں اپنے دام میں لے لیں۔ جن پر ہم ندیدے پن سے پل پڑیں جو ہمیں اپنے آپ سے باہر لے جائیں حقیقتاً کوئی بھی ناول کی شکل میں نا پختہ فلسفہ، فرائڈ کی تحلیل نفسی یا اخلاقی و معاشی پند و نصائح نہیں چاہتا اور جو ناول پڑھنے

والے کو یہ بتانے کے لئے لکھے جاتے ہیں کہ مصنف کے سوشلزم، تمدنی اور سیاسی مسائل جنسی محبت اور فن کے تقاضوں کے بارے میں کیا خیالات ہیں۔ لفظ کے اصل معنی میں ناول ہوتے ہی نہیں۔ آلڈس ہکسلے نے ایسے ناول اپنی پوری ذہانت اور طبیعت کی بُراقی کو بروئے کار لا کر لکھے اور گو ان کے خیالات نے ایک وقت میں ایک پوری نسل کے طرزِ فکر اور اخلاقی نظریے کو متاثر کیا۔ مگر وہ اب بطور ناول مر چکے ہیں، ممکن ہے وہ کچھ مدت اور فلسفیانہ یا سماجی رسائل کی حیثیت میں پڑھے جاتے رہیں مگر وہ ناول نہیں ہیں کیونکہ ان کے لوگ عام لوگوں کی بجائے مخصوص رنگ کے ذہنی اور فکری اندازوں کے علامتی اجسام ہیں۔ بوڑھے میرامن کی چہار درویش یا سٹیونسن کی کڈنیپڈ، اس وقت تک زندہ رہیں گی اور ہمارے دلوں کو بھاتی رہیں گی، جب کئی موٹے نصیح و بلیغ اور بظاہر فنی شاہکار کبھی کے بھلائے جا چکے ہوں گے۔

اور یہ ہے کڈنیپڈ کا پہلا باب:

کڈنیپڈ

پہلا باب

<u>میں شاز کی حویلی کو اپنے سفر پر روانہ ہوتا ہوں:</u>

میں اپنی قسمت آزمائیوں کی کہانی کا آغاز ۱۷۵۱ء کے بابرکت سال کے ماہ جون کی ایک خاص صبح سے کرتا ہوں جب میں نے آخری بار اپنے باپ کے دروازے میں سے چابی نکالی۔ میں سڑک پر تھوڑی دیر ہی چلا ہوں گا کہ سورج پہاڑیوں کی چوٹیوں پر دمکنے لگا اور میرے پادری کے مکان تک پہنچتے پہنچتے بلیک برڈ پرندے باغیچے کے بنفشی پودوں میں سیٹیاں بھر رہے تھے اور کہرہ جو پو پھٹنے کے وقت وادی کے گرد اترا تھا، اٹھنا اور بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔

مسٹر کیمبل، ایسنڈین کا پادری، باغ کے پھاٹک پر کھڑا میرے انتظار میں تھا۔ اچھا آدمی! اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کچھ کھایا پیا ہے اور یہ سننے کے بعد کہ میں سب انتظام کر کے چلا ہوں۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے شفقت سے اپنے بازو کے نیچے دبا دیا۔

"اچھا ڈیوی لڑکے" اس نے کہا "میں تمہیں رستے پر لگانے کے لئے تمہارے ساتھ فورڈ تک چلوں گا"

اور ہم خاموشی سے آگے چلنے لگے۔

"کیا تمہیں ایسنڈین چھوڑنے کا افسوس ہے" اس نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا۔

"جناب سچ یہ ہے" میں نے کہا "کہ اگر میں یہ جانتا ہوتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور میرا کیا بنے گا، تو میں آپ کو صاف صاف بتا دیتا۔ ایسنڈین بلاشبہ ایک اچھی جگہ ہے اور میں یہاں بڑا خوش رہا ہوں لیکن پھر یہ بات بھی تو ہے کہ میں اب تک کہیں اور نہیں گیا۔ چونکہ میرے باپ اور میری ماں دونوں مر چکے ہیں، میں ان سے ایسنڈین میں اس سے زیادہ نزدیک نہیں ہوں گا جتنا ہنگری کی سلطنت میں، اور سچ کہوں کہ اگر مجھے یہ پتہ ہوتا کہ جہاں میں جا رہا ہوں، وہاں مجھے اپنے حالات کو بہتر کرنے کا موقع ملے گا تو میں عیش و مسرت سے جاتا۔"

"ہاں" مسٹر ایسنڈین نے کہا "بہت اچھا ڈیوی لڑکے! اور اب یہ میرے لئے مناسب ہے کہ تمہیں تمہاری قسمت پر مطلع کر دوں۔ یعنی اس حد تک جتنا میں کر سکتا ہوں۔ جب تمہاری ماں اُٹھ گئی اور تمہارا باپ وہ رحم دل، پارسا آدمی، اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہو گیا اس نے مجھے ایک خاص خط سونپا جس کے بارے میں اس نے کہا کہ تمہارا ورثہ ہے "جونہی" اس نے کہا "میں رخصت ہو جاؤں اور گھر صاف ہو چکے اور اسباب وغیرہ ٹھکانے لگ جائے (اور ڈیوی یہ سب کچھ ہو چکا ہے) اس خط کو میرے لڑکے کے ہاتھ میں دے دو اور اسے شاز کی حویلی کی طرف روانہ کرو جو کریمانڈ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہی جگہ ہے" اس نے کہا "جہاں سے میں آیا تھا اور مناسب بھی ہے کہ میرا لڑکا وہیں لوٹ جائے تو وہ ایک مستقل مزاج لڑکا ہے" تمہارے باپ نے کہا "اور ایک ہوشیار راہرو اور مجھے یقین ہے کہ وہ سلامت رہے گا اور جہاں

کہیں بھی جائے گا لوگ اسے پسند کریں گے۔"

"شاز کی حویلی" میں چلایا۔" میرے غریب باپ کا بھلا شاز کی حویلی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"نہیں،" مسٹر کیمبل نے کہا" اس کے بارے میں کوئی یقین سے کیا کہہ سکتا ہے؟ لیکن اس کنبے کا نام ڈیوی لڑکے وہی ہے، جو تمہارا ہے ـــ خاندانِ بالفور۔ ایک قدیم ایماندار، با عزت گھرانا، جو شاید ان بعد کے دنوں میں تنزل پذیر ہو گیا ہے۔ تمہارا باپ بھی ایک صاحبِ علم آدمی تھا جیسا کہ اس کے مرتبے کے آدمی کے شایانِ شایان تھا کوئی شخص اس سے زیادہ لیاقت سے مدرسہ نہیں پڑھاتا تھا، اس کی وضع اور بات چیت بھی عام آدمی کی سی نہیں تھی لیکن (جیسا کہ تمہیں خوب یاد ہوگا) میں اسے اپنے مکان میں بڑی خوشی سے معزز لوگوں کو ملنے کے لئے بلایا کرتا، اور وہ جو میرے اپنے گھرانے کے تھے کلرہنٹ کے کیمبل، ڈنسزار کا کیمبل اور منچ کا کیمبل اور دوسرے سارے اچھے جانے پہچانے معزز آدمی اس کی صحبت میں لطف اٹھاتے۔ اب آخر میں، میں اس سارے معاملے کے اجزاء کو تمہارے سامنے رکھتے ہوئے، یہ اس کی وصیت کا خط ہے اور جس پہ تمہارے جنتی بھائی نے خود اپنے ہاتھ سے بند کر کے پتہ لکھا ہے۔"

اس نے خط مجھ کو دیا جس پر پتہ ان لفظوں میں لکھا ہوا تھا: "شاز کی حویلی کے ایبنیزر بالفور ایسکوائر (کے ہاتھوں میں دینا ہے) میرا لڑکا ڈیوڈ بالفور پہنچائے گا۔" میرا دل اس بڑے امکانِ ترقی پر زور زور سے دھڑک رہا تھا جو ایک سترہ سالہ لڑکے کے سامنے یوں اچانک ظاہر ہو گیا تھا، اتر ک کے جنگل میں ایک غریب دیہاتی استاد کے بیٹے کے لئے یہ درخشاں مستقبل!

"مسٹر کیمبل،" میں لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولا، "اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا جاتے؟"

"یقینی طور پر،" پادری نے کہا" ضرور میں جاتا۔ تمہارے جیسے ہوشیار ہٹا کٹا لڑکے کو دو دن کے سفر میں کریمنڈ پہنچ جانا چاہیئے (جو اڈنبرگ کے پاس ہے)۔ اگر بُری سے بُری بات بھی واقع ہو جائے اور تمہارے یہ اونچے قرابت دار (کیوں میں یہ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ تمہارے خون سے ہیں) تمہیں دروازہ دکھا دیں تو تم دو دن اور چلتے چلتے پھر واپس آ کر منس کے دروازے پر دستک دے سکتے ہو لیکن میں یہ امید کرتا ہوں کہ وہ لوگ تم سے تپاک سے پیش آئیں گے (جیسا کہ تمہارے بے چارے باپ نے تمہارے لئے پیش گوئی کی تھی) اور کیا پتہ ہے کہ تم کبھی بڑے آدمی بن جاؤ، اور یہ ڈیوی لڑکے، میرے ضمیر پر یہ بات پڑی ہے کہ میں اس جدائی کو بہتر بناؤں اور تجھے اس دنیا کے خطروں سے خبردار کر دوں۔"

یہاں اس نے آس پاس بیٹھنے کی ایک آرام دہ جگہ ڈھونڈنے کے لئے دیکھا۔ آخر سڑک کے کنارے ایک برچ (Birch) کے درخت کے نیچے پڑے ہوئے پتھر پہ اس کی نظرِ انتخاب پڑی۔ وہ اس پر ایک بڑے پرمتانت بالائی ہونٹ کے ساتھ بیٹھ گیا اور سورج سے بچنے کی خاطر (جو اب ہم پر دو چوٹیوں کے درمیان سے چمک رہا تھا) اس نے اپنے جیبی رومال کو اپنے کلغی دار ہیٹ کے اوپر ڈال لیا، وہاں بیٹھے ہوئے اٹھی ہوئی انگلی سے اس نے سب سے پہلے مختلف قسم کی بدعقیدگیوں کے خلاف خبردار کیا جن کے لئے میرے دل میں پہلے ہی کوئی کشش نہ تھی اور پھر اس نے مجھے تاکید کی کہ اپنی نمازوں اور انجیل کے پڑھنے میں کوتاہی نہ کروں۔ یہ ہو چکا تو اس حویلی کا جہاں مجھے جانا تھا لفظوں میں ایک نقشہ کھینچا اور مجھے سمجھایا کہ اس میں رہنے والوں کے ساتھ میرا طور طریقہ کیا ہونا چاہئے۔

عام باتوں میں نرمی، نرم مزاجی دکھانا، اس نے کہا، "تم ہر دم ذہن نشین رکھنا کہ اگرچہ تم اچھے گھرانے کے ہو، تمہاری تربیت ایک گاؤں میں ہوئی ہے، ہمیں شرمندہ نہ کرنا۔ اس بڑے، لمبے چوڑے گھر میں، وہ جتنے کئی نوکر ہوں گے، خود کو اتنا اچھا، اتنا چوکس، سمجھنے میں اتنا تیز اور بات کرنے میں اتنا کم گو ظاہر کرنا جتنا کہ کوئی اور۔ باقی رہا لیرڈ ـــ تو یہ کبھی نہ بھولنا کہ وہ لیرڈ ہے ـــ زیادہ میں کچھ نہیں کہتا سوائے کہ عزت جس کا حق ہے اس کی عزت کرنا واجب ہے۔ ایک لیرڈ کی اطاعت و فرماں برداری کرنے سے دلی خوشی ملتی ہے یا کم از کم تمہارے جیسے کو ملنی چاہئے۔"

"اچھا جناب!" میں نے کہا" میں نے آپ کی باتیں پلّے باندھ لی ہیں اور میں ان پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔"

"خوب کہا، بہت خوب،" مسٹر کیمبل نے جان و دل سے کہا۔ "اور اب کام کی باتوں کی طرف آتے ہوئے، میں تمہارے لئے یہ پیکٹ لایا ہوں جس میں چار چیزیں ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اسے بڑی دقت سے اپنے کوٹ کی حاشیہ کی جیب سے کھینچ کھانچ کر برآمد کیا۔ ان چار چیزوں میں سے پہلی چیز تو وہ ہے جس پر قانونی طور سے تمہارا حق ہے۔ تھوڑی سی نقدی تمہارے باپ کی کتابوں اور فرنیچر کی فروخت کی جنہیں میں نے (اور میں نے یہ تمہیں پہلے ہی سمجھا دیا تھا) اس ارادہ سے خرید لیا ہے کہ انہیں آگے آنے والے استاد کو کچھ منافع پر بیچ دوں۔ باقی تین چھوٹی چھوٹی تحفیاں ہیں جنہیں اگر تم قبول کر لوگے تو مسز کیمبل اور مجھے مسرت ہوگی۔ پہلی جو گول ہے تمہیں پہلی ملازمت میں غالباً سب سے زیادہ خوش کرے گی لیکن ڈیوی ڈیوی یہ سمندر میں ایک قطرے کے مصداق ہے۔ یہ بس ایک قدم تک ہی تمہارے کام آئے گی اور صبح کی طرح شام کے دم میں اُڑ جائے گی۔ دوسری جو چپٹی شکل میں مربع ہے اور جس پر لکھا ہوا ہے۔ جو سڑک کے لئے ایک مضبوط لاٹھی کی طرح۔ اور بیماری میں تمہارے سر کے لئے ایک اچھے تکیے کی مانند زندگی بھر میں تمہارا آسرا ثابت ہوگی۔ اور اب آخری چیز یہ مکعب نما آخری چیز میری تمنا ہے کہ یہ تمہیں ایک بہتر سرزمین میں دیکھے گی"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، اپنا ہیٹ گھماتا رہا۔ وہ تھوڑی دیر اونچی آواز میں دعا پڑھتا رہا اور اس کے الفاظ ایک ایسے نوجوان کے لئے جو پہلی بار دنیا میں قدم رکھنے لگا تھا بڑے پر رقت تھے۔ پھر اچانک اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اور مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر خوب زور سے بھینچا۔ پھر اس نے مجھے ایک بازو کے فاصلے پر الگ کر کے پکڑے رکھا مجھے اپنے چہرے سے دیکھتے ہوئے جس پر رنج و غم کی علامات ثبت تھیں اور پھر وہ گھوڑے کی سی تیزی کے ساتھ گھوما اور روکھی سی آواز میں الوداع پکارتا ہوا اس راستے پر سے واپس چلنے لگا جس پر سے ہم آدھے دوڑتے ہوئے آئے تھے کسی دوسرے کے لئے شاید یہ منظر ہنسنے کی بات ہوتی۔ لیکن میرا دل ہنسی سے بہت دور تھا۔ میں اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جس وقت تک وہ نظر میں رہا۔ اور اس نے اپنے پورے قدم نہ روکے اور نہ ہی ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ تب میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میرے جانے پر یہ اس کے رنج کا اظہار ہے اور میرے ضمیر نے مجھے سخت چوٹ کی کیونکہ میرا دل ہی دل میں اس خاموش بستی سے باہر نکلنے، اپنے ہی علم اور ذوق کے امیر اور باعزت لوگوں کے درمیان بڑے معروف گھر کو جانے پر غایت درجہ خوش تھا۔

ڈیوی ڈیوی! میں نے اپنے آپ سے کہا "کیا اتنی ناشکری بھی کبھی کسی نے کی ہوگی۔ تم ایک نام کی چمک کے لئے سب پچھلی شفقتوں اور پرانے دوستوں کو بھول گئے —— یہ کتنی شرم کی بات ہے۔"

اور میں اس پتھر پر بیٹھ گیا جسے اس اچھے آدمی نے ابھی ابھی خالی کیا تھا اور پارسل کو کھول لیا تا کہ دیکھوں کہ میرے یہ تحفے کس قسم کے ہیں۔ وہ جسے اس نے مکعبی کہا تھا اس کے بارے تو میرے دل میں شک نہ تھا۔ یقیناً یہ ایک خانے کے جزدان میں رکھنے کی ایک انجیل تھی۔ وہ جسے اس نے گول بتایا تھا شلنگ کا ایک سکہ تھا اور تیسری چیز جسے زندگی بھر صحت اور بیماری دونوں حالتوں میں میرا آسرا بننا تھا کھردرے بھورے کاغذ کا پرزہ تھا جس پر سرخ سیاہی سے یہ لکھا ہوا تھا۔

وادی کے پانی کی گل سوسن بنانے کی ترکیب: وادی کے سوسن کے چند پھول لو اور انہیں ایک بوتل میں رکھ کر نتھار لو، اور جب ضرورت پڑے ایک دو چمچے اس کے پیو۔ زبان کے لقوہ سے جن کی طاقت گویائی جاتی رہی ہو یہ بات بحال کر دیتی ہے۔ گنٹھیا میں اس کا استعمال مفید ہے۔ یہ دل کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور حافظہ کو تیز کرتی ہے۔ اور پھولوں کو ایک مرتبان میں ڈالو جو اوپر سے خوب بند ہو اور اسے چیونٹیوں کی ایک پہاڑی میں پورا ایک مہینہ رکھو پھر اسے باہر نکالو اور تم ایک شربت مرتبان میں پاؤ گے جو پھولوں سے پیدا ہوتا ہے اسے ایک چھوٹی بوتل میں رکھو۔ یہ ایک اچھی چیز ہے۔ خواہ اسے تندرستی میں استعمال کرے یا حالت بیماری میں، خواہ مرد ہو یا عورت۔

اور پھر پادری کے اپنے ہاتھ سے یہ فقرہ بڑھایا گیا تھا۔

اسی طرح اگر موچ آجائے تو اس کی مالش کرو اور پیٹ کے درد کے لئے گھنٹے میں ایک چمچہ پینا ہر مرض دور کرتا ہے۔

اور یقیناً میں اس پر خوب ہی ہنسا لیکن میری ہنسی کچھ کپکپاتی ہوئی ہنسی تھی۔ اور میں نے خوشی سے اپنے بنڈل کو اپنی لاٹھی کے سرے پر لٹکایا اور فورڈ کے اوپر

اوپر کی طرف کی پہاڑی کے ساتھ ساتھ روانہ ہو گیا۔ جب میں اس بڑی دروازوں کی سڑک پر نکلا جو سرخ ہیڈ رم سے پہلی ہوتی جاتی ہے تو میں نے ایڈ ہین کے چھوٹے گرجے، پادری کے مکان کے دو ستونوں اور گرجے کی قبرستان میں بڑے پہاڑی کوؤں کو آخری بار نظر بھر کر دیکھا، جہاں میرا باپ اور میری ماں سوئے پڑے تھے۔

ایک ناول کو کتنا دل لبھانے والا اور گرفت میں لے لینے والا انداز یہ ہے کہ تیز رفتاری سے آسانی سے اور دلچسپی سے پڑھی جانے والی تحریر مشکل سے لکھی جاتی ہے۔ اور یہ سٹیونسن کے بارے میں سب سے سچ ہے۔ وہ ایک ایک فقرہ بے انداز کاوش اور محنت سے لکھتا تھا لیکن اسے پڑھتے ہوئے کبھی اس چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ اسلوب کی سادگی اور اس کا ارتکاز ہمیں اپنے ساتھ بہائے جاتا ہے اور کہانی کی دلبستگی ہمیں نہ ہی صرف اپنی مٹھی میں لے لیتی ہے بلکہ ہمارے تخیل کو بھی دھکا دیتی ہے۔ اس کڈ نیپڈ کے آغاز میں ایک بھی بناوٹی اور جھوٹا فقرہ نہیں۔

ہمارے اُمنگ رکھنے والے ناولسٹ اگر ادبیت اور فن بگھارنے کی بجائے سیدھے سادے اور صاف لہجے میں اپنی بات کہتے تو ان کے یہ ناول یقیناً بہتر اور زیادہ پڑھنے کے لائق ہوتے۔

ہر کوئی اسٹیونسن نہیں بن سکتا۔ لیکن اگر میں اور ذکار الرحمٰن (اینڈ کمپنی) کبھی زندگی بھر میں اس سے آدھی کتاب بھی لکھ سکے جیسی کہ کڈنیپڈ ہے تو ہم فی الواقع خوش نصیب ہوں گے اور شادماں موت مر سکیں گے۔

محمد خالد اختر

الف (مجموعۂ کلام)

مصنف: رئیس امروہوی　　　ناشر: ادارہ ذہن جدید کراچی　　　قیمت ۳ روپے

رئیس امروہوی کو ابھی تک میں نے قطعہ کے زریم میں فٹ دیکھا تھا اور وہ قطعہ بھی ہنگامی اور اخباری۔ بایں ہمہ میں رئیس کی زود گوئی، قادر الکلامی، فنی پختگی، ذہانت اور جدت اظہار کا ہمیشہ سے قائل تھا

'الف' کی اشاعت نے رئیس کو قطعہ کے زریم سے نکال کر کائنات سخن کے اُفق پر جلوہ گر کر دیا ہے۔ اب رئیس ایک آفاقی انداز کا شاعر نظر آتا ہے۔ میں نے رئیس کو فرصت کے لمحات میں پورے خلوص اور احتیاط سے پڑھا ہے۔ اس ضمن میں جو کچھ بھی کہوں گا قاری کے اعتماد کو کسی قسم کی جانبداری کے اندھیرے میں رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس دور کی سب سے بڑی صداقت یہی ہے کہ مخاطب کو تصویر کا سچا رخ دکھا دیا جائے۔

الف کو آپ پورے انہماک اور لگن کے ساتھ پڑھئے تو آپ یہ تاثر ضرور قائم کریں گے کہ رئیس بھی اس دور کے جیش روشعرا جوش، ندیم، فیض، فراق کی طرح اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔ وہ آئندہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رہنے والا ہے۔ رئیس نے چودہ سال کی عمر سے شاعری کا آغاز کیا۔ اس مدت میں ان کا قلم غم جاناں سے لے کر غم دوراں تک اور عقل کے کربناک سے وجدان کی خلش تک دوراہوں میں بغیر تھکے ہوئے چلتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رئیس صاحب کے اپنے ایک بیان کے مطابق آج تک وہ کم و بیش چھ ہزار قطعات ...... تین سو غزلیں ...... ایک ہزار نظمیں ...... ایک سو چھ مثنویاں ...... اور متعدد مرثیے، سہرے، رباعیات وغیرہ وغیرہ سلک نظم میں پرو چکے ہیں۔ جس شاعر نے اتنا کچھ کہا ہو اس کا فن کس نہج پر ہوگا۔ یہ آپ خود اندازہ لگائیے۔

مجھے اس دور میں دو شخصیتیں ایسی نظر آتی ہیں جو بیک وقت غزل، نظم، قطعہ، مضامین اور دیگر اصناف سخن میں گراں قدر اضافہ کرتی کرتی چلی جا رہی ہیں۔ گزشتہ تیس سال سے احمد ندیم قاسمی اور رئیس امروہوی اس منزل کو قدم بہ قدم سر کرتے رہے ہیں۔

رئیس کی بسیار گوئی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ وہ اتنی تیزی سے لکھنے کے باوجود فکر کی گہرائی و گیرائی، فن کی

عظمت اور جدت و ندرت ان کے قلم سے ٹپکتی ہے۔

الف کے دو حصے نمایاں ہیں : غزل .... اور .... نظم

غزل جیسی نیم وحشی صنفِ سخن (جو ہر چند نیم وحشی صنفِ سخن نہیں ہے) کے بارے میں آپ خوب جانتے ہیں کہ اس کافر ادا نے اچھے اچھوں سے توبہ کرائی ہے اور بڑے بڑے سورما اس کے سامنے سپر انداز ہو گئے ہیں۔ اس دو مصرعوں کے ہلکے پھلکے ربط۔ کی وسعت کو دائرہ تسخیر میں مقید کرنا ہر چند ناممکن ہے مگر اس دور میں غالب کے بعد چند ایسے ذہن ابھرتے ہیں جنھوں نے نہ صرف تسخیر کی منزل کو پالیا ہے بلکہ اس میں نئی راہوں کا اضافہ بھی کیا ہے

رئیس کی الگ آواز ہے۔ ہر چند اس کی بڑی خصوصیت فلسفیانہ سوچ اور نفسیاتی طرزِ احساس ہے اور رئیس کے قارئین اپنی عادت کے مطابق رئیس کو انہی نظریات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ مگر یہ رئیس کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ شاعری میں صرف فلسفہ و نفسیات ہی ایک شاعر کا طرۂ امتیاز نہیں ہو سکتا۔ ہمارے پاس "ارسطو" سے "فرائڈ" تک اور "رومی" سے "غالب" تک ایسی بہت سی باتیں موجود ہیں۔ یہ سارا گھپلا رئیس صاحب کے فلسفیانہ مضامین اور نفسیاتی تحریروں نے پیدا کر دیا ہے۔ "الف" میں یہ دونوں عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں اور اسی لئے میں اشعار بطور سند پیش نہیں کرتا لیکن رئیس کی دوسری خصوصیات جو ان کی تصویر میں شاعرانہ رنگ بھرتی ہیں اور ان کی شخصیت میں ایک جاذبیت اور کشش پیدا کرتی ہیں سامنے لانا ضروری ہیں۔

"الف" کا مطالعہ یہ بات روشن کر دیتا ہے کہ رئیس کی غزل اس دور کا پورا پورا شعور رکھتی ہے جس میں روایت کی چاشنی بھی ہے، حال کی معموری بھی اور مستقبل کی جھلک بھی۔ یوں کہیے کہ رئیس نے "روحِ عصر" کو اپنی غزل میں بکمال حسن سمو لیا ہے۔

رئیس کے کلام میں جو سب سے زیادہ منفرد چیز مجھے نظر آئی ہے وہ "خوف کا عنصر" ہے۔ یہی خوف جب کالرج کی شاعری میں نمایاں ہوا تو اسے ماورائیت کا نام دیا گیا۔ انگریزی ادب میں یہی "ازم" کالرج کی حیات کا باعث ہے ورنہ آج کالرج کا کوئی نام لیوا نہ ہوتا۔

اردو ادب میں خوف کا یہ عنصر شاعروں کے ہاں "خال خال" نظر آتا ہے۔ خدا جانے رئیس کے ہاں یہ جذبہ شعوری ہے یا لاشعوری مگر اتنا نمایاں ہو کر آیا ہے کہ اردو ادب میں ایک مستقل قدر بنتا معلوم ہوتا ہے۔ اگر کالرج اور رئیس کی ماورائیت کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ کالرج نے خوف کی جو فضا بنائی ہے وہ تصوراتی ہے اور بیان کی حد تک محدود ہے مگر رئیس نے خوف کے نفسیات کی مدد سے کچھ ایسے دائرے بنے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو ان دائروں میں محصور پاتا ہے۔

اردو غزل یا نظم میں اگر ماورائیت کی کوئی قدر معین ہوتی ہے تو رئیس پہلا اور منفرد شاعر ہے جسے اس قدر کی علمبرداری کا اعزاز حاصل ہوگا۔ مثال کے طور پر چند شعر لکھتا ہوں :

یہ فقط شورشِ ہوا تو نہیں — کوئی مجھ کو پکارتا تو نہیں

میں تنہا جا رہا ہوں سوئے منزل — یہ پرچھائیں کہاں سے آ رہی ہے
یہ شام اور روشنی کی یہ قطاریں — اداسی اور گہری ہو گئی ہے
عروجِ ماہ ہے اور مقبروں پر — ابد کی چاندنی بھٹکی ہوئی ہے
گرا ہے شاخِ گل سے ایک پتہ — کسی نے کیا مجھے آواز دی ہے

بھوت بن کر مجھے ڈراتی ہیں — میری نا آفریدہ تخلیقات

کون آیا مرے تعاقب میں　　　　دبی فکر و خیال کے جنات
دفعتاً کس نے قہقہہ مارا　　　　یہ اندھیرے میں کون ہے بہ ثبات

دیوار پہ دائرے ہیں کیسے　　　　یہ کون ہے کس سے ڈر رہا ہوں

پیڑوں کے گھنے مہیب سائے　　　　یہ کون ہے مجھ پہ حملہ آور

پتوں میں جھپک رہی ہیں آنکھیں　　　　شاخوں پہ چمک رہے ہیں خنجر

اک موت سے ہوتی ہے ملاقات سر شام　　　　اک روح ڈراتی ہے مجھے آخر شب میں

"غم" ایک ابدی قدر ہے۔ اس کی کیفیت ہمہ گیر ہے۔ شاعری میں غم کی روایت کے دو راستے ہیں "غم جاناں اور غم دوراں"۔ رئیس کا غم جو خندیدہ ہے ان دو راستوں کے علاوہ ایک تیسرے راستے پر بھی گامزن نظر آتا ہے اور یہ تیسرا راستہ کرب کی کیفیت اختیار کرتے ہوئے عقل کی گہرائیوں سے اترتا ہے۔ وہ کرب جو عقل و خرد سے جسم و جان تک سرایت کر جاتا ہو۔ اس کی شدت محسوس کرلینا بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لینے کے مترادف ہے۔ رئیس نے اپنے کرب کا اظہار اس انداز سے کیا ہے:

ذہن پر ایک کھردری سی لکیر　　　　کھنکھورے کا راستہ تو نہیں

شگفتگی کو تڑ و فسردگی پائی　　　　مسرتوں کو بھولا ٹپک پڑے آنسو

چیونٹیاں جیسے ذہن پر رینگیں　　　　اُف یہ میرے لطیف احساسات

سرِ قریب ڈالے بہشت بے خبری　　　　خود آگہی کے جہنم میں جل رہا ہوں میں

شاید اسے عشق بھی نہ سمجھے　　　　جس کرب میں عقل مبتلا ہے

مری تخلیق نغمے سے ہوئی ہو　　　　مگر فریاد ہو کر رہ گیا ہوں

اور یہ

عقل کا زخم ہے بہت کاری

"غم اور کرب" جب سوچ کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو تخلیق کے جوہر نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ غم ہر چند کہ جانگسل ہوتا ہے مگر شاعر کے لئے یہ زہر تریاق کا کام کرتا ہے۔

گہرے سمندروں میں سفر کرنے والا رئیس جہانِ نو کی تلاش میں "سوادِ اعظمِ دنیا" سے اس خرابے میں آیا ہے۔ وہ ہر حادثے کے ساتھ کائنات دگر کی تخلیق پر سوچتا ہے۔ ترقی پسند شعرا نے ایک نئے بشر کی بشارت دی۔ حضرت جوش ملیح آبادی سے جب نئے بشر کی تعریف معلوم کی گئی تو انھوں نے اسے ہمہ صفت موصوف بتایا۔ جب اُن سے سوال کیا گیا کہ اگر انسان کے اعداد و شمار یونہی بڑھتے رہے تو دنیا تنگ ہو کر رہ جائے گی اور پھر غذا کا مسئلہ پیدا ہوگا کہ اس کے اگانے کے لئے جگہ نہ مل سکے گی تو حضرت جوش نے بڑے اعتماد سے فرمایا کہ نیا انسان ہواؤں میں غلہ اگائے گا۔ سائنس کی روز افزوں ترقی سے یہ بات کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ ہواؤں میں وہ کیمیاوی عناصر پیدا کرلے کہ جوش صاحب کے بیان کی تصدیق ہو جائے۔ رئیس کے ہاں بھی تخلیق اور تلاش کا یہ کرب "مضطرب فردا" کا روپ دھارتا ہے اور اس کا بیان کچھ اس انداز میں ملتا ہے ؎

جو نئی تخلیق کی دنیا ابھی منزل میں ہے — اس کا کرب آفرینش بھی ہمارے دل میں ہے

رئیس صاحب اُن گفتگو کے دوران نئے آدمی کی بڑی بڑی توجیہات پیش کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ مستقبل میں ہوگا کہ ان شعرا کی فکر کہاں تک صحیح ثابت ہوتی ہے۔

انسان بنیادی طور پر اپنی ذات کے متعلق بہت کچھ سوچتا ہے۔ یہ سوچ کبھی کبھی اسے بے خبری کے صحرا میں گم کر دیتی ہے کبھی کبھی جنون کی کیفیت اختیار کر جاتی ہے کبھی وہ اپنی ذات میں گم ہو جاتا ہے اور کبھی آفاق اس کی ذات میں گم!

میں اپنی سعیِ طلب کی تلاش میں گم ہوں — یہ وہ مقام نظر ہے جہاں خرد نہ جنوں

اپنے کو تلاش کر رہا ہوں — میں اپنی طلب سے ڈر رہا ہوں

میں خود اپنی ہی خاکسترِ جاں میں مدفون — جس طرح دفن خرابہ میں کوئی سرمایہ

کائنات میں گم ہو کر رئیس کہتا ہے ؎

یہ معجزہ کہ ہر اک عہد کی ہوئی تکمیل — یہ سانحہ کہ ہر اک داستاں ادھوری ہے

خوشا یہ خاک کہ اس خاک پہ سرورِ حیات — خدا کے ساتھ نہیں آدمی کے ساتھ آئی

رئیس کی قادرالکلامی کے چند اور نمونے ملاحظہ فرمائیے:

یوں لگا جیسے کہ بل کھا کے دھنک ٹوٹ گئی — اس نے وقفہ جو لیا تازہ انگڑائی میں

اک شخص سے ہم کلام ہو کر — ہر شخص سے پیار کر رہا ہوں

میں اور شکایتِ زمانہ — اک شخص کا ذکر چھڑ گیا ہے

دل جلا ڈالا ہے شاخِ گل کی طرح — دفعتاً کون کر گیا پروانہ؟

جس پہ الزام تھا پاکیزگیِ دامن کا — اس حسینہ کو نجھڑا تو نہ ساحل پایا

"الف" میں نظموں کی ضخامت غزلوں سے دوگنی ہے۔ اس مجموعے کی نظمیں آفاقی فلسفۂ محبت انسانیت کے تاثر کے تحت تخلیق ہوئی ہیں۔ "عفریت اور دیوتا، تضادِ بشر، خلوت نامہ، عالم ناکردہ، مصلوب کے سوال، قصیدہ مریخ و عزیم ماہ، جوہری عہد، مرزا غالب، آفرینش نامہ، ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعرانہ عظمتیں اور فلسفیانہ توجیہات کی روشنی میں "ذات اور کائنات" "انسان اور خدا" "معاشرہ اور معاشرہ کی نفسیات" کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

یہ نظمیں زیادہ تر طویل ہیں۔ ان کا اندازِ نگارش نظیر اکبر آبادی اور جوش ملیح آبادی کے انداز سے ملتا ہے۔ رئیس کی قادر الکلامی نے یہاں بھی اپنے کمالات دکھائے ہیں۔ صرف ایک مثال عرض کروں گا "عفریت اور دیوتا" میں شاعر یہ اُمنگ رکھتا ہے کہ شہر میں گھومنا چاہتا ہے کہ کوئی اسے پہچان بھی نہ سکے اور وہ ایک جِن یا بھوت کی طرح یہاں کے ذرہ ذرہ سے کر آفتاب تک ایک گہری نظر ڈالتا چلا جائے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا پُراسرار بنانا چاہتا ہے کہ:

خوف و حیرت سے لرگ دوہرائیں — میری جادوگری کے افسانے
یوں مرے جسم و جاں ہوں پُراسرار — یوں مرے خال و خد ہوں انجانے
جیسے میرے وجود میں مدفون — گم شدہ مقبروں کے تہ خانے
جیسے میرے غبار میں ابھریں — موت کی وادیوں کے ویرانے
مجھ میں آتا ہے شہر میں گھوموں — اور کوئی مجھے نہ پہچانے

وہ شہر میں گھومتے گھومتے شخصیتوں کے بتوں کی توڑ پھوڑ کرتا ہوا، دانا‌ؤں اور نادانوں سے اُلجھتا ہوا، داستانوں کے ڈھیر لگاتا ہوا، صبح کے گورستان اور شام کے مے خانوں کی سیر کرتا ہوا شہریار، وزیر و امیر و فقیر سب سے نیاز مسجدوں، مدرسوں اور صنم خانوں سے گریزاں، ہر ایک شے کا تجزیہ کرتا ہوا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ سارا شہر، دنیا، تاریخ عقل کا عفریت اور اہلِ دانش اس کے دیوانے ہیں۔ پھر اس کے دل میں یہ خواہش اُٹھتی ہے کہ یہ عفریت زندگی اے کاش! شاعر کو معصوم دیوتا سمجھ لے گا۔

"الف" کو نہایت سادگی سے چھاپا گیا ہے۔ کاش یہ مجموعہ دورِ جدید کی طباعت کے معیاروں کے مطابق ہوتا۔ جو مجموعہ میرے پاس ہے اس کی اشاعت دوسری مرتبہ ہوئی ہے اگر بارِ سوم چھپنے کی نوبت آئے تو رئیس صاحب کو چاہیئے کہ وہ اس کتاب کو عمدہ کاغذ پر جدید ٹائپ میں چھپوا کر خوبصورت گردپوش کے ساتھ بازار میں لائیں۔

اردو شعر کے قاری کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے:

سیف زلفی

مثنویاتِ حالی

مصنف: خواجہ الطاف حسین حالی — مقدمہ: مولانا مرتضیٰ احسین فاضل

صفحات: ۲۰۶ — قیمت: چھ روپے — ناشر: شیخ مبارک علی، اندرون لوہاری دروازہ لاہور

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کا اُن منتدین اور نقاد ادبا میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے غالب اور غالبیات کا بطورِ خاص مطالعہ کیا ہے۔ لکھنؤ میں رہ کر جو معرکۃ الآرا ادبی خدمات کئے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ کام کی باتیں تو بہت ہیں۔ ایک یہی کیا کم ہے کہ مولانا موصوف کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس انجمن کے باقیات الصالحات سے انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ لکھنؤ میں لُقاسعد کرد ابوتراب خاں اور ثقات فرنگی محل زبان کے قضایائے معاملات پر حکم تھے اور فیصلے نپٹاتے تھے، مولانا موصوف کا کرد ابوتراب خاں سے بھی تعلق ہے اور ثقات کرد سے بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح آپ کو سند بھی حاصل رہاہے۔ حکیم صاحب عالم[1] مرحوم کا مطلب

---

[1] ان کی نسبت جوش ملیح آبادی نے کہا ہے کہ: جوش میرا صاحب عالم ہے جانِ لکھنؤ ''آغا سہیل''

قیام پاکستان کے بعد بھی عرصہ دراز تک صاحبانِ علم اور اربابِ دانش کا مرجع تھا۔ مولانا موصوف بھی اس اڈے پر گاہے گاہے قیام فرماتے اور یہ مکتبہ تھا کہ زبان ادبی جگمگاتے ہوں اور مولانا تشریف فرما نہ ہوں اور اسی طرح یہ بات بھی طے ہے کہ اس چمنستانِ ادب کی خوشبوؤں کو مولانا نے اپنے قلب و نظر کے دامن میں خوب سمویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنویات پر جو مقدمہ موصوف نے سپردِ قلم فرمایا ہے۔ ہر اعتبار سے مکمل، متوازن اور جامع ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنویات کے باب میں اب کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ ان کو کلاسیک کا درجہ مل چکا ہے اور ان میں ہر مثنوی بجائے خود ہمارے دیدہ و دل کے لئے روشنی کا سامان بن چکی ہے مولانا موصوف نے مثنویات پر تحقیق کرنے والوں کے لئے مواد فراہم کیا ہے اور حالی کے باب میں تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی کے لئے ماخذ وغیرہ بھی مہیا کر دیا ہے۔

مولانا موصوف کے طرزِ نگارش میں ادبی ثقاہت، تحقیقی شان، زورِ بیان کا کمال اور بڑی دل نشیں شگفتگی موجود ہے۔ اگرچہ مولانا عربی زبان و ادب پر حاوی ہیں اور عربی زبان میں لکھتے بھی ہیں اور مدرس بھی۔ بڑی بے تکلفی سے گفتگو بھی فرماتے ہیں لیکن اس نسبت سے بعض لوگوں کو جو معرب زبان استعمال کرنے کا چسکا ہوتا ہے بحمداللہ مولانا موصوف کا دامن اس سے پاک ہے اور وہ ژولیدہ بیانی کو ابلاغ و ترسیل کے راستے میں رکاوٹ خیال کرتے ہیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں حسنِ بیان بھی ہے اور عالمانہ اور منطقیانہ بحث بھی، استدلال کا چوکھا انداز بھی اور تحقیقی موشگافیوں کا سامان بھی۔

مشمولہ مقدمے میں حالی کی مکمل تحقیق شدہ سوانح موجود ہے۔ ان کے خدماتِ ادب کا جائزہ ہے۔ حالی کے فن سے عالمانہ اور محققانہ بحث ہے۔ ان تمام مراحل کو مولانا موصوف نے خوب طے کیا ہے اور ہمارے بعض کم سواد پروفیسرانِ اردو ادب اور نام نہاد ادبا کے استفادے کے لئے (جن میں سے اکثریت پی ایچ۔ ڈی مارکہ ادبا و محققین کی ہے) بڑے کام کی باتیں جمع کر دی ہیں۔

آغا سہیل

مغرب کے تنقیدی اصول

مصنف: سید سجاد باقر رضوی — ناشر: ادارہ کتابیات لاہور

صفحات: ۳۳۵ — قیمت: ۱۲ روپے

یہ دش بخیر زمانۂ طالب علمی میں ایم اے کے درجات میں تنقید جیسا مضمون اور احتشام حسین سا ناقد استاد جس کے تبحر علمی کا اندازہ بقدرِ آگہی طلبہ کو بھی ہوتا اور محافلِ علم و ادب میں اساتذہ کو بھی نظری اور عملی تنقید دونوں ہی سے واسطہ پڑتا۔ کتابوں کی تعداد یاد نہیں کہ کس قدر پڑھنا پڑتی تھیں سلسلہ بالعموم ارسطو ہی سے شروع ہوتا تھا اور موجودہ زمانے کی تنقید پر تان ٹوٹتی تھی۔ اللہ رے انکسار کہ مارکسی دبستانِ تنقید کے ذیل میں بھی اپنا نام نہیں آنے پاتا تھا بعض لوگ اگر ذکر بھی کرتے تو اس انداز سے اعتراف ہوتا کہ جیسے اس کام کا جائزہ لینا ان کا کام نہیں ہمارا کام ہے ـــ

سید سجاد باقر رضوی نے مغرب کے تنقیدی اصول، افلاطون سے لے کر ٹی ایس ایلیٹ تک جمع بھی کر دیئے ہیں اور اردو میں منتقل بھی کر دیئے ہیں۔ کامپٹن رکٹ (Compton Rickett) اور ہڈسن (Hudson) کے حوالوں سے ہم تاریخ ادب انگریزی پڑھا کرتے تھے۔ بالطبقا ڈاکٹر عابد حسین کے حوالے سے مغرب اور احتشام حسین کے حوالے سے شعر و ادب پڑھتے تھے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ استادِ محترم اس مشہور و معروف کتاب پر ہر قسم کے نظریات رکھنے والے ناقدین کے آرا بھی سناتے اور اس زبان و ادب کا جائزہ لیتے جس نے اس کو کسی نہ کسی حیثیت سے قبول کیا اور اس کے ردِ عمل کہاں کہاں اور کن کن صورتوں میں ظاہر ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام (ڈگری کالج یونیورسٹی) نے ہڈسن کی کتاب کا ترجمہ کر کے تنقید کے طلبہ کے لئے جزوی طور پر سہولت پیدا کر دی ڈاکٹر عبادت بریلوی اب سے کوئی بیس بائیس سال قبل "اردو میں تنقیدی ارتقا" کا جائزہ لے چکے تھے۔ سید سجاد باقر رضوی نے مغرب کے جدید و جدید

متقدمین اور نقادانِ ادب کے آراء و نظریات کے پیشِ نظر جو تنقیدی اصول یکجا کئے ہیں وہ بے حد وقیع ہیں اور اس بات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس کام میں اُن کو کس قدر کاوش اور محنت کرنا پڑی ہو گی۔ اگرچہ یہی مضمون موٹے موٹے ابواب ہیں اور بڑے مشاق اور منجھے ہوئے استاد تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن مقالے کی شکل میں ایسے بصیرت افروز موضوع کو ڈھالنا بھی بہرحال ایک کمال ہے اور جس کی داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہے۔

اس بات کا اعتراف خود رضوی صاحب نے کیا ہے کہ اردو میں اپنی قسم کی یہ پہلی کتاب نہیں ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ بنیادی طور پر طلبہ کے ضروریات کے پیشِ نظر لکھا گیا ہے۔ احمد مقصود صاحب جنہوں نے اس مقالے کا دیباچہ لکھا ہے، فرماتے ہیں:

”باقر صاحب کی کتاب مغرب کے تنقیدی اصول پر اردو میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے۔“

یہاں میں مقصود صاحب سے بالکل متفق ہوں اور اگر وہ اجازت دیں تو اس قدر اور بھی عرض کرنے کو تیار ہوں کہ ہر کتاب بہت سی کتابوں کے ساتھ اپنے موضوع اور نفسِ مضمون کی یکسانیت کے باوجود اپنی طرز کی پہلی ہی کتاب ہوتی ہے، البتہ اُن کا یہ ارشادِ گرامی کہ:

”پچھلے کوئی ساٹھ ستر برسوں سے ہمارے نقادانِ فن انھیں مغربی تنقیدی اصولوں سے متاثر ہوتے رہے ہیں اور انھوں نے حتی المقدور ان اصولوں کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن محمد حسن عسکری اور فراق کے سوا شاید ہی کوئی اور ان سے صحیح معنوں میں فیض یاب ہو سکا ہے“

حقائق سے بہت زیادہ قریب نہیں ہے۔ لہٰذا اس محل پر بڑے غور و فکر کے بعد ایک متوازن رائے دینے کی ضرورت تھی۔ یوں تو ہم دونوں اپنی اپنی آراء کے سلسلے میں آزاد ہیں، انھیں مجھ سے اور مجھے اُن سے اختلاف کا حق ہے لیکن یہاں معاملہ میرا ان کا نہیں ہے اس لئے ٹھنڈے دل و دماغ سے سمجھنے اور غور کرنے کا ہے:

مجھے موضوع اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے کتاب اچھی معلوم ہوئی لیکن اندازِ بیان سے تدریسی حیثیت محسوس ہوئی۔ میری ناقص رائے میں سجاد باقر رضوی اچھے درجے کے شاعر ہیں اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں اس سے زیادہ حدِ ادب ہے اور کم از کم باقر صاحب جیسے مخلص دوست کے سلسلے میں ترکِ ادب مجھے منظور نہیں۔
ناشر کو دوسرے ایڈیشن کے موقع پر کتابت کے بعض نقائص کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے۔

آغا سہیل

جب لوہا پگھلتا ہے (ڈراما)

مصنف: ہربنس دوست — ناشر: تاج سعید، مکتبۂ ارژنگ، ۳۰ عنایت منزل، سکندر ٹاؤن، پشاور۔

اردو میں ڈرامے ہیں کتنے! اور جو ہیں بھی تو ان میں خوبیاں گنتی کی اور نقائص بے شمار ہیں۔ اسٹیج یا فلم میڈیم کے ضروریات کو عموماً نظرانداز کر کے لکھے گئے ہیں۔ ہربنس کے اس ڈرامے میں یہ خوبی بڑی نمایاں ہے۔ کرداروں کا تعلق ہے تو سبھی برصغیر سے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے مسائل اور ہندوستان کے مسائل میں زمین و آسمان کا فرق ظاہر ہوا ہے اس لئے ہمارے لئے اس ڈرامے کی کشش کم ہے۔ ہاں جن لوگوں کو دوسرے دیسوں کے مسائل سے کسی حد تک دلچسپی ہے اُن کے لئے اس میں تسکین کا سامان ہے۔ بعض کردار منفرد بھی ہیں اور جاندار بھی۔ عیب یہی ہے کہ مصنف کی عینیت پسندی ہر کردار پر حاوی نظر آتی ہے۔ بلراج ساہنی جیسے اداکاروں نے جو ٹیگور جیسے شاعر اور کلاکار کے معروف ادارے شانتی نکیتن سے وابستہ رہ چکے ہیں، میری منکدہ بلا خط کشیدہ رائے کی نفی میں چند باتیں کہی ہیں لیکن ان میں استدلال اور وزن نہیں ہے۔ اس کے باوجود ڈراما بُرا نہیں، دلچسپ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ پاکستان ڈرامے کے معاملے میں ہندوستان سے پیچھے ہے لیکن مغربی ڈرامے کے تمام نشیب و فراز اور رموز و نکات کو ہمارے ادیب بخوبی سمجھ رہے ہیں اور مغربی ڈرامے اور اس کی تکنیک سے ہم جو اثرات قبول کر رہے ہیں وہ اس اعتبار سے زیادہ صحت مند ہیں کہ ہندوستانی فلموں کا روایتی طور ڈرامائی انداز اس میں نہیں ہے۔ بدقسمتی سے دوست کے ڈرامے میں یہ بات بھی موجود ہے جو ہمیں بالکل اپیل نہیں کرتی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بمبئی کے فلمی ماحول سے قریب ہیں۔

مجھے دوست کے ڈرامے میں دوسری خوبی جو نظر آئی وہ بے ساختہ مکالمے ہیں۔ اگر وہ ڈرامے کی صنف پر بھرپور توجہ دے سکیں اور ہمارے مسائل کو بھی اپنے دائرہ عمل میں لا سکیں تو اردو ادب پر احسان ہوگا۔

اس ڈرامے کی تیسری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا حسن اسٹیج پر ظاہر ہوتا ہے کاغذ پر نہیں۔

آغا سہیل

پاگل پن کے پانچ دورے

"پنجابی زبان جو پاکستان کی کئی ایک علاقائی بولیوں ہی میں سے ایک ہے لیکن چند خصوصیات کے اعتبار سے منفرد زبان بھی ہے۔ وہ خصوصیات کچھ اس طرح کی ہیں:

دونوں قومی زبانوں کے بعد ملک کے سب سے زیادہ لوگوں کا ذریعۂ اظہار ہے

قومی اور علاقائی زبانوں میں سب سے زیادہ مظلوم ہے

تجارتی لحاظ سے باقی تمام ملکی زبانوں سے آگے ہے۔ چند ایک تجارتی فوائد یہ ہیں:

حکومت سے گرانٹ لینے کے کام آتی ہے کیونکہ اتفاق سے ایک زبان ہے۔

تعلیم بالغاں کی پہلی سیڑھی کے طور پر کم خرچ بالانشین شے ثابت ہوتی ہے

ذومعنی انداز میں لکھ کر فلمائی جائے تو فلمیں کئی کئی کھڑکی توڑ ہفتے مناتی ہیں۔

ریڈیو والوں کو تبرک کے طور پر کام دیتی ہے جو اسے بکمال کفایت استعمال کرتے ہیں مبادا اس کا ذخیرہ ختم ہو جائے۔

سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اہلِ پنجاب کو تنگ کرنا مقصود ہو تو تیر بہدف نسخے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

ایسی سونے کی چڑیا سے مفادِ عاجلہ حاصل کرنے کی بجائے اگر کوئی اس میں ثقافتی روایات، جمالیاتی اقدار، فنی بندشیں، معاشرتی اور تہذیبی تاریخ اور علمی ادبی کارناموں کی تلاش میں چل پڑتا ہے تو آپ اس حرکت کو پاگل پن کے سوا اور کیا کہیں گے؟ ایسے پاگلوں میں مجلس شاہ حسین بھی ہے کہ سنہ ۱۹۶۸ء سے سرگرم جنوں ہے۔ چار برس میں تجارت پیشہ حضرات کو پنجابی کی برکت سے منفعت کی کئی راہیں سجھائی دیں لیکن مجلس ہے کہ ایک ہی رٹ لگائے جا رہی ہے ؎

وہ سوداگر ہوں، میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

یوں تو مجلس کو سنہ ۱۹۶۸ء کے بعد ہر سال موسم بہار میں چھوٹا موٹا دورہ پڑتا ہی رہتا ہے لیکن سنہ ۱۹۷۲ء میں بقول کسے ؎

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری

والا قصہ ہو گیا ایک مہینے میں پاگل پن کے پانچ دورے اور بربخت جانی کا یہ عالم کہ اس برس تیسرا پڑ رہے ہیں ..... مارچ سنہ ۱۹۷۲ء کے آغاز میں مجلس نے پانچ مطبوعات پیش کرنے کا اعلان تو کر دیا لیکن بعد میں جو کچھ ہوا وہ مطبوعات کے دیباچوں سے ظاہر ہے۔ ان مطبوعات پر تبصرہ نہیں محض تعارف ہے۔

<u>پنجابی دے صوفی شاعر</u>: یہ کتاب پنجابی ترجمہ ہے ڈاکٹر لاجونتی رام کرشن کے تھیسس Panjabi Sufi Poets [illegible] کا جسے لکھ کر انہوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی یہ تقسیم ملک سے پہلے کی بات ہے۔ کتاب کا پہلا اور آخری نسخہ انگریزی زبان میں آج سے کوئی تیس برس پہلے چھپا تھا اگرچہ یہ کتاب اس موضوع پر اہل تحقیق کے لئے محض خام مواد مہیا کرنے کی اہل تھی لیکن آج تک کسی نے اسے بنیاد بنا کر پختہ تر تحقیقی عمارت تعمیر

کرنے کا سوچا تک نہیں ـــــ شاید اس لئے کہ یہ ایک غیر مفید فعل تھا ـــــ یہاں تک کہ کتاب قریب قریب نایاب ہو گئی۔ مجلس شاہ حسینؒ نے اسے ایک دفعہ پھر زندہ کر دیا ہے۔ اینٹی جنتا کو تنگ کرنے کے لئے! کیونکہ کتاب انگریزی کی بجائے پنجابی میں ہے! اب اسے کون پڑھے گا؟ لیکن "مجلس" والے بھی مصر ہیں کہ اس موضوع پر جب بھی تحقیقی کام ہوا بنیاد اسی کو بننا ہو گا اور وہ نہیں چاہتے کہ بنیاد مٹ جائے۔ کتاب "آئینہ ادب" کے تعاون سے چھپی ہے اور اس کی گٹ اپ سے مذکورہ ادارے کا روایتی سلیقہ جھلکتا ہے۔ کاغذ سفید ہے اور ضخامت ۲۰۴ صفحات۔

کافیاں شاہ حسین (پنجابی): بقول ڈاکٹر لاجونتی شاہ حسین نے بزبان شعر جو کچھ بھی کہا اس میں سے باقی صرف کافیاں بزبان پنجابی ہی رہ گئیں ہیں جن کی کل تعداد دو لوگوں نے الگ الگ بتائی ہے۔ کافیاں منتشر حالت میں تھیں انھیں یکجا کر کے چھاپنے کا کام قیام پاکستان سے پہلے ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے کیا۔ یہ اس ضمن میں پہلی قابل قدر کوشش تھی۔ ایک تو کتاب پرانے طرز پر چھپی، دوسرے اس میں املا کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد چند ایک تدریسی اداروں کی طرف سے کافیوں کو نئے سرے سے چھاپنے کا اہتمام تو ضرور ہوا لیکن مقصد پیش نظر تعلیم بالغان کی پہلی سیڑھی مہیا کرنا تھا کیونکہ حسن اتفاق سے کافیاں فاضل پنجابی کے کورس میں شامل کر لی گئی تھیں۔ اس لئے یہاں بھی کافیوں کی ترتیب، املا اور صحیح تعداد کے تعین کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ادھر موہن سنگھ والا نسخہ بھی ناپید ہو چلا تھا۔ چنانچہ "مجلس شاہ حسین" کو کافیاں دوبارہ چھاپنے اور ایک دفعہ پھر غیر مفید کام کرنے کا جواز مل گیا۔ موہن سنگھ کے نسخے میں مزید دو کافیوں کا اضافہ شاہ حسین کے کلام میں ایک نئے رجحان کی نشان دہی کرتا ہے جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھا۔ مقام حیرت ہے کہ ان دو کافیوں کا ماخذ بھی موہن سنگھ ہی کی کتاب "پنجابی دی تاریخ" ہے۔ اس کتاب کے چھپنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ حسین کا کلام بطریق احسن محفوظ ہو گیا ہے۔ کتاب دبیز کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے۔ سرورق حنیف رامے کا عطیہ ہے۔ قیمت درج نہیں۔ غالباً "مجلس" کے پیش نظر اس پہلو کی اہمیت کم تھی۔

کافیاں شاہ حسین (انگریزی): ـ انگریزی اینٹی جنتیا! ہوشیار باش!! اور بھول شاعروں کی محفل میں جانے کا اتفاق ہو یا امریکہ، برطانیہ یا کسی اور ملک سے کوئی ادیب شہر میں وارد ہو تو موضوع گفتگو اس قسم کا ہی ہوتا ہے کہ فلاں صاحب کی نظم فلاں زبان میں، فلاں صاحب کا افسانہ فلاں زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ غیر ممالک میں کھپت کے خیال سے لاہور ہی میں ایک دو اداروں نے ملکی تخلیقات کو انگریزی میں ڈھالنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کاروبار میں بعض اوقات متعدد قسم کی مصلحتوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ شاہ حسین کے کلام کو انگریزی نظم میں ترجمہ شائع کرنے کی مصلحت بجز اس کے کوئی نظر نہیں آتی کہ غلام یعقوب انور سے یہ ترجمہ کرنے کی حرکت سرزد ہو گئی ـــــ آپ سوچئے نا! پنجابی شاعر کا انگریزی میں ترجمہ!! ـــــ انور کے تراجم گلڈ کی طرف سے انگریزی میں چھپنے والی پاکستانی منظومات کے مجموعہ میں شامل تھے اور غالباً اسی غرض سے انھوں نے پنجابی شعرا کا بھی انگریزی نظم میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے مجلس شاہ حسین نے اپنے اشاعتی پروگرام کی ایک شق کے طور پر اچانک "منتخب کر لیا"۔ اچانک کا لفظ میں نے دانستہ استعمال کیا ہے۔ وہ اس لئے کہ مجلس نے جو کافیاں پنجابی میں چھاپی ہیں ان کی اور غلام یعقوب انور کے ترجمے کی نمبروار ترتیب ایک نہیں البتہ انگریزی نسخے میں ہر کافی کے نیچے پنجابی نسخے کا نمبر دے دیا گیا ہے۔ لیکن اس اچانک کا اثر یہیں تک محدود رہا۔ طباعت اور گٹ اپ کی خوبصورتی تو مجلس کے سر الزام تھوپ رہی ہے کہ کتاب کو بڑے اہتمام اور "ذہنی فرصت" سے چھاپا گیا ہے۔

"پنجابی ادب" کا شاہ حسین نمبر: چار کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ "مجلس" اور "پنجابی ادب" نے مشترکہ مساعی سے شاہ حسین کی زندگی اور فن کے بارے میں کم و بیش دو سو صفحات بھی پیش کر دیئے ہیں۔ "پنجابی ادب" ایک عرصہ سے زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے لیکن غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ اس کا اتنا ضخیم نمبر اور وہ بھی صرف ایک شاعر کے بارے میں پیش کیا گیا ہے۔ شاید یہ دعویٰ بھی بے جا نہ ہو گا کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار کسی پنجابی رسالے نے کسی ایک شاعر کے لئے اپنا پورا شمارہ وقف کر دیا اور یہ شمارہ بھی عام شماروں سے پانچ گنا ہے۔ اس شمارہ میں محمد آصف خاں نے شاہ حسینؒ کے بارے

بارے میں لکھے گئے مضامین کی فہرست کافی محنت کاوش سے تیار کی ہے۔ تصاویر کے صفحوں پر "حقیقت الفقرا" کے اصلی مسودے کا عکس اور شاہ حسین کے مزار کی تصویریں ہیں۔ لکھنے والوں میں جیلانی کامران، صفدر میر، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، غلام یعقوب انور، مسعود اللہ خاں، احمد سعید قریشی اور راحت نسیم ملک کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ لیجئے کیسے کیسے لوگ پنجابی لکھتے ہوئے پکڑے گئے۔

حقیقت الفقرا: یہ کتاب فارسی نظم میں شاہ حسین کی سوانح عمری ہے۔ اگر فقرا کی "نیر مجلس شاہ حسین" کو سمجھا جائے تو بات تب بھی بن جاتی ہے۔ کتاب کا مصنف شیخ محمود المعروف محمد پیر اس وقت تیرہ برس کا تھا جب شاہ حسین کا ٹوت شاہدرہ سے باغبانپورہ منتقل ہوا اسے شاہ حسین کے یار غار مادھولال کا برسوں قرب حاصل رہا جو شاہ کے بعد زندہ رہا۔ اس اعتبار سے شیخ محمود کو شاہ حسین ہی کے زمانے کا آدمی کہا جا سکتا ہے۔ مذکورہ کتاب ہمارے پاس شاہ حسین کے سوانح کا ایک اور صرف ایک ماخذ ہے جو کسی کے علم میں ہے لیکن اس کی چھپائی کا تاریخ میں کہیں بھی ثبوت نہیں ملتا۔ ایک آدھ قلمی نسخہ آج تک محفوظ چلا آ رہا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں اس کا اردو ترجمہ چھپا لیکن آج اس کے چھپنے کا بھی محض ذکر ہی باقی ہے۔ وہ کشمیری بازار میں بطرز کہنہ چھپا اور وہیں کہیں گم ہو گیا۔ "مجلس شاہ حسین" نے پھر پاگل پن کے چھپنے میں ٹانگ اڑائی اور میلے کے موقع پر اسے پیش کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن کتاب کے شروع میں وہ حالات پڑھ کر جن میں کتاب کی اشاعت کا انتظام ہوا، ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ دیوانگی قابل تعریف حالت ہے یا قابل مذمت میرے نزدیک اس کتاب کی اشاعت پاگل پن کا سب سے بڑا دورہ ہے جس میں "نئی مطبوعات" والے بھی برابر کے شریک ہیں ایسی ہوتی ہے حقیقت الفقرا!

کتابیں نقائص سے پاک نہیں ہیں۔ پھر میری تحریر سے قارئین کو یہ یقین بھی ہو گیا ہوگا کہ میں "غالب" کا طرفدار ہوں۔ اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ ایک تو ڈھائی صفحات میں پانچ مطبوعات کے بارے میں سخن فہمی بروئے کار نہیں لائی جا سکتی۔ دوسرے آپ سخن فہم ہی بن کر بتائیے کہ کوئی نحیف و نزار آدمی کشتی کے بغیر دریا میں کود پڑے اور آپ کے یقین کے خلاف کسی ڈوبنے والے انسان کو موت کی دہلیز سے واپس گھسیٹ لائے تو آپ ایسی باتوں کی عیاشی کہاں تک کر سکیں گے کہ تم نے ڈوبنے والے کے سلجھے ہوئے بال کیوں الجھا دیئے ہیں یا اس کا لباس بھیگ کر جسم سے یوں چپکا ہوا ہے کہ ہمارے جمالیاتی ذوق کو مجروح کر رہا ہے یا بچانے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں معلوم کیا کہ ڈوبنے والا کس قسم کا انسان تھا..... یا وغیرہ وغیرہ!

حسین شاہد

جاوید نامہ

مصنف: محمد اقبال — مترجم: اے، جے، آربری

ناشر: ایلن اینڈ انون۔ لندن — قیمت ۲۴ شلنگ

ای۔ ایم فاسٹر نے ۱۹۴۶ء میں محمد اقبال کے بارے میں لکھا تھا

وہ جدید ہندوستان کے دلچسپ ترین مظاہر میں سے ایک ہیں اور ان کے کارناموں سے ہماری غفلت حیرت انگیز ہے۔

اب پروفیسر آربری نے اقبال کے اہم شعری کارنامہ "جاوید نامہ" کا انگریزی زبان میں بے عیب، رواں دواں اور دلکش ترجمہ کر کے ہماری اس لاعلمی کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔

"جاوید نامہ کی ہیئت قدیم و جدید کے اس حسین امتزاج کا آئینہ دار ہے جو اقبال کے تمام کلام کا نمایاں وصف ہے۔ جاوید نامہ کو فارسی زبان کی قدیم ترین مقفیٰ صنف شعر مثنوی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے جہاں یہ کہنا برحق ہے کہ اقبال کا زبان اور ہیئت کا انتخاب بڑی حد تک نظم کی فلسفیانہ اور مقصدی نوعیت کا

مرہونِ منت ہے۔ وہاں یہ قرار دینا بھی بجا ہے کہ یہ انتخاب قومی اقدار کی مکمل نفی اور عالمگیر اسلامی تہذیب میں اقبال کے گہرے یقین کی غمازی کرتا ہے۔ مزید یہ کہ نظم جدید اور ہیئت کے تجربات سے بے اعتنائی، مغرب کی فضول نقالی سے اقبال کی ناپسندیدگی کی ترجمان ہے۔

ایک مذہبی کی سی وسعت کی حامل یہ نظم افلاک اور آں سوئے افلاک کے اس سفر کی کہانی بتاتی ہے جو شاعر نے فارسی زبان کے عظیم صوفی شاعر رومی کی معیت میں طے کیا۔ شاعر اور اس کا رہنما اس سفر کے دوران نطشے، ٹالسٹائی اور کچنر سمیت مختلف شخصیات سے ملتے اور ہمکلام ہوتے ہیں۔ یوں جو مکالمات ظہور میں آتے ہیں ان کی وساطت سے اقبال اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل نو سے متعلق اپنے بنیادی تصورات پیش کرتے ہیں۔

اقبال کے تصورات اپنے ہمعصر رشید رضا سے بڑی حد تک مماثل ہیں اور ان پر سید جمال الدین افغانی کی دلکش اور پُراسرار شخصیت کی گہری چھاپ ہے۔ اقبال کو اسلام اور مادی ترقی میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ ان کے نزدیک اسلام کے زوال کی ذمہ داری اُن افراد و ادارون پر عاید ہوتی ہے جو اسلام کی حقیقی روح سے خائف ہو کر مقدر پرستی اور جبر مشیت کے تباہ کن صوفیانہ تصورات میں سکون کے متلاشی رہے۔ ان تصورات کے زیر اثر مسلمان زمین پر خدا کے نائب کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو کر تارکِ عمل بن گئے اور یوں اسلام میں حرکت و عمل کا اصول اُن کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اقبال اس اصول کو اسلام کی بنیادی خوبی شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ اُسرارِ خودی کی طرح 'جاوید نامہ' میں بھی حرکت و عمل کے تصورات کا اثبات کیا ہے۔ زندگی کی حرکت اور تصادم 'جاوید نامہ' کا مرکزی موضوع ہے:

کیشِ ما مانندِ موجِ تیزگام اختیارِ جادہ و ترکِ مقام

'جاوید نامہ' شاہد ہے کہ اقبال مغرب کی مادی ترقی کا حقیقی راز جان گئے تھے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ مغرب سے صرف تکنیک سیکھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ مغرب کے مجموعی زاویہ نگاہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے لیکن اقبال کا اس زاویہ نگاہ کو روایتی اسلامی اسلوب میں سرگرم کار رہنا اتنا ہی غیر حقیقی تھا، جتنا نئے اور انفرادی خیالات کو قدیم شعری ہیئتوں میں پابند کرنا۔ (دی ٹائمز۔ لندن —— قسمت علمی و ادبی —— ترجمہ: ادارۂ فنون)

صلیبِ درد (مجموعۂ کلام)

مصنف: سہیل اختر ناشر: پیرا ماؤنٹ ٹیمز کارنر۔ ڈیرہ غازی خان

ضخامت: ۱۳۲ صفحات قیمت: ۴ روپے

سہیل اختر صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام 'دھوپ کے دیپ' ہماری نظر سے نہیں گزرا اس لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام 'صلیبِ درد' پہلے سے کس حد تک مختلف ہے اور انھوں نے اس دوران فنی ریاضت اور نکھار کی کون سی منزلیں طے کی ہیں۔ 'صلیبِ درد' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سہیل اختر کے پاس احساس کی وہ دولت بدرجۂ اتم موجود ہے جو اچھی شاعری کے لئے ناگزیر ہے۔ احساس کی اس شدت کی جھلکیاں جگہ جگہ نمایاں ہیں اور اگر سہیل اختر نے سہل انگاری سے کام نہ لیا اور فن شاعری کے مطالبات سے اغماض نہ برتا تو وہ کچھ عرصے کے بعد اردو کے اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگیں گے۔ یہ پیش گوئی اس لحاظ سے بڑے اعتماد کے ساتھ کی جا سکتی ہے کہ سہیل اختر زندگی کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں کسی الجھن میں مبتلا نہیں ہیں۔ وہ جبر و ظلم کے دشمن ہیں اور زندگی کو آسودہ، متوازن اور خوشحال دیکھنے کے متمنی ہیں۔ یوں جب شاعر کو معلوم ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے تو اظہار کی خامیاں یا زبان کی لغزشیں اسے نمایاں ہونے سے تادیر نہیں روک سکتیں بلکہ یہ امر عام مشاہدے میں آیا ہے کہ شاعر کے فکر کے ساتھ ساتھ اس کے بیان و زبان آپ ہی آپ نکھرتے چلے گئے ہیں۔

سہیل اختر نے اس مجموعے میں بعض آزاد نظمیں بھی شامل کی ہیں مگر ان کا اصل رنگ غزل میں اور غزل نما نظموں میں نکھرتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے 'صلیبِ درد' کے مقدمے میں بالکل درست کہا ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہ غزل کی طرف زیادہ توجہ دیں تو جدید غزل نگاروں میں ایک مقام حاصل کر سکتے ہیں اس لئے کہ 'صلیبِ درد' کی غزلیں ان کے روشن مستقبل کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہیں۔ (ح ح)

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر، پبلشر نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر "فنون" ۴/۴۷ - انارکلی لاہور سے شائع کیا